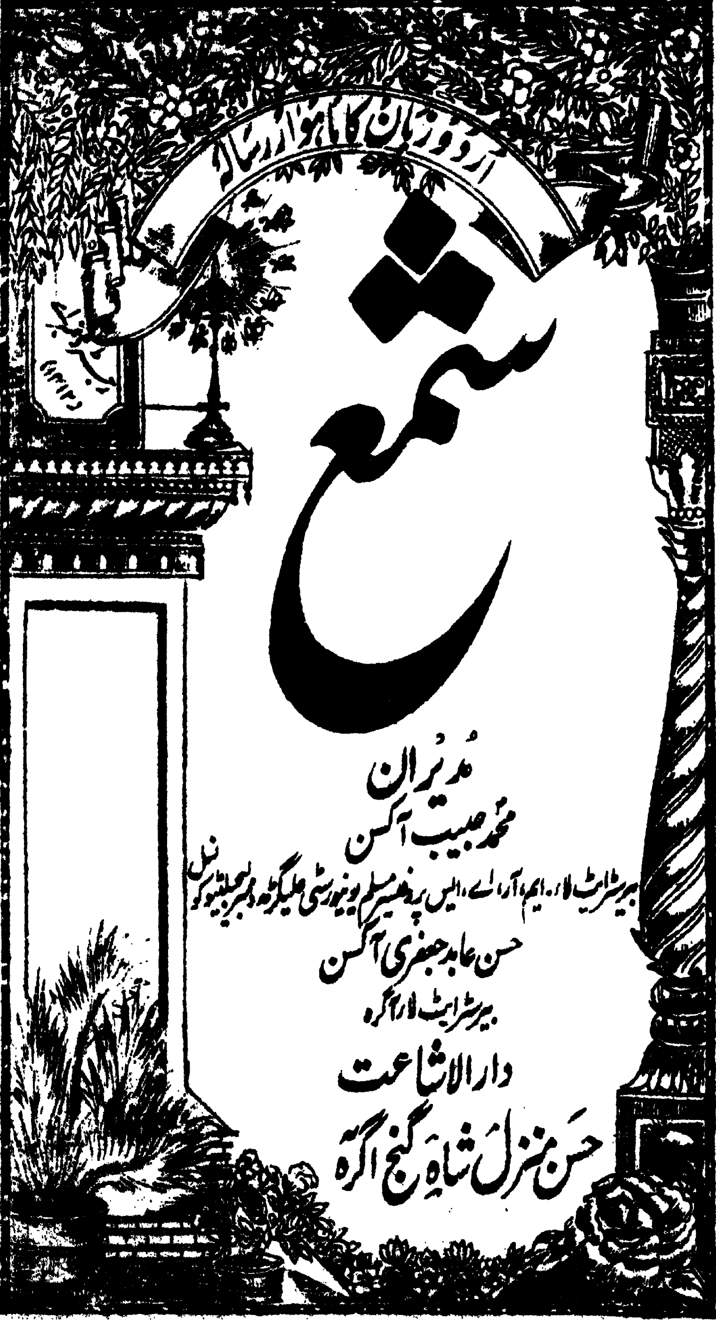

اردو زبان کا ماہوار رسالہ
شمع
مدیران
محمد حبیب آکسن
بیرسٹرایٹ لا، ایم، آر، اے، ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ممبر لیجسلیٹیو کونسل
حسن عابد جعفری آکسن
بیرسٹرایٹ لا آگرہ
دارالاشاعت
حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ ۲۰ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت مع محصول ڈاک ۱۰ آنہ ہے ممالک غیر سے عہ/ نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہوسکتا ہے۔

۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہوسکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت و ترسیل زرچندہ و اجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

۷۔ مضامین و خطوط متعلق مضامین ایڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔ پی منگواکر واپس نہ فرمائیے۔

شرح اجرت حسب ذیل ہے

مدت	¼ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	معہ/	عصہ/	مہصہ/
چھ ماہ	عصہ	مہصہ/	للعصہ/
ایک سال	مہصہ	صہ/	للعہ/

المشتہر:۔ منیجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اپنے اُن مہربان معاونین کی ایک فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو، وہ بغیر اُن سے دوبارہ دریافت کئے تیار ہوتے ہی اُن کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے - ہمیں اُمید ہے کہ خریداران رسالۂ اُردو ہمیں عام طور پر اس قسم کی اجازت دیدیں گے کہ اُن کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کرلئے جائیں اور انجمن سے جو کتاب شائع ہو فوراً بغیر دوبارہ دریافت کئے روانہ کردی جایا کرے - یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہو جائے گی - ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے معاونین جو اُردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں، اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے —

اِن معاونین کی خدمت میں کُل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کرکے روانہ ہوں گی -

براہ کرم جلد اطلاع دیجئے تاکہ سب سے پہلے آپ کا نام درج کر لیا جائے —

المشتہر

انجمن ترقی اُردو - اورنگ آباد دکن



مرزا محمد اسمعیل خان صاحب دیوان ریاست میسور

The "Riyasat" Press, Delhi.

جلد ۵ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ فروری ۱۹۲۷ء | نمبر ۲

تصاویر

(۱) جناب وزیر اعظم امین الملک میرزا محمد اسمٰعیل صاحب بی۔ اے۔ سی۔ آئی۔ ای۔ او۔ بی۔ ای۔

(۲) جناب وزیر المالک آصف جاہ نواب ابوالمنصور خاں بہادر صفدر جنگ۔

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو بہم خریدار ایک سال نئے سے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا۔
اگر آپ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کیجا ئینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون سنہ ۲۷ء تک جو بہترین افسانہ وصول ہوگا اس کے معاوضہ میں چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر آپ نے کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جب تک شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپکو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اسکی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائیں گی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپ کی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اس پر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ

جو مضمون، افسانہ، ناول، نظم یا غزل ناپسند ہوگی وہ ارکا ٹکٹ آنے پر واپس کردی جائے گی۔ البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے با احتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپ کا کلام شائع ہوگا، بلا لحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جائیگا

مطبوعات جدید

جو سنہ ۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، ان پر دو انعامات ہیں۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجیں گے، اور

(۲) دوسرا انعام حسب تجویز کمیٹی اُن کو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب رسائل فرمائیں گے۔

خادم - منیجر شمع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شمع

بابتہ ماہ فروری سنہ ۱۹۲۷ء

محکومیت نسواں

(مصنفہ جان اسٹورٹ مل)

(بہ سلسلہ ماسبق)

(۳)

از

(جناب مولوی محمد معین الدین صاحب انصاری۔ بی۔ اے (کنٹب) بیرسٹر ایٹ لا)

عورتوں کو سیاسی زندگی اور جائز پیشوں سے بھی محض اسلئے الگ رکھتے ہیں کہ کہیں وہ اپنی گھریلو زندگی اور خانگی دنیا کی چاردیواری سے باہر نہ آجائیں۔ جو کام ناکارہ سے ناکارہ مرد کے لئے

جائز ہے وہ لائق سے لائق عورت کے لئے حرام ہے پرانے خیال کے لوگ اسی صورت حال کو فی الجملہ سوسائٹی کے مفاد کے لئے ضروری بتاتے ہیں اور اب تک یہ کہنے والے موجود ہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں۔ انکا ذہن فطرتاً کند اور ناکارہ ہوتا ہے۔ اور خود عورتوں کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ وہ مرد کی مطیع ہو کر رہیں۔

میں کہتا ہوں کہ رواجی پابندیوں کے باوجود بعض اوقات عورتوں کے مخالفین کو بھی ماننا پڑا ہے کہ عورتیں بہت سے مردوں سے سبقت لے گئیں۔ اور بعض امور میں یقیناً مردوں سے افضل ثابت ہوئیں۔ اگر کسی شخص یا گروہ کو کسی خاص شخص یا چند اشخاص سے کچھ شکایت ہو تو خیر۔ لیکن جب ساری جنس اناث کے خلاف اس قسم کے مستبدانہ خیالات سراہے جاتے ہیں تو بجز جاہلانہ تعصب کے اس کو کیا سمجھا جائے؟ یہ کون سا انصاف ہے کہ محض جنسی اور روایتی تعصبات کی بنا پر ہم نے دنیا کی نصف آبادی کو تقریباً معطل کر دیا ہے؟ یہ کیونکر جائز ہے کہ عورت اگر اپنے پیروں کھڑی ہونا چاہے۔ اپنی عزت اپنی دولت اپنی سعی سے پیدا کرنا چاہے تو نہ حاصل کر سکے۔ اور جو پیشے مرد کے لئے جائز ہیں عورت کے لئے ناجائز سمجھے جائیں۔

میرے اعتراضات معاشری مشاغل تک محدود نہیں۔ عورتوں کے حق رائے دہندگی کو لیجئے۔ مانا کہ عورتیں خود حکومت کی اہلیت نہیں رکھتی ہیں لیکن یہ کمزوری بہت سے مردوں کو بھی لاحق ہے۔ بہر کیف اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جو خود حکومت کا اہل نہیں وہ اپنے حکمرانوں کو منتخب کرنے اور اُن کو اپنے اثر میں رکھنے کا بھی اہل نہیں۔

فرض کیجئے مرد اور عورت کا سیاسی مفاد ایک ہے تو ہمیشہ وہ مرد ہی کیوں ہو جو رائے دیا کرے؟ اور اگر عورتوں کا مفاد جداگانہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے حقوق کو تمام تر مردوں کے رحم و انصاف پر چھوڑ دیں۔

عورتوں کی اہلیت اور استعداد کا سوال یقیناً اہم ہے۔ اس پر بھی غور کر لیجئے۔ اگر عورتیں دنیا کے کسی کام میں نااہل ثابت ہوتی ہیں تو یہ اُن کی پیدائشی نااہلیت کی دلیل نہیں۔

کیونکہ عورتوں کو دنیا کے مشاغل میں عام طور پر مردوں کے مقابلہ میں آنے کی نہ تو کوئی ترغیب اب تک دی گئی نہ اُن کی تربیت آزادی سے ہوئی اس پر بھی اب تک جو ان بیچاریوں نے بعض موقعوں پر کر دکھایا وہ بہت ہے بلکہ اونکی اہلیت کی دلیل ہے۔ ملکہ الیزبیتھ اور جون آف آرک جنس اناث ہی سے تھیں! سیاست مدن ہی وہ رزمگاہ تھی جس میں عورتوں کو اپنی قابلیت کا ثبوت دینے کا اکثر موقع ملا ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عورتوں نے محض اپنی ذاتی استعداد سے دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کی صف میں جگہ حاصل کی اور اون کا نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ ان خوش قسمت عورتوں کو اگر دنیا کے قابل ترین اور تجربہ کار مردوں کی امداد نہ حاصل ہوتی تو وہ اس شہرت کی مستحق نہ ہوسکتیں لیکن عورتوں کے اس حسن انتخاب کی داد کس کو دیجئے گا؟

عورتوں میں انتظام و انصرام کی استعداد گویا پیدائشی ہے۔ اس کی تصدیق یورپ ہی کی تاریخ سے نہیں بلکہ ایشیا کے معاملات پر نظر کرنے سے بھی ہوسکتی ہے۔ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے معاملات کے دفتری مطالعہ[۱] سے یہ نتیجہ اخذ کرکے میں خود دنگ رہ گیا کہ جن ریاستوں کا انتظام سختی اور ہوشیاری سے ہو رہا ہے، جن کی مالی حالت درست ہے اور بغیر ظلم و تعدی کے انصرام حکومت امن و امان کے ساتھ جاری ہے، رعایا خوشحال اور زراعت ترقی پر ہے اُن ریاستوں میں ۵۰ فیصدی ایسی ہیں جن کی عنان حکومت عورتوں کے ہاتھ میں ہے۔ رواج ہنود کے لحاظ سے عورتیں خود حکمراں نہیں بن سکتیں لیکن نابالغ رئیس کی ولیہ کی حیثیت سے مدتوں اون کو یہ مواقع حاصل رہتے ہیں کہ خوش انتظامی اور دور اندیشی کے ساتھ امور سلطنت کو انجام دیں۔

---

[۱] انڈیا آفس (نظارت ہند) لندن میں عرصہ تک ملازم رہا۔ عجب نہیں کہ اُس نے ہماری دیسی ریاستوں کے اُس زمانہ کے حالات پر نظر دوڑائی ہو جس کا اوس کو موقع حاصل تھا۔ ۱۲

ہندوستان میں تو عام طور پر روسا اپنی بدکاریوں اور شہوت پرستی کی بدولت عمر طبعی کو پہونچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی ختم کر لیتے ہیں اور اکثر اسی وجہ سے اُن کے اطفال نوعمری میں ریاست کے مالک ہو جاتے ہیں جن کے بجائے ابتداً ادن کے خاندان کی عورتوں کو یہ مواقع حاصل ہوتے رہتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ یہ شہزادیاں جن کی پرچھائیں بھی کسی نے کبھی نہیں دیکھی جنہوں نے کبھی کسی غیر مرد سے بات تک نہیں کی، بلکہ بعض صورتوں میں اگر اقارب سے بھی وہ ہمکلام ہوئیں تو اس طور سے کہ درمیان میں پردہ کی دیوار حائل رہی، جو نہ تو خود لکھی پڑھی ہیں نہ ادن کی زبان میں ایسی کتابیں ہیں جنھیں پڑھ کر وہ امور مملکت کی بابت کچھ علم حاصل کر سکیں، جب وہ انتظامی امور میں اس قابلیت کا ثبوت دیتی ہیں تو بجز اس کے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ عورتوں میں انتظامی قابلیت خداداد ہے۔

یورپ میں عورتوں نے بہ لحاظ حکمراں ہونے کے اس سے بڑھ کر اپنی انتظامی قابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ ذرا اُس تناسب پر غور کیجئے جو یورپ کی تاریخ میں مردوں اور عورتوں کی تعداد کا حکمرانوں کی فہرست میں پایا جاتا ہے۔ پھر دیکھئے کہ کتنی عورتیں کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور کتنے مرد ناکام۔ عورتوں نے نہ صرف بادشاہت کی ہے بلکہ حکومت کی ہے اور براہ راست اہم انتظامی امور کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ فرانس کے بادشاہ چارلس ہشتم نے عنان حکومت درحقیقت اپنی ماں کے ہاتھ میں دیدی تھی اور یہ فعل اُس نے اپنے مرحوم باپ لوئی دہم کے ایما کے مطابق کیا تھا جس کی دور اندیشی کو دنیا مانتی ہے۔ فرانس کی تاریخ میں دوسری مثال سینٹ لوئی کی ہے جس کے تدبر اور حاکمانہ قابلیت کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ اس نے بھی اپنی حکومت کا انتظام عرصہ تک اپنی بہن کے ہاتھ میں رکھا۔ غرضکہ وہ ماں اور یہ بہن دونوں اپنے اپنے زمانہ میں عدیم النظیر حکمراں ثابت ہوئیں۔

شہنشاہ چارلس پنجم جس کے دربار میں حکما، اور قابل مشیران کار کی کمی نہ تھی اور جس کو ہمیشہ لایق سے لایق عمال کی خدمات حاصل رہیں، اوس نے یکے بعد دیگرے اپنے خاندان

کی دو عورتوں کو ہالینڈ کی صوبہ داری پر مقرر کیا اور دونوں نے غیر معمولی قابلیت سے اپنے فرایض انجام دیئے۔

اب یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ عورتیں جب موقع پانے پر ایسے سخت امتحانوں میں پوری اتری ہیں تو وہ عام کاروبار میں ہمیشہ ناکارہ ہی رہیں گی؟ عورتوں میں جو خامیاں ہیں وہ انکی موجودہ مجبوریوں کی وجہ سے ہیں۔ عورتوں میں جو سلیقہ اور جو گن ہے اس سے مرد یقیناً محروم ہیں۔ ان میں خاص بات یہ ہے کہ وہ عملی چیزوں کی طرف جلد مائل ہوتی ہیں۔ ہر حاضر شے کی طرف اُن کا ذہن فوراً منتقل ہوتا ہے اور وہ اسپر عبور حاصل کر لیتی ہیں۔ برخلاف اس کے مرد کی نظر اسقدر تیز نہیں دوڑتی۔ اگر مرد کی طرح عورت بھی کسی امر واقعی سے واقف کر دی جاتی ہے تو وہ اس امر کے گہرے احوال پر جلد تر حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ گویا عورت کا حصہ ہے۔ عمل میں بے شک عورتوں سے غلطیاں سرزد ہوتی ہیں جس کا سبب اُن کے تجربہ اور عام معلومات کی کمی ہے۔ نہ یہ کہ وہ اپنے علم سے فائدہ اٹھانے یا علم کو عمل کا جامہ پہنانے سے فطرتاً قاصر ہیں۔ اور اس کے مقابلہ میں یہ بھی کہدینا ضروری ہے کہ مرد فضول بھی نظریئے قائم کیا کرتے ہیں اور بلا وجہ دور کی سوچنے لگتے ہیں۔ وہ اپنی دور اندیشی کے آگے اکثر حالات حاضرہ اور اپنے ہمجلسوں کے موجودہ محسوسات اور جذبات کی پروا نہیں کرتے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ انتظامی اور سیاسی معاملات میں عورتوں کی حاضر دماغی اور موجود پرستی کو بھی شریک کار بنایا جائے تاکہ نظام دنیا میں مزید موزونیت اور توازن قائم ہو، ورنہ مرد اسی طرح "اگر" "مگر" میں پڑے رہیں گے۔ اور استبداد سے باز نہ کبھی شامل نہ ہوں گے۔

اگر یہ کہا جائے کہ عورتیں نسبتاً محرور المزاج ہوتی ہیں اور اُن کے اعصاب ذرا ذرا سی بات میں ہیجان پذیر ہونے لگتے ہیں اس لئے دُنیائے عمل میں اُن کا وجود مضر ہے یا یہ کہ اُن کی طبیعت اور ارادہ اسقدر تغیر پذیر ہوتا ہے کہ کسی بات میں استقلال نہیں ہوتا۔ تو میرا جواب یہ ہے کہ اس کی وجہ ایک بڑی حد تک یہ ہے کہ سوسائٹی نے عورتوں کو ابتک اہم اور وسیع الاثر

افکار اور معاملات میں پڑنے سے باز رکھا۔ اگر اُن کے لئے بھی زندگی کا کوئی اہم اور مفید مطمح نظر جائز رکھا جائے اُن کی تربیت اُسی آزادی اور اُسی انداز سے ہونے لگے جو مرد کے لئے مخصوص ہے تو اس قسم کی خامیاں بہت بڑی حد تک دور ہو سکتی ہیں۔ صورت تو یہ ہے کہ اُن بیچاریوں کو نہ تو کوئی قوت یا اقتدار حاصل ہے نہ کوئی اہم ذمہ داری۔ اُن کے مقاصد زندگی کم و بیش غیر معین ہیں۔ نیز میں کہونگا کہ اعصاب کا جلد ہیجان پذیر ہونا فی نفسہ کوئی ایسی خلقی کمزوری نہیں جو عورتوں کو دنیائے عمل میں معطل رکھے۔ بہت سے مرد جو فطرتاً یا امراض کی وجہ سے نہایت ہیجان پذیر اعصاب رکھتے ہیں اُن میں مستقل مزاج اشخاص کی کمی نہیں ہے بلکہ اکثر عاملانہ کاروبار کی خاصی اہلیت رکھتے ہیں۔ جن لوگوں کے مزاج میں افراط و تفریط ہوتی ہے اُن کا مقابلہ صبر و تحمل میں بھی بعض اوقات کوئی نہیں کر سکتا۔ جو قومیں زیادہ محرور المزاج اور افراط پسند ہوتی ہیں وہ محض اس بنا پر ترقی کی رزمگاہ میں لازماً شکست نہیں کھاتیں۔ فرانسیسیوں سے بڑھ کر تند خوئی کس قوم میں ہوگی؟ لیکن فرانسیسی سائنس تجارت حرفت قانون یا جنگ وغیرہ میں کس قوم سے کم ہیں؟

جلد از جلد خالی الذہن ہو کر ایک امر سے دوسرے امر کی طرف توجہ منتقل کر سکنا عملی معاملات میں ایک خوبی ہے جو مردوں میں کم پائی جاتی ہے۔ مرد بے شک توجہ کو ایک طرف زیادہ عرصہ تک بآسانی قائم رکھ سکتا ہے لیکن عملی دنیا میں یہ اتنی بڑی خوبی نہ شمار ہوگی۔ یہ دونوں خصوصیتیں کچھ تو فطری ہوتی ہیں اور کچھ تربیت سے پیدا ہوتی ہیں۔ کم از کم یہ ماننا ہوگا کہ عورتوں کو توجہ ایک طرف قائم رکھنے کی تعلیم ہی بہت کم ہونے پاتی ہے۔ اگر عملی دُنیا میں یہی خوبی کام آتی ہے تو عورتوں کی تربیت درست کرنے کے اسباب اور مواقع پیدا کرنا چاہئے۔ تاکہ وہ یہ خوبی حاصل کر سکیں اور میرے خیال میں ان دونوں خصوصیتوں سے عملی دُنیا کو فائدہ اُٹھانا چاہئے۔

بعض لوگ عورتوں کی خلقت کو حقیر گردانے کے لئے ایک دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ عورت کا دماغ یعنی بھیجہ مرد کے بھیجہ سے چھوٹا اور وزن میں کم ہوتا ہے۔ اول تو یہی امر علما،

میں متنازعہ فیہ ہے کہ آیا دماغ کے بڑے چھوٹے ہونے کا اثر ذہنی استعداد پر کچھ ہے بھی یا نہیں۔ بہرکیف
غالب گمان یہ ہے کہ بڑا بھیجہ اعلیٰ ذہنیت کی دلیل ہو سکتا ہے مگر یہ کہ بھیجہ کی بڑائی چھوٹائی ہی وہ
چیز نہیں جس پر کوئی فیصلہ کیا جا سکے بلکہ دماغ کی قسم اور اس کے اثرات پر بھی نظر کرنا چاہئے۔ یوں
دیکھئے تو ہاتھی کا بھیجہ سب سے بڑا اور وزنی ہوتا ہے مگر انسان کی سی عقل اس میں نہیں پائی جاتی۔
اگر اثرات کو لیجئے تو عورت کا مزاج نہایت نزاکت پسند ہے اور یہ نزاکت پسندی اور باریک بینی
اوس کے ہر کام میں ظاہر ہوتی ہے جس سے مرد عاری ہیں۔ ایک خاص بات عورت میں یہ ضرور
ہے کہ وہ کام سے جلد تھک جاتی ہے۔ اس کے اعضا اور دماغ دونوں جلد تکان محسوس
کرنے لگتے ہیں۔ لیکن مرد کی بہ نسبت اس کی تھکن جلد دور ہو جاتی ہے اور آناً فاناً چاق و چوبند ہو کر
اسی جوش و خروش کے ساتھ وہ اپنے کام میں منہمک ہو سکتی ہے۔

ہماری یہ ایک عجیب عادت ہے کہ ہم جس چیز میں عورتوں کے خواص کو
اپنے خواص سے مختلف پاتے ہیں ان خواص کو زنانہ کمزوریوں سے تعبیر کرنے لگتے ہیں اور
عورت کی فطرت کی خامی پر محمول کرتے ہیں حالانکہ عورتوں کی موجودہ کمزوریاں تمام تر فطری نہیں
بلکہ بہت کچھ گرد و پیش کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اگر مختلف ممالک میں جا کر مختلف اقوام کی عورتوں
کے حالات دیکھے جائیں تو میرے قول کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

ابھی تک صحیح طور پر نہیں دریافت ہو سکا کہ مرد اور عورت کے ذہن میں درحقیقت
کتنا فرق اصلی ہے اور کتنا ظاہری اور کسبی۔ لیکن خارجی اثرات اور حالات سے قیاس
کیا جا سکتا ہے کہ صورت واقعہ کیا ہے۔ مثلاً یہ دیکھا جائے کہ تقریباً سو برس سے عورتوں
کو تعلیمی آسانیاں بہم پہنچائی جا رہی ہیں اور اس اثنا میں اونہوں نے کیا کیا۔ ادبیات میں
اپنی تعداد اور اپنی بساط کے لحاظ سے عورتیں اب تک جو کچھ کر گذری ہیں وہ امید سے
زیادہ ہے ابھی تک عورتوں کے ساتھ ہمارا برتاؤ مساوات کے درجہ تک نہیں پہنچا۔ نہ
ابھی کافی عرصہ گذرا ہے کہ آخری فیصلہ عورت اور مرد کی خلقی مساوات کا براہ راست تجربہ

سکے واسطے سے کیا جا سکے ۔ عورتیں ابھی اُس زینہ پر ہیں جس سے مرد بہت عرصہ قبل گذر چکے ہیں اور اگر وہ واقعی اپنی جگہ پر اور اپنی ذات سے کوئی جدت دکھاتی ہیں یا کوئی بڑا کام کرتی ہیں تو فی الحال وہ ماضی کے کسی مرد کی طرف منسوب ہو چکا ہوتا ہے ۔ فنون لطیفہ ادبیات وغیرہ سب میں عورتوں کی ہمت افزائی کرنے والے بہت کم ہیں ۔ دُنیا میں ترقی کی راہیں لوگ شہرت پسندی کے لئے اختیار کرتے ہیں جو بجائے خود بُری بات نہیں کیونکہ اسی لالچ نے دُنیا کے بہت سے مفید اور دلچسپ کام انجام دلائے ۔ مگر سوسائٹی نے تو عورت کے دل سے آرزوئے شہرت ہی کو گویا نابود کر رکھا ہے ۔ اوس کے دل میں بڑا حوصلہ کبھی نہیں پیدا ہونے دیا جاتا ۔ پھر کونسی چیز ہے جو اُس کے دل کو بڑھائے ۔ میں کہتا ہوں ہزار علتوں کی ایک علت یہ ہے جو عورت کو تمام تر ترقیوں سے روکے ہوئے ہے اور جو اُسے مساوات کی راہ میں قدم بڑھانے سے بھی روکتی ہے ۔

اخلاقی حیثیت سے دیکھئے تو یہ امر مُسلم ہے کہ عورت مرد سے زیادہ نیک اور خوش اطوار ہے ۔ مگر یہ عجیب قانون ہے کہ نیک کو بد کی فرمانبرداری پر مجبور کرتا ہے اور پھر بھی وُہی قانون سراہا جاتا ہے ! شاید واقعہ یہی ہے کہ اقتدار اور دُنیاوی قوت انسان کی اخلاقی قوت کو گھٹا دیتی ہے ۔ عورتیں اپنی غلامی کی وجہ سے اوس قدر مذلت کو نہیں پہونچتیں جتنا کہ مرد کی قوت پسندی نے مرد کو اخلاقاً تباہ کیا ۔

جب یہ بحث آپڑتی ہے تو بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ عورت کے اخلاق خواہ کتنے ہی اچھے ہوں مگر اُن کے مزاج میں جنبہ داری اور طرفداری کا مادہ ایسا ہے جو اُن کی اخلاقی قوت پر بھی غالب آجاتا ہے ۔ اوّل تو میں اس کو اس صورت سے تسلیم ہی نہیں کرتا کیونکہ مرد اپنی بابت بہت کچھ بیجا حسن ظن رکھتے ہیں ۔ اور اگر تسلیم کر لوں تو میرا قول یہ ہے کہ عورتوں کے مغلوب الجذبات اور جانب داری کا عادی ہونے سے اخلاقی دُنیا کو جو ضرر پہنچتا ہے وہ مرد کی بوالہوسی اور خواہش پرستی کے ضرر سے زائد نہیں ہے ۔ اس ضرر کے

مقابلہ میں عورت کی دلی خواہش اور ذاتی تعصبات یا جبہ داسیاں اگر ہیں تو بمنزلہ صفر کے ہیں۔ اُس کی کوئی خواہش "خواہش" نہیں بلکہ محض ایک "آرزو" ہو سکتی ہے۔ مرد جو کچھ کرتا ہے خواہ عورتوں کے لئے مضر ہو یا مفید کہتا یہی ہے کہ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں اور سوسائٹی کا بھلا کرتا ہوں۔ عورت جو کچھ کرتی ہے وہ فی الواقع دوسروں ہی کے لئے ہوتا ہے۔ بالآخر یہ بحث یہ کہکر ختم ہو سکتی ہے کہ عورت اگر اپنی جانب داری کی وجہ سے یعنی دوسروں کے لئے گمراہ ہوتی ہے تو مرد محض اپنے لئے گمراہ ہوتا ہے۔

اب پوچھیے کہ عورت کو مساوی حقوق دینے سے کیا کیا فائدے ہو سکتے ہیں؟

مرد کا عورت پر قانوناً اور رتبتاً حاوی ہونا ہزار عیوب اور ہزار مظالم کی جڑ ہے۔ عورت کی معصیبت کو نظر انداز کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔ جب کسی قوی کو کمزور پر قانوناً حاوی کر دیجئے گا اوس کا نتیجہ بہر کیف ظلم ہوگا۔ اگر عورتیں سرکاری اور کاروباری کاموں میں رکھی جانے لگیں تو مردوں کی خود پسندی دور ہونے لگے۔ آزادانہ مقابلہ باہمی کی وجہ سے مرد کمزور تر اور کاہل ہوئے جا رہے ہیں۔ عورتوں کو آزاد کرنے سے مرد زیادہ مشقت کے اہل بنجائیں گے۔ اُن کی اخلاقی جرات بڑھے گی اور وہ ایثار کے عادی بننے لگیں گے۔ انسان جس منزل پر بغیر پوری جنگ کئے ہوئے پہنچ جاتا ہے یعنی جو منزلت اوس کو محض کسی "پیدایشی" حق کی بدولت حاصل ہوتی ہے وہ اس کا دماغ خراب کر دیتی۔ اوس کی اخلاقی حالت تباہ ہو جاتی ہے۔ جب کسی فرقہ کو بلا کسی کسبی خصوصیت کے خاص خاص حقوق دیدیے جائیں گے یا جب کبھی کسی انسان کے دل میں اوس کی پیدایشی افضلیت کا عقیدہ راسخ کر دیا جائے گا تو اس کا نتیجہ قوت کا بیجا استعمال یعنی ظلم ہوگا۔ اس صورت سے دنیا میں گویا مشق جور و ستم کی ایک تعلیم گاہ قائم ہے جہاں ہر آن معاشری جرائم ایجاد ہوا کرتے ہیں۔

عورتوں کی مساوات سے دُنیا کی ذہنی قوت دُونی ہو جائے گی۔ دُنیا کی کل اگر مرد عورت دونوں مل کر اپنی پوری قوت سے چلائیں تو ایک بہتر دُنیا پیدا ہو جائے۔ عورت کی ذات

سے دُنیا میں بہت سی خوبیاں قائم ہیں جو بڑھائی جا سکتی ہیں اور جن کا اثر عام کیا جا سکتا ہے خود صفت "مردانگی" عورتوں کے اثرات سے پیدا ہے جو ایک طرف بہادروں کو داد شجاعت دیتی ہیں اور دوسری طرف کمزوروں کی حمایت کرتی ہیں اور قوی تر جنس کو بےکسوں کی امداد اور معصوموں کے ساتھ رواداری پر مجبور کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ "مردانگی" کے معنی ہی یہ ہوگئے کہ انسان نہ صرف شرافت کے ساتھ شدّت برتے اور جارحانہ شجاعت کا ثبوت دے بلکہ ناچیز ہستیوں سے رحم کے ساتھ پیش آئے اور کمزوروں کے ساتھ رواداری دکھائے۔

"مردانگی" کا یہی نصب العین اب بھی باقی رکھنا چاہئے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس معنی میں "مردانگی" اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ عورتوں کی زندگی اور موت مردوں کے ہاتھ تھی۔ اگر مرد اس صفت سے متصف نہ ہوتے تو عورتیں اور بھی تباہ ہوتیں۔ لیکن اس زمانہ میں اگرچہ مردانگی اور شجاعت مفقود نہیں لیکن دُنیا کا وہ دَور گیا جب آئے دن تیر و تفنگ سے سابقہ رہتا تھا۔ ہر مرد سپاہی تھا۔ اب سپہگری کی جگہ کاریگری نے لے لی۔ اب زمانہ وہ ہے کہ مردوں سے رحم اور حلم کی استدعا کے بجائے انصاف اور دور اندیشی کا برتاؤ مطلوب ہے۔ پُرانے زمانہ میں نیکی کا صلہ تعریف اور شہرت تھی جس کے لوگ زیادہ دلدادہ ہوتے تھے۔ اب بُرائی سے روکنے کا طریقہ زیادہ تر نقصان کا خوف دلانا ہے۔ پہلے سوسائٹی کو مردوں کی "مردانگی" پر زیادہ بھروسہ تھا۔ اب کمزوروں کا تحفظ کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔

زمانہ حال میں عورتوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا کہ دُنیا کو جنگ سے پرہیز کرنے اور نوعِ انسان کی خدمت کرنے پر آمادہ کرنے کا کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اصول مذہب کی تبلیغ اور خیراتی کاموں میں اُن کا قدم مردوں سے آگے ہے اگرچہ ان امور میں بھی اون کی تعلیم ناقص تجربہ محدود اور آزادی مسلوب ہے۔ ان حالات میں یہ کہنا غلط ہوگا کہ عورتوں نے اپنے اثر سے جو کام لیا اُس کا نتیجہ نوعِ انسان کے لئے ہمیشہ خراب ہی ہوتا رہا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ عورتوں کو صحیح تعلیم اور معقول تربیت سے راہِ راست پر لگایا جائے تاکہ وہ واقعات زندگی کو صحیح طور

پر اندازہ میں لاسکیں تاکہ اچھے اور بڑے بڑے کاموں میں اُن کا اثر اپنا پورا فائدہ دکھائے۔

لوگ کہتے ہیں کہ عورت اپنے گھر میں بیٹھ کر خاندان کے مردوں پر جو اثر ڈال سکتی ہو وہ کسی دوسری طرح نہیں پڑ سکتا اور اس صورت سے مرد اخلاقی گمراہی سے بہت کچھ بچ جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے۔ اور خاص کر اُن مردوں کے حق میں اور بھی صحیح ثابت ہوتا ہے جن کی نفس پرستی اُن کے ہر خیال پر غالب رہتی ہے۔ تاہم میں یہ چاہتا ہوں کہ عورتیں آزاد ہو جائیں تو اُن کے یہ مسلمانہ اثرات اور بھی قوی اور عام ہو جائیں۔

جو گروہ سوسائٹی کے اعلیٰ تر مدارج میں زندگی بسر کر رہے اُن میں واقعی دیکھا گیا ہے کہ عورتیں اپنے مردوں کو رسم و رواج کی سطح سے گرنے نہیں دیتیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ہو کہ وہ اس سطح سے اوپر بھی نہیں جانے پاتے۔ وہ بیوی جس کی دماغی سطح پست ہو اپنے شوہر کے منصوبوں اور حوصلوں کے حق میں زہر ہے۔ اور اُس کے خاندان کے لئے افلاس اور مصیبت کی نشانی۔ ایسی عورت یا تو اپنے اور اپنے ناسمجھ بچوں کے لئے ظلم کی راہ کھولتی ہے یا شوہر پر اپنے خیالات اور جاہلانہ منصوبوں سے ستم ڈھاتی ہے۔ جب فریقین کا مذاق مختلف ہے تو تنازعہ بعید نہیں۔ اتحاد کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ایک فریق اپنی ہستی کو دوسرے کے لئے بالکل مٹا دے۔ یا دونوں فریق ہم پلہ ہوں۔ اول الذکر اتحاد غلام اور آقا کے درمیان ہوا کرتا ہے جس میں محبت کے جذبات کا پایا جانا بھی بعید نہیں دوسرے قسم کا اتحاد جو مساوات کے ساتھ ہو دوستی کہلاتا ہے جو طبائع کی ہمواری و ہم مذاقی سے پیدا ہوتا ہے یہ ضرور ہے کہ مساوی قوت کے اشخاص میں اگر مذاق ایک نہ ہوا تو نباہ مشکل ہے۔ مگر عورت کے موجودہ حالات اور رواجی تربیت کے زمانہ میں شادی شدہ زندگی کا نباہ اُس سے بھی زائد دشوار ہے۔ یکساں مذاق و تربیت کے لوگوں میں آپس کا نباہ زیادہ آسان ہوا کرتا ہے۔ مذاق زندگی کے بارہ میں زن و شو کا اگر کوئی جزئی اختلاف ہو تو دونوں کی روشن خیالی اُسکو دبا سکتی ہے برخلاف اس کے موجودہ حالت میں عورت کو مرد سے اور مرد

کو عورت سے ذرا ذرا سی بات میں ایثار کی توقع رہا کرتی ہے جو اکثر اوقات دونوں کو بادیوں میں گرفتار رکھتی ہے۔ زندگی کا وہ نصب العین جو یکسان مذاق اور ہم پلہ تعلیم کا پیدا کیا ہوا ہو ایک ایسی دوستی کی بنیاد قائم کر سکتا ہے جس کی لذت سے ہم عموماً آشنا نہیں ہیں۔

ایک نکتہ یہ بھی لایق غور ہے کہ موجودہ حالات میں شادی شدہ زندگی کا بناہ محض اس بنا پر ہوا کرتا ہے کہ عورت اگر ایک قسم کی خوبیوں سے اپنے شریک زندگی کو اپنی جانب مائل رکھتی ہے تو مرد دوسرے قسم کے اوصاف ظاہر کرکے اپنی زوجہ کو راضی رکھتا ہے۔ لیکن ان حالات میں یہ مضرت کیا کم ہے کہ مرد جس کی دماغی سطح معمولاً ارفع ہوتی ہے اپنی جاہل زوجہ کی صحبت سے اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ اس کو اپنا طرز تخیل بدلنا پڑتا ہے اور وہ ادنیٰ جذبات کا عادی بنتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ بری صحبت اچھوں کو برا کر دیتی ہے۔ انفرادی زندگی میں خواہ یہ بات زیادہ اہم نہ نظر آئے لیکن تہذیب اور معاشرتی ترقیوں پر اس کا کتنا بڑا اثر مرتب ہوتا ہے یہ امر نظر انداز کرنے کے لایق نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو آزاد کر دینے سے رفتار ترقی بہت تیز ہو جائے گی۔

ترقی یافتہ سوسائٹی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انفرادی آزادی دنیاوی معاملات میں ہر ہر قدم پر نہایت نمایاں ہوتی ہے۔ یہ صورت حال معاشری ارتقا کی بہت سی منزلیں طے کر چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے برخلاف اس کے ادنیٰ سوسائٹی کی علامت یہ ہے کہ اس میں افراد کو حریت عمل بہت کم حاصل ہوتی ہے۔ موجودہ دور ترقی میں عورت پر جو سختیاں عائد ہیں یہ اسی زمانہ جاہلیت کے آثار سے ہیں۔

ہم میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ اپنی آزادی کو تو از حد عزیز رکھتے ہیں لیکن دوسروں کی آزادی کی اہمیت ہمارے ذہن میں نہیں آتی۔ افراد کیا معنی اقوام پر بھی یہی کلیہ صادق آتا ہے۔ جو لوگ اقوام کی آزادی کا مسئلہ پیش نظر رکھنے کے عادی ہیں وہ عورتوں کی آزادی کے مسئلہ پر غور کیوں نہیں کرتے؟ آزادی کے بڑھنے سے جو مادی اور ذہنی ترقیاں نمودار ہوتی

ہیں وہ عورتوں کی آزادی سے بھی حاصل ہوں گی۔ غلاموں کا آزاد کرنا ہر زمانہ میں ایک نیکی خیال کیا گیا۔ مظلوم اقوام کو پنجۂ ظلم سے چھڑانا روشن خیالوں کا کام ہے۔ مجبور عورتوں نے کیا قصور کیا ہے جو آزادی سے محروم رکھی جائیں؟ دم بھر کے لئے اپنے اُن ایام کی خوشی کو یاد کیجئے جب آپ اپنے بزرگوں کی حکومت سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے۔ اگر یہ مسرت بجا تھی تو یقیناً دوسری ذاتیں بھی اس کی مستحق ہیں۔ دُنیائے اخلاق میں یہی کیا کم مسرت کی بات ہو گی کہ دُنیا کی نصف آبادی آزاد ہو جائے۔

ان سختیوں کی بدولت بہت سی عورتوں نے ایک معنی میں بے حیائی اختیار کر کے بجائے اپنی ہم جنسوں کی آزادی کے لئے کوشش کرنے کے محض ذاتی اور خود غرضانہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش ہر زمانہ میں جاری کی۔ مرجع خلق بننے کے لئے کبھی تو ذاتی شان و شوکت کی متوالی بنیں کبھی بازار حسن میں خود نمائی کے جلوہ دکھائے۔ جب جائز طریق سے وہ کامیابی کی راہ نہ دیکھ سکیں تو خود آرائی نے اُن کی ہوس اقتدار کو پورا کیا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جن حالات میں کسی گروہ کو عام آزادی کی طرف سے مایوسی ہوتی ہے تو انفرادی اقتدار کے تمام راستے کھلے ہوئے ہوتے ہیں جن میں جائز و ناجائز طریق کا سبب تقریباً یکساں اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ اور حسن اقتدار کے لئے حاکم و محکوم دونوں ساعی رہتے ہیں جو اگرچہ مختلف صورتوں سے مگر دونوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن ترقی اور آزادی کی راہ میں فی الجملہ اس قسم کے خود غرضانہ اقتدار پسندی سے بڑھ کر مضر کوئی چیز نہیں ہوتی

غرض کہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ جو جس کام کا اہل ہو وہی اس کا اہل سمجھا جائے اور اہلیت حاصل کرنے کی آزادی دونوں جنسوں کے افراد کو حاصل رہے۔ انصاف کو رواج پر قربان نہ کیا جائے۔ اور اس دور ترقی میں زمانہ جاہلیت کے آثار جو خاص کر عورتوں کے حقوق کے بارہ میں پائے جاتے ہیں ان کو روشن خیالی کے ساتھ دور کر دیا جائے۔

نغمۂ توحید

(از حضرت مولانا صفی صاحب لکھنوی)

جستجو میں تری اے قید تعین سے بری — مہر تاباں ہے گرفتار پریشاں نظری

اس فضا میں کہ جو ہے سرحد امکان و وجوب — ہم سے پوچھے کوئی ادراک کی آشفتہ سری

کس کی یہ بزم دل افروز ہے یارب کہ جہاں — ماہ و انجم متحیر ہیں بہ این دیدہ وری

دونوں یہ حلقۂ بیرون در خلوت ہیں — دور شمسی ہو زمانہ میں کہ دور قمری

خاک سے پاک کیا نسل بنی آدم کو — ابن مریم کو دیا معجزۂ بے پدری

ایک جلوے سے ہوئے موسیٰ عمراں بیہوش — جب سر طور کسی شوخ نے کی عشوہ گری

موجزن ہو کے کسی زہر محبت کا اثر — سنگریزوں کو بناتا ہے عقیق شجری

محمل روح رواں ہے دل نازک بخدا — کس نے حکمت سے اتاری ہے یہ شیشہ میں پری

پردۂ خاک سے گل چاک گریباں نکلا — حسن کو کس نے سکھائی روش جامہ دری

خواب راحت میں جو ہے سبزۂ گلشن اسکا — صبح چلتی ہے دبے پاؤں نسیم سحری

مست و آئینہ بکف دیکھ کے اس محفل میں — ماہ کامل پہ ہوا قہقہہ زن کبک دری

کردیا کسکی کشش نے شب اسرے ثابت — قاب قوسین ہے سرحد عروج بشری

معتدل ہے وہ کسی گلشن وحدت کی بہار — جسمیں گرمی ہے نہ سردی ہے نہ خشکی نہ تری

ہے قضایائے دو عالم کا نتیجہ توحید — دیدۂ دل میں مگر چاہیے بالغ نظری

چھوڑ دو حال پر اپنے اسے اے متقیو!
رند ہے رند صفی مست مے بیخبری

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

قرون وسطیٰ میں ہندوستان کے براہ خشکی بار برداری اور آمد و رفت کے ذرائع

از

(جناب سید حسن عابد جعفری صاحب، (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع)

(بہ سلسلہ ما سبق)

تجارت اور حرفت کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے کے لئے زندگی اور جائداد کا تحفظ، شرط اول ہے، کسان، زراعت، سے اور پیشہ ور محنت سے گھبرائیں گے جب تک کہ ان کو یقین نہ ہوگا کہ اُن کی کوششوں کے ثمر غارت گر ہاتھوں سے محفوظ نہ رہیں گے اور تجارت کو اُس وقت تک فروغ نہ ہوگا جب تک کہ راستے خوف و خطر سے خالی نہ ہوں گے۔ کسی ملک میں تجارت اور حرفت میں ترقی کے یہ معنی ہیں کہ وہاں ملکی اندرونی انتظامات اچھے ہیں اور رعایا اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں نہ تو زمانہ موجودہ کے پولیس کے انتظامات تھے، اور نہ رعایا کو وہ اطمینان تھا جو آج حاصل ہے، اور نہ اس کی توقع کیجا سکتی ہے، کیونکہ زمانہ جوں جوں ترقی کرتا ہے، تحفظ کے ذرائع بھی قوی تر بنتے جاتے ہیں۔ حکومت کی خواہشات یعنی قوانین کی پابندی کرانے کا کام اُس زمانہ میں بہت دشوار تھا، کیونکہ ملک کی وسعت اور ملک کے بڑے حصہ میں آمد و رفت کی دشواریاں، ایسی کٹھن مشکلات تھیں کہ ان پر حادی ہو جانا آسان کام نہ تھا۔ اسی لئے، قرونِ وسطیٰ کے متعلق رائے زنی کرنے سے قبل ہم کو یہ دشواریاں پیش نظر رکھنی چاہئیں، اور ہندوستان کی اُس حالت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے جب کہ آج میں تار برقی، ٹیلیفون، اور ریل و موٹروں کے جدید اختراعات رائج نہ تھیں،

ہندوستان کی فارغ البالی، متعدد تجارتی مرکزوں کی خوش حالی، اور کئی بندرگاہوں کی موجودگی جو ایسٹ انڈیا کمپنی سے پیشتر ہندوستان میں تھیں، ہم کو یاد دلاتی ہیں کہ عام طور پر ہندوستان کی حالت قابل اطمینان تھی۔ اور کافی طور پر مال اور جان کی حفاظت ہوتی تھی۔ اندرون ملک تحفظ کی خدمت چوکیدار، اور گاؤں کے سرغنہ، مقدم اور زمیندار کرتے تھے، سکرانتی میں لکھا ہے "گاؤں کا سرغنہ، لوگوں کو ظالموں، چوروں اور حکام کے مظالم سے ماں باپ کی طرح بچاتا ہے" جنوب میں وجیانگر کی ہندو سلطنت نے (۱۳۳۶ء لغایتہ ۱۵۶۵ء) انتظام حکومت کا اچھا طریقہ اختیار کر لیا تھا۔ اور جان و مال کی حفاظت بھی کافی طور پر ہوتی تھی۔ یہی اسباب تھے جن سے وہ قرون وسطیٰ کے ایک نہایت مالدار ریاست بن گئی۔ شاہ رُخ کا ایلچی متعینہ وجیانگر، عبدالرزاق نے لکھا ہے "حفاظت، اور انصاف اس ریاست میں ایسی جڑ پکڑ چکے ہیں کہ نہایت مالدار تاجر، بندرگاہوں سے کثیر سامان لاتے ہیں اور بغیر لکھے پڑھے، یا حساب کئے اُس کو بازار میں بکنے کے لئے بھیج دیتے ہیں اور مطلق تامل یا اندیشہ نہیں کرتے ہیں" وارتھیما، بولون کا سیاح بھی اس مقام کی انصاف پسندی اور ملک میں قیام امن کا ثنا خواں ہے، اُس کا بیان ہے" اس ملک میں تم کہیں پھرو، محفوظ رہو گے"

نونیز، پرتگالی سیاح (۱۵۳۵ء) مندرجہ بالا بیان کی تصدیق کرتا ہے، اور لکھتا ہے "اگر کوئی شخص آکر شکایت کرے کہ وہ فلاں صوبہ میں، فلاں سڑک پر لٹ گیا تھا، تو بادشاہ اُس صوبہ کے افسر اعلیٰ کو فوراً طلب کرتا ہے، خواہ افسر اعلیٰ اُس زمانہ میں بادشاہ کے پاس ہی کیوں نہ موجود ہو، لیکن اُس کو حکم ہوتا ہے کہ اگر وہ چور اور مال کو گرفتار کر کے نہ لائے گا، تو وہ خود حوالات میں رکھا جائیگا اور اُس کی جائداد چھین لی جائے گی۔ اسی طرح گاؤں کے مکھیا کو ایک ایک چوری کا جوابدہ ہونا پڑتا ہے، انہیں وجوہ سے ملک میں امن ہے اور اگر چوری کی واردا تیں ہوتی بھی ہیں تو برائے نام، اگر تمہاری چوری ہو جائے، اور تم ان لوگوں کو تھوڑی سی بخشش دیدو، اور چرائی ہوئی چیز کا کچھ حوالہ بتا دو، تو یہ لوگ جادوگروں کے ذریعہ سے

فوراً معلوم کر لیتے ہیں کہ چوری کا مال ملک کے اندر ہے، یا باہر چلا گیا۔ اس ملک میں بڑے بڑے جادوگر ہیں، غرض جہاں ایسی سختیاں ہوں گی وہاں لازمی طور پر چوری بھی کم ہوں گے"
وہاں کی انتظامی حالت زوال سلطنت ۱۵۶۵ء تک بدستور اچھی رہی۔

گجرات کے حکمراں بھی اپنی حدود کے اندر اچھے انتظامات رکھتے تھے، باربوسا کا بیان ہے "اس جگہ آدمی قاعدے سے رکھے جاتے ہیں، ملک میں امن ہے اور انصاف"
گولکنڈہ کی صاف سڑکوں، اور سفر کے آرام کے متعلق باربی بہت تعریف کرتا ہے" اگر کوئی شخص لٹ جائے، (اس ملک میں ایسا واقعہ اکثر درپیش آتا ہے) تو حکومت اس کے نقصان کی تلافی کر دیتی ہے"

مغلوں کے عہد سے پہلے شمالی ہندوستان میں اندرونی انتظامات کے احوال ہم کو بہت کم معلوم ہیں۔ گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی کے راجپوتوں کے تمدن کے تذکرے میں مسٹر کنیڈی کا بیان ہے کہ "پنج کی، اور عام لڑائیاں یہاں رائج تھیں، لیکن باہمی جنگ و قتال، اور اجنبیوں سے سخت مغائرت ہوتے ہوئے بھی اندرون ملک بہت کافی تجارت ہوتی تھی۔
تجارت کو فروغ تھا، اور پنڈتوں اور شاعروں کی درباروں میں کمی نہ تھی، گنگا کا پانی، اور کشمیر کے پھول سومنات پر روز چڑھائے جاتے تھے"

پٹھان عہد میں (۸۷-۱۲۶۶ء) غیاث الدین بلبن نے بہت سے جنگل کٹوا دیے تھے، اور لوٹ مار کا بہت معقول طریقہ پر استیصال کر دیا تھا۔
۱۳۴۱ء میں البتہ ابن بطوطہ ہندوستان میں سفر کرنا خالی از خطر نہیں بتاتا۔
شیر شاہ (۱۵۴۰ء لغایتہ ۱۵۴۵ء) جس کے کارہائے خیر اب تک یادگار ہیں، غالباً مسلمانوں میں پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد میں اندرون ملک کافی حفاظت جان و مال کی ہوا کرتی تھی! "اس نے اپنے صوبہ داروں اور عاملوں کے نام احکام جاری کر دیئے تھے کہ

وہ رعایا کو تاجروں اور مسافروں کے ساتھ نیکی سے پیش آنیکا طریقہ سکھائیں، اُن کو تکلیف نہ دیں، اور اگر کوئی سوداگر مرجائے تو اُس کے مال پر اس طرح قبضہ نہ کریں جس طرح کہ لاوارثوں کے مال پر کیا جاتا ہے۔"

اُس نے دیہاتوں کو ذمہ دار بناکر، اور دیہاتوں کے مکھیا اور مقدم کو چوریوں اور ڈاکوں کا جوابدہ قرار دیکر ملک کو ڈاکوؤں اور لٹیروں سے پناہ دلوادی تھی، مقدم کا فرض تھا کہ یا تو چور کو لائے یا نقصان کی تلافی کرے۔ یہ طریق حکومت کامیاب ہوا۔ اور ملک میں امن اور اطمینان پھیل گیا۔ اور سفر ایسا آسان ہوگیا کہ "لاغر کو رستم کا خوف نہ رہا، شیرشاہ کے "پولیس کے انتظام کی نظام الدین نے بھی تعریف کی ہے: "شاہراہیں اسقدر محفوظ تھیں کہ آدمی اشرفیوں کا توڑا لیکر اگر جنگل میں سو جاتا تو کوئی گزند نہ پہنچتا اور چوکیدار کی ضرورت نہ ہوتی۔"

اکبر کے عہد میں بھی سڑکیں کافی طور پر محفوظ تھیں، "اُس نے اندرون ملک محاصل کو معاف کرکے تجارت کو ترقی دی تھی، اور سوداگروں کا بہت خیال رکھتا تھا" دیگر مغل بادشاہوں نے بھی سوداگروں کی حفاظت اور سرپرستی کی، اور یہ شہزادگان مغلیہ کی غیر معمولی قابلیت کا نتیجہ تھا کہ کامل دوسو سال تک سلطنت مغلیہ دُنیا کی بہترین، اور سب سے زیادہ دولتمند سلطنت بنی رہی۔" اکبر کے پچیسویں [۲۵] سنہ جلوس (۱۵۸۱ء) میں ہندوستان کی مردم شماری لی گئی، جس کی ایک غرض یہ بھی تھی کہ اندرونِ ملک انتظام کو اور بہتر بنایا جاسکے۔ ابوالفضل نے جو ضروری سفارشیں کی تھیں، ان میں ایک یہ بھی تھی "افسران ریاست کو حکم دیا جائے کہ وہ اجنبی آدمیوں کو ٹھہرنے نہ دیں تاوقتیکہ وہ لوگ کسی خاص پیشہ کے پابند نہوں، چالاک آدمیوں کی آمد اور روانگی کا بھی خیال رکھا جائے اور تحقیقات کی جائے کہ اُن کے مقاصد نیک ہیں یا بد، تاکہ تھوڑے عرصہ میں ایسے لوگوں کا صحیح حال معلوم ہوجائے جو بظاہر تو شریف ہیں اور دراصل بدنیت ہیں، اس ذریعہ سے ہندوستان کے ہر حصہ میں اطمینان اور آسودگی پھیلانا مقصود تھا۔"

قصبات میں امن قائم رکھنا کوتوال اور پولیس کا کام تھا، اور دیہاتوں میں آخر تک یہی دستور تھا کہ ڈکیتیوں، لوٹ مار، اور چوریوں کے جواب دہ کوتوال، فوجدار، اور چوکیدار رہے کوتوال کے فرائض کے متعلق اکبر کی حکومت نے مفصل قواعد بنائے تھے، ابوالفضل نے ان کی مجملاً تفصیل اس طرح کی ہے :-

"کوتوال کو مضبوط، تجربہ کار، چست، باہمت، صابر، سخت، اور رحمدل ہونا چاہئے اسکی نگہداشت سے اور شب کو پہرہ دینے سے رعایا آرام کی نیند سوئے گی، اور بدنیت لوگوں کو بدمعاشیوں کا موقع نہ ملے گا۔ اس کو چاہئے کہ مکانات اور ان سڑکوں کا جن پر آمد رفت زیادہ رہتی ہے، رجسٹر بنائے۔ اور رعایا سے عہد لے کہ وقت ضرورت کے کام آئے، اور غم اور خوشی میں شریک ہو، اس کو چاہئے کہ مختلف آبادیوں کا اپنے طور پر ایک حلقہ قائم کرے، اور اپنے ایک ہوشیار معتمد کو وہاں مقرر کردے تاکہ وہ اس پر نگاہ رکھے، اور روزانہ شام کو اپنی مہر لگا کر کوتوال کے پاس رپورٹ بھیجے جس میں نو واردوں اور جانیوالوں کا اور تمام واقعات کا ذکر ہو، اور خفیہ کو مقرر کردے جو غریب ہو اور لوگ اس سے ناواقف ہوں، اور اپنی تحریری رپورٹ کو پیش نظر رکھکر پوری طرح تحقیقات کرتا رہے، اسکو چاہئے کہ ایک سرائے علیحدہ بنائے جس میں اجنبی نو وارد ٹھہرائے جائیں اور مختلف اقسام کے خفیہ لوگوں کے ذریعہ سے ان کے حالات معلوم کرے۔ اس کو چاہئے کہ لوگوں کی آمد و خرچ پر نگاہ رکھے، اور اپنے طرز عمل سے لوگوں کے دلوں میں اپنی عزت اور اپنا وقار قائم کرے، اور محکمہ کو قابل احترام بنائے .... اس کا یہ بھی فرض ہے کہ رات کو شاہراہیں کھلی رہیں، اور ان مقامات پر رکاوٹیں قائم کردی جائیں جہاں دوسروں سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور جب رات زیادہ ہوجائے تو کسی کو گاؤں کے اندر نہ آنے دے، اور نہ کسی کو باہر جانے کی اجازت دے، بیکاروں کو کام سے لگائے۔ پرانی شکایتوں کو رفع کرے، اور ہر شخص کو دوسرونکے مکان میں زبردستی داخل ہونے سے روکے اور چوروں

کا پتہ لگائے۔ ورنہ وہ نقصان کا خود ذمہ دار رہے گا " ابو الفضل نے یہ بھی لکھا ہے۔ کہ اگر کسی مقام پر کوتوال نہ ہو تو یہ خدمت محصّل ٹیکس کے سپرد رہے گی۔

سترھویں صدی کے آخر نصف زمانہ میں تھی وے نو، اور منوچی نے بھی ذکر کیا ہے کہ اگر فوجدار اور کوتوال چوری کا سُراغ لگا کر مال برآمد نہ کر سکتے تھے تو اُن کو نقصان کی خود تلافی کرنی ہوتی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان قواعد کی کس قدر پابندی ہوتی تھی، اور اپنی بچت کے لئے کتنے افسران محکمہ رعایا پر الزام عائد کر دیا کرتے تھے، بہر کیف اس طریق انتظام سے رعایا میں ہوشیاری کا مادہ پیدا ہوتا تھا اور جرائم کی تعداد میں بھی کمی ہو گئی تھی۔ تھی وے نو کا بیان ہے کہ کوتوال ہمیشہ اپنی چالاکیوں سے روپیہ کی ادائیگی نہ کرتے تھے، اور وہ ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتا ہے کہ مسٹر بے بر کی چوری کا معاوضہ ایک فوجدار کو مبلغ پندرہ ہزار روپیہ ادا کرنا پڑا۔

حکومت کی سخت کوششوں کے باوجود راہزنی اور قزاقی کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی تھیں، بالخصوص اُن مقامات پر جو ذرا دُور واقع ہوئے تھے، دور دراز کی مسافتیں خطرے سے خالی نہ تھیں اور بغیر کاروان کے اس قسم کے سفر ذرا مشکل سے سلامتی کے ساتھ طے ہوتے تھے، پہاڑی اور جنگلی مقامات، بالخصوص مالوا اور سنٹرل انڈیا میں راہیں بہت مخدوش تھیں، حالانکہ مغربی بندرگاہ کو جانے کا راستہ یہیں سے تھا، ان جنگلوں میں بھیل، گونڈ اور موگھی اقوام کے چور پناہ گزین رہتے تھے، اور بسا اوقات قافلہ تک کے سامان کی چوریاں کر لیتے تھے۔ البتہ مقابلہ پر ذرا مشکل سے آتے تھے ۱۶۰۸ء لغایتہ ۱۶۱۱ء میں ہاکنس کے یہ الفاظ "عہد جہانگیری میں چوروں اور قزاقوں کی ایسی زیادتی ہے کہ کوئی شخص اپنے مکان سے نہیں نکل سکتا ہے تاوقتیکہ اُس کے ہمراہ پوری فوج نہ ہو"، یقینی طور پر خلاف واقعہ ہیں کیونکہ اُسی زمانہ میں مسٹر ٹامس رو (۱۶۱۵ء لغایتہ ۱۶۱۹ء) اور ٹیری (۱۶۱۵ء) راجپوتانہ سے دور افتادہ اور خطرناک مقام سے ہو کر سفر نہ کر سکتے۔ اگر راہیں صاف اور خطرہ سے خالی نہ

ہوئیں، انگریزی سفیر نے تو ایسے وقت میں سورت سے اجمیر کا سفر برہان پور، اور
چتوڑ ہو کر کیا تھا، جب کہ سیاسی فتنہ وفساد کی گرم بازاری تھی۔ یہی حال ٹیری کا تھا
جس نے "نہایت آرام کے ساتھ" سورت سے مانڈو تک کا سفر کیا تھا اور صرف بڑودہ
کے قریب آدھی رات کو اس کے مختصر قافلہ پر ایک معمولی سا حملہ ہوا تھا، انہیں راستوں سے
بنجارے اپنی گونیں بھر کر آتے جاتے تھے، اور کبھی ایسا نہ ہوا کہ راستوں کے خطروں کے
باعث انہوں نے اپنے آبائی پیشوں کو ترک کیا ہو،

قزاقوں اور رہزنی کی روک تھام کا ایک ذریعہ عہد مغل میں یہ بھی تھا کہ قزاقوں کو ایک
دم تہ تیغ کر کے اُن کی کھوپڑیوں سے مینار قائم کر دیئے جاتے تھے تاکہ دوسرے بداعمالوں
کو عبرت حاصل ہو، آرہ کا بیان ہے کہ رام سور، اجمیر سے بیس میل، کے فاصلہ پر "بادشاہ
نے سو قزاقوں کو قتل کیا تھا، اور اُن کی برہنہ لاشیں پڑی ہوئی تھیں" پندرہ برس کے بعد
۱۶۳۱ء میں پیٹر منڈی نے "آگرہ میں کئی منایاں (چھوٹے مینار) دیکھیں جو گرفتار چوروں
کی کھوپڑیوں سے بنائی گئی تھیں۔ بعض چور اور ڈاکو تو زندہ جلا دیئے گئے تھے، اُن کی
لاشیں اٹریوں میں پھندا لگا کر آم کے باغوں میں ٹانگ دی گئی تھیں۔ اور خود شہر میں متعدد
مقامات پر ٹکٹیوں پر لاشیں لگی ہوئی تھیں"! ایک سال کے بعد منڈی نے باکیوار اور چپر گھاٹ
کے درمیان میں گنگا کی وادی میں اسی قسم کی دو سو میناریں دیکھیں، حالانکہ دونوں مقامات کا
فصل صرف ۵۰۔۶۰ میل تھا، یہ راستہ ایسا خطرناک تھا کہ بادشاہ نے عبداللہ خاں کی کمان
میں دو ہزار سوار، اور بیس ہزار پیادے بھیجے، جنھوں نے قزاقوں اور ڈاکوؤں کے گاؤں
برباد کر دیئے، اور اُن کا کل مال واسباب لوٹ لیا، قزاقوں کی ہمتیں ایسی بڑھی ہوئی تھیں کہ
اُنھوں نے کھلم کھلا بغاوت کر دی اس کے استیصال کے لئے بادشاہ کو بہت
بڑی فوج بھیجنے کی ضرورت ہوئی۔

ٹے ورنیر نے کالاباغ، واقع راجپوتانہ میں بھی ایک ایسا ہی مینار دیکھا تھا، اورنگ زیب

نے وہاں کے راجہ اور باشندوں کو اس جرم میں یہ سزا دی تھی کہ وہ مسافروں کو لوٹتے تھے، اور سوداگروں سے زبردستی کثیر محاصل وصول کرتے تھے۔

مالوہ اور گجرات میں ایک خاص فرقہ تھا جو چارن کے نام سے مشہور تھا اُن کا پیشہ یہ تھا کہ اُنکی جماعتیں یا ٹولیاں مسافروں کے ہمراہ سفر کرتی تھیں، اور راہ کے ڈاکوؤں اور قزاقوں کو مسافروں سے کچھ روپیہ دلوا کر، حملہ سے محفوظ رکھتی تھیں، بنئے عام طور پر چارنوں کو لیکر سفر کرتے تھے، ہیبر ۱۸۲۵ء میں کہتا ہے کہ سوداگر اور مسافر عام طور پر مالوہ اور گجرات میں ایک چارن کو ہمراہ لے لیتے ہیں، چارن کا وجود ایسا متبرک خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی ڈاکو اس مسافر سے ہاتھ نہیں لگاتا،

سترھویں صدی کے اخیر میں سلطنت مغلیہ کے جوڑ بند ڈھیلے ہو چلے تھے، اور رفتہ رفتہ باہمی جنگ و قتال نے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کردی تھیں جو خود سر ہوگئی تھیں، شمالی ہندوستان کی فتنہ سامانیوں اور ہنگامہ آرائیوں نے ملک میں سیاسی بدنظمی اور بدانتظامی کا بازار گرم دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قوانین اور قاعدے جن کی برکت سے عہد مغلیہ کو دو سو سال تک سکون اور امن پسندی کی شہرت حاصل تھی، رفتہ رفتہ مٹ گئے، پنڈاری ٹھگوں، جاٹوں اور مرہٹوں نے زور پکڑا، اور اپنی اپنی سلطنتوں کے خواب دیکھنے لگے اُنکے زمانہ میں غارتگری، قزاقی، اور بدعہدی نے از سر نو سر اٹھایا اور ہر جگہ مظلوموں کے آہ و بکا کے نعرے بلند ہوگئے، خود اورنگ زیب کے عہد میں چورا من جاٹ آگرہ کے قرب و جوار اور فتح پور سیکری میں لوٹ مار کرتا پھرتا تھا، اور مرہٹے سرونج اور اُجین تک غارتگری کرتے آجاتے تھے، اٹھارھویں صدی کے وسط میں تو مرہٹے بنگال تک پہنچ گئے تھے۔ فصلی حملوں کے علاوہ سخت محاصل وصول کرتے اور مسافروں اور سوداگروں سے ٹیکس لینے میں بھی بہت تشدد کرتے تھے۔ اور اُن کے مظالم کی انتہا نہ تھی۔

اس باب کو ختم کرنے سے پہلے، غالباً امپیریل گزیٹیر سے مندرجہ ذیل اقتباس غیر موزوں نہ ہوگا عہد اورنگ زیب کے اختتام پر آمد و رفت؛ اور مال و اسباب کی

لانے لیجانے کے متعلق درج ہے کہ سڑکوں پر چلنے کا جو حق عوام کو حاصل ہے اُس کی حفاظت کیجاتی تھی۔ اور جان اور مال کا بھی بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ مغل بادشاہوں کو ہمیشہ فکر رہتی تھی کہ جن سڑکوں پر کارواں اور مسافروں کی آمد و رفت رہتی تھی اُس کی پوری نگہداشت کی جائے۔ سڑکوں پر جابجا چوکیاں تھیں، اور چوکیوں کے درمیان پتھر کے نشان اور ستون اور درختوں کی قطاریں نظر آتی تھیں، جن زمینداروں کی زمین پر ہو کر سڑکیں نکلیں تھیں اُن کی جانب سے چوکیدار تھے اور مسافروں سے بہت ہی معمولی محصول لیا جاتا تھا، عمل گذار یعنی مجسٹریٹ اپنے حلقوں میں چوریوں کے ذمّہ دار تھے، اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رعایا کی کافی حفاظت ہوتی تھی۔

خاتمہ

جملہ واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان قرون وسطیٰ میں بار برداری اور آمد و رفت کے معقول ذرائع کے اعتبار سے خوش قسمت تھا، اور زمانہ کی ضرورت کے مطابق کافی طور پر رعایا کی حفاظت ہوتی تھی۔ ہندوستان کی تجارت بڑھتی ہی رہی، اور اندرون ملک اُس کو ہمیشہ فروغ ہوتا رہا سڑکیں اور شاہراہیں محفوظ تھیں، اور اگر کبھی وارداتیں ہوجاتی تھیں تو اُن کا عام طبائع پر زیادہ اثر نہ ہوتا تھا۔ بداعمالیوں، قزاقیوں اور چوریوں کے استیصال کی طرف حکومتیں ہمیشہ توجہ کرتی تھیں، اور قانون کی پابندی، اور مفید قوانین کے نفاذ کو اپنا فرض سمجھتی تھیں، اور ہندوستان ایک سرے سے دوسرے سرے تک لطف اور آرام کا گہوارہ تھا، قرون وسطیٰ کے حکمرانوں پر یہ الزام بالکل غلط ہے کہ وہ اپنی حدود حکمرانی سے باہر خلق اللہ کی بہبودی اور اُن کی راحت کے لئے کوشاں نہ ہوتے تھے، ملک کی خوشحالی، فارغ البالی، شہروں اور بندرگاہوں کی رونق اور تجارت کی کامیابی، انہیں حکمرانوں کی مرہون منت تھی جن کو آج یورپین مورخ اپنی کوتاہ نظری سے مطعون کرتے ہیں، اور خود اپنی قوم کے سیاحوں اور مورخوں کی شہادتوں پر التفات نہیں کرتے، یہ علمی اور تاریخی ظلم ہے جس کو ہم

اور ہمارے طلبا رانگریزی مورخین کی تواریخ ہندوستان ، اور درسی تواریخ میں جبراً اور قہراً برداشت کر رہے ہیں ، اور اُن رہبران ملک وملت کو بُرا کہنے پر مجبور ہوتے ہیں جو حقیقتاً ہمارے لئے مایۂ ناز ، اور ہماری تاریخ میں طرۂ امتیاز تھے ۔

(مختار) (باقی)

(نوٹ) قرون وسطیٰ کے مضمون کا بڑا حصّہ اس قسط کے ساتھ ختم ہوتا ہے ۔ نوعیت اور تحقیق کے اعتبار سے جس پایہ کا یہ مضمون ہے اُس کے بارے میں ہم کو زیادہ عرض کرنیکی ضرورت نہیں ۔ قابل مصنف نے زیادہ تر یوروپین ، سیاحوں اور مورخوں کے حوالہ سے ہندوستان میں قرون وسطیٰ کی حالت کا جو دلفریب اور اطمینان بخش نقشہ کھینچا ہے اُس کے مطالعہ سے کسی ہندوستانی کی گردن شرم سے نیچی نہ ہوگی ، ہمارے لئے یہ تاریخی شہادتیں موجب فخر ہیں کہ جہاں تک ملک رانی ، قوانین سازی ، اور فارغ البالی کا تعلق تھا ، ہم خدا کی خدائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے ! آیندہ قسط میں اُس عہد کی ڈاک کے انتظامات پر ایک مضمون شائع ہوگا اور اس طرح پر مصنف کا پورا مضمون اردو کے قالب میں ڈھل کر قارئین شمع تک پہنچ جائے گا ۔

ہمارا ارادہ ہے کہ مضمون کی کل اقساط کو جمع کر کے یکجا شائع کر دیں ، قیمت صرف عہ ، ہے ۔ درخواستیں ابھی سے آنی شروع ہو جانی چاہئیں تاکہ ۵۰۰ خریداروں کی درخواستیں آجانے پر اس کی طباعت شروع کرا دی جائے ۔ ۱۰۰ جلدوں کے خریداروں کو بیس فی صدی اور ۵۰ جلد کے خریداروں کو دس فیصدی کمیشن دیا جائے گا ۔

منیجر شمع

غزل

(از حضرت مصور جذبات میرزا ثاقب صاحب لکھنوی)

یوں جھیلتا ہوں ہجر کی شبہائے تار کو
ہر صبح یاد کرتا ہوں شامِ مزار کو

نازاں نہ تیرگی پہ ہو شامِ مزار کو
لاؤں کہاں سے ہجر کی شبہائے تار کو

گرنے لگی ہے قیمتِ دل آنسوؤں کیساتھ
کس نے اُلٹ دیا ورقِ اعتبار کو

جب زلف دیکھ لی ہی تو چہرہ بھی دیکھ لوں
گردش نہیں ہی کیا مرے لیل و نہار کو

آوازہ چمن کی امید اور میرے بعد
چپ کر دیا فلک نے زبانِ بہار کو

در سیکڑوں قفس میں ہیں پھر بھی اسیر ہوں
کیسا مکان ملا ہے غریب الدیار کو

میں سخت جاں نہیں ہوں مگر ہاں نگاہِ یاس
روکے ہی دست و بازوئے خنجر گذار کو

اس حادثے سی قبل کہ میں کچھ نہ کہہ سکوں
سُن لو بیانِ حالِ دلِ بے قرار کو

خود آسماں کو نقش وفا سے ہے دشمنی
تم کیوں مٹا رہے ہو نشانِ مزار کو

ثاقب یہ شعر حسن میں جھلک خونِ دل کی ہی
دکھلا رہے ہیں کیفیتِ قلبِ زار کو

نجات

(بہ سلسلہ جنوری ۱۹۲۷ء)

از

(جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب، آکسن، بیرسٹرایٹ لا ممبر لیجسلیٹو کونسل۔ ایڈیٹر شمع)

(۴)

صبح کو جب ہوش آیا تو دن اچھی طرح نکل چکا تھا، اور دھوپ کی تیز شعاعیں میرے چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ درد کی شدت سے سر میں ٹیسیں ہو رہی تھیں اور بہ مشکل آنکھ کھلتی تھی۔ ڈوبتے آدمی کو زمین پر پیر ٹیکنے سے جو خوشی ہوتی ہے وہی خوشی مجھ کو فرش پر کھڑے ہو کر اس احساس سے ہوئی کہ میرے پیروں تلے زمین موجود تھی اور میں اپنے ہی کمرہ میں تھا! والدہ کا چوبی صندوق رکھا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر آئینہ تھا۔ میں آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر روزانہ صبح کو ورزش کیا کرتا تھا۔ "کیا رات کو مجھے میرا ہی عکس نظر آیا تھا؟ .... اور کبھی؟" میں نے آواز دے کر ملازم سے پوچھا "رات کو میرے ساتھ کون تھا؟" اس نے جواب دیا "حضور نے تو مجھے رات کو چھٹی دے دی تھی اور فرمایا تھا کہ صبح ۲ (؟) آنا، مجھے کیا معلوم آپ کے ساتھ کون آیا تھا، باہر امیر معز الدین بیٹھے ہیں، انہوں نے آپ کے جگانے کو منع کر دیا تھا" یہ کہہ کر وہ تو رخصت ہوا مگر مجھے اپنے سوال پر خود ہی ندامت ہوئی، اتنے میں معز الدین کمرہ میں آگیا اس کا چہرہ کامیابی کی مسکراہٹ سے چمک رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی کہنے لگا "زیب النسا کا پیغام ہے کہ آج آپ میرے یہاں مدعو ہیں، وہ بھی آئے گی۔ آپ کی رات کی باتیں اس کی زبانی معلوم ہو کر

مجھے بہت ہنسی آئی"

میں نے فوراً جواب دیا "سہ پہر کو ایک اور جگہ جانا ہے" اس کو چپ کرنے کے لئے مجھے کہنا پڑا "سخت مجبوری ہے" اور ہتھیلی سے پیشانی کو سہلانے لگا، درد کی شدت سے بُرا حال تھا، مگر اُس پر مطلق اثر نہ ہوا، میرے انکار پر اُس کا اصرار بڑھتا گیا۔ مجبوراً مجھے کہنا پڑا "زیب النسا سے ملنا ناممکن ہے، آپ اس قصے میں نہ پڑیں .... وجہ دریافت کرنے پر اگر ایسا ہی اصرار ہے تو خیر سُنئے، مجھے زیب النسا سے بہتر عورت مل گئی ہے .... فرمایئے، کیا یہ وجہ انکار کے لئے کافی نہیں ہے؟"

اس گفتگو کے بعد معز الدین کو رخصت ہونا پڑا، اُس کی گھبرائی ہوئی صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ مجھے پھانسنے اور تباہ کرنے کی جو اُمیدیں اس نے باندھی تھیں، اُن کا خاتمہ ہو چکا تھا میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا، مگر اختلاج قلب سے تمام جسم لرز رہا تھا۔ دل کی دھڑکن کانوں کو محسوس ہوتی تھی، اور ایک دفعہ تو ایسا معلوم ہوا کہ "میں چلا" گھبرا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا، اور کپڑے پہننے لگا۔ چند سیکنڈ کے اندر میں سڑک پر تھا۔ مگر کیوں!

لچھمی کو آتا ہوا دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، لیکن خیال آیا کہ میرے معمہ کو وہی حل کر سکے گی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر ایک قدم بڑھایا تو گر کر مر جاؤں گا، وہ بازار سے واپس آ رہی تھی، ایک ہاتھ میں ترکاریوں کی ڈلیا تھی، اور دوسرے ہاتھ سے ساری کو درست کرتی جاتی تھی۔ سڑک خالی تھی، کوئی دس قدم کا فاصلہ رہا ہوگا کہ میں گفتگو کرنے کو رُکا، وہ حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ اور آنکھیں نیچی کر لیں۔ میں نے کہا "بڑا احسان کیا، رات کو مجھے بچا لیا" اس نے رفتار دھیمی کر لی اور مجھے اس کے لباس کی خوشبو سونگھنے اور اس کی زلفوں کو شانے پر بکھرے ہوئے دیکھنے کا اچھی طرح موقع ملا.......

اب صرف ایک گز کا فاصلہ رہ گیا تھا، اس نے منع کرنے کے انداز سے ہونٹوں پر انگشت

شہادت رکھ لی، یعنی میں خاموش رہوں اور خفا نہ ہوں، اور مجھے کنکھیوں سے دیکھتی اور مسکراتی ہوئی برابر سے نکل گئی۔

"کیا وہ میرا مطلب سمجھ گئی تھی؟...... کیا اس عمر اور اس وضع کی تربیت یافتہ لڑکیاں اپنے باپ کے شناساؤں کو جواب دینے کی بجائے اسی طرح مسکرایا کرتی ہیں؟" — وہ نرم اور ہلکے پاؤں سے فوراً گھر پہونچ گئی، اور مڑ کر دیکھنے لگی۔ اب بھی ہنس رہی تھی...... واقعی اس کی طبیعت میں محبت تھی، اور بچپن کا بھولا پن موجود تھا، مجھے ہاتھ کا اشارہ کیا جسکا مطلب تھا "پھر ملیں گے" اور مکان کے اندر چلی گئی۔

میں جب اپنے کمرے میں داخل ہوا تو میری دنیا دوسری ہو چکی تھی، اکرم سنگھ کی بیٹی میرے لئے ایک نازک پھول تھی جو نسیم سحر کے ہلکے جھونکوں سے کھلتا ہے، رات کی کچھی اصلی کچھی نہ تھی! وہ میری طبیعت کی خرابی، اور نشہ کی ہیجانی کیفیت کا تخیل محض تھی!..... معلوم ہوتا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤنگا، اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور پیشانی کی پھڑکتی ہوئی رگوں کو انگلیوں سے دبانے لگا۔ دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی، جس قدر قابو میں لانے کی کوشش کرتا تھا، اسی قدر طبیعت خراب ہوتی تھی، سامنے خنجر رکھا تھا۔ میں نے اس کو غلاف سے نکال لیا اور چاہا کہ زندگی کا خاتمہ کر دوں، خنجر کی بے قرار نوک جگنو کی طرح چمک رہی تھی، پھر خیال آیا کہ میرے بعد میری کل جائداد سرکار میں ضبط ہو جائے گی کیونکہ میں بے وارث ہوں، میرا عہدہ امیر معز الدین یا کسی اور ایسے ہی بد اعمال کو ملیگا، اور زیب النسا، فخر یہ کہتی پھرے گی کہ میں نے اسی کی وجہ سے خود کشی کی تھی لہٰذا میں نے خنجر کو غلاف میں رکھدیا کیونکہ ان حالات میں خودکشی کرنا سخت حماقت تھی اور چونکہ سخت انتشار تھا اس لئے کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ رفتہ رفتہ طبیعت کو سکون ہونے لگا اور اس فیصلہ پر پہنچ کر کہ "سب جھگڑوں کا فیصلہ کر دینا مناسب ہے" بے بیان اطمینان ہو گیا۔ میں اس نتیجہ پر کس طرح پہونچا؟ اس سوال کا جواب میرے امکان سے باہر ہے، کیونکہ دنیاوی علایق سے قطع تعلق کی خواہش از خود پیدا ہوئی تھی، اور میں نے اس کا احساس اس وقت

کیا جبکہ میں مستقل رائے قائم کر چکا تھا! ناتجربہ کاری کے باعث مجھے زندہ دلی کی تلاش رہتی تھی۔ اور چونکہ اب اس کی حقیقت معلوم ہو گئی، اور میں سمجھ گیا تھا کہ اس کے ذریعہ سے زندگی اور مسرت کا ملنا محال، اس لئے میں یکایک متنفر ہو گیا۔

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنھیں چاہ کے ارماں ہونگے

مجھے تو اب قلب کی راحت، اور دماغ کے سکون کی ضرورت تھی، اور اپنا وہ عہد معصوم پیش نظر تھا جبکہ میں خوف اور جوشش کا متحمل نہ تھا، اور والدہ کی تربیت اور محبت کی نگاہیں میری محافظ تھیں؟ والدہ اب زندہ نہ تھیں، اور غالباً ان کی زیارت کبھی نصیب نہ ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی آنسوؤں کا تار بندھ گیا، اب تک میں اُن کے غم میں جی کھول کر نہ رویا تھا۔ رونے سے طبیعت ذرا ہلکی ہوئی، "مگر اب میری حفاظت کون کرے گا؟" ایک بزرگ بزرگ کی نورانی اور مسکراتی ہوئی صورت میری اشک آلود آنکھوں کے سامنے آگئی اور میں بے اختیار ہو کر کہنے لگا "انہیں کی خدمت کرونگا، اور انہیں کے قدموں پر سر رکھدونگا"!

چوبی صندوق سے والد مرحوم کا مُطلّا قرآن شریف نکالا، کئی ہفتوں سے تلاوت نہ کی تھی۔ پہلی آیت نظر آئی "اللہ کے کرم سے مایوس نہ ہو، وہ سب گناہوں کو معاف کر دیتا ہے، وہ رحمٰن ہے اور رحیم ہے" کتاب اللہ کو میں نے سینہ سے لگا لیا۔ اور پھر کھولا تو یہ آیت ملی "اور جب ان لوگوں سے (سچے ایمان والوں سے) کوئی شرمناک اور نقصان رساں فعل سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں، اور کون ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے، جو گناہوں کو معاف کرے، بشرطیکہ وہ لوگ جان بوجھ کر بار بار گناہوں کا ارتکاب نہ کریں" دل کو مضبوط، اور ہمت کو بلند پا کر میں نے تیسری مرتبہ کلام الٰہی سے امداد طلب کی، یہ آیت ذرا بڑی تھی اور قاتلوں، زانیوں، اور بے ایمانوں سے تعلق رکھتی تھی، "جن کو روز قیامت دوگنی سزا دیجائے گی، لیکن جو توبہ کرتا ہے، اور خدا کا یقین رکھتا ہے اور اپنے

اوقات کو نیک کاموں میں گذارتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی زندگی کی بُرائیوں کو نیکی سے بدل دیگا کیونکہ اللہ رحمٰن اور رحیم ہے ، اور بے شک جو توبہ کرتا ہے اور اعمال نیک رکھتا ہے وہ حق کی جانب ہو جاتا ہے "

اب سید ہارا ستہ میرے پیش نظر تھا۔ اور جو کچھ جھجک باقی تھی نکل چکی تھی! "جو توبہ کرتا ہے اور خدا کا یقین رکھتا ہے اور اپنے اوقات کو نیک کاموں میں گذارتا ہے" یہ الفاظ میرے دل میں اُتر گئے ، قرآن کریم کو میں نے تکیہ کے پاس رکھدیا ، اور جس طرح بچّہ ماں کو یاد کرکے روتا ہے میرا دل چھوٹ گیا اور بے قرار ہوکر رونے لگا۔ اختلاج بھی کم ہوگیا اور مجھ پر سکون بخش اور آرام کی نیند غالب ہوگئی!

(۵)

اسی روز سہ پہر کو میں حضرت شیخ نظام الدین اولیار کی خانقاہ پر حاضر ہوا ، اور بستر علالت سے اُٹھے ہوئے مریض کی طرح گر پڑا ، کیونکہ میرے سر میں ابھی تک درد باقی تھا۔ کرن سنگھ پھاٹک پر تھا حسب معمول خندہ پیشانی سے ملا۔ اُس کو فقرار اہل اللہ اور صوفیوں پر بہت اعتقاد تھا ، بعض لوگ اُس کو مسلمان سمجھتے تھے ، مگر وہ مسلمان نہ تھا۔ وہ اہل سیاست اور فقرار کی شہرت کے لحاظ سے انکی تعظیم وتکریم کرتا تھا اُس کے قلب کی وسعت میں دو قطعی مختلف عقاید کی بہ یک وقت گنجایش تھی ، نو وارد مذہب کی کامیابی کو وہ اُس کی سچائی پر محمول کرتا تھا اور جس حد تک مذہب کامیاب ہوتا تھا اسی حد تک اُس کو سچا مذہب سمجھتا تھا۔ غرض کرن سنگھ کے دل میں اسلام اور ہندو دھرم اسی طرح جاگزین تھے جس طرح ہندوستان میں ہندو اور مسلمان آباد ہیں۔

وہ اُن لوگوں میں تھا جو اپنی حالت پر فطرتًا قانع اور صابر رہتے ہیں۔ اور کبھی شکایت نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے حضرت شیخ اس کو پیار فرماتے تھے۔ میرے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہنے لگا ، "بہت اچھا کیا کہ یہاں چلے آئے ، آجکل ہر شخص تمہارا ذکر کرتا ہے شیخ کو بھی اطلاع کرونگا

وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے" میں نے کہا "اطلاع کرنے کی زحمت نہ کیجئے۔ جب اور لوگ زیارت کریں گے میں بھی زیارت کرونگا" اور ہم ایک وسیع کمرے میں داخل ہوگئے جہاں انسانی وضع کے عجیب وغریب نمونے موجود تھے، چونکہ میرے سر میں بہت درد تھا میں دیوار کے سہارے سے بیٹھ گیا۔ کرن سنگھ میری تکلیف کو محسوس کرکے کہنے لگا "میری بیٹی کہتی تھی کہ تمہاری طبیعت اچھی نہیں ہے" اور میری پیشانی کو اپنی انگلیوں سے سہلانے لگا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس نے مجھے سینہ سے لگالیا، اور پوچھنے لگا "کیا ماں کی یاد آگئی؟"

ملازم نے آکر اطلاع دی کہ حضرت شیخ تشریف لارہے ہیں۔ ہم سب سروقد کھڑے ہوگئے اور اس خیال سے کہ ہر شخص کو حضرت کی زیارت کا پورا موقع ملے، نصف دائرہ بناکر فرش پر بیٹھ گئے،

یہ سوچ کر کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرنا پڑے گا، مجھے پھر اختلاج ہونے لگا۔ کیونکہ گناہوں کا اقبال آسان ہے مگر حماقتوں کا اظہار امکان سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ مگر مجھے سابقہ زندگی کو اختیار کرنا منظور نہ تھا، اور یہ بھی معلوم تھا کہ محض سابقہ گناہوں کی بناپر حضرت مرید بنانے سے انکار نہیں کرتے اسلئے میں نے دل کو مضبوط کرکے عہد کرلیا کہ چاہے کچھ ہو مگر میں شیخ سے ایک ایک بات عرض کردوں گا اور کچھ نہ چھپاؤں گا، البتہ یہ خیال نہ رہا کہ میرا ہمسایہ بھی وہاں موجود تھا!

حضرت شیخ نظام الدین کی عمر ستر سال سے کم نہ تھی۔ بال سفید ہوگئے تھے مگر ہونٹوں پر ہر وقت ہنسی اور شادمانی رہتی تھی۔ آنکھوں میں حیرت انگیز قوت تھی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ کر راحت اور اطمینان سے معمور کردیتی تھی۔ حضرت نے چاروں طرف نگاہ دوڑاکر مجھے منتخب فرمالیا۔

اللہ رے نگاہ کہ مجمع کے بیچ میں
جس دل سے لاگ تھی اُسے پہچان لے گئی

اور بلند آواز سے فرمایا "یہاں ایک بیش قیمت نگینہ موجود ہے! اے میرے دل شکستہ! میرے

پاس آؤ" میں فوراً آگے بڑھ گیا، اور کرن سنگھ نے یہ کہہ کر تعارف کرادیا "امیر حسام الدین کے بیٹے ظہیر الدین یہی ہیں انہیں کو کل شہنشاہ معظم نے ملک بنایا ہے" "میں نے ان کو کبھی نہیں دیکھا، مگر تعارف کی ضرورت نہیں ہے" یہ فرما کر حضرت نے میری ٹھوڑی کو داہنے ہاتھ میں لیکر بلند کیا، اور بائیں ہاتھ سے ایک ہلکا طمانچہ میرے داہنے رخسار پر لگا کر تبسم فرمایا۔

حاضرین بھی مسکرانے لگے، اور ان کو خیال ہوا کہ حضرت میری ترقی سے خوش ہو رہے ہیں مگر میرا ہی دل جانتا تھا کہ ان الفاظ کی تہہ میں کیا کیا باتیں تھیں، حضرت نے میری ٹھوڑی کو اور اونچا کیا تاکہ میں اُن کی آنکھوں کی مقناطیسی قوت سے متاثر ہو جاؤں، میں متاثر ہو گیا، اور ان آنکھوں نیں میرے لئے پیغام تھا جس کا صاف مطلب تھا "میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے، مجھ سے ہر بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے" اور قبل اس کے کہ میں معلوم کر سکوں میرے گناہوں کا اقبال ہو چکا تھا۔

شیخ نے فرمایا "اے میرے پیارے سبزہ آغاز ملک، تمہارا باپ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے، اس کو لے چلو" میں پھر تھرا گیا کہ اب تنہائی میں شیخ اچھی طرح ایک ایک بات پوچھیں گے، اور جرح کریں گے، مگر میں نے دل کو پھر مضبوط پکڑا، حضرت نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا، اور قطعی فیصلہ کن انداز میں فرمایا "جو چیز خدا کریم نے اپنی بے نہایت اور غیر محدود عقل میں مسطور کر دی ہے اس کو پوشیدہ رکھو، اور کسی کو نہ دیکھنے دو، بہت اچھا کیا کہ میرے پاس چلے آئے۔ ہمت سے کام لو، اور سلطان کو جا کر استعفا دیدو۔ جوش اور شوق کی ابتدائی طغیانی میں ایسے اہم کام آسان ہوا کرتے ہیں"

"اور میری جائداد"؟

"اپنے وارث کو دے ڈالو"؟

"میرا کوئی وارث نہیں ہے"

"جس سے تمہارا پیار ہے اس کو دیدو"

"مگر .... میری زبان نے ساتھ نہ دیا۔ اور میں جو چاہتا تھا نہ کہہ سکا"

حضرت نے معصومانہ انداز سے فرمایا "انہیں کو دیدو" اور مجھ کو پیار کی نگاہوں سے دیکھنے لگے، میرے والد نے بھی مجھ کو اس طرح کبھی نہ دیکھا تھا،

"اس کا باپ بغیر حضور کے حکم فرمانے کے قبول نہ کرے گا"

"وہ کون ہے؟"

"کرن سنگھ!" مگر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا۔

شیخ خوش ہو گئے، اور تالیاں بجا کر فرمانے لگے "کرن سنگھ! ٹھیک ہے، اس کو بیٹی کے جہیز کی فکر بھی تھی۔ اچھا، میں خط دیتا ہوں تم دستاویزات کے ساتھ اس کے حوالہ کر دینا!"

قصر ہزار ستون میں ابھی روشنی شروع ہوئی تھی۔ میں نے میر خاں ساماں کے ذریعہ سے بارگاہ سلطانی میں اطلاع کرانی چاہی، وہ مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگا "آپ تھے کہاں؟ سلطان آپ کو یاد فرما رہے ہیں، آج کچھ شکایتیں ان کے کان تک پہنچی ہیں۔ اور آپ کی تلاش میں آدمی بھیجے گئے ہیں خدا کرے یہ ملاقات خیر و خوبی کے ساتھ انجام پائے"

میں قصر سلطانی میں بے دھڑک چلا گیا۔ سلطان علاء الدین اپنے برج کے تخت پر فروکش تھے، اور معتمد کاغذات کا بستہ لئے سامنے کھڑا تھا، سلطان نے میرا مجرا قبول کیا، اور ایک سر بہ مہر لفافہ کو چاک کر کے پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ ان کے لبوں پر طنز آمیز مسکراہٹ تھی۔ اور کاغذ کو بے پرواہی کے انداز سے عمداً اسقدر نیچا کر لیا تھا کہ میں اس کو خواہ مخواہ پڑھ سکوں۔ اخیر جملہ تھا کہ "نہایت پریشانی کے عالم میں حضور کی خادمہ نے یہ عریضہ لکھا ہے اور وہ اخیر مرتبہ عرض کرتی ہے کہ حضور اس کی خطا کو معاف فرمائیں۔ حضور کی لونڈی، زیب النساء،"

خط پڑھ کر سلطان نے دریافت کیا "وہ ہے کہاں؟"

معتمد نے عرض کیا "حضور وہ باہر موجود ہے، اور امیر معز الدین اسکے ہمراہ ہیں۔"

"کہدو کہ وہ کم بخت یہاں سے دفع ہو جائے، اور اب اس کی عرضی آئی تو میں اس کو چہرے پر چابک لگواؤنگا، اور ایسا ذلیل کرونگا کہ یاد کرے گی........ مگر نہیں . . . . ذرا ٹھہرو"

سلطان کی خبیث طینت نے زیب النساء کے دوبارہ ارتکاب جرم کا انتظار نہ کیا، وہ ایسی سزا تجویز کر رہے تھے جو چابکوں سے بھی زیادہ سخت ہو۔ فرمانے لگے "چابک کھاکر تو وہ اور مشہور ہو جائیگی، اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں، وہ تو خود شہرت کی طلبگار ہے، ایسا ہو کہ وہ ایسے مکان کے کونے میں بیٹھ کر گناہوں سے توبہ کرے جہاں نہ آرام مل سکے اور نہ عشاق پہنچ سکیں۔ اور نہ رہائی کی کوئی صورت نکل سکے، اچھا! اس کی تمام دولت ضبط کرکے داخل خزانہ کی جائے، اس کی سواری پر پہرا لگا دیا جائے تاکہ وہ گھر پہنچ کر کسی چیز کو نہ چھپا سکے، کونے کونے کی تلاشی لی جائے، اور ایک ایک چیز خزانہ میں داخل ہو جائے یاد رکھو، اگر ایک تنکا بھی رہگیا تو تم لوگوں کی کھالیں کھچوا دونگا، اس نے میرے امیروں کو لوٹا ہے، اگر جائداد کے حوالہ کرنے میں عذر کرے اور ہبہ نامہ پر دستخط کرنے سے تعرض کرے تو فوراً شکنجہ میں دیدو، پوری سمجھ آجائے گی۔ سمجھے؟ اور دیکھو، کل مال اور دولت قبضہ میں لینے کے بعد قاضی مغیث کو حکم دو کہ وہ اس کا نکاح بداعمال معزالدین سے پڑھا دے! عرض ممالک کے نام حکم بھیجدو کہ معزالدین کی آیندہ ترقی بند کیجاتی ہے، نصف شب تک میرے تمام احکام کی پابندی ہو جائے۔ اور اسوقت تک زیب النساء بدستور حراست میں رہے اور اب تم جاؤ"

معتمد کے رخصت ہو جانے پر سلطان میری طرف متوجہ ہوئے، "اب آپ کی باری ہے، مجھے تین مخبروں کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے کہ آپ رات کو نشہ میں چور تھے، اور اسی حالت میں طوائف کے گھر گئے تھے۔ کیا یہ اطلاعات غلط ہیں؟"

"جہاں پناہ، میں سچائی سے انحراف نہ کرونگا" یہ کہکر میں نے تخت سلطانی کو بوسہ دیا،

اور اُن کے ہاتھ میں اپنا استعفا دیکر عرض کیا "کیا سلطان المعظم اُس کو معاف نہ فرمائیں گے جو تائب ہو چکا ہے، اور جس کو معاف کرنے کا خدا بھی وعدہ کرتا ہے؟"

"ضرور معاف کرونگا" یہ فرماکر سلطان نے میرے معروضہ کو بغور ملاحظہ فرمایا، اور کہنے لگے "میں ہرگز نہ مانوں گا! کیا شہر میں حرام زادوں کی کمی ہے جو شیخ میرے بہترین چھوٹے سردار کو چھینتے ہیں! نہیں۔ استعفا واپس"

میں نے عرض کیا "میرا باپ حضور کا نمک خوار تھا، اور میں کبھی حق نمک فراموش نہ کرونگا۔ لیکن حضور مجھے معاف ہی فرما دیں، جب میرا دل کہیں اور ہے تو فوج میں رہکر کیا کرونگا"

سلطان میری صورت دیکھنے لگے۔ اور بالآخر فرمایا "خیر۔ اگر ایسا ہے تو یوں ہی سہی لیکن تم لونڈے سخت احمق ہوتے ہو اگر ایک طرح کی نہیں تو دوسری طرح کی سہی، اگر کروگے حماقت مزدور کل رنڈی سے بغل گرم کی، اور آج ایک ولی اللہ کے آستانہ کے جاروب کش بن گئے! کوئی نئی چیز ہو، تم لوگ پروانہ وار گرتے ہو، شیخ کو الزام دینا فضول ہے۔ تصوف کو دلّی کی رنڈیاں کامیاب بنا رہی ہیں، نوجوانوں کی عقلیں چھین لیتی ہیں اور پکی عمر والوں کی دولت ہتیا لیتی ہیں۔ اور ان احمقوں کے پاس سوائے اللہ کی ذات، اور اُمید نجات کے کچھ نہیں چھوڑتی ہیں۔ ایک برس کے اندر ان رنگین تیتریوں کے نکاح کراکے رہونگا"

میں نے کہا "سرکار کی تجویز بالکل مناسب ہے۔

سلطان۔ "میری سلطنت میں تین قسم کی عورتیں ہیں (۱) پیشہ ور رنڈیاں (۲) پیشہ ور خانگیاں اور (۳) شادی شدہ عورتیں جو کبھی کبھی گمراہ ہو جاتی ہیں۔ میں ان سب کو اُن کے قصور کے مطابق سزائیں دونگا۔ لیکن اخیر دو قسم کی عورتیں بہت بُری ہیں:"

میں نے زمین کو بوسہ دیا اور رخصت چاہی۔ "ملک ظہیر الدین تم اپنے آبائی پیشہ کو ترک تو کر رہے ہو، لیکن اس کے وقار کو قائم رکھنا جو تمہارے دل میں آگ لگ رہی ہے میں اس کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ شہرت اور نام آوری کا جن تم پر سوار ہے اور تم ایسی عزت پیدا کرنا چاہتے ہو جو سلطنت

کی دھی جھوٹی عزت سے زیادہ پائدار ہو۔ میں تم کو روکتا نہیں ہوں اگر تم اس کو حاصل کر سکتے ہو تو کرو۔ میرا کچھ نقصان نہیں ہے۔ مگر اپنے باپ کے دوست کی ایک نصیحت یاد رکھنا! سیاسی امور میں جھوٹ بول کر بھی انسان کامیاب ہو سکتا ہے، کیونکہ دنیا بے وقوف ہے، لیکن مذہب کی آڑ میں فریب کا جال پھیلانا بہت دشوار ہے۔ اس لئے نہایت دوراندیشی اور پیش فہمی کی ضرورت ہے۔ اگر اس کھیل میں ہارے تو یاد رکھنا روح، جسم، اور سب کچھ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر سلطان نے تبسم فرمایا اور مجھ کو رخصت ہونے کی اجازت دیدی۔

باہر آ کر طرفہ تماشہ دیکھا آیا۔ ایک بند پالکی کو چاروں طرف سے سپاہی تلواریں علم کئے گھیر ہوئے تھے، اور معزالدین پاس کھڑا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی کہنے لگا "مصیبت کے وقت تو بے رخی مناسب نہیں، کچھ تو بتاؤ یہ کیا اسرار ہے" زیب النسا کو میں قطعی فراموش کر چکا تھا اس لئے بلاتکلف پالکی کے پاس چلا گیا۔ معزالدین نے زیب النسا سے کہا "ملک ظہیرالدین ہیں۔ ان سے پورا حال معلوم ہوگا"

زیب النسا نے یہ کہہ کر "ان سے کیا پردہ" پردہ اٹھا دیا اور میں معزالدین پالکی کے اندر بیٹھ گئے اس وقت اس کی صورت بہت ہی بھدی اور شکستہ نظر آئی جس پر قبل از وقت بڑھاپے کے آثار تھے، اس نے بڑھاپے کو دبانے کی کوششیں کر کے اور منہ کو بنا بنا کر باتیں کرنے کا طریقہ اختیار کر کے اپنی صورت کو اور بھی مسخ کر لیا تھا۔ بدن سے عطر اور پسینہ کی مخلوط بو دماغ کو ناگوار معلوم ہوتی تھی۔ اور اس کا لباس تینتیس برس کی عمر کی عورت کے لئے قطعی غیر موزوں تھا "معنوعی عشق" کے ساتھ مجھ سے مخاطب ہوئی اور کہنے لگی "مدارات کی شراب نے تکلیف تو نہیں دی؟" گذری ہوئی باتوں کو ختم کرنے کے خیال سے میں نے کہا "میں تو دوسری شراب پی چکا ہوں، اور اب اسی کا نشہ ہے۔ حضرت شیخ نظام الدین نے مجھ کو مرید کر لیا ہے۔ اور میں ابھی استعفا دیکر آرہا ہوں" اس کا طرز گفتار یکدم بدل گیا اور بڑے تعجب سے پوچھنے لگی۔

"کیا! استعفا دیدیا" میں اس کے تنفر کو محسوس کر رہا تھا مگر اس نے طبیعت کو قابو میں لا کر مجھ سے پوچھا "تمہیں کچھ معلوم ہے کہ ہم لوگوں کو کیوں روکا گیا ہے؟" میں نے کہا "اس لئے کہ تم بھی میری طرح روپوش نہ ہو جاؤ، یہاں تم اس لئے روکی گئی ہو کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے مکان کی اچھی طرح تلاشی لی جاسکے، اور ایک ایک چیز بحق سلطان ضبط کیجائے" یہ باتیں سن کر وہ زرد پڑگئی اور معزالدین سے کہنے لگی "ہائے کمبخت، ہیرے پر پانچ سو ٹکا دستوری کے لے چکا ہے گھر کے سامان کے ساتھ وہ ہیرا بھی چلا جائے گا! اچھا مزا دے! سلطان کی محبت کا لالچ دیکر تو نے ہی یہ دن دکھایا ہے" یہ باتیں کہتی جاتی تھی اور زار و قطار روتی جاتی تھی۔ فرط الم سے یہ حالت تھی کہ ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا! ہچکیاں لے کر بار بار تاسف کے ساتھ کہتی تھی "ہائے یہ عمر کیسے کٹے گی؟"

میں نے جواب دیا "اس کا بھی انتظام ہو گیا ہے، اب تم پاک اور صاف زندگی بسر کروگی اور امیر معزالدین کی منکوحہ بیوی بن کر رہوگی! سلطان نے میرے سامنے حکم دیا ہے کہ آدھی رات سے پہلے قاضی منیث تم دونوں کا نکاح پڑھا دے! معزالدین کی ترقی روک دی گئی ہے، لیکن مرد جس قدر روپیہ اپنی بیوی کے اوپر صرف کرتا ہے اسی کے مطابق دنیا میں اس کا اعتبار ہوتا ہے" زخم خوردہ ناگن کی طرح بل کھا کر زیب النساء معزالدین سے الگ ہو گئی۔ اور کہنے لگی "نامراد، بدمعاش! میری آمدنی کے دس روپیہ سیکڑہ پر تو شریف بنا پھرتا تھا! ذرا نکاح تو ہونے دے! مزا چکھا دونگی! تیرے کوڑھی بدن سے ہاتھ نہ لگاؤں گی، اور تیری اور تیرے گھر والوں کی زندگیاں حرام کردوں گی! دیکھ تو سہی، سور کے بچے!........"

چونکہ "ادب لطیف" کی بہت زیادہ مثالیں سن لی تھیں اور زیادہ سننے کی تاب نہ تھی اس لئے میں اٹھ کھڑا ہوا، اور معزالدین کو اس کی زوجہ ثانی کی صلواتیں سننے کے لئے چھوڑ کر چلا آیا۔ پہرے والے بھی ہنس رہے تھے، اور کہتے تھے "کیا مزے کا بیاہ ہے! اور کیسے مزے کے بنے اور سہاگ ہیں"

(۶)

میں سیدھا مکان پہنچا، اور دستاویزات اور زمینداری کے متعلق کاغذات کو لے کر کرن سنگھ کے پاس چلا گیا۔ دروازہ بند تھا۔ کنڈی کھٹکائی۔ لچھمی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی، اس نے دروازہ کھولا مجھ کو دیکھ کر گھبرا گئی، اور اس کے ہاتھ میں چراغ ہلنے لگا، آہستہ آہستہ کہنے لگی "چلے جاؤ، چلے جاؤ" اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے بولنے کو منع کیا۔ میں نے آہستہ سے جواب دیا "نہیں جاؤں گا" اور ذرا اونچی آواز میں کہا "تمہارے باپ کہاں ہیں؟ تمہارے لئے جہیز لایا ہوں"

"جہیز لائے ہو؟" اس کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ مگر شرما گئی۔ اور خاموشی سے چراغ دکھاتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور میں پیچھے پیچھے اس کے باپ کی کوٹھری کی طرف چلا گیا،

کرم سنگھ نے حسب معمول اخلاق اور تپاک سے میرا استقبال کیا، اور ہم دونوں سفید فرش پر بیٹھ گئے،

"تم نے اچھا کیا شیخ کے مرید ہو گئے، ان کی دعائیں تم کو کامیاب کریں گی"

میں نے کہا "نجات کا طالب ہوں اسی لئے فوجی خدمات سے آج مستعفی ہو گیا ہوں"

کرن سنگھ اور اس کی بیٹی دونوں چونک پڑے مگر میں نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھا "تمہاری بیٹی کو اپنی کل جائداد جہیز میں دیتا ہوں، اور یہ خط حضرت شیخ کا ہے" دستاویزات کو میں نے لڑکی کی گود میں رکھدیا اور کہا "یہ تمہارا جہیز ہے" کرن سنگھ نے خط کو آنکھوں سے لگا۔ مضمون بالکل مختصر تھا "میں لچھمی کو جہیز بھجواتا ہوں۔ قبول کر لینا۔ نظام" میں نے کاغذات کو فرش پر پھیلا کر بیچ میں چراغ رکھدیا۔ اور کرن سنگھ سے کہا کہ وہ حساب کتاب اور معاملات کو اچھی طرح سمجھ لے تاکہ کارندہ دہوکہ نہ دے سکے۔ ہر بات کو سمجھانے میں بہت دیر ہو گئی، آراضی کے مواضع، کاشت کی اقسام، مہاجن کے پاس جو روپیہ جمع تھا اس کی تفصیل، کاشتکاروں پر چڑھے ہوئے روپیہ کا حساب، معاہدوں قرضے اور زمینداری کے پورے حالات غرضکہ

بہت باتیں تھیں جن کو بتانے میں کافی وقت صرف ہوگیا۔ لچھمی اپنی معصومانہ مسرت کو نہ چھپا سکی، اِدھر اُدھر اٹھلاتی پھری، اکا غذات کو دیکھنے میں اکثر اس کا سانس میرے چہرے سے اور اس کی زلفیں میرے بالوں سے مس ہوتی تھیں، لیکن میری طبیعت جس طرح قوس قزح کی رنگینی یا گلاب کی خوشبو سے بے قابو نہ ہوتی تھی اسی طرح ان باتوں کا بھی کچھ اثر نہ ہوا۔ کل حساب کتاب کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وضع محاصل ولگان وغیرہ کے بعد میری آمدنی پندرہ سو سالانہ سے کہیں زیادہ تھی، لچھمی نے بھولے منہ سے، مگر تجاہل عارفانہ کے ساتھ کہا "جائداد کا قرضہ بھی ہم کو ادا کرنا ہوگا؟" کرن سنگھ نے جواب دیا "بے شک! یہ کیونکر ممکن ہے زمینداری تم لو، اور قرضہ یہ ادا کریں؟" اور خفت کو دور کرنے کے لئے معذرت کے انداز میں کہنے لگا "میرے سامنے بدتہذیب ہو جاتی ہے، اس کی ماں کے مرجانے کے بعد کوئی سکھانے والا نہ تھا"

میں اُٹھنے لگا تو اُس نے بیٹی سے کہا "ان کا شکریہ تو ادا کرو" لچھمی نے مجھے نیچی نظر سے شرما کر دیکھا اور کہنے لگی "میں بڑی خوشی سے تمہارا قرض ادا کرونگی" کرن سنگھ کے سر سے بڑا بوجھ ٹل گیا تھا، لمبا سانس لیکر کہنے لگا "شنخ کی برکت سے ہر قسم کی نعمت حاصل ہوتی ہے" لچھمی چراغ لیکر آگے آگے تھی، اور میں پیچھے تھا۔ دروازہ پر اُس نے آہستہ سے کہا "ٹھہرو" میں نے مڑ کر دیکھا۔ چراغ کی روشنی اُس کے آدھے چہرہ پر پڑ رہی تھی، نظریں نیچی تھیں اور اُس پر ایک تصویر کا عالم تھا۔ دل نے کہا "بس آسمان کی حوریں بھی ایسی ہونگی" میں نے پوچھا "مٹرک کی گفتگو سمجھ گئی تھیں؟" کہنے لگی "کچھ تھوڑی سی! البتہ کل شام کو تمہارے نوکر نے ہماری انا سے کہا تھا کہ تم نے اپنی ماں کا ہیرا ایک عورت کو دے دیا اور تم رات کو گھر نہیں آؤ گے۔ مجھے بہت رنج ہوا۔ اور اُسی رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ وہی عورت تم کو گود میں اٹھا رہی ہے۔ میں تم کو بلانے لگی، اور کئی دفعہ آواز دی، تم چلے آئے اور میرے ساتھ اپنے گھر پہنچ گئے۔ مگر آئینہ سی بہت ڈرنے لگے اس لئے میں نے تم کو پلنگ پر لٹا دیا۔ میرا خواب تمہاری سمجھ میں آیا؟" میں نے کہا "کچھ تھوڑا سا! خدا کریم تم کو ہمیشہ پاک اور صاف رکھے اور ایسے ہی خواب دیکھنے

نصیب ہوا کریں"

اُس نے معصوم اور پیارے ہاتھ کے اشاروں سے مجھے رخصت کیا اور کواڑ بند کر لئے، اس کے بعد پھر ہم نے کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھا......

کرن سنگھ کے مکان سے واپس ہو کر خانقاہ میں داخل ہوتے وقت خیال آیا "یہ کام بھی آسان نکلا، میں نے ہنستے کھیلتے دُنیا کی زنجیریں توڑ ڈالیں اور ذرا بھی زحمت نہ ہوئی"۔ ایک نوکر نے کھانا لاکر سامنے رکھدیا اور کہا کہ فارغ ہو کر شیخ سے مل لیجئے گا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ پلنگ پر بستر راحت فرما رہے تھے، سر کے بال بالکل سفید تھے، ایک ہاتھ سر کے نیچے تھا، اور پاس ہی فرش پر امیر خسرو، مشہور و معروف شاعر بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے حضرت نے فرمایا "یہ نیا زائر ہے! کل سلطان نے اس کو ملک بنایا تھا اور آج سب پر لات مار آیا" امیر خسرو نے مسکرا کر فرمایا "زہے نصیب! مجھے تو رشک آتا ہے"

حضرت نے ارشاد فرمایا "اپنے طریق پر تمہارا قلب بھی جوش سے معمور ہے، روایت ہے کہ ایک دن جناب رسول مقبول صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے، ارشاد ہوا مجھے تین چیزیں پسند ہیں:-

(۱) خوشبو (۲) عورت اور (۳) نماز کے وقت آنکھوں کی ٹھنڈک، اُسی وقت حضرت جبرئیل وحی لائے کہ اللہ کو تین چیزیں پیاری ہیں۔

(۱) تائب نوجوان (۲) اس کی آنسو بھری آنکھیں اور (۳) اور اُسکا پگھلتا ہوا دل۔ کچھ لوگ دنیا میں رہکر خدا کی راہ میں ثابت قدم رہتے ہیں۔ اور کچھ لوگ دُنیا کو ترک کر کے اس نعمت کو حاصل کرتے ہیں۔

میں نے ظہیر کو ایک نظر میں پہچان لیا کہ اس کے قلب کو ترک دنیا سے راحت حاصل

ہوگی۔ کہو ظہیر۔ آج کیسی گذری؟ سب کام ختم ہو گئے؟"

میں نے عرض کیا "خدا کا شکر ہے، بہت اچھی طرح گذری۔ شیخ کی برکت سے مجھ نئی زندگی مل گئی، اور نئی امید حاصل ہوئی!"

شیخ نے فرمایا "خسرو! ان کے لئے کیا خطاب تجویز کرتے ہو؟ اب یہ ملک نہیں ہیں" شاعر عارف نے مجھے بغور دیکھا اور فرمایا "یہ عاشق صادق ہیں۔ ان کی صورت گواہ ہے"! حضرت نے اس خطاب کو پسند فرمایا۔ اور ارشاد ہوا "بالکل سچ ہے! عاشق صادق سب کچھ دے ڈالتا ہے اور معاوضہ طلب نہیں کرتا، عشق ہی اس کا معاوضہ ہے اور وہی انعام ہے، اچھا عاشق صادق، اب تم آرام کرو۔ کل سے، انشا اللہ تمہاری تربیت شروع ہوگی"!

مریدوں کو جو کمبل خانقاہ میں ملا کرتے تھے۔ میں ان میں لپٹ کر سو گیا۔ مگر زمین کی سختی کو محسوس کرکے میں نے کہا "یہ انقلاب کیونکر ہوا؟ ایک دن اور ایک رات میں میری دنیا بدل گئی! اور مجھے راحت ابدی کی دولت ہاتھ آگئی! اب نہ میرے پاس کچھ ہے، اور نہ کسی چیز کی حاجت ہے، دنیا میں لوگ کس چیز کی تمنا کرتے ہیں؟ خوشی کی؟ خوشی کیا ہے؟ صرف کی حالت ہے جو کسی کو دولت کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور کسی کو فقر کے ذریعہ سے! میں رات کو ملک تھا۔ ہزاروں ٹنکے سالانہ آمدنی کی جائداد میری تھی، اور آج فقیر ہوں! درحقیقت مجھے پہلے خوشی کی جو آرزو تھی وہ غلط نہ تھی، لیکن طریق حصول غلط تھا"!

یہ تو میرا قصہ تھا! اب آج کے سبق کی طرف متوجہ ہونا چاہئے۔ عقلمند آدمی کبھی اپنے جذبات سے کشتی نہیں لڑتا، وہ برے خیالات کو نیک خیالات سے بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض لوگ مشین کی طرح اوقات معینہ پر دعاؤں کو پڑھنا اپنی حفاظت کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی خوش فہم ہیں جو بجلی کی کڑک سے کمبلوں میں

پلٹ جاتے ہیں کہ عبادا ان پر بجلی گر پڑے! لوگوں کو حیرت ہوتی ہے کہ عبادت کے پابند آدمی خود غرضانہ اور ناپاک زندگیاں کیونکر بسر کرتے ہیں؟ حالانکہ وجہ ظاہر ہے، عبادت ان لوگوں کی عادت ہو جاتی ہے، اور قلب سے تعلق نہیں رکھتی۔ اوراد اور وظائف محض نیند کا ذریعہ بن جاتے ہیں، اور انکا دل ناپاکیوں کی مدافعت کے قابل نہیں رہتا۔ بعض کا خیال ہے کہ گوشت تمام برائیوں کی جڑ ہے، اور وہ جسم کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے ہیں لیکن گوشت بجائے خود نہ تو نیکی ہے اور نہ بدی ہے بلکہ اس کی تمام خواہشات جائز اور حقیقی اطمینان قلب کے ذریعہ سے پوری ہوسکتی ہیں۔ برائیوں کی جڑ فی الاصل "ناپاک خیال" ہے جو ترک دنیا کی وجہ سے زیادہ گہرا ہو جاتا ہے، حضرت نظام الدین کا قول ہے۔

"عبادت اور مسرت کی راہ ایک ہی"

نوٹ

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو وصول ہوئی ہیں جن کے لئے ہم شکر گزار ہیں اور بہت جلد ان پر ریویو شائع کریں گے افسوس ہے کہ مسٹر جعفری مدیر شمع کی علالت کے باعث بعض کتب پر ابتک ریویو نہ ہو سکا تاہم معافی خواہ ہیں۔

(منیجر شمع)

نمبر	کتاب		قیمت
(۱)	مثنوی سحر	زمانہ بک ایجنسی کانپور	۸ر
(۲)	غذائے روح	مترجمہ جناب عاشق لکھنوی - سری معرآشرم چھاونی نیمچ	" عہ ر
(۳)	مذاکرات (سال اول)	معتمد صاحب مجلس مذاکرہ - دار الترجمہ حیدر آباد دکن	" عہ ر
(۴)	آئینہ حقیقت نما	مصنفہ جناب مولانا اکبر شاہ صاحب نجیب آبادی - نجیب آباد	" بہ
(۵)	فرہنگ اصطلاحات علمیہ	مرتبہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد	" روپے ۳ر
(۶)	جلال الدین خوارزم شاہ	از جناب سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	" عہ
(۷)	سرگذشت وزیر خاں لنکران	از مولانا محمد عابد نقوی صاحب فانی ایم اے لکھنؤ یونیورسٹی	" عہ
(۸)	مصباح القوافی	سید محمد نقوی السرسوی صاحب۔ مولوی سید زین العابدین صاحب نقوی ماسب م	
(۹)	پیمان وفا	از ایم اسلم صاحب - نسیم بک ڈپو - اردو بازار لاہور	" ۵ر
(۱۰)	امانت	" " " " "	" ۳ر
(۱۱)	نور ہدایت	" " " " "	" ۴ر
(۱۲)	خط تقدیر	" " " " "	" ۶ر
(۱۳)	ارمغان عرب	" " " " "	" ۴ر
(۱۴)	ساربان	" " " " "	" ۴ر

بہ تقریب

جشن عقد ہمین پور ریاست محمود آباد صاحبزادہ بلند اقبال محمد امیر احمد خاں صاحب بہادر طال اللہ عمرہٗ و اقبالہٗ

سہرا

از

(مصور جذبات حضرت میرزا ثاقب لکھنوی)

کیا ہمایوں ہے ولیعہد کے سر پر سہرا — اوجِ گردوں پہ سعادت کا ہے اختر سہرا

رات دن ہوگئی، ایسا ہے منور سہرا — نیرِ رُخ پہ شعاعوں سے ہے بہتر سہرا

شکر کا قصد ہے تسبیح کی یہ ساعت ہے — لے چکا سبحۂ صد دانۂ گوہر سہرا

سایہ افگن ہے خدا رکھے ہمائے اقبال — کہ ہے پرواز میں کھولے ہوئے شہپر سہرا

کھینچتا ہے سحرِ وصل کی روشن تصویر — سرِ پرنورِ ولیعہد پہ آ کر سہرا

چرخ سے عقدِ ثریا کی صدا آتی ہے — اسی دن کیلئے گوندھا گئے اختر سہرا

ایک موتی میں جو ہے دوسرے موتی کا عکس — نظر آ جاتا ہے سہرے کے برابر سہرا

حسن کا نشو و نما فرق تلک آتے ہی بڑھا
بڑھ چلا صورتِ گیسوئے معنبر سہرا

میں یہ کہتا ہوں کہ اس سہرے کا زیور سر ہے
لوگ کہتے ہیں کہ ہے فرق کا زیور سہرا

ناتواں تاروں میں یہ تاب ہے ماشاء اللہ
کہ اٹھائے ہوئے ہے حسن کا لنگر سہرا

کل تو پھولوں سے گرانبار تھی شاخِ چمن
آج دیکھا کہ گلوں کا ہے ترے سر سہرا

جن کو سب کہتے ہیں موتی وہ نشانِ لب ہیں
بخت نے باندھ کے چوما ہے مکرر سہرا

موجیں اٹھتی ہیں صفا کی ترے عکسِ رخ سے
کروٹیں نور میں لیتا ہے برابر سہرا

قابلِ دید ہے شادی میں یہ خودداریٔ حسن
پاؤں رکھتا نہیں محفل کی زمیں پر سہرا

غم سے کہتا ہوں کہ ہٹ عیش سے کہتا ہوں کہ آ
کہ بناتا ہے دلِ دوست میں اک گھر سہرا

ساز و برگِ فقرا کچھ نہیں اک دل کے سوا
لے چلا ہوں اسی کشتی میں لگا کر سہرا

ایک ہی طرح کے گلچیں بھی ہیں اور ہاتھ بھی ہیں
کیوں نہ ہو غالب و ثاقب کا برابر سہرا

شمع مزار

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ شمع بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء)

تیسرا آنسو

(کمپنی بہادر کے سایۂ عاطفت میں بادشاہی)

نمبر ۲

از

(جناب مولوی امیر احمد صاحب علوی بی اے علیگ جج)

مرزا شاہ رخ مرحوم سے دائمی مفارقت کے بعد بادشاہ کی تسلی و تشفی کا وسیلہ صرف نواب زینت محل تھیں یا اُن کے لاڈلے فرزند مرزا جوان بخت۔ بیگم کو آرزو پیدا ہوئی کہ انکا نورِ نظر ولی عہد سلطنت قرار دیا جائے۔ بادشاہ بھی ہم خیال ہوگئے۔ قریب تھا کہ خلف اکبر کو اس منصب سے معزول کرانے کی علی الاعلان کوشش کی جائے کہ ۱۱ر جنوری ۱۸۴۹ء کو مرزا دارا بخت دنیا سے رخصت ہوگئے اور خانہ جنگی کے لئے میدان صاف ہوگیا۔

بادشاہ نے مرزا جوان بخت کو ولی عہد بنانا چاہا اور کمپنی بہادر کے ملازمین کو اپنی طے شدہ پالسی ظاہر کرنے اور لال قلعہ کو خاندان تیموریہ سے خالی کرانے کا وعدہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ غلام فخر الدین عرف مرزا فخرو بادشاہ کی زندہ اولاد میں سب سے بڑے تھے اور انگلستان کے قانون وراثت کے مطابق منصب ولی عہدی انہیں کا حق تھا۔ مرزا جوان بخت کئی مرشد

زادوں سے چھوٹے تھے اور بادشاہ اُن کی نامزدگی پر مُصر تھے۔ انجام یہ ہوا کہ مرزا فخرو نے ولی عہدی کی طمع میں کمپنی کے پیش کردہ شرائط قبول کر لئے۔ انگریزوں نے ان کو ولی عہد مقرر کر دیا اور زینت محل منہ دیکھتی رہ گئیں۔

اس وقت لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے۔ جن کا عہد حکومت ہندوستان کی تاریخ میں دیسی ریاستوں کے الحاق کی وجہ سے یادگار ہے۔ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے سالگرہ مبارک اور نوروز وغیرہ جشنوں کے موقع پر پیش کی جاتی تھی پہلے[1] ہی موقوف ہو چکی تھی۔ فرمان روائے دہلی کا نام سکہ پر نقش ہوتا تھا وہ بند ہوا۔ گورنر جنرل کی مہر سے "فدوی خاص بادشاہ" کے الفاظ خارج کئے گئے اور ہندوستانی رئیسوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ بھی اپنی اپنی مہروں سے بادشاہ کی نسبت اس قسم کے بے معنی الفاظ خارج کر دیں۔ قلعہ کے آیندہ انتظام کے لئے ایک کمیٹی نامزد ہوئی جس میں ولی عہد جدید بھی شامل تھے اور یہ تجویز پاس ہوئی کہ بہادر شاہ کی وفات کے بعد مرزا فخرو برائے نام بادشاہ ہوں لیکن قلعہ خالی کر دیں اور قطب صاحب میں جا کر رہیں۔ زینت محل کو زک دینے کے لئے ولی عہد نے یہ شرطیں منظور کر لیں اور ۱۸۵۲ء میں ایک معاہدہ دستخط و مہر سے مکمل ہو گیا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے مرزا فخرو کو باضابطہ ولی عہد بنا دیا لیکن زینت محل اپنی ترکیبوں سے غافل نہ تھیں جائز و ناجائز ظاہر و پوشیدہ ہر قسم کی کوششیں اپنے فرزند کو تاجدار بنانے کی کرتی رہتی تھیں۔ کبھی رزیڈنٹ کی خوشامد کرتیں کبھی انگریزوں کو دھمکیاں دیتیں۔ علوی، سفلی ہر قسم کے اعمال۔ ٹونے ٹوٹکے برابر ہوتے رہتے تھے۔

---

[1] نذر ۴۳-۱۸۴۲ء میں لارڈ ایلنبرا نے بند کی تھی۔ ان واقعات کی تفصیل کے لئے "چھٹے آنسو (اخلاق معاشرت اور جزوی واقعات) کی ورق گردانی کیجئے۔ ۱۲

دھتی کہ ۳ نومبر ۱۸۵۳ء کو مسٹر ماس مٹکاف رزیڈنٹ دفعتاً مرگئے اور علامات مرگ نباتاتی زہر سے مسموم ہونے کی دیکھی گئیں تو عوام نے شبہ کیا کہ یہ بھی زینت محل کی کارسازی تھی!!) پارٹی بازی کا بازار گرم تھا۔ مرزا فخرو اور مرزا جواں بخت کی جدا جدا ٹولیاں تھیں شہزادوں کے حرکات بادشاہ کے لئے سوہان روح تھے۔ اور ایک معتبر راوی کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں وہ اکثر فرمایا کرتے تھے "مری اولاد ناحق آرزو سلطنت کی رکھتی ہے یہ کارخانہ آگے کو چلنے والا نہیں ہے۔ مجھ ہی پر خاتمہ ہے از تیمور تا ظفر"۔ راوی[۵۵] کا بیان ہے کہ یہ قول حضرت کا تکیہ کلام ہوگیا تھا۔ اس عرصہ میں ایک نیا گل کھلا یعنی تیموری شہزادے مرزا حیدر شکوہ اور مرزا نور الدین (عرف مرزا مراد) پسران مرزا کام بخش ابن شہزادہ سلیمان شکوہ مرحوم جو دادا کے وقت سے لکھنؤ میں آباد[۵۶] تھے۔ سرکار اودھ سے ایک ہزار روپیہ ماہوار

---

۵۵ ظہیر دہلوی۔ داستان غدر۔ صفحہ ۱۹۔

۵۶ ابتدائی اجزا میں کئی شہزادگان تیموریہ کے لکھنؤ جانے کا ذکر آیا ہے لیکن مفصل روداد بیان نہیں کی گئی کیونکہ شمع گریاں ان کے عبرتناک حالات پر ایک جداگانہ آنسو بہانا چاہتی تھی۔ آدھی رات گذر گئی اور شمع کا تقریباً نصف حصہ جلگیا۔ ایسا نہو کہ شمع کی عمر طبعی گذر جائے اور اس کہانی کی نوبت نہ آئے لہذا یہ داستان بطور فٹ نوٹ کے اس مقام پر درج کی جاتی ہے۔

(۱) "شاہ عالم"

نواب وزیر اودھ کو اپنے دار الحکومتہ میں سب سے پہلے جس خداوند نعمت کی میزبانی کا شرف نصیب وہ شہزادۂ عالی گوہر کی ذات والاصفات تھی۔ سنہ ۱۷۵۸ء میں دہلی کے وزیر غازی الدین نے مرہٹوں سے سازش کرکے دار السلطنت پر قبضہ کرلیا اور بادشاہ عالمگیر ثانی کو زچ کرنے کے لئے قلعہ شاہجہانی کا محاصرہ کیا بادشاہ کو قلعہ کی حفاظت سے مایوسی ہوئی تو اس نے حکمت عملی سے اپنے بیٹے علی گوہر کو بھگا دیا اور حصار کے دروازے کھول دیئے۔ غازی الدین کی وزارت تسلیم کی۔ اور اپنی برائے نام بادشاہی برقرار رکھی۔ شہزادہ گرتا پڑتا اودھ کے فرماں روا شجاع الدولہ کے پاس پہونچا۔ (بقیہ صفحہ آئندہ)

وظیفہ پاتے تھے اور مذہب سلطنت کے حلقہ بگوش تھے ۔ وطن آبائی کی زیارت کے لئے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) نمک حلال خادم نے سر آنکھوں پر جگہ دی سات لاکھ روپیہ نقد اور چند پیش بہا اجناس حضور اقدس میں پیش کر کے ہم چشموں میں سربلندی حاصل کی۔ شہزادے نے تسخیر بنگالہ کے لئے مشرق کی طرف کوچ کی عزیمت کی۔ شجاع الدولہ نے بھی بوقت ضرورت امداد کا وعدہ کیا۔ شہزادہ مشرق کی طرف راہی ہوا عظیم آباد کے قریب مظلوم عالمگیر ثانی کے قتل ہونیکی خبر ملی ۔ اور وہیں شاہ عالمگیر ثانی کے منحوس لقب سے تخت سلطنت پر جلوس فرمایا جیساکہ پہلے آنوٹ میں بیان ہو چکا ہے۔ بکسر کی مشہور لڑائی میں شاہ عالم کو اُنہیں انگریزوں سے شکست ہوئی جو پانی پت کے جنگ میں مرہٹوں کی تباہی کا باعث ہوئے تھے ۔ بادشاہ نے انگریزوں کی پناہ قبول کی اور شجاع الدولہ بہزار خرابی اپنے ملک تک واپس پہونچا۔ ان واقعات کی تفصیل سے ہمکو کچھ واسطہ نہیں البتہ یہ قصہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس زمانہ میں شاہ عالم الہ آباد میں تشریف رکھتے تھے شجاع الدولہ اکثر اُن کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتا تھا بلکہ ایک بار خود بدولت نے بھی فیض آباد کو اپنے قدم میمنت لزوم سے سرفراز فرمایا اور شاہی محل "لال باغ" میں قیام کیا تھا۔ بادشاہ کی عزت ہنوز اسقدر باقی تھی کہ شجاع الدولہ نے بڑے دہوم دہام سے مہمانی کی اور بوقت رخصت گیارہ لاکھ روپیہ کا نقد وجنس بطور پیش کش کے حاضر کیا۔

قیصر التواریخ کا مؤلف لکھتا ہے کہ "ایک دن بادشاہ جب رونق افروز لال باغ تھے بر سبیل تفرج تخت پر سوار گلگشت کو نکلے شجاع الدولہ حسب دستور پیادہ جلو سواری میں تھے ۔ بعد ہوا خوری جب تخت سے اُترنے لگے اتفاقاً بادشاہ کا چرن بردار پیچھے رہگیا تھا۔ شجاع الدولہ نے اپنی کفش نذر کی بادشاہ نے پہن لی اور شجاع الدولہ خود برہنہ پا ساتھ چلے۔ جب چرن بردار حاضر ہوا تو بادشاہ نے شجاع الدولہ کو اشارہ کیا نواب وزیر نے نذر دی ۔ آداب بجالایا اور کفش شاہی بہ تفاخر بجائے کلغی کے اپنے سر پر باندھی!!! اللہ!! اللہ!! دہلی کی عظمت و دبدبہ کا ایک دن وہ بھی تھا!!!

ان نینن کا یہی بسیکہ
وہ بھی دیکھا یہ بھی دیکھہ

(بقیہ صفحہ آئندہ)

۱۸۳۰ء میں دہلی تشریف لائے ہر طرح صاحب لیاقت تھے۔ شعر وسخن سے ذوق۔ خواجہ

(۲) شاہزادہ "جواں بخت"

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) مرزا جہاندار شاہ عرف شاہزادہ جواں بخت اپنے پدر بزرگوار کی طرح نمکحراموں کی بیوفائیوں سے تنگ آکر ۱۷۸۴ء میں لکھنؤ آئے۔ اس زمانہ میں وارن ہسٹنگز گورنر جنرل بھی لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے مہمان تھے۔ جب شاہزادہ شہر کے ناکہ پر پہنچا نواب وزیر اور گورنر جنرل دونوں استقبال کے لئے گئے۔ نذریں پیش کیں۔ صاحب عالم ہاتھی پر سوار ہوئے نواب وزیر نے خواصی میں بیٹھکر مورچھل ہلانے کی آبائی خدمت ادا کی۔ گورنر جنرل گھوڑے پر سوار کرنج کھینچے جلو میں تھے جنرل مارٹن کی مشہور کوٹھی میں قیام ہوا۔ نواب وزیر نے تین لاکھ نقد وجنس پیشکش نذر کیا۔ ہر صبح کو نواب وزیر اور گورنر جنرل دربار شاہی سمجھکر حاضر خدمت ہوتے اور لوازم مہمانداری بجا لاتے تھے۔ لیکن شاہزادہ بہادر شب وروز عیش وعشرت میں مصروف رہتے تھے۔ تیموریہ شہزادوں کے لئے سوائے عیاشی کے اور کام ہی کیا باقی رہگیا تھا!!

افتاد کی بات "بگھیا" نام ایک خوبصورت کسبی پر آنکھ پڑی اور دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ نواب وزیر کو خبر ملی تو بہت ناگوار گزرا۔ کیونکہ اس کسبی کی طرف وزارت مآب کی بھی نظر عنایت تھی۔ بگھیا کے آمد ورفت کی بندش کی گئی۔ سمند عشق پر تازیانہ لگا۔ شاہزادہ صاحب رات کے وقت ڈولی میں چھپ چھپ کر اس طوائف کے گھر جانے لگے۔ آتش رقابت تیز ہوئی اور نواب وزیر نے منظور نظر کی حفاظت کے لئے پہرے متعین کر دیئے۔ ناسمجھ دل پر شہزادہ کا قابو نہ تھا۔ جب کھڑکیاں چھوپی گئیں روزن در بند ہوئے۔ تو صاحب عالم نے گورنر جنرل کو بیچ میں ڈالا اور نواب وزیر سے "بگھیا" کی درخواست کی غرض بگھیا محل شاہی میں داخل ہوئی اور اسی خوش قسمت عروس سے شاہزادہ عالی قدر پیدا ہوئے جنہوں نے ماں کے اثر سے شیعہ مذہب اختیار کیا۔ شاہزادہ کو معشوق تو ہاتھ آیا لیکن نواب وزیر سے صفائی نہ رہی۔ خیراندیشوں نے مناسب سمجھا کہ شہزادہ صاحب لکھنؤ کی سکونت ترک کر کے بنارس میں قیام کریں۔ چنانچہ شاہزادہ نے کاشی جی میں باس کیا۔ جیسا کہ پہلے آلنو (بقیہ صفحہ آئندہ)

آتش سے تلمذ تھا۔ بادشاہ نے اپنا عزیز سمجھ کر خلوت و جلوت کا رفیق بنایا۔ دل کے راز ظاہر

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) ہیں درج ہے۔ انکی اولاد اسوقت تک بنارس میں مقیم ہے۔

(۳) "جہانگیر"

دوسرے آنسو میں شاہزادہ جہانگیر کی شعلہ مزاجی اور خودسری کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس جگہ یہ قصہ درج نہیں کیا گیا کہ شہزادہ صاحب الہ آباد جانے سے قبل لکھنؤ بھی تشریف لائے تھے۔ اس داستان کو اب سنئے۔ لکھنؤ میں سلطنت مغلیہ کے ولی عہد کے آمد کی خبر گرم ہوئی۔ نواب وزیر معہ رزیڈنٹ کے استقبال کو نکلے۔ شہر خوب سجایا گیا۔ کوچہ و بازار تماشائیوں سے بھر گئے۔ نواب وزیر نے ایک سو ایک اشرفی نذر گزرانی۔ سلامی کی توپیں چلیں۔ شہر میں اشیاء زر کرتے ہوئے داخل کوٹھی فرح بخش ہوئے۔ شاہزادہ کا لباس انگریزی تھا۔ سر پر کالی ٹوپی ترکمانی ولایتی تلوار زیب کمر بڑا اونچا امبانی حقہ ہاتھی کے ماتھے پر تھا۔ بعد چائے پانی کے کشتیاں نذر کی پیش ہوئیں چار گھوڑے کی گاڑی پر سوار ہو کر پنڈ باغ میں داخل ہوئے۔

دوسرے دن نواب وزیر معہ رزیڈنٹ اور مرشد زادوں کے حاضر ہوئے۔ چائے پانی کے بعد سب کی نذریں علی قدر مراتب گذریں۔ نواب وزیر کو ہفت پارچہ خلعت عطا ہوا۔ ہر پارچہ پر نذر دیگر آداب بجا لاتے تھے۔ رزیڈنٹ کے لئے صرف دوشالہ اور رومال کا حکم ہوا تھا۔ مگر نواب وزیر کی فرمائش سے پانچ پارچہ کا خلعت عطا ہوا۔ رزیڈنٹ نے ناواقفیت سے چاہا کہ ہر پارچۂ خلعت پر آداب گاہ سے مجرا بجا لائے مگر خواص شاہی نے کہا کہ یہ منصب صرف وزیر اعظم کا ہے رزیڈنٹ بہت منفعل ہوئے اور افسوس کیا کہ اس جلسہ میں ناحق تشریف لائے غرض نواب وزیر نے کوئی دقیقہ مراسم جانداری کا فروگذاشت نہیں ہونے دیا اور تمنائے دلی تھی کہ صاحب عالم کی خدمت اسطرح کی جائے کہ بادشاہ دہلی کی خوشنودی مزاج کا باعث ہو اور کدورت ہائے ماضیہ رفع ہو جائیں لیکن شہزادہ کے عادات و اطوار ایسے بگڑے ہوئے تھے کہ زیادہ عرصہ تک صفائی قایم رہنا محال تھا۔ اشرف علی خاں نام ایک شخص بتیا زخوب (بقیہ صفحہ آئندہ)

کئے اور کمپنی کی طرف سے جو شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں اُن کا تذکرہ کیا۔ باہمی مشورہ سے یہ رائے

بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) بجا تا تھا اُسے اپنا وزیر اعظم کیا اور وہ فرماں روائے اودھ سے ہمسری کا دعویدار ہوا۔

روزانہ صبح کو شہزادہ بلند اقبال گھوڑے پر چڑھتے اور شہر کے گلی کوچوں میں بے تحاشا گھوڑا دوڑاتے تھے۔ ایکدن خاص نخاس میں گھوڑا پھیرنے لگے۔ کئی بچے کچل گئے لیکن آپ کے دل مبارک پر کچھ اثر نہ ہوا۔

ارباب نشاط کے طائفے روز و شب موجود رہتے۔ اور شہزادہ کا بیشتر وقت عیش و عشرت میں گزرتا تھا۔ تقدیر کا کھیل! ایک کسبی "واسطی" نام سے جو ناچ میں بے نظیر تھی۔ آنکھ لڑی۔ دل ملا اور وہ محل سرائے سلطانی میں داخل ہوئی۔ نواب وزیر کو رنج ہوا۔ رزیڈنٹ کے پاس پیام بھیجا کہ اطوار شاہزادہ کے خراب ہیں ایسا نہ ہو کسی حرکت سے سخت خجالت پیدا ہو۔ رزیڈنٹ پہلے سے خار کھائے تھا۔ اس نے قطعی حکم دیا کہ شہزادہ فوراً لکھنؤ سے رخصت ہو جائے۔ چنانچہ اُسی دن یہ دو شب میں سوار ہو کر الہ آباد چلے گئے اور خسرو باغ میں مقیم ہوئے۔ بعد چند روز کے اکبر شاہ کے اصرار سے دوبارہ دلی گئے جیسا کہ دوسرے آلنو میں بیان ہوا ہے۔

(۴) سُلیمان شکوہ"

مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم کا اسم گرامی اس بد اقبالی کی شب تاریں جگنو کی طرح چمکتا ہے جب تک انشاؔ مصحفیؔ سوزؔ و جراتؔ کا نام زندہ ہے اس علم دوست شہزادہ کی ہنر پروری بھی یادگار رہے گی۔

غلام قادر کی نمک حرامی سے بادشاہ بصارت سے معذور ہوئے اور انتظام سلطنت مرہٹوں کے ہاتھ میں چلا گیا تو یہ عالی ہمت شہزادہ نہایت بے سروسامانی کے ساتھ وطن مالوف سے جدا ہوا اور سنہ ۱۲۰۰ھ میں رامپور ہوتا ہوا لکھنؤ پہنچا۔ نواب وزیر اور مرزا جواں بخت سے بے لطفی ہو چکی تھی اور وہ بنارس روانہ کئے جا چکے تھے، اس لئے حفظ ما تقدم (بقیہ صفحہ آئندہ)

قرار پائی کہ مقدمہ ولی عہدی کی پیروی کے لئے مرزا حیدر شکوہ بادشاہ کی طرف سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کی طور پر تین مہینے تک نواب اودھ اپنے ولی نعمت کے استقبال کو نہ گئے
مرزا بھی خود دار تھے۔ پانچ ہزار سوار و پیدل و شاگرد پیشہ کی جمعیت سے لکھنؤ سے تین کوس پہ
ڈیرے ڈالے پڑے رہے۔ مگر شہر کے اندر قدم نہ رکھا۔ آخر کار گورنر جنرل کی تحریک سے نواب وزیر
استقبال کو نکلے اور شہزادے کو ہاتھی پر سوار کرکے خود خواصی میں چنور لیکر بیٹھے اور نہایت تجمل کے ساتھ شہر
میں لائے چھ ہزار روپیہ ماہوار جیب خرچ کے لئے بطور پیش کش کے مقرر ہوا اور نواب وزیر فدویانہ سلوک
کرتے رہے۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ ایک ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر آداب
گاہ جا کر بار بار مجرا بجالاتے تھے۔ نواب غازی الدین حیدر نے لارڈ ماٹرا کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کے اشارے
سے خطاب بادشاہی قبول کیا تو انکی خواہش ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ مساویانہ حیثیت سے ملاقات
کریں۔ رزیڈنٹ لکھنؤ نے شاہزادہ سے کہلا بھیجا کہ اب تک نواب وزیر تھے وہ با آداب وزارت حاضر
ہو کر نذر دیا کرتے تھے اور خلعت پہنتے تھے اب بہ حکم انگریزی گورنمنٹ وہ بادشاہ ہوئے ہیں
لہذا ان سے حضور مساویانہ حیثیت سے ملیں۔ شاہزادے نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے میں ملاقات
کرونگا تو اسی طرح کرونگا۔ پھر رزیڈنٹ نے کہلا بھیجا کہ کل بادشاہ اودھ فدوی سے ملنے کو آئینگے ملاقات
کے وقت اسکا لحاظ رکھا جائے دوسرے روز صبح کو بادشاہ اور رزیڈنٹ مع امرا و ارکان دولت
شاہزادہ کے جلو خانہ میں تشریف لائے نواب ناظر نے چلمن اٹھائی اور حسب دستور آواز دی
"اہل دربار خبردار ہو جاؤ حضور برآمد ہوتے ہیں" شاہ اودھ نے موافق اپنی عادات قدیم کے
فوراً خم ہو کر سلام کیا ادھر چوبدار نے آواز دی "صاحب عالم و عالم پناہ سلامت" شاہزادہ
نے سلام کا جواب بطریقہ اسلام دیا۔ دہنے ہاتھ میں شاہ اودھ کا ہاتھ بائیں میں رزیڈنٹ
کا ہاتھ لیکر دیوان خاص میں ایک دنگل پر اپنے پاس شاہ اودھ کو بٹھا لیا۔ ایک لمحہ کے بعد فرمایا
کہ سرکار کمپنی کو خوشی ہو گئی میری بیوی "ممتاز محل" قریب مرگ ہے میں اسکو سکرات میں چھوڑ آیا
ہوں اسوقت فرصت نہیں ہے پھر ملاقات ہو گی یہ کہکر اٹھ کھڑے ہوئے (بقیہ صفحہ آئندہ)

وکیل مقرر کئے جاویں اور آگرہ و کلکتہ وغیرہ صدر مقامات پر حاضر ہو کر حقوق شاہی کی برقرار

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) کشتیاں آئیں شاہ اودھ نے ایک شالی رومال اُٹھا کر اپنے کاندھے پر ڈال لیا مگر دل میں بہت کبیدہ ہوئے اس دن سے پھر نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات نہ ہوئی بادشاہ کو یہ دھن تھی کہ میں بادشاہ ہوا ہوں تو میرے بیٹے کی شادی تیموریہ، خاندان میں ہونی چاہیے۔ جوڑ توڑ لگا کر شاہزادے کے مصاحبوں کو ہموار کر کے نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان شکوہ کی بیٹی سے کر لی۔ چھ ہزار پہلے سے تھے ایکہزار روپیہ ماہوار شادی کے وقت اور پانچہزار مساویانہ ملاقات کے وقت جملہ بارہ ہزار ماہانہ پیشکش مقرر ہو گیا جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور اُنہوں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو ایک لڑکی پر ڈورے ڈالے جس کو شہزادی بیگم نے پرورش کیا تھا اور اس کا نام "قمر چہرہ" تھا۔ پہلے تو گفت وشنید رہی اسکے بعد کٹنی کو بھیج محل سے اُڑوا لیا۔ شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا رزیڈنٹ تک بات پہنچی اُس نے بادشاہ کو سمجھا بجھا کر "قمر چہرہ" کو واپس کروایا۔ مگر شاہزادے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کرنل کارن رئیس کاسگنج کو بلوا بھیجا۔ اُنکی پوتی شاہزادے کے بیٹے سے منسوب تھی اُسی کے ساتھ کاسگنج چلے گئے۔ پانچہزار روپیہ جو غازی الدین حیدر نے بوقت ملاقات مساویانہ مقرر کئے تھے وہ بند ہو کر سات ہزار میں سے ایک ہزار خزانہ شاہی سے اور چھ ہزار بتوسط رزیڈنٹ شاہزادہ کو ملتے رہے۔ وہاں یہ گل کھلا کہ کرنل صاحب کے بیٹے قمر چہرہ کو لے اُڑے اور اور جا کر عیش کرنے لگے اس سے شاہزادہ وہاں سے بھی دل برداشتہ ہو گئے اور اکبر آباد جا کر بودوباش اختیار کی آخر کار ماہ ذیقعدہ ۱۲۵۴ھ میں مر کر سکندرہ مقبرہ اکبر شاہ تیموری میں مدفون ہوئے۔ (ماخوذ از قیصر التواریخ و گل رعنا)

مرزا سلیمان شکوہ کے کئی بیٹے تھے۔ ان میں سے بڑے بیٹے مظفر بخت ایک مرتبہ اولوالعزمی سے تسخیر ممالک کیلئے راجپوتانہ کی طرف گئے۔ قاضی محمد صادق خاں اختر اور بہت سے شرفائے لکھنؤ ساتھ تھے۔ بہت کچھ ہاتھ پاؤں مارے مگر کوئی صورت کامیابی کی نظر نہ آئی کئی برس کی سرگردانی کے بعد واپس آئے اور خانہ نشین ہو گئے۔ مرزا سلیمان شکوہ کا سو روپیہ ماہوار (بقیہ صفحہ آئندہ)

رہنے جانے کا مطالبہ کریں اور مرزا جوان بخت کی ولیعہدی سے کرا دین لیکن یہ صلاح بارآور

(بقیہ نوٹ صفحہ گذشتہ) اُن کے جیب خرچ کے لئے مقرر کردیئے۔ دوسرے بیٹے شہزادہ کے مرزا کام بخش تھے۔ مدت العمر اپنے والد ماجد کے کاروبار کے مہتمم رہے سیاہ وسفید کے مالک تھے۔ خاک پاک لکھنؤ کے اثر سے مذہب اثنا عشریہ اختیار کرلیا تھا۔ مرنے کے بعد آغا باقر کے مشہور امام باڑے میں دفن ہوئے اور سب سے بڑی نعمت یہ حاصل ہوئی کہ اُنکے دو بیٹے مشرف بہ زیارت کربلائے معلیٰ ہوئے اور طہران پہنچکر شاہ ایران کے عرصہ تک مہمان رہے۔ ان کے بڑے بیٹے مرزا حیدر شکوہ مع دیگر اعزا کے اپنے والد کی وفات کے بعد اکبرآباد سے لکھنؤ آئے۔ رزیڈنٹ کی سفارش سے ہزار روپیہ ماہوار سرکار اودھ سے مقرر ہوئے۔ اس میں سے چھ سو مرزا حیدر شکوہ لیتے تھے اور چار دوسرے متعلقین کو تقسیم کر دیتے تھے۔ عزت و حرمت خوب تھی لیکن ہاتھ کھلا ہوا تھا۔ امدنی کم خرچ زیادہ۔ عسرت سے بسر ہوتی تھی اپنے آبائی وطن کی زیارت کا شوق ہوا اور دہلی کا سفر کیا وہاں جو کچھ گزرا متن کتاب میں ملاحظہ فرمائیے۔ ہنگامۂ غدر میں مرزا حیدر شکوہ نے نہایت عاقبت اندیشی سے کام لیا۔ اور بیلی گارد میں جہاں انگریزی فوج محصور تھی داخل ہو کر سرکار کمپنی بہادر کی حفاظت میں آگئے۔ قیام امن کے بعد ان کے مشاہرہ میں پانچسو کا اضافہ ہوا۔ اور اسطرح ڈیڑھ ہزار ماہوار اس خاندان کی تنخواہ خزانۂ انگریزی سے مقرر ہوئی مرزا حیدر شکوہ دل شکستہ ہو کر عازم عتبات عالیات ہوئے اور ماہ صفر ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں بمقام مشہد مقدس جوار رحمت میں پہنچے۔

ان کے بڑے صاحبزادے جو "مرزا ولی عہد" مشہور تھے بزرگوں کی پونجی بیچنے کے بعد لکھنؤ میں عسرت اور تنگدستی سے زندگی کے دن گزارتے رہے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا!!

مرزا سلیمان شکوہ کے چھوٹے بھائی مرزا سکندر شکوہ اور اُن کے بیٹے عباس شکوہ بھی لکھنؤ تشریف لائے اور یہیں کی خاک پاک کا پیوند ہوئے۔ لیکن اُن کی دردناک احوال کی تفصیل سے شمع گریاں کو کچھ علاقہ نہیں۔

نہیں ہوئی سرکار انگریز کے ایجنٹ متعینۂ دہلی نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ وکالت کے عہدہ پر شہزادوں کے مقرر کرنے کی کوئی تعلیم نہیں ہے اور جدید قاعدہ جاری نہیں کیا جا سکتا۔ مگر شاہزادے بڑے ہنر مند تھے یہ نسخہ مفید نہ ہوا تو دوسری دوا تجویز کی بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ مذہب اثنا عشریہ قبول کریں تاکہ فرمانروائے اودھ سے رابطۂ یکجہتی قائم ہو اور دونوں متحد ہوکر مرزا جواں بخت کی ولیعہدی سرسبز کرادیں بلکہ ایک سفیر شاہ ایران کے پاس بھی بھیجا جائے اور نادر کے تخت گاہ سے تاجدار دہلی کی حفاظت کے لئے امداد طلب کیجائے اس تجویز پر عمل کی نوبت نہ آئی تھی کہ بادشاہ بیمار ہوگئے مرض کو اشتداد ہوا ایک دن جانکنی سی حالت طاری ہوگئی برطانوی[1] حکام نے یہ سمجھ کر کہ کہیں بادشاہ کے انتقال پر تخت حاصل کرنے کی غرض سے شہزادوں میں باہمی جنگ نہ چھڑ جائے قلعہ کے باہر ایک پلٹن متعین کردی۔ حاضرین دربار نے اس واقعہ کا ذکر بادشاہ سے کیا انہوں نے مسٹر کمشنر دہلی کو پیغام بھیجا۔

"جناب عالی! کیا آپ کا خیال ہے کہ میری لاش انگریزوں سے جنگ و جدال کریگی؟ کیا آپ مجھے اطمینان کے ساتھ مرنے بھی نہ دیں گے؟" کمشنر نے خط پڑھتے ہی پلٹن کو واپس بلالیا اور بوڑھا بادشاہ تن تنہا چھوڑ دیا گیا وہ ابھی زندگی باقی تھی۔ مصائب کا پیالہ لبریز نہیں ہوا تھا۔ فرد قرارداد جرم میں کئی دفعات کا اضافہ ہونے کو تھا۔ مرزا حیدر شکوہ نے منت مانی کہ بادشاہ کو صحت ہوجائے تو لکھنؤ میں حضرت عباس کی درگاہ پر علم چڑھاؤنگا اور تیمارداروں کو مشورہ دیا کہ آخری وقت ہے بادشاہ کو خاک شفا دیجائے۔ اللہ کی شان۔ خاک کی چٹکی اکسیر بن گئی مرض کا زور گھٹا اور چند روز میں صحت کلی حاصل ہوگئی۔ جشن صحت دھوم دھام سے منایا گیا۔ استاد ذوق نے بڑے زور شور کا قصیدہ لکھا۔ اور

---

[1] سوانحعمری شمس العلما ذکاء اللہ نوشتہ پادری سی۔ ایف۔ اینڈریوز صاحب۔ ۱۲

خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضہ نقرہ انعام پایا - اس قصیدہ کا قطعہ ذیل بہت مشہور ہے -

ہوا ہے مدرسہ بھی درسگاہ عیش و نشاط ۔ کہ شمس بازغہ کی جا پڑے ہیں بدر منیر
اگر پیالہ ہے صغریٰ تو ہے سبو کبریٰ ۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

ظفر کے دیوان چہارم میں ایک قطعہ بند غزل ہے جو اسی جشن صحت کی یادگار ہے -

محفل شادی ظفر آج بھی ہو کل بھی ہو ۔ گھر ترا شادی کا گھر آج بھی ہو کل بھی ہو
رات کو تجو بجگا دن کو صحنک بھی تھا ۔ دھوم یہ شام و سحر آج بھی ہو کل بھی ہو
باعث صحت ترے روز ہی دن عید کا ۔ کیونکر نہ خوشی ہر شب آج بھی ہو کل بھی ہو
آج شب قدر ہو کل کا ہو دن روز عید ۔ یمن شفا کا اثر آج بھی ہو کل بھی ہو

جشن صحت سے فراغت کے بعد شہزادگان مہمان لکھنؤ واپس گئے اور اپنے ساتھ چند کاغذات لے گئے جن پر بادشاہ کی مہر ثبت تھی -

اُس وقت لکھنؤ آج کا سا اجڑا دیار نہ تھا - رنگیلے پیا جانِ عالم[1] کی راجدہانی تھی - گلی گلی حسن برستا تھا ہر ایک محلہ شہر عشق اور ہر ایک کوچہ حسن آباد تھا - مرزا حیدر شکوہ نے نذر ادا کرنے کے لئے حضرت عباس کی درگاہ پر علم چڑہانے کا ارادہ کیا بادشاہ دہلی سے امداد لیکر سامان جلوس و احتشام فراہم کیا - سارا شہر امنڈ آیا - یہاں مجمع سنا یاں بھی تلاش یار میں آئے - شاہی خاندان کے تمام ارکان شہر کے رؤسا اور اُمرا شریک تھے - کہا جاتا ہے

[1] لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ کیطرف اشارہ ہے - سلطان عالم شاعر بھی تھے اختر تخلص تھا - غدر کے زمانہ میں ان کو کچھ دنوں کے لئے قید فرنگ کا تجربہ ہوا تھا - اس وقت ایک مختصر رسالہ مصائب اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بیان میں لکھا تھا - دیباچہ میں فرماتے ہیں ؎

ہوں شاہزادہ نام واجد علی ۔ مگر ملک تعبیر ہے خواب کی ۱۲

کہ سلطان عالم نے عَلَم مبارک کی مشایعت کی اور حضرت مجتہد العصر نے اپنے مقدس ہاتھوں سے عَلَم چڑھایا۔

اس رسم کو خاص اہمیت حاصل ہونے کی یہ وجہ ہوئی کہ مرزا حیدر شکوہ نے حضرت قبلہ و کعبہ کے حضور میں ایک عریضہ پیش کیا تھا جو پنسل[۱] سے لکھا ہوا تھا اور جس پر بادشاہ دہلی کی مُہر ثبت تھی۔ عریضہ کا مضمون یہ تھا کہ بادشاہ دہلی نے مذہب اثنا عشریہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ خبر لکھنؤ کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی اور دار السلطنت کے باشندوں کو نہایت مسرت ہوئی دہلی میں بھی خبر پہنچی۔ لکھنؤ والوں کو جقدر خوشی ہوئی تھی اُس سے زیادہ دلی والوں کو رنج ہوا۔ تمام شہر میں ہیجان پیدا ہو گیا۔ بادشاہوں کا مذہب شاہ عالم اول کے وقت سے مشتبہ ہو رہا تھا۔ لیکن علی الاعلان اظہار شیعیت کا یہ پہلا موقع تھا۔ بہادر شاہ نبض شناس تھے۔ سارا الزام مرزا حیدر شکوہ کے سر تھوپا اور تبدیل مذہب سے انکار کیا۔ حکیم احسان اللہ خاں مقرب خاص تھے انہوں نے اس خبر کی تردید کے لئے رسالے شائع کرائے۔ شہر کے گلی کوچوں میں اشتہارات چپاں کئے گئے کہ یہ افواہ بے بنیاد ہے۔ مرزا غالب نے حکیم صاحب کی فرمایش سے ایک مثنوی فارسی زبان میں لکھی جس میں مرزا حیدر شکوہ۔ مجتہد العصر بلکہ مذہب شیعیت پر بھی اعتراضات تھے۔ ع

(مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے!!)

بہادر شاہ نے حاشیہ نشینوں سے بیان کیا کہ مرزا حیدر نے متعدد کاغذات اپنے ہاتھ سے لکھ کر مُہر شاہی خود ثبت کر لی ہے۔ البتہ ایک فرمان حضرت مجتہد کے نام بادشاہ نے لکھایا ہے مگر اس میں تبدیل مذہب کا تذکرہ نہیں ہے۔ صرف یہ بیان ہے کہ جو حضرات اہل بیت سے محبت نہ رکھے وہ مسلمان نہیں ہے۔ دوستوں نے باشندگان

---

[۱] دستور تھا کہ شاہی فرامین پر سیسہ کی قلم یعنے پنسل سے بنایا جاتا تھا۔ ۱۲

دہلی کے اطمینان مطلوب کے لئے کمپنی بہادر کے ایجنٹ کی معرفت اس فرمان کی نقل لکھنؤ سے منگوائی گر اتفاق سے (!!) اس میں وہی مضمون پایا گیا جس کی شہرت تھی یعنی بادشاہ نے مذہب اثنا عشریہ قبول کرلیا ہے۔

مرزا ابو ظفر نے واقعی مذہب تبدیل کیا تھا یا اظہار تشیع سلاطین ایران و اودھ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایک پولیٹکل چال تھی! آج جبکہ نہ بہادر شاہ اس عالم میں ہیں اور نہ مرزا حیدر شکوہ اس معمے کا تسکین بخش حل بہت دشوار ہے۔ دل کا راز سوائے علام الغیوب کے کون جان سکتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ بادشاہ کو محبت اہل بیت میں غلو اس سے زیادہ تھا جتنا کہ ان کے ہمعصر ہموطن ظاہر کرتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

میرا حامی ہے پیشوا ہے علی میرے ہر درد کی دوا ہے علی

جو اس امام کا ہے دوست ہے خدا کا دوست
قبول ہوتی ہے اس کی علی الدوام نماز
جو ہو حسین کا دشمن اسے کہاں ایمان
اگرچہ پڑھتا بھی ہو وہ برائے نام نماز

نماز پڑھ کے سدا سجدہ و قیام کے ساتھ وظیفہ چاہئے ذکر غم امام کے ساتھ

ہیں در دولت سے ہوتے بہرہ ور شاہ و گدا پھر بھلا اس در کے ہوتے کس سے کیجے التجا
آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں پر ظفر ہے آپ کا آئیے اب تو مدد کے واسطے بہر خدا
یا حسینؑ ابن علیؑ بندہ بہت ناچار ہے

محرم میں بادشاہ فقیر بنتے۔ سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے۔
چھٹی تاریخ کو تھوڑی دیر کے لئے سدرے ہاتھوں میں لیکر اور چاندی کی زنجیر کمر میں ڈال کر گشت کرتے تھے۔ ساتویں کو مہدی بڑی دھوم دھام سے اُٹھتی تھی اور بادشاہ بہ نفس نفیس اس کی مشایعت کرتے تھے۔ آٹھویں کو حضرت سقاء حرم کی یادگار میں لال کھاروئے کی لنگی باندھ کر بہشتی بنتے اور شربت کی بھری ہوئی مشک کاندھے پر رکھ کر معصوموں کو شربت پلاتے تھے۔ دسویں تاریخ کو موتی مسجد میں عاشورہ کی نماز پڑھ کر ظہر کے وقت حاضری کے دسترخوان پر نیاز دیتے تھے۔ دسترخوان پر شیرمالیں چنی ہوتی تھیں اور شیرمالوں پر کباب پنیر۔ پودینہ۔ ادرک۔ مولیاں۔ کتر کے رکھی جاتی تھیں۔[۵]
یہ رسوم اہل سنت میں نہ اس وقت رائج تھے نہ اب ہیں۔ خصوصاً نماز عاشورہ اور حاضری کا سینوں کے مذہب میں قطعاً وجود نہ تھا۔
واضح رہے کہ یہ قواعد و آداب قلعہ معلیٰ میں اس وقت ملحوظ رکھے جاتے تھے جبکہ حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید دہلی کے اہل سنت سے تمام رسوم قبیحہ اور بدعات چھڑا چکے تھے سوائے طبقہ جہلا اور گروہ متصوفہ کے کوئی سُنی ان افعال کو نظر استحسان سے نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ بادشاہ پر بھی وہابی علما کا کافی اثر تھا۔
عظیم آباد کے مشہور "متبع سنت" واعظ مولوی ولایت علی جو حضرت سید اور مولانا شہید کے اصحاب و رفقا میں سے تھے لیکن نعمت شہادت سے محروم رہگئے تھے اسی زمانہ کے قریب دہلی تشریف لائے نواب زینت محل کے استاد مولوی امام علی اس کے مرید ہوئے۔ بادشاہ نے مولوی صاحب کو قلعہ میں طلب فرمایا۔ دیوان خاص میں اجلاس ہوا۔ تخت شاہی کے نیچے فرش مکلف بچھایا گیا۔ بادشاہ نے لب فرش تک استقبال کیا۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد مسند

۵؎ یہ ایک چشم دید گواہ کا بیان ہے۔ ملاحظہ ہو بزم آخر۔ مرتبہ منشی فیاض الدین مرحوم۔

پر ایک طرف حضرت کو بٹھایا اور دوسری جانب خود بیٹھے۔ عطر و پان کی تواضع ہوئی۔ امرار دربار اپنے اپنے مقامات پر استادہ تھے فرنگی قلعہ دار بھی شریک مجلس تھے۔ اور (صاحب تواریخ عجیبہ معروف بہ سوانح احمدی کی روایت کے مطابق) بادشاہ کے سر پر مورچھل ہلاتے تھے۔ مولوی صاحب نے دنیا کی بے ثباتی پر وعظ شروع کیا۔ وزیر اعظم نے جھک کر عرض کی کہ دوزخ اور عذاب کا بیان بادشاہ کے سامنے نہ کیجیے لیکن مولانا نے نہ مانا اور ایسی پُر اثر تقریر کی کہ بادشاہ۔ بیگمات اور شہزادے زار زار رونے لگے۔ بعد ختم مجلس مولانا کو محلات شاہی کی سیر کرائی گئی اور پچاس خوان الوان نعمت کے بھرے ہوئے نذر کئے گئے۔ یہ بھی گزارش کی گئی کہ مولانا ماہ رمضان قلعہ میں بسر کریں تاکہ بادشاہ اور شہزادوں کو مواعظ میں شرکت کا موقع ملے لیکن مولوی صاحب نے وہاں قیام خلاف مصلحت سمجھا کیونکہ حکام انگریزی مختلف اشخاص سے دریافت کرتے تھے کہ یہ مولوی[1] کون ہے اور یہاں کیوں آیا ہے؟

بادشاہ کا مذہب واقعی گومگو کا معمہ تھا۔ ایکدن مراسم عزاداری میں غلو تھا۔ دوسرے روز سرگروہ "متبعین سنت" کی خاطرداری میں انہماک۔ تیسرے روز عرس اور مجالس حال و قال میں شرکت۔ چوتھے دن راکھی سلونو کے میلہ کی تیاری!!

کسکی ملت میں گنوں آپکو بتلا اے شیخ
تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھکو

حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت حسن عسکری اسی عرصہ میں دلی

---

[1] مولوی صاحب نے محرم ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا۔ انکی بابت ایک لطیفہ مشہور ہے کہ جس زمانہ میں وہ دلی تشریف لائے ہیں دارالسلطنت میں اُلو کے حلت و حرمت کی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ ایک فریق اُلو کو حلال کہتا تھا اور دوسرا حرام۔ بعض حضرات نے آپ سے استفتا کیا تو بولے کہ "بھائیو میں اُلوؤں کے جھگڑے میں نہیں پڑتا"۔ ۱۲-

فزائے دہلی ہوئے اور دربار شاہی میں وہ رسوخ واقتدار حاصل کیا جو بعد کو ان فرشتہ بصورت بزرگ کی شہادت کا سبب بنا۔ یہ عبرت ناک روداد چوتھے آنو میں مفصل بیان ہوگی اس مقام پر صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ ظفر کے دیوان چہارم میں مندرجہ ذیل اشعار کی مخاطب غالباً آپ ہی کی ذات والاصفات ہے:۔

ہو گیا آپ کا اس طرح سے آنا جو ادھر
کشش شوق ظفر ہے تمہیں حضرت لائی

ہے یقین آپ کے آنے سے وہ ٹل جائیگی
گردش چرخ ستمگر ہے جو آفت لائی

خازن مخزن اسرار تمہیں ہو کہ قضا
آپ کے پاس کلید در دولت لائی

اس خزانہ سے مجھے بھی تو عنایت کچھ ہو
میری قسمت تمہیں اے گنج سعادت لائی

بسکہ گنجینۂ عرفاں ہے تمہارا سینہ
نہ تہیدست گیا یاں جسے قسمت لائی

یہی قصہ عاشقانہ انداز میں:۔

مدت کے بعد آج ادھر کیونکر آئے ہو
از خود جو آئے ہو مرے گھر کیونکر آئے ہو

آنکھیں ملا کے ہم سے کرو بات صاف صاف
کیا آپکو ہی مد نظر کیونکر آئے ہو

آنا تمہاری ذات سے تو یاں بعید تھا
اپنے زہے نصیب! مگر کیونکر آئے ہو

کہنے لگے کہ تم بھی عجب شخص ہو کوئی
ہمسے جو پوچھتے ہو ظفر "کیونکر آئے ہو"

لائی ہے کھینچکر کشش دل ہی آپ کی
کہتے ہو بار بار "ادہر کیونکر آئے ہو"

اس پوچھنے پر ہم نہ آئیں گے پھر کبھی
منہ سے نہ کہنا بار دگر کیونکر آئے ہو

قدرت نے اسرار غیب پر پردہ ڈال رکھا ہے ورنہ اس سوال کا جواب نہایت آسان تھا کہ "خاک گور" کھینچکر لائی ہے۔

اسپ تازی برنشست وشاد تاخت
خون بہائے خویش را خلعت تناخت

اے شدہ اندر سفر باصد رضا
خود بہ پائے خویشتن تا سوء القضا

اس دردناک کہانی کو تھوڑی دیر کے لئے بند کرکے خاندان مغلیہ کی آخری

بازیب وتجمل شادی کا تماشہ دیکھیے۔

معلوم ہے کہ مرزا جوان بخت نواب زینت محل کے لاڈلے فرزند اور مرزا شاہرخ کی وفات کے بعد بادشاہ کے سب سے زیادہ عزیز نورنظر تھے۔ انکی شادی کتخدائی میں وہ سامان کیا گیا کہ مرزا جہانگیر و سلیم شہزادوں کی شادیوں کی داستان تقویم پارینہ ہو گئی۔ تکلفات رسوم ساچق و مہندی و برات و آرائش شہر و روشنی بیان کرنا بیکار ہے۔ البتہ ایک چشم دید[1] گواہ کا بیان بزم نشاط اور تقسیم طعام کے اہتمام کی بابت اوسی کی زبان سے نقل کیا جاتا ہے:۔

"قرینہ محفل سب سے جداگانہ تھا۔ دیوان کی بارہ دری میں جدا جدا محفلیں ترتیب دی گئی تھیں۔ ہر در میں ایک طائفہ جدا رقص کرتا تھا۔ شاہزادگان کی محفل جدا تھی۔ ملازمین معززین کی انجمن جدا فرقہ سپاہ کی بزم جدا۔ شاگرد پیشہ کے لئے جدا۔ اسی طرح ہر فریق کی محفل جدا تھی۔ اہل شہر کے لئے حکم عام تھا کہ آئیں اور تماشائے رقص و سرود سے محظوظ ہوں رقاصان پری پیکر ہر طرف سرگرم ناز و انداز تھے دمہ جنبان ناہید نواز زمزمہ پرداز دس بارہ روز تک یہ محفلیں گرم رہیں۔

کل ملازمین شاہی اور رؤسائے شہر کے واسطے توڑہ جات کا حکم تھا۔ جسکا جی چاہے زر نقد پچاس روپیہ توڑے کی قیمت لے خواہ توڑہ لے۔ جتنے قلم کے نوکر تھے نام بنام سب کو توڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔ مثلاً میرے والد کا توڑہ جدا۔ میرے نام جدا۔ میرے چھوٹے بھائی کے نام جدا۔ وہ بھی نوکر تھا۔ میری والدہ کے نام جدا کیونکہ ایک تنخواہ انکے نام بھی تھی میں نے مہتمان توڑہ بندی سے کہلا بھیجا کہ آٹھ روز کے بعد ایک توڑہ بھجوا دیا کرو۔

اس دریا دلی سے تقسیم توڑہ جات کی ہوئی تھی کہ جس روز توڑہ آتا تھا تمام عزیزو

[1] حضرت راقم الدولہ ظہیر دہلوی "داستان غدر" صفحہ ۱۷ و ۱۸۔

اقارب دوست احباب کے گھر کھانا تقسیم ہوا کرتا تھا - ایک تورہ میں طعام اسقدر ہوتا تھا کہ ایک محل شکم سیر ہو کر کھالے - پیرے مکان کا تمام دالان بھر جاتا تھا - ایک ایک طباق میں پانچ پانچ سیر کھانا ہوتا تھا - چار چار پانچ پانچ طرح کے پلاؤ زنگ برنگ کے میٹھے چاول سُرخ - سبز - زرد - اودے - پانچ سیر کی باقرخانی - ایک شیریں - ایک نمکین اور کئی قسم کی نان غرض کہ اقسام خوردنی سے کوئی شئے باقی نہ رکھی گئی تھی - اس کے علاوہ جن شعرا نے قصائد تہنیت اور سہرے وغیرہ لکھے تھے باوجودیکہ ملازم تھے مگر سب کو صلے و خلعت و انعام عطا ہوئے - شاگرد پیشہ کو جوڑے تقسیم کئے گئے -
غالب مرحوم کی رسائی دربار شاہی میں ہو چکی تھی - نواب زینت محل کی ایما سے انہوں نے یہ سہرا کہہ کر زرنگار کاغذ پر لکھکر ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ حضور میں نذر گزرانا -

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
سات دریا کے فراہم کئے ہوں گے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا
رخ پہ دولہ کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا — ہے رگ ابر گوہر بار سراسر سہرا
ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں — دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا - اُستاد ذوق سے فرمایش کرکے ایک سہرا لکھوایا :-

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا — آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا
سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا
آج وہ دن ہے کہ لائے دُر انجم سے فلک — کشتی زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

تابش حسن سے مانند شعاع خورشید — رخ پر نور پہ ہے تیرے منور سہرا
تا بنے اور بنی میں رہے اخلاص بہم — گوندھے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا
درِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا — واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا
جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو — دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچہ کوچہ میں پھیل گیا۔

بہادر شاہ پر فقر درویشی کا رنگ ایام ولی عہدی سے چڑھا ہوا تھا لیکن اب حوادث گوناگوں نے یہ نشہ بہت تیز کر دیا۔ تخت سلطنت پر بیٹھ کر اسرار و نکات تصوف بیان فرماتے اور طالبین کو ہدایت و تلقین کرتے تھے۔ سلسلۂ پیری و مریدی فروغ پر تھا۔ جو خوش نصیب شرف بیعت سے فیضیاب ہوتے اُن کو شجرہ عنایت فرماتے۔ مسئلہ وحدت الوجود کی تعلیم دیتے اور ایک سُرخ رنگ کا رومال بطور تبرک عطا فرماتے تھے۔ بیشتر مریدین کو پانچ روپیہ ماہوار بطور مدد معاش کے خزانہ عامرہ سے ملتا تھا۔ اور اس طمع سے مریدین کی تعداد میں روز افزوں ترقی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچی کہ سرکار کمپنی بہادر کے دیسی سپاہی بادشاہ کے مرید ہونے لگے۔ ایک جمعدار حمید خاں نام بھی اس نعمت سے مشرف ہوا تھا۔ رزیڈنٹ کو اندیشہ ہوا کہ فوج کے سپاہی اگر بادشاہ کے حلقہ بگوش ہوئے

---

[1] مرزا غالب مرحوم نے "مہر نیم روز" کے دیباچہ میں اسی پر چوٹ کی ہے:-

شبلی از منبر دہد آواز عشق — شاہ ما بر تخت گوید راز عشق
شاہ ما دارد بہم در رہبری — خرقۂ پیری و تاج خسروی
شاہی و درویشی ایں جا باہم است — بادشاہ عہد قطب عالم است

۱۲

تو بوقت ضرورت حق نمک فراموش کریں گے۔ لہٰذا اہلکاران فوج کو بہادر شاہ سے بیعت کرنے کی حکماً ممانعت کی گئی لیکن دہلی کے دوسرے باشندے اس خوان کرم سے بے تکلف بہرہ اندوز ہوتے تھے۔

اگرچہ بادشاہ سلامت کو تصوف میں اسقدر غلو تھا کہ گلستاں کی شرح ایک صوفی کے نقطۂ نگاہ سے خود لکھی اور اشغال و اذکار میں ایک کتاب "سراج المعرفت" نام مفتی میرلال سے لکھوائی (جن پر آیندہ ابواب میں ریویو کیا جائیگا) لیکن یہ شبہ نہ کیا جائے کہ ہجوم مصائب یا کثرت ریاضت نے حضور انور کا دل سرد کر دیا تھا۔ اور آتش شوق بالکل بجھ گئی تھی، نہیں ہرگز نہیں۔ عمر شریف ستر برس سے متجاوز تھی اس وقت کا واقعہ ہے کہ "حضور انور نے راکھی سلونو کے میلہ کی تقریب میں راجہ بھولاناتھ کو پچاس روپیہ اور تخت خاص کے کہاروں کو ایک اشرفی مرحمت فرمائی۔ اس عیش و عشرت کے وقت میں حضور انور نے ایک مطربہ[۱] زہرہ پیکر ماہ طلعت کو شرف مناکحت سے اعتبار و امتیاز کا رتبہ مرحمت فرمایا۔ اختر محل خطاب دیا۔ دو سو روپیہ ماہوار مقرر فرمایا۔ ایک خواجہ سرا اور خدمت گار ڈیوڑھی پر مقرر کئے۔ اور اعلیٰ اعلیٰ قسم کے بہت سے زیور عطا فرمائے۔

خود ارشاد فرماتے ہیں:۔

اے ظفر جو شباب کے دن تھے	بس وہی خورد و خواب کے دن تھے
دور عشرت تھا اور عہد نشاط	جام صہبائے ناب کے دن تھے
مہندی مل کر نہاتے تھے ہر روز	نہ مقرر خضاب کے دن تھے
کرتے آرام سرد خانہ میں	تابش آفتاب کے دن تھے
جاگتے رات کو بھی جاڑے کی	ہم نشہ میں شراب کے دن تھے

[۱] احسن الاخبار بمبئی۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۴۷ء۔ ۱۳

جتنی پیتے تھے روز مے۔ اس سے پیتے دونی سحاب کے دن تھے
تھا نہ "کلوا واشربو" پر اپنا عمل کہ شراب و کباب کے دن تھے
تھا نہ کچھ دلمیں خوف روز حساب گنہ بے حساب کے دن تھے
نہ یہ راتیں تھیں آہ و زاری کی اور نہ یہ رنج و تاب کے دن تھے
رہے پیری میں اس لئے جیتے دیکھنے کچھ عذاب کے دن تھے

لذت گناہ ہنوز دل میں باقی ہے!! ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!!!

بادشاہ مرزا غالب کے قول کے مطابق ممکن ہے کہ قبلی وقت اور قطب عالم ہوں لیکن کمپنی بہادر کی نظر میں ان کے "تاج خسروی" کی یہ وقعت باقی رہگئی تھی کہ ۱۸۵۴ء میں دارالسلطنت کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گاؤکشی کے قدیم مابہ النزاع مسئلہ پر کچھ جھگڑا ہوا۔ بادشاہ نے معاملہ کو سلجھانے کے لئے مشورۂ نیک دینا چاہا۔ اور اپنی رائے لفٹنٹ گورنر صوبہ مغربی و شمالی کو لکھکر بھیجی تو صاحب بہادر نے جواب دیا کہ مقامی عہدداروں سے جو قیام امن کے ذمہ دار ہیں رجوع کرنا چاہیئے"۔ القاب و آداب میں بھی فرق آگیا۔ پہلے جو خطوط لفٹنٹ صاحب کی طرف سے بادشاہ کو لکھے جاتے تھے وہ May it please your Majesty سے شروع ہوتے اور your Majesty's faithful servant پر ختم ہوتے تھے۔ مگر ۲۲ اگست ۱۸۵۴ء کو مسٹر کالون لفٹنٹ گورنر آگرہ نے مسئلہ گاؤکشی کے متعلق بادشاہ کے خط کا جواب دیا تو My most esteemed & royal friend سے شروع کیا اور your Majesty's sincere friend پر ختم کیا۔ یعنے شہنشاہ دہلی کا مرتبہ لفٹنٹ گورنر کے برابر بلکہ اس سے بھی کم رہگیا۔

(ظفر) ؎
اب جو لکھتا ہے وہ یہ کاہے کو لکھتا تھا کبھی
دیکھ لو اس بت بے پیر کا پہلا کاغذ

صفر ۱۲۷۱ھ میں حضرت شیخ ابراہیم ذوق نے باغ جناں کی راہ لی۔ بادشاہ کو بہت افسوس ہوا اور بار بار مرحوم کے حقوق یاد کر کے اظہار قلق فرماتے رہے۔ جشن ملتوی فرمایا اور ان کے صاحبزادہ شیخ محمد اسماعیل کو خلعت تعزیت سے سرافرازی بخشی۔ نواب مرزا خاں داغ شاگرد ذوق کی مرزا فخرو ولی عہد کے وسیلہ سے قلعہ میں آمد و رفت تھی۔ لیکن ولی عہد معتوب تھے اور ان کے متوسل کا چراغ نواب زینت محل کے سامنے جلنا ممکن نہ تھا۔ بادشاہ داغ کی طباعی اور شستہ بیانی کے معترف تھے مشہور ہے کہ قلعہ کے ایک مشاعرہ میں داغ نے بے اصلاحی غزل پڑھی جبکا شعر تھا ؎

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی۔
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا میں بھرم نکلے

بادشاہ کے حسب حال تھی۔ دل پر چوٹ لگی۔ نو عمر شاعر کو اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا مگر منصب استادی خالی ہوا تو ولی عہد کے آوردہ کا تقرر محال تھا۔ حافظ غلام رسول ویران[۱] شاگرد ذوق کو یہ منصب عنایت کیا گیا اور خدمت اصلاح مرزا اسد اللہ خاں غالب سے متعلق ہوگئی۔ خواجہ حالی[۲] فرماتے ہیں کہ "مرزا غالب اس کام کو بادل ناخواستہ سرانجام کرتے تھے" اور ایک ناظر سے روایت کرتے ہیں کہ مرزا کو بادشاہ کی آٹھ نو غزلیں بنانے میں اس سے زیادہ دیر نہیں لگتی تھی جتنی کہ "ایک مشاق استاد کو چند غزلیں صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کرنے میں لگتی ہے"

---

[۱] ۱۳۰۸ھ میں انتقال ہوا۔ مزار پر یہ شعر کندہ ہے:-
فاتحہ مرقد ویران پہ بھی پڑھتے جانا　　　　اُن سے کہدو جو ہیں اس رہ سے گذرنیوالے
[۲] یادگار غالب صفحہ ۲۶۔ ۱۲

خضر کا وہ کلام جو غالب کی "بادل ناخواستہ" اصلاح سے مزین ہوا تھا غدر میں تلف ہو گیا یا حکیم احسان اللہ خاں مرحوم نے جن کے پاس ترتیب دیوان کیلئے جمع ہوتا تھا غائب کر دیا اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ کو غالب کی اصلاح سے فائدہ پہونچا یا نہیں اور درحقیقت بادشاہ صرف "ایک ایک دو دو مصرعے کہتے تھے" اور غالب اُن مصرعوں پر غزلیں لکھ دیتے تھے۔ یا یہ روایت بھی شہزادہ پرستی کا ثمر ہے۔ بادشاہ کہنہ مشق شاعر تھے ممکن ہے کہ آخری زمانہ کا کلام استقام سے بالکل خالی ہو۔ اور اس وجہ سے مرزا غالب کو کاوش اور جانکاہی کی ضرورت نہ پڑتی ہو اور ناظر حسین مرزا کی روایت کا آخری حصہ بالکل صحیح ہو یعنی "صرف کہیں کہیں اصلاح دیکر درست کر دیتے ہوں"۔

غرض ذوق کے بعد مرزا غالب کی قلعہ میں خوب قدر افزائی ہوئی۔ اس عہد کے چند لطیفے چھٹے آنسو میں درج ہیں، لیکن مرزا اپنی فطرتی شوخی سے باز نہ آتے تھے۔ ایک روز سلطان نظام الدین قدس سرہٗ اور حضرت امیر خسرو کی خصوصیت کا ذکر دربار میں ہو رہا تھا مرزا نے اُسی وقت یہ شعر انشا کر کے پڑھا ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرت حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو سراج الدین کو غالب

بادشاہ کے چھوٹے صاحبزادے مرزا خضر سلطان غالب کے شاگرد ہوئے اور انہیں کیطرف الہامی شاعر نے اپنی مشہور غزل کے ایک شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

چند سال کے بعد ۲۶ برس کی عمر میں درگاہ نظام الدین اور شہر دہلی کے درمیان یہ نونہال خون سے سینچا گیا۔ لہو کے فواروں سے جسم لال ہوا اور سر شہر کے خونی دروازہ پر آویزاں کیا گیا!!

فاعتبروا یا اولی الابصار

۱۰ جولائی ۱۸۵۶ء کو مرزا فخرو ولی عہد بعارضۂ ہیضہ دُنیا سے رخصت ہوئے اور شبہ کیا گیا کہ ان کو زہر دیا گیا ہے۔ ولی عہدی کا قصّہ پھر ابھرا۔ نواب زینت محل نے جان توڑ کر کوشش کی بادشاہ نے جواں بخت کی ولی عہدی کا باضابطہ مطالبہ کیا اور ایک محضر پیش کیا جس پر اُنکے آٹھ بیٹوں کے دستخط تھے۔ اور لکھا تھا کہ ہم سب خوش ہیں کہ زینت محل کا بیٹا ولی عہد مقرر ہو۔ لیکن دوسرے ہی دن بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قویش نے رزیڈنٹ کو اطلاع دی کہ محضر پر دستخط اضافہ تنخواہ کا لالچ دیکر حاصل کئے گئے ہیں اور اس منصب کا مستحق سوائے مرزا قویش کے کوئی نہیں ہے۔ کمپنی کے مزید کامیابی حاصل کرنے کا موقع ملا۔ مرزا قویش سے یہ شرط منظور کرا لی کہ بہادر شاہ کے بعد لقب شاہی موقوف کیا جائے صرف خطاب "شہزادہ" باقی رہے اور زرپیش کش جو اس وقت تک سوا لاکھ کے قریب تھا صرف پندرہ ہزار ماہوار رہجائے۔ انکھوں پر پردے پڑے ہوئے تھے۔ شہزادہ نے یہ شرط تسلیم کر لی، اور سرکار کمپنی بہادر نے مرزا قویش کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔

جب یہ افسوسناک خبر ضعیف العمر باپ کے کان تک پہونچی تو اُسکی رنج و غم کی کوئی حد نہ تھی ایک نہایت دردناک نظم اس سانحہ جانگداز سے متاثر ہو کر لکھی جو چند گھنٹوں کے اندر شہر کے کوچہ و بازار میں پھیل گئی۔ لڑکے اُن اشعار کو مرثیہ کی طرح گاتے پھرتے تھے اور بوڑھے اُسے سُن سُنکر رو دیتے تھے۔ مکمل نظم اب دستیاب نہیں لیکن اُس کا ایک شعر دِلی والوں کی زبان پر ہے۔

اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظام سلطنت
بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نام سلطنت

(باقی آئندہ)

غزل

(حضرت لسان الملک محشر صاحب لکھنوی)

نکتے نکتے میں بھرا خونِ رگِ دل میں نے
لکھا اس طرح جوابِ خطِ قاتل میں نے

رازِ سرگشتگیٔ شوق نہ پوچھے کوئی
کسطرح ڈھونڈ لیا جادۂ منزل میں نے

ہجر میں لذتِ غم سے نہ کبھی منھ موڑا
کر دیا سہل سی بھی بات کو مشکل میں نے

لے چل اے جستجوئے ملکِ عدم
یہ تو کہنے کو نہ ہو ہار دیا دل میں نے

شکوۂ ناز نہیں قصۂ غم تو سن لو
ڈرتے ڈرتے یہ کہا اُنسے بہ مشکل میں نے

کر گیا حشر بپا رات کو افسانۂ ہجر
تیغ خونیں اُلٹ دی صفِ محفل میں نے

روح سی بھی ہے سوا آبلۂ عشق کی قدر
دل پہ یہ نقش اُبھارا ہے بہ مشکل میں نے

عشرتِ وصل و غمِ ہجر پہ صدقے محشر
دیکھا دونوں کا نہ دنیا میں مقابل میں نے

محکمہ معیار

از

(جناب سیّد حسن زاہد جعفری صاحب، منیجر رسالہ شمع)

واشنگٹن (امریکہ) میں محکمہ معیار ہے، وہاں ایک آلہ ہے جو سیکڑوں میل دور جلتی ہوئی موم بتی کی حرارت کو ناپ لیتا ہے، ایک اور آلہ ہے جو بتا دیتا ہے کہ چھ انچہ موٹے فولاد کو موڑنے کے لئے کس قدر قوت کی ضرورت ہے، وہاں پر حسب فرمایش آندھیاں بنائی جاتی ہیں۔ سکینڈ کے دس لاکھویں حصّہ کی پیمایش ہوتی ہے، اور معمولی نقطہ کو وزنی چیزوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ محکمہ کچھ عرصہ سے قایم ہے، اور اپنی گوناگوں خصوصیات کے اعتبار سے دُنیا میں عجیبُ غریب مقام ہے، اور صحیح معنی میں جدید ترین تحقیقات کا عجائب خانہ کہے جانے کا مستحق ہے، اسی جگہ امریکہ کی ترازو اور باٹ کی جانچ ہوتی ہے یہاں ایسی نازک ترازوئیں موجود ہیں کہ جب تک اُن کو انسان اپنی آنکھوں سے خود دیکھکر اطمینان نہ کرلے۔ سنی ہوئی باتوں کا مشکل سے یقین کرسکے گا۔ فرض کیجئے آپ تین چار انچہ لانبے اور نصف انچہ چوڑے کاغذ کو وزن کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت آسان ہے آپ اس کاغذ پر اپنا نام لکھئے ترازو بتا دے گی کہ سیاہی سے لکھے ہوئے نام کا کیا وزن ہے اب آپ پنسل سے اپنا نام لکھئے ترازو بتا دے گی کہ سیاہی سے اور پنسل سے لکھے ہوئے ناموں کے اوزان میں کیا فرق ہے شاید آپ اپنے نام کے ایک حرف پر نقطہ لگانا بھول گئے تھے۔ اب لگا دیجئے اور دستخط کو پھر

وزن کیجئے، آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اس ایک نقطہ کا کیا وزن ہے!

عجائب خانہ کے دوسرے کمرے میں تشریف لائیے یہاں اُس شخص سے ملاقات ہو گی جس نے ایک انچہ جگہ میں بچیس ہزار سیدھی اور متوازی لکیریں کینچنے کی ترکیب نکالی ہے کمال یہ ہے کہ ہر لکیر کا فاصلہ برابر ہے! تعجب ہوتا ہے کہ آخر اس دماغ سوزی سے فائدہ؟ معلوم ہوا کہ یہ لکیریں ستارہ سے لیکر ذرّہ تک کی شعاع کا تجزیہ کرسکتی ہیں اور بتاسکتی ہیں کہ اُن کی ساخت کیا ہے شعاعوں کی لہروں کی پیمائش کرسکتی ہیں اور یہاں تک پتہ دے سکتی ہیں کہ ذرّہ میں کیا کیا چیزیں شامل ہیں!

اسی ماہر نے حال میں نہایت باریک حرف کی پیمائش کا طریقہ ایجاد کیا ہے حروف شیشہ کے اوپر تھے اور اسقدر باریک تھے کہ انجیل کی پوری آیت لکھی ہوئی تھی مگر آنکھو نظر نہ آتی تھی۔

ہم ابھی ان صنعتوں کے مطالعہ میں مصروف تھے کہ یکایک بادل کی گرج اور نہایت سخت شور و شغب نے ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیا، معلوم ہوا کہ سرنگون میں سے ہوا چھوڑی جارہی ہے اور ہوائی جہازوں کی جانچ ہو رہی ہے، یہیں آندھیاں بنائی جاتی ہیں جن کی رفتار بیس میل فی گھنٹہ سے لیکر ایک سو اسی میل فی گھنٹہ تک ہوتی ہے، یہاں پر ہوائی جہاز، طیارے، غبارے، گولے، موٹریں، غرض کہ ہر چیز کا جس میں رفتار ہوتی ہو معائنہ کیا جاتا ہے اور کامل امتحان کے بعد اُن کے متعلق صحیح رائے دیجاتی ہے۔ ہوا کے مقابلہ میں اُن کی مزاحمت کی پیمائش اُس قوت کو وزن کرنے سے معلوم ہوتی ہے جو انکو معلوم رفتار کی ہوا میں ساکت رکھتی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ایک مشہور کارخانہ کا بنا ہوا نہایت طاقتور موٹر انہی سرنگون کے سامنے ساٹھہ میل فی گھنٹہ رفتار کی ہوا میں رکھا گیا، اور ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا، یعنی موٹر کے اوپری حصہ کی ساخت ناقص تھی اور ساٹھہ میل فی گھنٹہ کی رفتار میں ہوا کی مزاحمت

میں تیس گھوڑوں کی طاقت صرف ہوتی تھی۔ اس انکشاف نے موٹروں کی ساخت میں انقلاب پیدا کر دیا ہے اور اب جو موٹریں بنائی جاتی ہیں ان میں قوت مزاحمت کو حتی الوسع کم کرنے کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

اس عجائب خانہ میں بیس عمارتیں ہیں اور تینتالیس ایکڑ زمین ہے۔ سو سے زائد معمل ہیں، اور ہر معمل میں دس سے زیادہ عجیب و غریب چیزیں ہیں بلکہ ہمارا اندازہ ہے کہ کئی ہزار حیرت انگیز چیزیں وہاں موجود ہیں۔ چنانچہ ہمارے سامنے ایک نہایت بڑی ڈھنگی لمبی عمارت ہے جو ٹین سے پٹی ہوئی ہے، اس کے اندر ریختہ تالاب ہے جو چار سَو فیٹ لانبا اور چھ فیٹ چوڑا ہے تالاب کے اوپر لوہے کی پٹریوں پر جو کہ تالاب کے دونوں جانب ہیں پہیہ دار چوبی چبوترہ ہے جسکی وضع گاڑی کی سی ہے۔ اور بجلی کی طاقت سے حرکت کرتا ہے اس گاڑی کے پرزے اس قدر صحیح ہیں اور اُن پر ایسی قدرت رکھی گئی ہے کہ گاڑی کو جس رفتار پر چاہیں چلا سکتے ہیں، یعنی دو انچ فی سیکنڈ سے لیکر بیس فیٹ فی سیکنڈ تک اسکی رفتار ہے گاڑی کے پیچھے اور پانی میں لٹکتا ہوا ایک آہنی آلہ ہے جس کے اجزا گھومتے رہتے ہیں آلہ لٹو کی شکل کا ہے معلوم ہوا کہ اس آلہ سے پانی کی رفتار ناپی جاتی ہے۔ اور اسی کے ذریعہ سے انجینیر معمولی چشمہ سے لیکر زبردست دریا تک کے پر زور بہاؤ کی پیمائش کرتے ہیں۔ طغیانی کے وقت یہ آلہ نہایت مفید ثابت ہوتا ہے اسکی خوبی اسکی صحت پر منحصر ہے تالاب کے اور بجلی کی گاڑی بنانے کی غرض یہ ہے کہ آلہ کی قوت پیمائش کی صحیح جانچ ہو سکے، چونکہ بہتے ہوئے پانی میں مستقیم آلہ سے اور ٹھہرے ہوئے پانی میں متحرک آلہ سے ایک سے نتائج پیدا ہوتے ہیں اس لئے گاڑی کے پیچھے لٹکے ہوئے آلہ کی وہی رفتار ہوتی ہے جو گاڑی کی ہوتی ہے، اس طریقہ پر آلہ کی صحت یا خرابی کی جانچ ہو جاتی ہے۔ اور اصلاح کر دی جاتی ہے۔

انجینیر پانی کی مقدار کا اندازہ اور سیلاب میں خطرہ سے محفوظ رہنے کی تدبیر ابھی

آلہ کی مدد سے کرتے ہیں۔

چند دنوں کی بات ہے کہ حکومت نے محکمہ سے دریافت کیا کہ موتی جھرہ کے بخار اور آنتوں کے کیڑوں کے مارنے کی شعاعوں کے متعلق اپنی تحقیقات کے نتیجہ سے مطلع کرے محکمہ نے بالائے بنفشی شعاعوں کی صحیح مقدار کا تعین کرکے حکومت کو اطلاع دیدی۔ اس تحقیقات سے جو نتائج آئندہ پیدا ہوں گے وہ جراثیم کی دنیا میں تہلکہ مچادیں گے۔

اس حیرت خانہ میں سب سے زیادہ متحیر کرنے والی بات یہ ہے کہ یہاں ماہرین فن گز یا فٹ کا ذکر نہیں کرتے، بلکہ انچوں کے لاکھویں اور کروڑویں حصہ سے واسطہ رکھتے ہیں ہر شئے میں انتہائی صفائی اور صحت کا ہونا اُن کے ایمان کا جزو ہے، اور دنیا اور دنیا سے باہر کوئی ایسی معلوم شئے نہیں ہے جس میں ان کو دلچسپی نہ ہو اُن کو ہر چیز سے تعلق ہے۔ اور ہر بات کی چھان بین میں ان کا وقت صرف ہوتا ہے لطف یہ ہے ان کے یہاں اگرچہ قلیل ترین اجزا کی طرف توجہ کیجاتی ہے لیکن اُن کے نتائج مہتم بالشان ہوتے ہیں۔ یہاں پر ہزاروں ایجادات ہوئی ہیں جن سے آج ہم بیشمار فوائد حاصل کر رہے ہیں۔

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان لوگوں کے نظر میں انچہ کے دس لاکھواں حصہ بہ نسبت گز کے زیادہ قابل وقعت ہے، کیونکہ معیار کے لئے انتہائی صحت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ صحت بغیر ٹھیک پیمائش کے حاصل نہیں ہوسکتی ہے۔

چنانچہ پہلے "ضرورت" کی پیمائش کیجاتی ہے اور پھر حسب ضرورت چیز بنائی جاتی ہے ٹیلیفون۔ موٹر، ریڈیو وغیرہ وغیرہ میں ایسی نازک اور پیچیدہ پیمائشیں ہوتی ہیں کہ دیکھنے اور سننے والا حیران رہجاتا ہے، فی زمانہ انتہائی مختصر اور قلیل اجزا کی پیمائش پر سائنس کا دارومدار ہے۔ جس قدر باریک پیمائش ہوگی اسی قدر سائنس میں کامیابی ہوگی۔ دنیا میں سات عجائبات مشہور ہیں لیکن آٹھویں عجیب شئے یہ پیمائش ہے جو لاکھویں اور کروڑویں حصہ سے شروع ہوتی ہے! کیلیفورنیا میں ایک زبردست دریا پر بند بنایا گیا ہے جس پر کئی کروڑ روپیہ

کی لاگت آئی ہے۔ یہ بند محض آزمائشی ہے، اور اس کی عمر صرف ایک تجربہ تک ہے۔
بندوں کی تعمیر کے متعلق دنیا کے بڑے بڑے انجنیروں کی آرا میں اختلاف ہے، ایک گروہ کا عقیدہ ہے کہ ڈاٹ دار پل جو بہت ارزاں تعمیر ہوتا ہے، مضبوط ہوتا ہے، دوسری جماعت کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کا پل سخت خطرناک ہوتا ہے!

موجودہ بند صرف اس فیصلہ کے لئے تعمیر ہوا ہے کہ دونوں فرقوں میں سے کس کی رائے صحیح ہے!

امتحان کے وقت ممکن ہے کہ یہ بند یک لخت شکست ہو جائے۔ اس میں صرف شگاف پڑ کر رہ جائے، یا اس کو مطلق کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے، بہر کیف یہ مسئلہ ہے نہایت دلچسپ اور اس امتحان کے بعد قطعی طور پر فیصلہ ہو سکے گا کہ اس قسم کے بند میں کسقدر قوت مزاحمت ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی نتیجہ نکلے گا اس سے انجنیری کے فن میں ایک مستقل اور نہایت قابل اعتبار واقفیت کا اضافہ ہوگا۔ اس امتحان کے لئے یہاں پر کئی جدید آلات بنائے گئے ہیں ان میں ایک آلہ انٹرفیرومیٹر ہے، جو بند کی دیوار سے لگا دیا جائیگا۔ اس کے بالائی شیشہ میں دیکھنے سے پانی کے معمولی دباؤ کے اثر بھی معلوم ہو جاتا ہے، کہ یعنی پانی کے دباؤ سے بند کے ایک انچ کا دس لاکھواں حصہ بھی اگر دبتا ہے تو اس آلہ کے ذریعہ سے انسان دبے ہوئے مقام کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ آلہ میں ایک تختی لگی ہوئی ہے جس پر نوٹ ہو جاتا ہے کہ بند کس وقت ایک انچ کا ایک کروڑواں حصہ دبا تھا! غرض فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ عمارت کس وقت کس جگہ سے کسقدر دبی تھی!

یہ آلہ بجائے خود بہت سادہ ہے اور آئینوں اور پلیٹوں سے بنا ہے اس کے تمام اجزا نہایت صفائی سے ایک دوسرے کیساتھ پیوست ہیں ایک ہی مبدا نور سے دو سلسلوں کو پیدا کر کے ان میں طلا ملا دینے سے سایہ کی لکیریں بن جاتی ہیں آلہ کے اوپری حصہ کو آنکھوں پر

لگانے سے یہ لکیریں صاف نظر آتی ہیں۔

فرض کیجئے آپ نے آلہ انٹر فیرو میٹر کے فولاد کے چھ انچہ موٹے دُھرے پر لگا دیا ہے اب اس کے اوپری حصہ کو آنکھوں پر لگا کر دیکھئے۔ اور دُھرے پر اپنی انگلیوں کا پانچ سیر وزن ڈالیئے۔ آپکو سایہ کی ہم مرکز لکیریں نظر آئیں گی جن میں ۱/۸ انچہ کا فصل ہو گا ان لکیروں کا ہر درجہ انچہ کے دس لاکھویں حصہ دباؤ کو ظاہر کرتا ہے نا واقف کی سمجھ میں ذرا مشکل سے آئیگا مگر یہ مرتعش خطوط صاف بتا دیتے ہیں کہ ایک ہاتھ کے وزن سے پختہ دیوار یا فولادی دُھرا ایک انچہ کا دس لاکھواں حصہ دب جاتا ہے، اسی طرح اگر آپ ساڑھے تین انچہ موٹے لوہے پر اپنا ملاقاتی کارڈ رکھدیں تو اُسکے وزن سے لوہے پر جو دباؤ پیدا ہو گا آپ اُسکو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

باورچی خانہ میں آپکو چینی کے برتنوں پر لکیریں نظر آتی ہیں اور اکثر برتن چٹخ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برتنوں اور چینی کی وارنش میں جذب حدت کی قوت مختلف ہوتی ہے یعنی گرمی سے برتن زیادہ پھیلتا ہے اور اوپر کی چینی جو اس قدر زیادہ نہیں پھیل سکتی چٹخ جاتی ہے لیکن اب انٹر فیرو میٹر کے ذریعہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ حدت سے اثر پذیر ہو کر مختلف چیزیں کس قدر پھیلتی ہیں اور خنکی میں کس قدر سکڑتی ہیں، لہذا اب اوپر کی وارنش اور برتنوں کو ہم قوت بنایا جا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ اس جدید دریافت نے چینی سازی کے کارخانوں میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اور آیندہ چینی کے برتن گرمی یا سردی سے نہ چٹخ سکیں گے۔ اسی طریقہ پر اب دُنیا کی ہر چیز کے سکڑنے اور بڑھنے کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اندازہ محض پیمایش کی صحت پر منحصر ہے موٹر کار کے بنانے میں تقریباً تیس ہزار پیمایشوں کی ضرورت ہوتی ہے، پُرزے جسقدر صحیح طور پر لگائے جائیں گے اسی قدر موٹر اچھا ہو گا اور اس کی رفتار سبک ہو گی۔ توپ کا گولہ بھی صحیح پیمایش کا محتاج ہے، وہ توپ کے مُنہ میں جسقدر ٹھیک بیٹھے گا اسیقدر

دُور جا سکے گا، اور اُسی قدر نشانہ صحیح لگے گا براؤننگ کے معمولی پستول میں بائیس سو باسٹھ ۲۲۶۲ پیمائشوں کی ضرورت ہوتی ہے، اور اُس کی لب لبی کو انچہ کا ایک لاکھواں حصہ تک ٹھیک بنانا پڑتا ہے۔

عجائب خانہ میں سب سے زیادہ ذکی الحس ایک آلہ ہے اگر اس قدر گرمی اُس کے قریب پہنچ جائے کہ اس سے آپ کی انگلی بقدر ایک ڈگری دس لاکھ برس میں گرم ہو سکے تو وہ اُس کو بھی محسوس کرے گا، وہ اس قدر نازک ہے کہ سیکڑوں میل پر جلتی ہوئی موم بتی کی حدت کا اندراج کر لیتا ہے، اسی آلہ کے ذریعہ سے ابتک سیکڑوں ستاروں اور سیاروں کی (جن میں مریخ اور چاند شامل ہیں) حدت کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اسی کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہوا کہ مریخ میں دن کے وقت اس قدر گرمی ہوتی ہے کہ ذی روح زندہ رہ سکتے ہیں۔ یہ آلہ بھی جو لاکھوں میل کے فاصلہ کی چیزوں کی حدّت کو ناپ لیتا ہے ساخت کے اعتبار سے بہت معمولی ہے، چاندی اور گندھک سے اس کی ترکیب ہوئی ہے، اور اسی کے ذریعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ درخت کے پتوں پر کس قدر دھوپ پڑتی ہے اور وہ کسقدر دھوپ کو جذب کر لیتے ہیں،

حکومت نے استفسار کیا تھا کہ موسم گرما میں خیموں کے اندر سپاہیوں کو سخت تکلیف پہونچتی ہے، کیا ایسی کوئی تدبیر ہے کہ خیموں کے اندر گرمی نہ آنے پائے؟ اس استفسار کا جواب بھی یہیں دیا گیا، اور سیکڑوں تجربات کے بعد اصول قایم ہوا کہ اگر خیموں کے اوپر سفید اور اُن کے اندر استر پر الیومنیم کا رنگ دیا جائے تو فی صدی اسّی حصہ گرمی خیموں میں داخل نہ ہو سکے گی۔ اسی اصول کی بنا پر ہم کو اپنے گھروں کے آتش دان الیومنیم کے رنگ سے نہیں رنگنے چاہئیں بلکہ اُن کو کوئی رنگ ملا کر رنگنا چاہیئے تاکہ حدت زیادہ خارج ہو۔ الیومنیم کا رنگ حدت کو روکتا ہے۔ ایک غار پینتیس ۳۵ فیٹ گہرا ہے۔ اس میں اگر بیرونی حدت نہ پہنچائی جائے

تو درجۂ حرارت ایک برس میں ایک ڈگری بھی نہیں بڑھتا ہے، اس غار کے اندر ایک آلہ ہے جو ایسا نازک ہے کہ اگر جسم انسانی اس سے دس قدم کے فاصلہ پر آجائے تو وہ خراب ہوجائیگا۔ خود موجد پندرہ فیٹ کے فاصلہ پر بیٹھ کر دوربین کے ذریعہ سے تجربات کیا کرتا ہے، اگر موٹر کار پندرہ فیٹ قریب آجائے تو آلہ بالکل شکست ہوجائے گا! اسی لئے زمین دوز تہہ خانہ میں اس کے ذریعہ سے تجربات کئے جاتے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہے کیا بلا ہر اور اس دردسری کا مقصد کیا ہے؟ آپ سُن کر حیران رہجائیں گے کہ موجد اس کے ذریعہ سے زمین کو وزن کررہا ہے، ایک سال سے تجربہ جاری ہے۔ اور اگر زمین کا صحیح وزن معلوم ہوگیا تو دیگر سیاروں کے اوزان بھی معلوم ہوسکیں گے؟ عام طور پر ماہرین سائنس کا عقیدہ ہے کہ زمین کے بیچوں بیچ لوہا ہے، اب تک تو یہ عقیدہ محض خیالی ہے، لیکن اس جدید آلہ کے ذریعہ سے صحیح طور پر تحقیق ہوسکے گا، اسی آلہ کے کے ذریعہ سے کشش کی پیمائش ہوسکے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جب عجیب وغریب تجربات سے دُنیا کی حقیقتیں واضح ہوجائیں گی تو انسان کی ترقی کی رفتار اور اس کی معلومات کی وسعت بھی حیرت انگیز ہوجائے گی۔

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کا پایہ اردو ادبیات میں

(جناب محمد عزیز اللہ صاحب بی اے مدراس)

افسوس ہے کہ مضمون ایک عرصہ تک ہمارے پاس رہا اور کثرت مضامین کے باعث اشاعت کی نوبت نہ آئی۔

مدیران شمع

انیسویں صدی کے اواخر کا وہ زمانہ تھا جب کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مومن۔ ذوق اور غالب یکے بعد دیگرے رخصت ہو چکے تھے اور میدان بالکل خالی ہو گیا تھا ہندوستان کی پرانی ہمدم یعنی عاشقانہ شاعری کا دور دورہ ختم ہو چکا تھا اور اس کی ترقی کا چشمہ خشک ہو گیا تھا۔ وہ چمن بگڑ گیا اور وہ نغمہ پرداز چمن اڑ گئے۔ نہ وہ آشیان رہا اور نہ وہ عنادل۔ پھر بھی اس خزاں رسیدہ گلشن پر نوحہ کرنے والی ایک دو غمزدہ بلبلیں۔ میر انیس اور مرزا دبیر جیسی رنگینی تھیں جن کی لے ہر ایک کو رلائے دیتی تھی۔ یہ رونا خواہ قوم کی سوشیل حالت کا رونا سمجھیے یا مذہبی عزاداری کا۔ لیکن افسوس کہ یہ رونے رلانے والے بھی اس محفل سے اٹھ گئے۔ اب کون تھا جو شاعری کو سنبھالے اور اس گرتی ہوئی دیوار کو تھام لے۔ کس کا منہ تھا کہ اس زبردست ریفارم، یا اصلاح کا بیڑا اٹھائے اور شاعری کو اس کے معراج کمال پر پہنچائے۔ قوم کی اصلاح کی جانب بہتیرے مصلحین نے توجہ کی اور بعضوں نے اپنی زبان کی بگڑی حالت کو سنوارنا چاہا۔ کسی نے نثر پر توجہ کی

اور کسی نے نظم پر۔ لیکن شاعری کے حق میں جو خضر راہ بنا وہ وہی سحر بیان انسان ہے جس کے نام سے سرنامہ مزین ہے۔

مولانا حالی جو اپنی اعجاز بیانی اور سخن فہمی کے سبب "سعدی ہند" کا لقب حاصل کر چکے ہیں سنہ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد خواجہ ایزد بخش کرنال کے باشندے تھے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی سے آپ نے فارسی پڑھی جو اُس زمانہ کے اعلیٰ فارسی دانوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور حاجی محمد ابراہیم حسین انصاری سے عربی کی تعلیم پائی، ۱۷ سال کی عمر سے آپ اکثر دہلی میں رہے اور یہیں منطق۔ فلسفہ وغیرہ علوم کی تکمیل کی۔ عنفوان شباب ہی میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد کے صاحبزادوں کی تعلیم آپ کے سپرد ہوئی۔ اُس زمانہ میں آپ نے جو کچھ کہا اُس میں نواب صاحب سے اصلاح لی۔ اسی تعلق سے آپ کو آزردہ۔ نیر۔ درخشاں اور حضرت غالب مرحوم کی خدمت میں باریابی حاصل ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ مرزا غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے۔ غالب نے آپ کی طبیعت کا اندازہ کرکے کہا کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو شاعری کے حق میں ظلم کروگے۔ آپ کی عالی دماغی اور سخن فہمی کا اُس زمانہ میں بھی شہرہ تھا جب کہ قابل سخنور موجود تھے۔ آپ مرزا غالب کی وفات کے موقعہ پر دہلی میں موجود تھے بلکہ تجہیز و تکفین میں بھی شریک تھے۔
اُستاد کی وفات پر مرزا سالک اور میر مہدی حسین مجروح اور آپ نے ایک ساتھ مرثیہ کہا۔ لیکن انصاف کی نظروں سے دیکھا جائے تو جو منزلت اور مقبولیت مولانا حالی کے مرثیہ کو حاصل ہوئی وہ اُن میں کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ اس مرثیہ کا ہر مصرع مؤثر، ہر شعر پُردرد اور ہر بند لاجواب ہے جس کا دل ہر نشتر کی نوک کا سا اثر ہوتا ہے۔ آپ کو مرزا غالب سے کمال عقیدت اور محبت تھی جس نے آپ کو مرزا کی سوانح لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس لاجواب تصنیف یعنی یادگار غالب کا ذکر مناسب موقع پر کیا جائیگا۔
ابتدا میں آپ کی شاعری کا رنگ وہی ایشیائی شاعری کا سا تھا جو شعرائے

دہلی کی صحبت کے اثر سے پیدا ہوا تھا۔ یعنی وہ گل و بلبل کے افسانوں اور ہجر و وصل کے بیانات سے مزین تھی۔ مولانا کے ابتدائی اشعار سے یہ پایا جاتا ہے کہ وہ پہلے پہل شاعری کا ماحصل طبیعت پر زور ڈال کر کہنا سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے اس کلام میں زیادہ تر دقیقہ سنجی اور معنی آفرینی کی جھلک نمایاں ہے۔ مگر درحقیقت مولانا کی طبعی مناسبت سادگی پر مبنی تھی جو بعد میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس جوہر پنہانی کو ابھارنے کے لئے ایک خاص وقت کا انتظار تھا۔

جس موقع کی حالی کو جستجو تھی وہ موقع اس وقت ہاتھ آیا جب کہ دلی میں غدر کا ہنگامہ بلند ہوا اور کئی مسلمان خاندان تباہ و برباد ہوئے۔ اس ناگہانی بلا سے آپ کو اپنے ہمعصر و ہم وطن مولانا آزاد کی طرح شہر چھوڑنا پڑا۔ ان دونوں صاحب کمالوں نے کرنل ہالرائڈ کی خدمت میں پہنچکر کتابوں عبارت کو زمانہ حال کے مطابق درست کرنے کی خدمت لی۔ اس وقت آپ کو انگریزی لٹریچر پر غور کرنے کا بہت اچھا موقع حاصل ہوا۔ "پنجاب بکڈپو" میں جب تک حالی رہے کرنل صاحب کے خیالات سے اثر پذیر ہوتے رہے۔ پھر کیا تھا۔ انہوں نے قدیم راستہ کو یکقلم ترک کرکے طرز جدید اختیار کی اور اردو کے بے جان قالب میں ایک نئی روح پھونک دی انگریزی لٹریچر کے بیش بہا موتی اردو زبان میں بھی استعمال ہونے لگے اور اس اجڑی محفل کو نئی طرح سے زینت دی گئی۔ کرنل صاحب جو یادگار چھوڑ گئے ہیں اور جن کے احسان سے اردو ادب سبکدوش نہیں ہو سکتا وہ یہ ہے کہ انہوں نے جدید قسم کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔ وہ فرسودہ مشاعرے جن میں کسی مصرعہ طرح پر طبع آزمائی کیجاتی تھی ان کے پیش نظر نہ تھے بلکہ ایک خاص مضمون کا عنوان دیا جاتا تاکہ ہر ایک شاعر اپنا اپنا کلام پیش کرے۔ مولانا حالی نے بھی اس گلشن میں جدت طرازی کے نغمہ سنائے۔ چنانچہ انہوں نے مشاعرے میں چار مثنویاں لکھکر پڑھیں جو اس کی یادگار ہیں۔ وہ مثنویاں یہ ہیں:۔

(۱) برکھا رت (۲) نشاط امید (۳) حب وطن (۴) مناظرہ رحم و انصاف۔ یہ چاروں

مثنویاں قبول عام ہوئیں اور بار بار چھپ کر شائع ہوئیں۔

مولانا حالی پر غالب کی صحبت، غدر کے بعد قوم کی تباہ حالت، پنجاب بک ڈپو کا علمی حلقہ اور کرنل ہالرائڈ کے فیضان صحبت کا بہت کچھ اثر ہوا۔ لیکن ان سب سے بڑھکر سر سید احمد خاں کی قومی اور ملی تحریکات اور اُن کی پُرجوش کارروائیاں تھیں جنہوں نے سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ کا کام کیا۔ حالی کی شاعری کا بیج مرزا غالب کی صحبت میں بویا گیا لیکن سر سید کی گرمی اثر نے اُس میں پھل پھول پیدا کئے۔ سر سید ایک قابل ادیب ہی نہ تھے بلکہ ادیب گر بھی تھے ان میں بلا کی تیز نظری اور مردم شناسی پائی جاتی تھی۔ جس کام کے لئے جس کسی کو انتخاب کرتے تھے وہ بہترین طور پر اُس کے لئے موزوں ثابت ہوتا بلکہ اُس جیسا دوسرا نہ مل سکتا۔

ان انتخابی نامہ نگاروں میں سب سے پہلے حالی ہیں جن کو سر سید نے اپنی صحبت سے متاثر کیا تھا۔ اُن کو آمادہ کرنا گویا بارود کے مخزن کو دیا سلائی دکھانا تھا۔ فی الفور نئے رنگ کے خیالات شرارے بن کر نکل پڑے اور کائنات ہند میں ان کے کلام نے ایک آگ سی لگا دی۔ اب مولانا حالی نے :-

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی   بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی

اور وہ ایک نئے رنگ میں الاپنے لگے :-

اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر   ہو چکا ہنگامہ مدح و غزل"

اس نئی طرز میں مولانا نے ایک مسدس "مدوجزر اسلام" لکھی جس نے کشمیر سے راس کماری اور سندھ سے کلکتہ تک ہلچل ڈالدی۔ اس مسدس کا مضمون اور وزن قوم کو ایسا مرغوب ہوا کہ اُس وقت سے آج تک قومی شعرا اپنے خیالات کا اظہار اس مسدس یا ترکیب بند یا ترجیع بند میں کیا کرتے ہیں۔ وہ مسدس جو اَمانت جیسے شعرا کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھی اب حالی کے ہاتھوں چمک اُٹھی اور اُسکو چار چاند لگ گئے۔ اس کے شائع ہوتے ہی قوم کے برسوں کی بجھی ہوئی طبیعت میں ایک ولولہ پیدا ہوا۔ جو سوئے تھے وہ کروٹیں لینے لگے اور جو کروٹیں بدل رہے

تھے آنکھیں مل مل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آخر اُس کی شہرت اس قدر ہوئی کہ ہر گلی کوچہ سے اسی کی صدا آنے لگی۔ وہ لوگ جو حالی کے نام سے واقف بھی نہ تھے شیدائی بن گئے۔ اس نظم سے دنیائے شعر و شاعری میں انقلاب عظیم پیدا کیا۔ وہ خود اپنے دیباچہ مسدس میں لکھتے ہیں:-

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چار طرف دہائی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے رسم رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے امرا جو قوم کو بہت فائدہ پہنچا سکتے ہیں غافل اور بے پروا ہیں۔ علما جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔ ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں اور ساری ناؤ کی سلامتی میں ہماری سلامتی ہے۔ ہر چند لوگ بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھ رہے ہیں مگر نظم جو بالطبع سب کو مرغوب ہے اور خاص کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا موروثی حصہ ہے قوم کے بیدار کرنے کے لئے ابتک کسی نے نہیں لکھی۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ اور تدبیروں سے کیا ہوا جو اس تدبیر سے ہوگا۔ مگر ایسی تنگ حالتوں میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیال گذرتے ہیں۔ ایک یہ کہ 'ہم کچھ نہیں کر سکتے'، دوسرے یہ کہ 'ہم کو کچھ کرنا چاہئے'! پہلے خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے"

پہلے وہ قوم کی ابتر حالت ظاہر کرتے ہیں اور یہ بتلاتے ہیں کہ ابتک کسی نے قوم کے بیدار کرنے کے لئے نظم نہیں لکھی۔ اس لئے اس راستہ میں یہ سب سے پہلی کوشش ہے جو مولانا حالی نے کی۔ اس لئے جب تک مسلمان دنیا میں زندہ ہیں مولانا کو ہمیشہ وقعت اور عزت کی نظر سے دیکھا کریں گے۔

اس مسدس میں انھوں نے پہلے پانچ سات بند تمہید یہ لکھ کر عرب کی حالت تنزل

کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی جس کو زمانۂ جاہلیت کہتے ہیں۔ پھر آفتاب رسالت کا طلوع ہونا اور باطل پرستی و ضلالت کا مٹ جانا اور اُن چند وحشی عربوں کا اسلام لانے کے بعد دینی و دنیوی ترقیات میں عالم میں تمام پر سبقت لیجانا وغیرہ اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ اس کی مثال شاید ہی کسی لٹریچر میں مل سکے۔ اگر یہاں اس بے نظیر مسدس کے چند اشعار پیش نہ کئے جائیں تو مولانا حالی کے حق میں بہت بڑی بے انصافی ہوگی۔

(۱) مسلمانوں کی موجودہ حالت اور طرزِ تغافل ملاحظہ ہو:۔

"یہی حال دنیا میں اُس قوم کا ہے — بھنور میں جہاز آکے جس کا گھرا ہے
کنارہ ہے دور اور طوفان بپا ہے — گماں ہے یہ ہر دم کہ اب ڈوبتا ہے
نہیں لیتے کروٹ مگر اہل کشتی
پڑے سوتے ہیں بے خبر اہل کشتی

(۲) عرب کی جاہلیت کا فوٹو اس طرح کھینچا ہے:۔

"عرب جسکا چرچا ہے یہ کچھ وہ کیا تھا — جہاں سے الگ اک جزیرہ نما تھا
زمانہ سے پیوند جس کا جدا تھا — نہ کشورستاں تھا نہ کشورکشا تھا
تمدن کا اُس پر پڑا تھا نہ سایہ
ترقی کا تھا واں قدم تک نہ آیا"

(۳) پھر آفتاب رسالت کے طلوع ہونے کا سما باندھا ہے:۔

"یکایک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت — بڑھا جانب بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے کی وہ ودیعت — چلے آتے تھے جسکی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیل اور نوید مسیحا"

(۴) پھر رسالت مآب نے جو "تعلیم توحید" عربوں کو دی اُسکو حالی نے اس خوبی سے ادا کیا ہے۔

"کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق　　　زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اُسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق　　　اُسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اُس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اُس کے آگے جھکاؤ"

(۵) جو سبق قرآن مجید نے آپس میں محبت و ہمدردی کا سکھلایا اُسکو مولانا اس طرح ادا کرتے ہیں:۔

"یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا　　　کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا　　　خلائق سے ہے جسکو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایمان
کہ کام آئے دنیا میں انسان کو انسان"

(۶) ایک اور جگہ فرماتے ہیں:۔

"خدا رحم کرتا نہیں اُس بشر پر　　　نہ ہو درد کی چوٹ جس کے جگر پر"

ان مثالوں سے یہ ثابت ہوا ہوگا کہ مدس "مد و جزر اسلام" کا ہر ایک لفظ اہل بصیرت کے لئے پند و نصائح کا لُبِّ لباب ہے۔ ہم اس کو ابتدائی زمانۂ تعلیم میں پڑھتے ہیں، عالم جوانی میں مطالعہ کرتے ہیں، انجمنوں اور سوسائیٹیوں میں سُنتے ہیں، کانفرنسوں میں بڑے بڑے قومی لیڈر اس کو سُنا کر جوش دلاتے ہیں، مولود خوانی میں راگ سے اور بغیر راگ کے پڑھی جاتی ہے۔ لیکن اس کے بار بار دُہرائے جانے سے کان بدمزہ نہیں ہوتے اور طبیعت اکتا نہیں جاتی بلکہ شوق کو اشتعال ہوتا ہے اور دل میں بلا کا جوش و خروش پیدا ہوتا ہے۔ جب اسلام کے ادبار کی کیفیت سُنائی جاتی ہے تو سنگدل سے سنگدل انسان بھی آنسو بہائے بغیر نہیں رہتا اور جب اسلام کی ترقی و خوش اقبالی کا ذکر آتا ہے تو سامعین کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ اس حیثیت سے یہ کتاب مسلمانوں

کے ترقی پذیر خیالات کا ایک مقدس مجموعہ سمجھی جاسکتی ہے۔

بعض شخصوں نے اس بے مثل مسدس پر اعتراض بھی کیا ہے۔ لیکن ان کے اعتراضات انصاف پر مبنی نہیں بلکہ آتش رشک کی جلن سے کئے گئے ہیں کیونکہ وہ بھی اسی طرز میں خامہ فرسائی کرکے ناکام رہگئے ہیں۔ آفتاب کے مقابل میں ذروں کا کیا شمار ہوسکتا ہے۔ قبولیت عام ایک خداداد نعمت ہے۔ جس کسی کو حاصل ہوگئی۔ ہوگئی۔

ایں سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اگر حالی صرف اس مسدس ہی پر اپنی تصانیف کا خاتمہ کرتے تو بھی وہ ایک سچے قوم کے خادم اور طبقۂ اول کے شعرا میں گنے جاتے۔

فقط یہی نہیں بلکہ ان کی دوسری نظموں کو بھی بے حد مقبولیت حاصل ہوئی شکوۂ ہند اور بیوہ کی مناجات آج تک پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ حالی کا دیوان ایسے مضامین سے مالامال ہے۔ دیوان میں بعض نظمیں قوم کی حالت پر لکھی ہیں بعض جگہ اچھوتے اور نئے خیالات کو شعر میں باندھا ہے مثلاً خودستائی نفس پرستی۔ تعصب۔ خوشامد۔ حرص۔ بے اعتدالی وغیرہ مختلف مضامین پر نظمیں لکھی ہیں جو مولانا کی قابلیت کی اعلیٰ مثالیں ہیں۔ دیوان میں صد ہا قطعات، غزلیات قصیدے مرثیے ترکیب بند، تاریخیں، رباعیاں وغیرہ شامل ہیں جن کے پڑھنے سے حالی کا قادر الکلام ہونا ثابت ہوتا ہے۔ بالخصوص اُن کی رباعیات زبان زد خاص وعام ہیں ان جدید طرز کی نظموں کو دیکھکر پرانی لکیر کے فقیر خواجہ حالی پر یہ اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ آپ کو غزل لکھنا ہی نہیں آتا۔ آپ کا مقصد اصلاح قوم تھا اس لئے آپ نے اُن نکتہ چینیوں کی مطلق پروا نہ کی اور قوم کی بہبودی اور فلاح کے راستہ میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا اُن کے دیوان میں دو قسم کی غزلیات ہیں پہلی وہ غزلیں جو نئے خیالات اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد لکھی ہیں۔ دوسری وہ غزلیں جو ابتدا میں لکھی تھیں ان میں سے بعض غزلیں جو سادہ

مضامین سے پرہیز کیا۔ وہ اس دیوان کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

" ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی اس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضایقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لئے جس پر رہگیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ قافلہ کا ساتھ، راہ کی ہمواری اور رہگذر کی فضا چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتاب عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہوا وہ تمام سیمیائی جلوے جو خواب غفلت میں حقائق سے زیادہ دلفریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی" اور جس شاعری پر ناز تھا اس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے۔ مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔"

چنانچہ عشقیہ غزل سے طبیعت سیر ہو چکی تھی۔ انہیں مضامین کے کھیتوں میں جہاں چڑیاں چگ چکی تھیں کیا خاک دھرا تھا سوائے اس کے اور کیا تھا کہ دوسروں کے چبائے ہوئے نوالوں کو آپ بھی منہ میں چباتے رہیں اور خوش ہوں اس لئے مولانا حالی نے عشقیہ مضامین کو چھوڑ کر ایک بالکل جدید طرز اختیار کی چنانچہ کہتے ہیں:۔

" مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ "

(باقی)



وزیر الممالک آصف جاہ نواب ابو المنصور خان بہادر صفدر جنگ

از

(حسن عابد جعفری صاحب آکسن - بیرسٹر ایٹ لا - اڈیٹر شمع)

نواب برہان الملک سعادت خاں مرحوم کے انتقال کے بعد اودھ کی صوبہ داری کے متعلق اہم پیچیدگیاں پڑگئی تھیں - برھان الملک مرحوم نے اپنی صاحبزادی نواب بیگم صاحبہ کا عقد اپنے بھانجے مرزا مقیم سے کردیا تھا اور مرزا کو اسی غرض سے نیشاپور سے ہندوستان بلایا تھا - نواب برھان الملک اپنے بھتیجوں کے عادات و اطوار سے خوش نہ تھے - اور غالباً اپنا جانشین مرزا مقیم کو بنانا چاہتے تھے مگر قضا نے مہلت نہ دی - اُن کا انتقال ہوتے ہی بھتیجوں نے ریشہ دوانیاں شروع کردیں اور چونکہ ابھی تک نادر شاہ ہندوستان میں موجود تھا اور محمد شاہ بادشاہ دہلی کی حکومت برائے نام تھی اس لئے نثار محمد خاں مخاطب بہ شیر جنگ برادر زادہ برہان الملک نے طہماسپ خاں کے ذریعہ سے نادر شاہ کی امداد طلب کی مرزا مقیم سے اودھ کے اہل دربار خوش تھے - جس وقت یہ حال معلوم ہوا راجہ لچھمن نرائن پسر راجہ ہرنرائن وکیل برھان الملک مرحوم نے بھی نادر شاہ کی خدمت میں مرزا مقیم مخاطب بہ صفدر جنگ کی جانب سے درخواست دیدی اور شیر جنگ کی ناقابلیت نواب مرحوم کی کشیدگی، اور صفدر جنگ کی اہلیت کے احوال کے علاوہ دو کرور روپیہ نذرانہ کا بھی وعدہ تھا - نادر شاہ نے دو کرور روپیہ لینے کے واسطے دہلی سے دو سو سوار بھیجدیئے اور محمد شاہ سے صفدر جنگ کی سفارش کرکے خلعت صوبہ داری بھجوا دیا - اور اس طرح صفدر جنگ صوبہ دار ہوگئے "



جناب وزیر الممالک آصف جاہ نواب ابوالمنصور خان بہادر صفدر جنگ

ایک روایت ہے کہ برہان الملک کے انتقال کے بعد اُن کا لڑکا جو چار یا پانچ سال کا تھا جانشین ہوا، اور صفدر جنگ اس کے ولی مقرر ہوئے۔ مگر وہ بچہ عارضۂ چیچک میں یا زہر دینے کی وجہ سے فوت ہو گیا اور اس کے بعد جھگڑے جو پیدا ہوئے اُن کو نادر شاہ نے بموجب واقعات مذکورۂ بالا صفدر جنگ کے حق میں طے کرا دیا۔

صفدر جنگ نیک طبع اور ہوشیار تھے۔ تمام عمر نواب بیگم کے مطیع رہے۔ آرام طلبی اور عیش پسندی سے انکو تنفر تھا اور انتظام سلطنت میں زیادہ انہماک رہتا تھا ۱۱۵۲ھ میں صفدر جنگ کو خلعت صوبہ داری ملا اور ۱۱۵۴ھ میں اُن کو محمد شاہ کے حکم کے بموجب مہابت جنگ صوبہ دار بنگالہ کی کمک کی غرض سے روانہ ہونا پڑا کیونکہ مہابت جنگ نے نادر شاہ کے آتے ہی تیور بدل دیئے تھے اور ساڑھے تین کرور روپیہ سالانہ کی بجائے صرف ایک کرور روپیہ خزانہ دہلی میں داخل کیا تھا، مہابت جنگ دکھنیوں کے استیصال میں مصروف تھا اور اپنے ملک کی سرحد سے باہر پڑا ہوا تھا صفدر جنگ کی آمد کا حال سنکر گھبرایا ہوا بنگال واپس آیا صفدر جنگ کو اسی زمانہ میں بادشاہ دہلی کا حکم وصول ہوا کہ وہ بغیر جنگ کئے ہوئے اودہ کو واپس ہو جائیں اور ایک حکم مہابت جنگ کے پاس پہنچا کہ چونکہ تم ملک بنگالہ سے باہر تھے اور دکھنیوں کے حملہ کا احتمال تھا اسلئے بہ نظر دور اندیشی صفدر جنگ کو لشکر کیا تھا بنگالہ کیطرف مصلحتاً بھیجا گیا تھا اب تم اپنے ملک میں واپس آگئے ہو اسلئے صفدر جنگ کو واپسی کا حکم دیا جاتا ہے"، بادشاہ کا یہ فعل صفدر جنگ کو بہت ناگوار گذرا مگر مجبوراً واپس ہونا پڑا۔

محمد شاہ بادشاہ کا ایما تھا کہ نواب صفدر جنگ کے بیٹے شجاع الدولہ مرزا جلال الدین حیدر کی شادی نواب موتمن الدولہ اسحٰق خاں بہادر کی دختر نواب بہو بیگم سے ہو جائے بیگم بادشاہ کی گود لی کہلائی ہوئی تھیں اس لئے اس شادی میں اُنکو خاص دلچسپی تھی نواب صفدر جنگ نے اس تجویز کو منظور کر لیا۔ اور نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ۱۱۵۷ھ میں شادی ہوئی مورخین کا بیان ہے کہ چھیالیس لاکھ روپیہ صرف ہوا نواب بہو بیگم صاحبہ کا نام امۃ الزہرا بیگم تھا ان کا وجود تاریخ اودھ میں خاص اہمیت رکھتا ہے جو آئندہ بیان ہوگا۔

سنہ ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ نواب صفدر جنگ شہزادہ احمد شاہ ولیعہد سلطنت دہلی کے ہمراہ اس معرکہ میں بمقام لاہور شریک ہوئے۔ اور انہیں کی ہمت اور لیاقت کا نتیجہ تھا کہ ایک نہایت اہم موقع پر جبکہ شاہزادہ احمد شاہ کی فوج ابدالی افواج کے سامنے آ گئی تھی اور یقینی شکست کھائی، خلاف توقع کامیاب ہو گئی اور ابدالی فوج کو شکست کھا کر فرار ہونا پڑا۔ مگر اس معرکہ میں اعتماد الدولہ نواب قمرالدین خان وزیر اعظم سلطنت دہلی اور نجم الدولہ[لہ] محمد اسحاق خاں کام آئے اور خود نواب صفدر جنگ کی بائیں آنکھ تیر کا نشانہ بن گئی۔ جنگ سے فارغ ہو کر واپسی میں پانی پت میں قیام ہوا اور وہیں اطلاع ملی کہ محمد شاہ قضا کر گئے۔ نواب صفدر جنگ نے شہزادہ کو نذر پیش کی اور شہزادہ نے فرط جوش میں کہا "سلطنت بہ ما و وزارت بہ شما مبارک"

اسی زمانہ میں فرخ آباد میں فتنہ پیدا ہو گیا۔ اور سنہ ۱۱۶۱ھ میں علی محمد خاں رئیس افغانان کے انتقال اور ان کے بیٹے سعداللہ خاں اور رئیس فرخ آباد قائم جنگ کے درمیان کشت و خون اور موخرالذکر کے ہلاک ہونے کی اطلاعیں وصول ہوئیں۔ نواب صفدر جنگ اُن تعلقات کی بنا پر جو اُن کو علی محمد خاں سے تھے، فوراً دہلی سے روانہ ہو کر نواح فرخ آباد میں پہونچے اور قائم خاں کے بھائی محمد خاں کے بیٹوں کو گرفتار ان کے سات معتمد غلاموں کو قتل اور قائم خاں کی ماں کو فرخ آباد روانہ کر کے اپنی طرف سے قلعہ وار اور کوتوال مقرر کر دیئے اور قائم خاں کے دوسرے بھائیوں کو جن میں احمد خاں بھی تھا گذارا مقرر کر دیا اور اس حصہ ملک کو جس پر بنگش افغان قابض تھے مہاراجہ نول رائے کی سپرد کر دیا کہ وہ اسکا انتظام کریں۔ اور خود دہلی واپس چلے گئے۔ نواب کی غیر موجودگی میں راجہ نول رائے اودہ کا بھی انتظام کرتے تھے سنہ ۱۱۶۲ھ میں احمد خاں برادر قایم خاں نے بغاوت کر دی اور فرخ آباد پر قبضہ کر لیا۔ راجہ نول رائے نے حملہ کیا مگر مارے گئے۔ راجہ کے انتقال کے چالیسویں دن

لہ بعض مورخین کو نجم الدولہ کے انتقال سے انکار ہے۔ ۱۲

نواب نے احمد خاں پر حملہ کیا لیکن نواب کو شکست ہوئی اور احمد خاں صوبہ اودھ اور الہ آباد پر بھی متصرف ہو گیا۔ اسی سال احمد خاں کے ملازموں اور لکھنؤ کے شیخ زادوں میں چھڑ گئی اور معز الدین خاں فاروقی ساکن لکھنؤ نے افغانوں کو اودھ سے نکال دیا نواب نے اسمٰعیل خاں کابلی اور راجہ ناگرمل وغیرہ کی رائے سے آپاجی وملہار راؤ ہولکر مرہٹوں سے جو کوٹہ میں جمع تھے امداد طلب کی۔ مرہٹوں نے ایک کروڑ روپیہ انعام ٹھہرا کر نواب کی خاطر خواہ مدد کی۔ احمد خاں نے علی محمد خاں کے وارثوں سے صلح کر لی اور افغانوں کی دو تین مرہٹوں اور نواب کے آدمیوں کے مقابل ہوئیں مگر احمد خاں کو پسپا ہو کر گاؤں میں جا کر چھپنا پڑا۔ نواب نے محاصرہ کر لیا لیکن مرہٹوں نے صلح کرا دی وہ آب میں سولہ محال احمد خاں کو اور افغانوں کا مقبوضہ بدستور علی محمد خاں کے روسا کو اور دوآب کا بقیہ کل حصہ نواب کو دلوا دیا اور خود پچاس لاکھ نواب سے اور پچاس لاکھ روپیہ افغانوں سے لیکر رخصت ہو گئے۔ غرض علی محمد خاں افغان اپنی جگہ اور احمد خاں فرخ آباد پر برقرار رہے۔ احمد شاہ بادشاہ دہلی نے نواب کو خلعت عطا کیا اور بہت خصوصیت کا برتاؤ رکھا مگر حاسدوں نے شکر رنجی کا موقع پیدا کرانے کی تدابیر شروع کر دی تھیں۔ چنانچہ ایسا اتفاق ہوا کہ نواب نے بادشاہ کا ایما پا کر صاحب الزمانیہ اُدھم بائی والدہ بادشاہ کے خواجہ سرا کو دعوت کے بہانہ سے اپنے یہاں بلا کر قتل کرا دیا۔ خیال تھا کہ یہ فعل بادشاہ کی خوشنودی کا باعث ہوگا مگر صاحب الزمانیہ کو سخت ملال ہوا۔ اور بادشاہ بھی ان کی غمخواری میں شریک ہو گئے۔ اُدھر نواب سے صاحب الزمانیہ کو کد ہو گئی اور ادھر بادشاہ جو محض ناتجربہ کار اور ملازموں کی صحبتوں کے دلدادہ تھے نواب سے خلاف ہو گئے۔ مجبوراً نواب کو دہلی کی شہر پناہ کے باہر قیام کرنا پڑا بادشاہ نے شہر پناہ کے دروازے بند کرا دیئے تاکہ نواب کے ملازمین شہر میں نہ آ سکیں۔ اور بعض امرا نے نواب کا مقابلہ کیا۔ نواب بہت پریشان ہوئے اور ایک معروضہ خدمت بادشاہ میں بھیجکر وجہ ملال خاطر دریافت کی اور بدنامیوں اور خوشامدیوں کی چالوں سے آگاہ کیا۔ بادشاہ نے خلعت بھیجا اور حکم

دیا کہ نواب بالفعل اودھ کو واپس جائیں یہی مناسب ہے۔

بادشاہ کے طرز عمل نے نواب کو بہت غمگین کردیا وہ اودھ کو واپس تو ہوئے مگر بہت غمزدہ تھے کچھ عرصہ کے بعد بادشاہ تورانیوں کے ہاتھوں عاجز آگئے اور نواب سے امداد طلب کی۔ مگر نواب عارضۂ دُنبل میں گرفتار تھے معذور رہے اور اسی مرض میں سنہ ۱۱۶۶ھ مطابق ۱۷۵۲ء پاپڑ گھاٹ نظامت سلطانپور میں رحلت کرگئے۔ نواب بیگم ہمراہ تھیں انہوں نے نواب کی موت کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ اور ہاتھی پر لاش کو لیکر فیض آباد چلی آئیں وہاں پہنچکر انتقال کی خبر چاروں طرف پھیل گئی نعش گلاب باڑی واقع فیض آباد میں سپرد رہی اور پھر کربلائے معلی بھیجدی گئی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نعش پہلے دہلی میں دفن ہوئی اور بعد کو کربلائے معلی بھیجی گئی۔

شذرات

میسور جس کے جلیل القدر وزیر اعظم امین الملک میرزا محمد اسمٰعیل صاحب بی اے ۔ سی، آئی ۔ ای ۔ او، بی ۔ ای ۔ کی تصویر زیب شمع ہے، ہندوستان کی مشہور ریاست ہے، اور تاریخی حیثیت سے مہتم بالشان حیثیت رکھتی ہے، قدیم میسور کے شاہی خاندانوں کے حالات تاریخ ہند میں دلچسپ اور سبق آموز ہیں، اور ان کے مطالعہ سے معاشرتی اور تمدنی ارتقار کا ولپذیر باب پیش نظر ہو جاتا ہے، لیکن موجودہ دور حکومت بھی ترقی اور امتیازات خصوصی کے اعتبار سے ملک کے لئے مایہ افتخار ہے، اور ریاست میسور کا شمار بہترین ریاستہائے ہندوستان میں ہے۔

بالخصوص تعلیم و صنعت و حرفت اور آئین حکومت کے سلسلہ میں تو ریاست مذکور نے ایسی روشن مثال قائم کر دی ہے کہ اسکی پیروی ملک کی دوسری ریاستوں پر فرض ہے۔ ملک کے ایک مشہور اور مسلم الثبوت لیڈر نے کہا تھا، ہماری ریاستیں خوش نصیب ہیں کہ ان میں ریاست میسور شامل ہے، اور ریاست میسور خوش قسمت ہے کہ اس کی باگ میرزا محمد اسمٰعیل صاحب سے کامل شخص کے ہاتھوں میں ہے،، ایسی جگہ جہاں تعلیم عام ہے، اور ملازموں کی زبان تک انگریزی ہے، اور عام طور پر علمی اور صنعتی ترقیاں ہو رہی ہیں دیوان کے عہدہ پر پہونچ جانا ۔ ممدوح کی حسن لیاقت کی بیّن دلیل ہے، آپ نہایت جفاکش، زود فہم، سنجیدہ اور ہمدرد بزرگ ہیں ۔ آپ کی روشن خیالی ۔ وسعت نظر، اور گہری دلچسپی ایسی اعلیٰ صفات ہیں جن کو اہل ہندوستان نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آپ کا وسیع تجربہ، خوش خلقی، اور ملکی معاملات میں استغراق اور انہماک اسقدر بڑھا ہوا ہے کہ اگرچہ آپ کو قلمدان وزارت حاصل کئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس قلیل عرصہ میں ریاست کے ہر شعبہ میں ایک نئی روح حلول کر گئی ہے، اور ہر

طرف ترقی اور اطمینان کی لہر نظر آتی ہے۔ آپ کی ذاتی شخصیت کا پرتو ہر محکمہ اور ہر صیغہ پر پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ اقتصادی اور سیاسی مشکلات ہر قدم پر نظر آتی ہیں، ریاست میسور شاہراہ ترقی پر استقلال کے ساتھ گام زن ہے، حضرت کو زبان اردو سے خاص اُنس ہے، اور اس کی فلاح و ترقی میں آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ یقین ہے کہ قارئین کرام اس امر سے خوش ہوں گے، اور دعا کریں گے کہ حضرت کا عہد حکومت کامیاب ہو، اور آپ کے فیض بخش ہاتھوں سے اردو کو مستفید ہونا نصیب ہو، آمین،
ہم عنقریب آپ کے عہد حکومت پر مفصل تبصرہ کریں گے تاکہ قارئین کرام اس کو شوق کے ساتھ پڑھ سکیں،

مولینا مولوی عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی مرحوم اور جناب خان بہادر مولینا مولوی سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی مرحوم ادب اردو کے لئے مایۂ ناز ہستیاں تھیں، دونوں بزرگ مدت العمر اردو کی آبیاری میں مصروف رہے اور ادبی فیض کے چشمہ کو تا دم مرگ جاری رکھا۔ مولینا شرر مشہور ادیب مورخ، اور ناول نویس تھے عرصہ تک رسالہ دلگداز اُن کی ادارت میں شائع ہو کر ملک پر احسان کر چکا ہے، اُن کے مضامین دیگر رسالوں یا اخباروں میں کم نظر آتے تھے۔ مگر اُن کے علمی اشغال میں کبھی فرق نہ آیا تھا۔ ناول نویسی کو اردو میں بڑی حد تک انہیں نے کامیاب کیا تھا اور حق یہ ہے کہ اُن کے ناولوں کے بعض حصے ناول نویسی کے فن کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ تاریخی حیثیت سے بھی انکا پایہ بلند تھا۔ گرادیب کی حیثیت سے وہ ملک کے محسن تھے۔ انکا انتقال ایک سانحہ ہے اور زبردست نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ ہم کو اُن کے صاحبزادے محمد صدیق صاحب ناظم انجمن ترقی اردو سے دلی ہمدردی ہے۔ یقین ہے کہ موصوف بہت جلد مرحوم کی غیر مطبوعہ تصانیف کو شائع فرما کر اہل ملک کے دلوں میں مرحوم کی یاد تازہ کردیں گے۔

مولینا اثر مرحوم کے انتقال کے بعد ہی جناب شاد مرحوم کے صاحبزادے کی بھی تحریر سے
حضرت شاد انتقال کی خبر وصول ہوئی، مرحوم نے ۹ر جنوری سنہ ۲۷ء کو پٹنہ میں رحلت فرمائی
اور صوبہ بہار کی اردو شاعری کو یتیم کر گئے۔ مولینا مرحوم نہایت وضع دار اور صحبت یافتہ
رئیس تھے اُن کی تمام عمر شعر و شاعری اور ادبی تحقیقات میں صرف ہوئی۔ شاعری میں کوئی
صنف ایسی نہ تھی جس میں مرحوم کو ید طولیٰ نہ رہا ہو۔ وہ بے مثل غزل گو تھے۔ نہایت
پاکیزہ مرثیے کہتے تھے، اور اصلاح دینے میں اُن کو خاص ملکہ تھا۔ اگرچہ مرحوم کو عمر طبعی
ملی۔ لیکن جو ناقابل تلافی نقصان اُن کی وفات سے اردو شاعری کو پہونچ گیا ہے اُس کا
اندازہ کچھ وہی کرسکتا ہے جنہوں نے اُن کے کلام کا مطالعہ کیا ہے۔ مرحوم نے میر انیس، و دبیر
نفیس کی آنکھیں دیکھیں تھیں اور عرصہ تک اُنسے مشورہ سخن کیا تھا۔ اخیر میں جو تحریرات مرحوم
نے ہم کو بھیجیں تھیں اُنسے مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ دُنیا سے اسقدر جلد اُٹھ جائیں گے۔ باوجود
پیرانہ سالی کے اُن کے اوقات عزیز کا زیادہ حصہ تالیف و تصنیف میں صرف ہوتا تھا۔ مولنا ایک
گرانپایہ مورخ بھی تھے اور صوبہ بہار کی تاریخ تصنیف فرما رہے تھے۔ اُن کے شاگرد رشید
جناب قیس نے اُن کے مختصر سوانح عمری "گلشن حیات" حال میں تصنیف فرمائی تھی اور ہم نے
اُس پر ریویو کرتے ہوئے رسالہ شمع میں اہل بہار کو توجہ دلائی تھی کہ وہ مرحوم کی جامع اور
مکمل سوانح عمری لکھیں کیونکہ مرحوم کی سوانح عمری کم و بیش ساٹھ ستر برس کی بہار کی تاریخ
ہوگی۔ لیکن افسوس ہے کہ آج ہم مرحوم کا ماتم کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ زندہ دلان بہار مرحوم
کی مبسوط سوانح عمری کو بہت جلد شائع کریں گے۔ اور اس طرح پر اُن کے وسیع اخلاق اور
کمالات کو موجودہ اور آیندہ نسلوں کے لئے محفوظ کردیں گے۔ ہم مرحوم کے صاحبزادے
جناب سید حسن خانصاحب اور مرحوم کے خویش جناب مولوی سید جعفر صاحب بی۔ اے
ال۔ ال۔ بی وکیل کھیم پور کھیری کی خدمت میں دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور دست
بدعا ہیں کہ خدائے کریم مرحوم کو جنت اور اُن کے متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

یہ خبر مسرت کے ساتھ سنی جائیگی کہ ہز اکیسلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد صاحب بہادر یمین السلطنت جی۔سی۔آئی۔ای نے پانچ ہزار روپیہ کی گراں قدر رقم ہمارے لائق دوست نواب مسعود جنگ بہادر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن حیدر آباد کی معرفت انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کو مرحمت فرمائی ہے۔

انجمن مذکور عطیہ کی مستحق تھی۔اور وہ مفید کام کر رہی ہے۔ مہاراجہ صاحب بہادر کی علمی فیاضیاں ملک پر روشن ہیں، آپ اردو میں کامل ادیب، باکمال شاعر اور مشہور صاحب تصنیف ہیں، آپ کی محترم ہستی ہندوستان کے لئے مایۂ افتخار ہے۔آپ ادب اُردو کے زبردست محسن۔اور تصوف کے اعلیٰ حامی ہیں۔فارسی کلام بہت دلکش ہے اور تاریخی مذاق کی بلندی آپ کی تصانیف سے ظاہر ہے، ہم عنقریب آپ کی تصانیف پر ریویو کرینگے آپ کا تاریخی مضمون ستمبر سنہ ۱۹۲۶ء کے رسالہ شمع میں مع عکس مبارک کے شائع ہو کر قارئین کرام سے داد تحقیق لے چکا ہے۔

سال گذشتہ میں جناب آنریبل رائے جیشور بلی صاحب بی اے وزیر تعلیمات صوبہ ہذا کی سفارش پر گورنمنٹ صوبہ ہذا نے انڈین اکاڈمی کے لئے پچیس ہزار روپیہ سالانہ دینا منظور کیا تھا۔ اب یہ اکاڈمی رجسٹر ہو رہی ہے، ہمارے محترم اور اردو کے حامی سر تیج بہادر سپرو صاحب ایم اے ال ال، ڈی، کے سی آئی ای۔ایڈوکیٹ، الہ اباد اس کے پریسیڈنٹ، اور ہمارے معزز عنایت فرما جناب ڈاکٹر تارا چند صاحب اس کے سیکرٹری ہیں، ڈاکٹر صاحب کو اردو سے خاص شغف ہے، اکاڈمی میں جناب وزیر صاحب تعلیمات، اور ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم صوبہ ہذا کے علاوہ غالباً تیئیس۲۳ میمبر ہوں گے۔یقین ہے کہ وہی حضرات میمبر ہوں گے جو انڈین اکاڈمی کے فرائض کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور حق شناس کو فرض سمجھتے ہیں۔

آنریبل رائے صاحب کی کوشش لائق تشکر ہے، اور ہم کو دلی مسرت ہے کہ یہ مفید

تحریک وہ نہایت ہمدرد، آزاد خیال، اور سچے بہی خواہان ملک کے مقتدر ہاتھوں میں ہے -
یقین ہے کہ تحریک کامیاب ہوگی اور ایسے لوگوں کی اعانت کرے گی جو علمی اور ادبی خدمات
کرنا چاہتے ہیں، لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے کوئی نمایاں کام نہیں کر سکتے ہیں -

محمود غزنوی

جناب پروفیسر محمد حبیب صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا ایم - آر - اے - ایس ممبر لیجسلیٹو کونسل پروفیسر
تاریخ و سیاسات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و اڈیٹر شمع

کا معرکۃ الآرا رسالہ "محمود غزنوی" مہذب دنیا میں مقبول ہوچکا ہے - کل مضمون کا ترجمہ جناب
پروفیسر سید جمیل حسین صاحب ایم - اے (علیگ) نے نہایت خوش اسلوبی کیساتھ کیا ہے اور جستہ جستہ
شمع میں شائع ہوچکا ہے، چونکہ یہ مضمون کئی نمبروں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوا ہے - اور احباب کا اصرار
ہے کہ اسکو علیحدہ کتابی صورت میں شائع کردیا جائے - اس لئے ہمنے اس کی اشاعت کا انتظام کیا
ہے تاریخی حیثیت سے اس مضمون کا جواب نہیں ہے اور ایک مستقل کتاب ہے تاریخ کے شائقین
کو صلائے عام ہے کہ وہ اس نفیس تاریخی تحقیقات سے لطف اندوز ہوں - چونکہ کتاب نظر ثانی کے
اور دیباچہ وضروری حواشی سے مزین ہوکر شائع ہو رہی ہے اس کا حجم زیادہ ہو جائے گا -
اس لیے قیمت عہ رکھی گئی ہے لیکن جو حضرات اخیر اپریل ۱۹۲۷ء تک عہ بذریعہ ٹکٹ یا بذریعہ
منی آرڈر بھیجدیں گے اُن کی خدمت میں کتاب مفت روانہ کی جائے گی - اور چونکہ مانگ زیادہ
ہوگی اس لئے سختی کے ساتھ اس امر کا لحاظ رکھا جائے گا کہ جو آرڈر پہلے وصول ہونگے پہلے
انہیں کی تعمیل ہوگی -

المشتہر

منیجر رسالہ شمع - حسن منزل - شاہ گنج آگرہ

تبصرہ

نیرنگِ جمال

از مولوی محمد معین الدین انصاری۔ بی اے کینٹب۔ ایم آر اے ایس بیرسٹرایٹ لا

نیرنگِ جمال مولانا احمد علی شوق قدوائی مرحوم کی اُن چند ولاآویز نظموں میں ہے جن میں حسن و عشق کی کرشمہ سازیاں بے ساختہ اور فطری پیرایہ میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آیا شاعر اس سعی میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے قارئین کے فیصلے کے لئے چھوڑا جاتا ہے۔ البتہ اس نظم کی بعض خوبیوں پر بطور ذیل میں روشنی ڈالی جائے گی۔

قصہ یہ ہے کہ ایک خوش رو نوجوان لکھنؤ کے ریلوے اسٹیشن پر ٹہل رہا تھا کہ اوسکی نگاہ ایک دوشیزہ نازنین پر پڑی جو کسی ٹرین کے زنانہ درجہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کا دوچار ہونا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔ مگر موقعہ نہ تھا کہ ایک کو دوسرے سے واقف ہونیکی نوبت آتی۔ ٹرین چلی گئی اور عاشق و معشوقہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

یہ کوئی نیا افسانہ نہیں۔ وہی عشق کا دکھڑا ہے جسے لاکھوں شعرا اور فسانہ نگار اپنی اپنی زبان میں آپ بیتی یا جگ بیتی کہکر سنا چکے ہیں۔ مضمون ایسا ہے کہ ایک شعر بلکہ ایک مصرع میں ادا ہو سکتا ہے۔ مگر شاعر جو سب کا رازداں اور بصیرتِ خداوندی کا حصہ دار خلق ہوا ہے واقعاتِ عالم کے ہر پہلو کو طرح طرح سے دیکھتا ہے اور طرح طرح سے ادا کرتا ہے۔ اوسکی کامیابی یہ ہے کہ نقل کو عموماً اصل سے زیادہ رنگین اور موثر کر کے دکھلائے۔ اور نفس الامر کا ایک ایسا فطری ماحول پیش کرے جو اکثر قرینِ قیاس اور تمام تر مصورانہ نگاہ کا مرتب کیا ہوا ہو۔ اسی قسم کی کہانیاں اور نظمیں وغیرہ ہوتی ہیں جو مختلف قوموں اور زمانوں کے طرزِ تخیل اور

معاشری حالات کا پتہ مورخین عالم کو دیتی ہیں ورنہ زمانہ کے رسم و رواج اور معاشری کیفیات کو قلم بند کرنیکے لئے کسی عہد میں کوئی قوم کوئی مخصوص اہتمام نہیں کرتی کہ آئندہ کے مؤرخ اوس سے مستفید ہوں۔

حضرتِ شوق مرحوم اُن مجتہدین ادب میں تھے جنہوں نے اگر ایک طرف روایتی شعرگوئی کو معراج کمال پر پہنچایا تو دوسری طرف پُرانی لکیر کو چھوڑ کر سرزمین اُردو میں ایک نئی عمارت کی بھی داغ بیل ڈالی اور اس عمارت کی بنیاد میں نیرنگِ جمال بھی ایک خشتِ زرین ہے۔ اس کام کو آگے بڑھانا آنے والوں کا کام ہوگا۔

اِس نظم میں شاعر نے بجائے کسی خمارخانہ کی فضا دکھلانے یا کسی میدان کارزار کا نقشہ پیش کرنے یا کسی اور منظرِ دنیاوی کو سامنے لانیکے، ہماری معاشری دنیا سے ایک دردناک منظر اخذ کیا ہے۔ اسمیں باوجود موجودہ رسم و رواج کی جکڑ بندیوں کے ایک موقع دفعتاً ایسا آتا ہے کہ عشق کا دیوتا اپنے ترکش کو خالی کر دیتا ہے اور پھر اُن کی آن میں طرفین فراقِ دوامی کی تاریک فضا میں جذب ہونے لگتے ہیں۔ ہمارے ملک کی "پس پردہ" دنیا میں اگر یہ واردات ممکن ہے تو صرف اِسی طرح اور شرم و حیا اور رسم و رواج کے پہلوؤں پر نظر کیجیے تو اسکا انجام بھی قدرتاً وہی ہے جو شاعر نے پیش کیا ہے۔ اس مُرقع محسوسات میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری مصنوعی عادات اور معاشری توقعات کی یہ سطحی چیزیں فطرتِ انسانی اور ہوس انتخابِ جنسی پر کس حد تک غالب ہیں۔ اور ہر فرد کم از کم اپنے عالمِ تنہائی اور دبستانِ خیال میں پھر بھی کس قدر آزاد اور خود مختار ہے۔ یہاں اِن سوالات سے شاعر کو کچھ تعلق نہیں کہ ہماری معاشرت میں کوئی تغیر ہونا چاہیے یا نہیں نہ اِس سے واسطہ ہے کہ زمانۂ شباب میں انسان کو کن اُصولوں کا پابند ہونا چاہیے ہے یہاں غرض صرف اِس سے ہے کہ چند مقررہ حالات میں جذبات عشق و محبت کیونکر پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے جزئی خصوصیات کیا ہیں۔

مصنف کی دوسری نظموں کی طرح یہ نظم بھی نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔ جہانتک صحتِ زبان اور تحقیقِ

لغات ومحاورات کا تعلق ہے، واقعہ یہ ہے کہ شوق مرحوم کا پایہ بہت بلند ہے انکا سا وسیع النظر جہاں دیدہ اور سچا محقق پیدا ہونا دشوار ہے جس زبان میں وہ نظم کرتے تھے وہ زبان پچاس برس قبل کے لکھنؤ کی ہے یعنی جب لکھنؤ مُردہ تھا۔ چنانچہ اُنکی زبان اُسی زمانہ کی خصوصیتوں کو لئے ہوتے ہے۔ اُنکے بعض الفاظ اور ترکیبیں بیشک ایسی ہیں جو ہم کو انوکھی اور اجنبی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس بات کو ہمیں اُنکی قدامت پرستی کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیے بلکہ اسے اکثر اُن کی تحقیق پسندی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور اُنکی ذاتی رائے پر محمول کرنا چاہیے۔ مثلاً حرف "کو" کا استعمال اُنکی نظم و نثر میں معمول سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ اگر کہنا ہو کہ "ہم لکھنؤ جاوینگے" تو وہ اکثر "ہم لکھنؤ کو جاوینگے" کہتے تھے۔ اور اسی کو فصیح خیال کرتے تھے بلکہ بعض اوقات اس "کو" کے استعمال سے بعض اہم فروق کیطرف اشارہ کر دیتے تھے مثلاً "سر کو جھکانا" کے معنی صرف سر کو جھکانا جو ایک معمولی بات ہے مگر اُنکے نزدیک اسکے مقابلہ میں "سر جھکانا" محض سرِ تسلیم خم کرنیکے معنی میں استعمال ہونا چاہیے۔ اسیطرح مصنف نے لفظ "دیدہ" بھی کثرت سے استعمال کیا ہے جو ہمکو بعض اوقات بیجا معلوم ہوگا۔ مگر مصنف نے اسپر بہت زور دیا ہے کہ اُردو میں "دیدہ" سے مراد صرف آنکھ کے ڈھیلے کی سپیدی لیجاتی ہے۔ معلوم نہیں زمانہ اس قسم کی تحقیق سے کہانتک فائدہ اُٹھانے پر آمادہ ہوگا اور مرحوم کی جفاکشانہ زندگی کے جو ساٹھ سال انہیں مشاغل تحقیق و تجسس میں گذرے اسکی داد اُنکے بعد ملنے کی کچھ توقع ہو سکتی ہے یا نہیں۔

یہ نظم اصل میں چند نظموں کا مجموعہ ہے اسکا پہلا جزو رسالہ "اردو ادیب" (فروری ۱۹۱۲ء) اور دوسرا اور تیسرا جزو "الناظر" (نومبر ۱۹۱۲ء و جنوری ۱۹۱۳ء) میں نکلا تھا لیکن مصنف نے اسکے بعد ان اجزاء پر نظرِ ثانی کی اور بہت کچھ رد و بدل کیا اور اب یہ گویا بالکل ایک نئی چیز ہے۔ مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اسکے ہر جزو کی بحر الگ ہے۔ چار "رنگ" دکھاتے گئے ہیں جنمیں ہر رنگ کی بحر اسکے مضمون کے لحاظ سے نہایت موزوں رکھی گئی ہے بلکہ نشستِ الفاظ بھی اکثر اسی لحاظ کی پابند ہے۔ دوسرے "رنگ" میں قوافی کی ترتیب ہماری زبان میں ایک نیا نمونہ ہے۔ بحریں بھی وہ ہیں جنھیں ہمارے شعرا آجکل گویا ترک کئے ہوئے ہیں حالانکہ ان بحروں کی روانی ایک خاص چیز ہے۔

اس نظم میں شاعر کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی کا ثبوت بھی قابلِ ملاحظہ ہے نازک اور مشکل مطالب کو کس صفائی اور سلاست سے ادا کیا ہے ملاحظہ ہو ؎ عشق اور حُسن کی جب نگاہیں ملگئیں ؎ دو دلوں کو بیل کی جا راہیں مل گئیں

عاشقِ ناکام اپنی نارسائی کی شہادت یوں دلاتا ہے ؎ یہ درخت یہ زمیں اور رہگذر گواہ ہے ؎ میری آنکھیں کھوئے ہیں منتظر نظر گواہ ہے
وہ بے بس لڑکی اپنی داستان کہتی ہے ؎ یہ تڑپ بدنکی ظاہر کر رہی ہیں اُچھل رہی ہیں ؎ جو جھکے ہیں پکیں تو یہ ہاتھ مل رہی ہیں
کہ نظر کے بس میں اگر وہ نکل گیا نظر سے

یہ آخری مصرعے کتنی جدت اور عمدگی سے نظم ہوتے ہیں۔ کلام پر قدرت ظاہر ہے۔
استعارے اور تشبیہیں بھی بعض جگہ عجیب مزے سے نظم ہوئی ہیں جس چیز کو جدید طرز کی شاعری کہتے ہیں اُسکا مقصد یہی ہے کہ شاعرانہ تخیل کو روایات کے شکنجے سے چھڑایا جائے۔ اسکی نظیر ذیل کے مصرعے ہیں۔

گیسوؤں کے سلسلے گالوں سے ملے ہوتے　　لال لال پھول۔ دو بیلوں میں کھلے ہوتے
کچھ لٹیں کھلی ہوئی تھیں جبینِ صاف پر　　چھوٹی چھوٹی ناگنیں تھیں زمینِ صاف پر
آنکھ سے نکلتی تھی وہ نگاہ اس طرح　　مست کی زباں سے نکلے بات جس طرح

اس آخری شعر میں بلا کی تشبیہ ہے مستی کی حالت میں انسان اٹک اٹک کر بات کرتا ہے۔ اسکی زبان بولنے میں رکتی اور لڑکھڑاتی ہے۔ یہاں آنکھ کی مستی، نیم بازی اور غالباً کسی قدر شرمیلے پن کیطرف اشارہ ہے۔ نگاہ کا مرکز نگاہ سے رُک رُک کر نکلنا یعنی اسمیں تسلسل اور استقلال کا نہ پایا جانا جو بے اختیاری جسم کیطرف اشارہ ہے ایک نہایت دلکش کیفیت پیش کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہاں آنکھوں کی مستی کا اثر نگاہ تک میں پایا جاتا ہے جو ایک لطف مبالغہ ہے۔

تیسرے دورنگ[۱] میں جنگل کا منظر بڑی روانی اور خوبی سے نظم کیا ہے۔ اسکا لطف بھی شعار کو روانی کیساتھ پڑھنے سے ہے اور اس دورنگ میں جو بحر اختیار کیگئی ہے اسکے جوہر خوب کھلتے ہیں۔ الفاظ بھی قریب قریب وہ جمع کئے ہیں کہ اصلی منظر آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ مثلاً ؎

بہت گری ہوا اس شب کو، ہیں درخت جس سے تر　　ٹپک رہی ہیں ٹپ ٹپ اُسکی بوندیں اب زمین پہ
اُدھر وہ بیلیں اور اِدھر پیڑوں کی قطار ہے　　یہ چھپ رہے ہیں پھول لالے کی بہار ہے

یہ متفرق مثالیں بلا تخصیص پیش کی گئیں مگر اس نظم کی جو خصوصیت معاملہ بندی اور ایک ایک ادا کو ظاہر کرتا ہے اور جذبات کی ترجمانی جسطرح کی نزاکتوں کو ملحوظ رکھکر کی گئی ہے اسکا اندازہ صرف مسلسل پڑھنے سے ہو سکتا ہے خاصکر وہ آخری پیام ناکام محبت اور اسیرِ قفس کیطرف سے ہے اسکو پڑھتے پڑھتے جب اِن پُر درد الفاظ پر پہنچے تو اثر آفرینی درد کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔

[۱] مصنف کی تحقیق ہیکہ چھپانا (بضم اول وسوم) شیخ منظر کیلئے آتا ہے۔ سبزہ زار کیلئے لہلہاتا بولتے ہیں اور اگر زرد منظر ہو جیسے گیندے کا تختہ تو اُسکی تعریف میں ڈہڈہاتا کہیں گے۔

گذارش

قارئین کرام ملاحظہ فرمائنگے کہ شمع میں جو تصاویر شائع ہوتی ہیں اپنی مخصوص خوبیوں کے لحاظ سے کسی تعریف کی محتاج نہیں ہیں۔ ہم نے اسپر بھی قناعت نہیں کی اور اس اصول کو پیش نظر رکھ کر کہ دنیا میں ترقی نہایت ضروری ہے۔ ایسی تصاویر فراہم کی ہیں جو یقیناً بےمثل ہیں اور اُن کے بلاک انگلستان میں تیار کرائے ہیں۔ عہد مغلیہ کی مشہور اور نادر الوجود تصاویر اودھ کے بادشاہ اُن کے اُمرا اور شعرا کے مرقعے۔ تاریخی اور یادگار تصویریں۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا دلچسپ خزانہ ہے جس کی اشاعت بہر طور ایک علمی خدمت ہے اور جس کو پبلک کے سامنے لانے میں ہم نے کثیر اخراجات کا مطلق خیال نہیں کیا۔

عمدہ اور پاکیزہ مضامین فراہم کرنا بہت دشوار ہوتا ہے لیکن الحمد للہ ہم نے اس خدمت کو بھی بہ حسن و خوبی انجام دیا اکثر مضامین دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئے ہیں اور اردو کے متعدد اخبارات اور رسائل نے حوالہ دیکر اور اکثر بلا حوالہ اور بعض اوقات ہمارے مضامین کو تخفیف و تحریف کر کے بلا تکلف شائع کر دیا۔ صحافت کے اعتبار سے اس قسم کے افعال کسی حیثیت کے ہوں مگر ہم کو مسرت ہے کہ ملک نے ہماری کوششوں کی قدر کی۔

شمع اگر ہمارا علمی شغلہ ہے تو آپکی دلچسپیوں اور دماغی ضیافتوں کا بھی ذریعہ ہے کیا شمع آپ کی علو ہمت۔ فراخدلی اور علمی فیاضی سے اسقدر توقع بھی نہ رکھے اس کو مستحکم بنانے میں آپ اپنے احباب کو خریداری پر آمادہ فرمادیں۔

یاد فرمائیے کہ

شمع کے خریداران میں جسقدر اضافہ ہوگا اسی قدر شمع کے حجم اور تصاویر میں اضافہ ہوگا۔ کیونکہ شمع کی آمدنی اسی میں صرف ہوتی ہے۔ آپ اپنی اعانت سے کسی کو ذاتی یا شخصی فائدہ نہ پہونچائیں گے۔ بلکہ خود اپنی اور اپنے احباب کی دلچسپیوں کے شاندار انتظام میں مدد دینگے

اور یہ سب کچھ

محض آپ کی ادنیٰ توجہ پر منحصر ہے

مینیجر شمع

عرض حال

ہندوستان کی تاریخ میں وہ عہد زریں بھی گذر چکا ہے جبکہ اہل ہند کیا بلحاظ علم وفضل اور بلحاظ فنون ولطیفہ وسائنس۔ خدا کی خدائی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ملکی معاشرتی زندگی عوارض سے پاک تھی۔ ان کا نظام حکومت قومی تھا جس میں تنگ دلی کی گنجائش نہ تھی اور اُن کی حکومت رعایا کے لئے رحمت تھی لیکن وہ زمانہ اب خواب وخیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا ہے یعنی ماضیہ کے ہمارے تاریخی کارنامے محض افسانے ہیں! آج دنیا کی دیگر اقوام میدانِ ترقی میں فروغ حاصل کر رہی ہیں اور ہم تاریکی میں اُن کے پیچھے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہماری روحانی اور مادی عشرت سے متاثر ہو کر انگلستان کے ایک مضمون نگار مسٹر ولیم آرچر کو کہنا پڑا کہ ہم ہندیا تو دنیا کی مہذب اقوام میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ ہیں۔ یا سب سے زیادہ مہذب ہیں۔

ہماری قومی زندگی کے انحطاط کے ساتھ ہمارا قومی ادب بھی برباد ہو گیا۔ چنانچہ فی زمانہ حصول علم کی راہیں مسدود۔ ہمارے متقدمین کے علمی کارنامے فراموش اور ان کی بے مثل تصانیف کرم خوردہ یا احسان فراموش اولاد کی نالائقی کے باعث فروخت ہو کر اغیار کے کتب خانوں کی رونق ہیں۔

ہم کو اپنی بدنصیبی سے انکار نہیں لیکن ہمت اور استقلال کے ساتھ اُن خرابیوں کو جو شاہراہ ترقی میں حائل ہیں رفع کرنے کے مستحکم نیتہ کے مقابلہ میں بدقسمتی یا بدنصیبی کی شکایت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے جس طرح مریض کے لئے سابقہ زندگی کے بدلنے کے واسطے مرض کا وجود باری تعالیٰ کی جانب سے تنبیہ کا حکم رکھتا ہے اسی طرح ایک قوم کی بدقسمتی دعوت آسمانی ہے کہ وہ اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہو۔

ہماری قومی حیات کے لئے منجملہ دیگر اصناف کے "ادب" کی تجدید تعمیر کی بھی ضرورت ہے اور اس مرتبہ کے لحاظ سے جو خوش نصیبی سے ہندوستانی زبان کو حاصل ہے ہماری قومی زبان بننے کی اس میں صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے لیکن جب تک اسکو حصول علم کا مستقل ذریعہ قرار دیکر اس کے ادب کو دنیا کی اور زبانوں کی طرح وسعت نہ دی جائے کامیابی ممکن نہیں ہے

سائنس کے جدید ترین انکشافات سے لیکر دنیا کی قدیم ترین اقوام کی فراموش شدہ تاریخ میں نہایت ابتدائی تحقیقات تک ایک انگریز کو اپنی مادری زبان میں مل سکتی ہیں اسی طرح عہد ہائے ماضی و حال کے ذہنی انکشافات یعنی ہنود اور بدھ حکماء کی نصائح سے شروع کرکے گوئٹے کی شاعری اور افلاطون کے فلسفہ کی تمام مفید اور محرک غور و فکر خصوصیات اُسکے پیش نظر رہتی ہیں لیکن ہر ایک اردو داں ان نعمتوں سے محروم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا مبلغ علم اس کی زبان کی طرح محدود ہے۔

کارکنان شمع کی دلی تمنا ہے کہ ادب اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں اور اس کے فروغ اور ثبات کے لئے امکانی کوششوں سے دریغ نہ کریں اسی لئے پبلک کے سامنے لمبے چوڑے مقاصد کا اظہار ہمارے لئے زیبا نہیں ہے البتہ ہم اسقدر ضرور عرض کرینگے کہ اسقدر قلیل مدت میں شمع نے جو ہر دلعزیزی اور کامیابی حاصل کی ہے اور جس خلوص اور جوش کے ساتھ ملک کے مقتدر جرائد اہل الرائے حضرات نے شمع کا خیر مقدم کیا ہے اس کی بناء پر یقین ہے کہ اہل وطن ہمارے مقاصد کو کامیاب بنانے میں ہماری امداد سچے دل سے کریں گے۔ اور بہت جلد اسکو ملک کا نہایت کامیاب رسالہ بنا دیں گے حصول مقصد سے قبل نہ ہم کسی تعریف کے مستحق ہیں اور نہ طلب گار۔ لیکن ہم اس اصول کو کبھی فراموش نہ کریں گے کہ ناظرین کے خیالات میں غور و فکر کی تحریک پیدا کردینا رسالہ کا اصلی مقصد ہے۔

ادب اردو میں ایک بڑا نقص جو بدقسمتی سے ہنوز موجود ہے [illegible] کہ زبان کو اظہار خیالات کا ذریعہ بنانے کے بجائے محض زبان کی طرف توجہ کیجاتی [illegible] سے میں ہم اپنی کسی ذاتی رائے سے ناظرین کو پابند نہیں کرتے ہیں۔ ہم ناظرین کے سامنے ایسے مضامین پیش کرتے ہیں جو معقول اور سنجیدہ رائے قائم کرنے میں معاون ہوں۔ اسی خیال سے ہم نے بھی اپنے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی ہے۔ اس رسالہ میں ہر قسم کے مضامین کیواسطے جگہ موجود ہے تاریخ۔ فلسفہ۔ سیاست۔ سائنس مذہب وغیرہ وغیرہ کے متعلق ہم اس قسم کے مضامین شائع کرتے ہیں جن سے فی زمانہ ایک تعلیم یافتہ آدمی کو دلچسپی ہوتی ہے یا ہونی چاہئے۔

شمع کا اجرا کسی ذاتی مقصد کی غرض سے نہیں کیا گیا ہے اور نہ کسی مالی فائدہ کی نیت سے ہماری کاوشوں اور مصروف زندگیوں کے عزیز لمحات کا بہترین معاوضہ اور ہماری تمناؤں کی حقیقی کامیابی یہ ہے کہ شمع اپنے نام کی صحیح معنوی رعایت کے ساتھ محرک خیالات ثابت ہو۔ اور یہ روشنی محفل ادب کے بعید ترین گوشوں میں بھی پہنچ سکے! اس عرض حال کے ذریعہ سے ہم اپنی صدا تمام ملک میں پہنچانا چاہتے ہیں۔ اور بہ وثوق یقین کرتے ہیں کہ ادب اردو کے سچے بہی خواہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائیں گے اور شمع کی توسیع اشاعت میں اعانت فرمانا فرض تصور فرمائیں گے۔

خاکساران

محمد حبیب (آکسن)، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس۔ بیرسٹرایٹ لا پروفیسر تاریخ و سیاسات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

حسن عابد جعفری (آکسن)، بیرسٹرایٹ لا ایڈووکیٹ

مدیران شمع۔ حسن منزل شاہ گنج آگرہ

اورنٹیل کالج میگزین

ایک سہ ماہی علمی رسالہ

اغراض و مقاصد اس رسالہ کے اجراء سے غرض یہ ہے کہ احیاء و ترویج علوم مشرقیہ کی تحریک کو تا مقدور امکان تقویت پہنچائی جاوے اور خصوصیت کے ساتھ ان طلبہ میں شوق تحقیق پیدا کیا جاوے جو سنسکرت۔ عربی۔ فارسی اور دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

کس قسم کے مضامین کا شائع کرنا مقصود ہے خالص علمی مضامین کو شائع کیا جاتا ہے جو مضمون نگاروں کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ غیر زبانوں مثلاً فرنچ۔ جرمنی۔ اطالی وغیرہا سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے اور کم ضخامت کے بعض مفید قلمی رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رسالے کے دو حصے یہ رسالہ دو حصوں میں شائع ہوتا ہے۔ حصہ اردو۔ حصہ ہندی ہر ایک حصہ

وقت اشاعت یہ رسالہ ہر سال چار بار یعنی ستمبر۔ نومبر۔ فروری اور مئی میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت اشتراک سالانہ چندہ کل رسالہ کیلئے [illegible] ہے۔ ہر حصہ کیلئے الگ الگ [illegible]

خط و کتابت و ترسیل زر خرید رسالہ کے متعلق جملہ خط و کتابت اور ترسیل زر پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کے نام ہونی چاہئے۔ مضامین کے متعلق جملہ مراسلات چیف ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں۔

محل فروخت یہ رسالہ اورنٹیل کالج لاہور کے دفتر سے خریدا جا سکتا ہے۔

قلم تحریر چیف ایڈیٹر پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور۔ حصہ اردو ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے۔ حصہ سنسکرت و ہندی کے ایڈیٹر ڈاکٹر لکشمن سروپ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور حصہ پنجابی کے ایڈیٹر بھائی جے انت سنگھ بی۔ اے ہیں۔

منیجر اورنٹیل کالج میگزین لاہور

جناب کوی علونو ڈاکٹر وید حکیم پنڈت ٹھاکر دت شرما ویدمو امرت دھارا کا تیار کردہ

چند ادویات خوبصورتی

ابٹن جیت سومی رجسٹرڈ

اس ابٹن کو غسل کے وقت استعمال کرنے سے چہرے کے بد نما داغ کیل چھائیاں وغیرہ دور ہو جاتی ہیں چہرے کی رنگت ان بن نکھر جاتی ہے اور جھریاں نہیں پڑتیں

قیمت عہ نمونہ ۲ر

دل سندری حسن افزا رجسٹرڈ

یہ غسل کے بعد استعمال ہوتا ہے یہ ایک قسم کا روغن ہے جو چہرہ کو چمکاتا ہے اور داغ وکیل وغیرہ کو دور کرتا ہے غسل کے پہلے ابٹن اور غسل کے بعد حسن افزا استعمال ہو تو کہنا ہی کیا ہے

قیمت ۱۲ نمونہ ۲ر

بشرسن رجسٹرڈ

یہ دوائی چہرہ کی چھائیوں کو اٹھاتی ہے اس سے چھائیاں دور ہو جاتی ہیں

قیمت عا نمونہ ۸ر

بال اڑانے کی دوائی

اس دوائی کو پانی میں ملا کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر نرم سے نرم جگہ کے بال صفائی و کمال حد تک سے دور ہو جاتے ہیں۔ جس نے منگوایا تعریف کی

قیمت ۱۲ نمونہ ۱ر

بال دور کرنیکی دوائی

(بال عمر بھر نہ اگیں)

اس دوائی کے ملنے سے بال عمر بھر نہیں اگتے ہیں بالوں کو صاف کر کے لگایا جاتا ہے اس سے آئندہ بال نکلنے بند ہو جاتے ہیں

قیمت عہ نمونہ نہیں ملتا

مکھ رعب رجسٹرڈ

مونچھیں بڑھانے کا تیل

یہ تیل نہ صرف مونچھوں کو بڑھاتا ہے بلکہ ہر ایک جگہ کے بالوں کو بخوبی بڑھاتا ہے اور ان کا سیاہی کو قائم رکھتا ہے اور ملائم بناتا ہے رعب دار چہرہ کیا بھلا معلوم ہوتا ہے

قیمت عا نمونہ ۴ر

باغ پھول تیل رجسٹرڈ

بالوں پر تمام تیلوں کا سرتاج ہے بالوں کو نرم و ملائم کرتا ہے بڑھاتا ہے سر کو ٹھنڈا رکھتا ہے صرف خوشبودار ہی نہیں بلکہ دماغ کے لئے نہایت مفید ہے

قیمت ایک روپیہ عہ ر

پران سکھ رجسٹرڈ

پستانوں کو ڈھلکنے سے بچاتا ہے اور ڈھلکے ہوؤں کو اصلی حالت پر لاتا ہے جو لستان واقعی عورت کے لئے وبال جان ہوتے ہیں۔

قیمت للعہ نمونہ عہ ر

المشتہر منیجر امرت دھارا امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا ڈاکخانہ امرت دھارا لاہور خط و کتابت و تار کیلئے پتہ امرت دھارا لاہور

کیا آپ ہندوستانی ہیں ؟

اگر آپ ہندوستانی ہیں تو آیورویدک ادویات آپ کو فائدہ پہنچائیں گی وہ دیگر ادویہ سے غیر ممکن ہے
کیونکہ آپ کا جسم ہندوستانی آب و ہوا کا پروردہ ہے۔ اور یورویدک ادویہ ہندوستانی آب و ہوا کے
عین موافق ہیں۔ لیکن ان کے تیار کرنے کا طریقہ درست نہ ہو تو یہ بھی مفید نہیں ہوتیں آیورویدک
ادویہ کی جان اور آیورویدک کا لب لباب جو نہایت جانفشانی اور دماغ سوزی کر کے تیار
کی گئی ہے وہ مقویات سرتاج عالم

آتنک نگرہ گولیاں

ہیں۔ جو تقریباً نصف صدی سے ہندوستان اور ممالک غیر میں اپنی فتح کا ڈنکا بجا چکی ہیں اور روز بروز
ترقی کر رہی ہیں ہر قسم کی کمزوری کو رفع کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت اور توانائی دیتی ہیں۔ بقبضیت بدہضمی
خون کی خرابی و کمی ویریہ کی ہر قسم کی شکایت .. .. کو دور کر کے پوری صحت
بخشتی ہیں۔ انسان کی ٹوٹی ہوئی زندگی کو از سر نو درست کرتی ہیں۔ قیمت رفاہ عام کی غرض سے
فی ڈبیہ صرف ایک روپیہ۔ پانچ ڈبیہ چار روپئے۔

آنکھ جو انسان کیلئے نہایت ضروری اور بے بہا تحفہ ہے اگر اسمیں کسی قسم کا خسارہ آیا تو لطف
زندگی سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔ آنکھ کی جملہ شکایات سرخی۔ پھولا۔ پانی کا بہنا۔
کم دکھائی پڑنا وغیرہ کو دور کر کے پوری صحت دینے والی آیوروید کا سار۔ نیتر انند سندار سو گئی ہے۔
قیمت فی مدد سو گئی عہ۔

المشتہر:۔ ویدشاستری مالک آتنک نگرہ اوشدھالیہ جام نگر کاٹھیاواڑ

برانچ :۔ ۶۸۵ چاندنی چوک دہلی

ایجنٹ :۔ لالہ شمبھو لال رام سروپ راوت پاڑہ آگرہ

مرقع

دارالادب لکھنؤ کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

اگر آپ کو ہندوستان کے مشہور ادیبوں مولفوں پرانا اور مستند اساتذہ کے کلام اور مضامین سے لطف اٹھانا ہے اور اردو زبان اور اردو شاعری کی حقیقی تصویر دیکھنا ہے تو مرقع منگائیے۔ ہندوستان میں کوئی رسالہ ان اغراض اور مقاصد کے ساتھ اور اپنے رنگ میں خاص امتیاز رکھنے والا آپ کو "مرقع" کے سوا دوسرا نظر نہ آوے گا۔ قیمت سالانہ پانچ روپیہ (صہ) مع محصولڈاک

ملنے کا پتہ: منیجر "مرقع" نظیر آباد لکھنؤ

اردو

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن کا سہ ماہی رسالہ جو مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے کی ایڈیٹری میں شائع ہوتا ہے اور جس میں زبان اردو اور ادب کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے اور محققانہ اور تنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں یہی ایک خالص ادبی رسالہ ہے جو اس اہم خدمت کو خاص حیثیت سے انجام دے رہا ہے۔ اردو مطبوعات اور رسالوں پر اسکے تبصرے امتیازی شان رکھتے ہیں۔ چندہ سالانہ مع محصولڈاک آٹھ روپے سکہ انگریزی [illegible]

المشتہر۔ انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد۔ دکن

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ سید سلیمان ندوی

(قیمت پانچ روپیہ سالانہ معہ محصول ۔ ۔ ۔ ۔ نمونہ کا پرچہ قیمت آٹھ آنہ)

پتہ۔ منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ

[illegible] کہانی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]	[illegible]	کہانی [illegible]	[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]

[illegible] لاہور

مردوں کو مرد بنانیوالی چھ اکسیرین

اکسیر نمبر ۵

رسالہ ... مردان ہیں
... کا بہترین ...
... آنے کے ٹکٹ آنے پر مفت
رسالہ امرت ... مشہور و معروف دوائی
... کی مفت
بھیجا جاتا ہے

المشتہر مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور ... امرت دھارا (نمبر ۱۰) لاہور

مستقل ادب کا مخصوص ترجمان

قومی فتح

جو ہر مہینہ سے ملک کی گراں بہا علمی و ادبی خدمات بجا لا رہا ہے جس میں مشاہیر ملک

کے دلچسپ اور مضامین لکھے جاتے ہیں۔ اور غیر ملکی زبانوں کے بہترین

شائع کئے جاتے ہیں۔

اگر آپ کو اعلیٰ ادب کے انقلاب آفرین تاریخی مضامین پڑھنے کا شوق ہو بہترین

افسانوں اور ڈراموں سے بہرہ اندوز ہونے کی آرزو ہو حیرت افزا معلومات اور خندہ

آفرین لطائف سے محظوظ ہونا ہو۔ اور شاعری کے وجد آفرین انتخابات سے جذبات

کو بیدار کرنا ہو تو

آج ہی

قومی فتح کے خریدار ہو جائیے۔

ہر پرچہ میں ... تصاویر نذر ہوتی ہیں۔

... ہے کہ ... تصاویر ... ان کی عظیم الشان

... ہو!

باہتمام خواجہ صدیق حسین

آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا گیا

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۴۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آلحسن
بیرسٹر ایٹ لا، ایم، آر، اے، ایس، پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و ممبر لیجسلیٹو کونسل
حسن عابد جعفری آلحسن
بیرسٹر ایٹ لا، آگرہ

دار الاشاعت
حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرے ماہ کی تاریخ ۱۵ تک رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت معہ محصول ڈاک ۱۰ آنہ ہے ممالک غیر سے عہ، نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا ہے۔

۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت و ترسیل زر چندہ و اجرت اشتہارات براہ راست مینجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

۷۔ مضامین و خطوط متعلق مضامین ایڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زر چندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔ پی منگواکر واپس نہ فرمائیے۔ جواب کے لیئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا لازمی ہے

شرح اجرت حسب ذیل ہے

مدت	¼ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	معہ/	عہ ۵/	مہ ۵/
چھ ماہ	عہ	مہ ۵/	للعہ ۵/
ایک سال	مہ	سہ ۵/	للعہ/

المشتہر:۔ مینجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ



اعلحصرت ٮواٮمعلٮ واں سعد الدوله حلال الدٮں
حلدرحں دار سعد الملک






جلد ۵ ‖ فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء ‖ نمبر ۳

تصویر } آصف جاہ وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خاں بہادر شجاع الملک

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار یک سال کے لئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا
اگر آپ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کی جائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون ۱۹۲۷ء تک جو بہترین افسانہ وصول ہوگا اُس کے معاوضہ میں چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر آپنے کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اُسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپکو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی بیش بہا نمونہ یا کوئی نہایت دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اُس کی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائینگی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپ کی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اُس پر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ

جو مضمون، افسانہ، ناول، نظم یا غزل ناپسند ہوگی وہ اگر کا ٹکٹ آنے پر واپس کردی جائے گی، البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے بہ احتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپکا کلام شائع ہوگا، بلا لحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جاوے گا۔

مطبوعات جدید

جو ۱۹۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، اُن پر دو انعامات ہیں۔
(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجیں گے، اور
(۲) دوسرا انعام حسب تجویز کمیٹی اُن کو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائیں گے۔

خادم منیجر شمع

شمع

ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء

منشی ذکاء اللہ مرحوم دہلوی

(از مسٹر سی - الیف - اینڈریوز)

ذیل کا مضمون مسٹر اینڈریوز نے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے انتقال کے بعد ہی لکھا تھا اسوقت ڈاکٹر نذیر احمد زندہ تھے - لیکن بعد میں مسٹر موصوف نے اس خیال سے اسے شائع نہ کیا کہ جب " منشی صاحب مرحوم کے حالات زندگی کتابی صورت میں مرتب کرینگے تو اسے بطور ضمیمہ شائع کردیں گے - یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون ابتک شائع نہ ہوسکا - اب مکمل حالاتِ زندگی کتابی صورت میں جمع ہوگئے ہیں اور جہاں ایک طرف وہ مشہور انگریزی رسالہ " ماڈرن ریویو " میں ماہ بماہ شائع ہوچکے ہیں وہاں دوسری طرف ان کا ترجمہ اردو کے مشہور رسالہ " زمانہ " میں بھی ماہ بماہ شائع ہوچکا ہے - جو مضمون اب

"شمع" میں شائع ہو رہا ہے وہ بعد میں اُسکو کتاب کا جزو بنا دیا جائے گا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ کتاب زیادہ سے زیادہ ۱۹۲۶ء کے وسط تک شائع ہو جائے۔

مسٹر اینڈریوز منشی صاحب کے مخلص دوستوں میں سے ہیں اور قارئین کرام مضمون سے اس محبت اور عقیدت کا اندازہ لگا سکیں گے جو اول الذکر کو موخر الذکر سے تھی۔ اور ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی

ہندوستان میں انیسویں صدی پر کسی قسم کا تبصرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اس میں ایک نہایت اہم حقیقت کو یعنی اس ذہنی جمود کو شامل نہ کیا جائیگا جس نے کچھ عرصہ تک اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں مسلمانوں کی قومی ترقی کو روکے رکھا۔ ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان ہی سب سے زیادہ مایوس تھے۔ جس شک و شبہ کی نظر سے انگریز انہیں اسوقت دیکھتے تھے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے لیڈروں کی اسپرٹ کو کچلا جا رہا ہے۔ اسوقت صرف ردِ عمل کی آوازیں بلند کیجا رہی تھیں۔ اس طرح سے کئی قیمتی سال گذر جانے کے بعد تحریک علیگڈھ کی ابتدا کی گئی لیکن اس نے بھی باوجود اس حقیقت کے کہ وہ بہت شد و مد کے ساتھ شروع کی گئی تھی۔ ابتدا میں مسلمانوں کے صرف محدود طبقہ پر اپنا اثر ڈالا۔ عرصہ دراز تک مغربی تعلیم اکثر مسلمانوں کے لئے نفرت انگیز چیز رہی۔ غالباً یہ کہنا بجا ہوگا کہ ۱۱-۱۹۱۰ء تک ترقی کی جانب لیجانے والی کوئی عام تحریک موجود نہ تھی۔

جو بیداری حال میں پیدا ہوئی ہے اس نے اس خیال کو حیرت انگیز طریقہ سے غلط ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں سیاسی تحریک دوسری سمتوں میں ترقی کو روک دینے کا باعث ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری سیاست کی رہین منت رہی ہے۔ لیکن جیسا کہ لبا اوقات ہوا ہے سیاسی ترقی تیزی کے ساتھ ذہنی جدوجہد میں مبدل ہو گئی ہے سیاسی لہروں کے مد نے اس تعلیمی جمود کو جو اتنے عرصہ سے غیر متحرک رہا ہے، بہا کر دور پھینکدیا ہے اور اب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں نمایاں ترقی ظہور میں آچکی ہے۔

انجام کار ہمارے ہندوستان کو اسلام کی موجودہ ترقی کرنے والی تحریک سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے بشرطیکہ دانشمندانہ اور فیاضانہ طرز عمل اختیار کیا گیا اور جدید تعلیم سے تمام وکمال استفادہ حاصل کیا گیا۔ بمقابلہ دوسرے اسباب کے سب سے زیادہ ایک چیز نے ہندوستان کی دو عظیم الشان قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور وہ چیز جہالت ہے، اس لئے کہ جہالت (جہاں کہیں بھی وہ پائی گئی ہے) غیر بردباری کی ماں ثابت ہوئی ہے۔ جب تک ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی جمود رہا اس وقت تک اس امر کا احتمال تھا کہ عدم مفاہمت باہمی بدفرقگی اور بے اعتمادی کا باعث ہوگی اور یہ کہ ان عناصر کے باہمی اتصال کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام میں استبداد کی اسپرٹ عام ہو جائیگی۔ اب جبکہ مسلمانوں کی قوتیں دانشمندانہ رہبری کی بدولت تعلیمی جد و جہد کی جانب منعطف کر دی گئی ہیں ہر شخص کو جسے ہندوستان سے کچھ بھی محبت ہے، یہ امید پیدا ہوگئی ہے کہ اس خطرہ کا تدارک ہو جائے گا۔ دنیا کے ہر ملک میں رہنمائی کا کام نسبی یا نسلی سیادت سے ہٹ کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آرہا ہے جو ذہانت کی سیادت رکھتے ہیں اور جب لازمی تعلیم عوام تک پہنچ جائے گی اس وقت سیادت کی تبدیلی یقینی ہے۔ ہندوستان میں پُرامن انقلاب کا انحصار کسی اور عنصر کے مقابلہ میں صرف تعلیم کی ترویج پر ہے۔ اور یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قوم جو بہت ہی پسماندہ ہے، تلافی مافات کرے۔

اسلامی تہذیب و ترقی کی نشو و نما جن اصولوں اور اسباب پر مبنی تھی ان پر مناسب غور و خوض کرنے سے بھی مقصد برآری ہو سکتی ہے۔

ان اصولوں میں سے ایک اصول جس پر قرآن مجید میں بھی زور دیا گیا ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں پر فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ علم کی تحصیل کریں خواہ علم چین ہی میں کیوں نہ پایا جائے۔[1] [2]

[1] فاضل مضمون نگار نے غلطی سے حدیث کو قرآنی آیت سمجھ لیا ہے۔ (مترجم)

[2] [illegible]

اسی اصول کی مطابقت میں تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ بن گیا ہے کہ جب کبھی اسلامی تہذیب کسی دوسرے ذہن اماحول سے دوچار ہوئی ہے اس کا نتیجہ لازمی طور پر ترقی اور روشنی کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

مثلاً عربوں کا ایک جانب بازنطینی تہذیب اور دوسری جانب ایرانی تمدن کے ساتھ تعلقات رکھنے کا یہ اثر ہوا کہ عربوں کے تہذیب و تمدن کو قابل یادگار ترقی نصیب ہوئی۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ اور علوم و فنون کے بہت سے خزانے دنیا کے بزرگ ترین خلفا کے ترقی پرور عہد حکومت میں دمشق اور بغداد کے علما و فضلا کے جوش، جدوجہد اور وسیع الخیالی کی ہمہ گیر اسپرٹ کے باعث آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لئے گئے۔ اور جب تک اُن کی طاقت قائم و برقرار رہی اس وقت تک بردباری اور آزادخیالی کی وسیع راہیں ذہنی ترقی کے لئے کھلی رہیں۔

آل عثمان کے زبردست سلاطین کے عہد حکومت سے بھی جو ۱۴۵۳ء میں سقوط قسطنطنیہ کے بعد سے شروع ہوا، دوسری مثال اخذ کیجا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں دول یورپ کے ساتھ ترکوں کا جو تعلق پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں باہمی مفاہمت رونما ہو گئی اور معاشرتی آزادی کی روح وسیع تر ہو گئی۔ بلاشبہ یہ امر اُس فوجی فتح سے کم حیرت انگیز نہ تھا جس کے باعث وہ تعلق پیدا ہوا۔ پروفیسر بوری رقمطراز ہے کہ "ساری عیسائی دنیا میں اس زمانہ میں غالباً کوئی حاکم ایسا نہ تھا جو سلطان سلیمان کی طرح انصاف کرنے کی غیر تصنع آمیز خواہش یا سچا ارادہ رکھتا ہو"

مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ہندوؤں کے تہذیب تمدن کے ساتھ آمیزش کی داستان بھی اسی تاریخی سبق کو پیش کرتی ہے۔ اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کی ترقیاں مغلیہ حملہ آوروں کی نوخیز قوت اور زندگی بخش طاقت کے مقابلہ میں قدیم ہندوستانی تہذیب کے ملاپ کی کچھ کم رہین منت نہ تھیں۔ اس زمانہ میں ذہنی ترقی اطراف و اکناف

میں پھیل گئی تھی اور مذہبی بردباری کا ہر جگہ دور دورہ تھا۔

اس اہم نکتہ کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ امر مسلمہ ہے کہ جہاں کہیں اسلام جدید علوم و فنون کی شاہراہ پر گامزن ہوا وہاں اس نے اپنے ماحول سے مناسبت اور مطابقت کرنے کی اُن قوتوں کا اظہار کیا ہے جو آزاد و خیالانہ ترقی کی سچی دلیل ہیں۔

حضرت محمد (صلعم) نے جو حکم اپنے متبعین کو دیا تھا یعنی یہ کہ "علم کی تلاش کرو جہاں کہیں وہ بھی پایا جائے" اُس کی دانشمندی تجربہ سے ثابت ہو گئی ہے۔ جب کبھی اس حکم کی وسیع مطابعت کی گئی ہے اسلام بے انتہا ترقی کی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی وسیع ترقیاں اس کی شاندار جن کی فتوحات کے بعد عمل میں آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیان اسی کے ابتدائی زمانہ پر بالکل صادق آتا ہو۔ لیکن اس کے سارے زمانوں پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ اور کم سے کم آج تو بالکل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً جو تحریکیں ہم اسلام میں ہر جانب دیکھ رہے ہیں خواہ وہ ٹرکی میں ہوں یا ایران میں، ہندوستان میں ہوں یا شمالی افریقہ میں، وہ کسی عظیم الشان فوجی کارنامہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ تر تعلیمی تحریک کا ماحصل ہیں جسکا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اپنے میں جذب کیا جائے۔

کئی برس ہوئے مجھے کیمبرج میں جدید ترکی انقلاب کے ایک لیڈر کے ساتھ گہری ملاقات کرنے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ تمام تحریک کی تہ میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ مغربی علوم و فنون کی آزادانہ قبولیت اور انجذاب ہے۔ انکا شمار ان سچے مسلمانوں میں ہے جن سے میری کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ میری ان سے ملاقات ایسے زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ وہ پناہ گزیں کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم تھے اور جبکہ ٹرکی میں کسی انقلاب کے امکان یا اس ملک میں اسلام کی کسی اصلاح کے خیال سے بڑھکر اور کوئی بات مایوسانہ نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے شخص کی حیثیت سے

وہ اس عظیم الشان اصول پر سختی سے جمے رہے اور اپنی تحریرات کے ذریعہ انہوں نے اُن لوگوں میں بھی وہی روح پھونک دی جو اُن کی تعلیمات کے (جن کی تہ میں مذکورہ بالا اصول کام کر رہا تھا) پیرو تھے۔ واقعات نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ان کی تشخیص صحیح تھی اور یہ کہ جس علاج کی انہوں نے جا و بیجا تلقین کی تھی وہ ناکافی نہ تھا۔

اسلام کے ترقی کے ساتھ جو گہری دلچسپی مجھے ہوئی اس کا بیشتر حصہ منشی ذکاءاللہ کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے، یہاں تک کہ جن خیالات کا اظہار میں نے اوپر کیا ہے انہیں بھی انہی کے خیالات کی خوشہ چینی سمجھنا چاہیئے۔ ان کی پوزیشن کو واضح کرنے کی غرض سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔ وہ دارالسلطنت دہلی میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سالہائے دراز سے اُن کا خاندان آل تیمور کے شاہی گھرانے کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نگران و ذمہ دار تھا۔ انہوں نے تہذیب شائستگی کی اعلیٰ روایات کو جو عہدِ مغلیہ کے ابتدائی دور سے اُنہوں نے ورثہ میں پائی تھیں، جوں کا توں برقرار رکھا۔ نوعمر ذکاءاللہ کو قدیم دہلی کا وہ زمانہ یاد تھا جبکہ اس پر مغربی تہذیب کا اثر نہ پڑا تھا۔ ان کی زندگی کی مابعد کی روش اور ان کے بڑھاپے کے اعتقادات کا خیال کرتے وقت ضروری ہے کہ اس واقعہ کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

نوعمر لڑکے کی والدہ دہلی کی نہایت مشہور خواتین میں سے تھیں۔ وہ بہت عقلمند اور کیرکٹر کی مضبوط تھیں اور اپنے بچوں کی نہایت شفقت مگر سختی کے ساتھ رہنمائی اور نگرانی کیا کرتی تھیں۔ ذکاءاللہ ان کے بغایت درجہ شکر گزار تھے اور محسوس کرتے تھے کہ وہ فرض شکر گذاری سے کبھی عہدہ برآنہ ہو سکیں گے۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اپنے انتہائی بڑھاپے کے عالم میں جب کبھی وہ اپنی مادرِ مہربان کا ذکر فرماتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ تمام عمر وہ اپنی والدہ سے مشورہ کئے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرتے تھے وہ اُن بڑے ہندوستانیوں میں سے ہیں جن کے کیرکٹر کو ماں کی محبت نے ابتدائی زمانہ

سے سانچہ میں ڈھالدیا تھا۔ ان کے والد علومِ قدیمہ کے زبردست فاضل تھے اور اپنی ایرانی ادبی تہذیب وشائستگی کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور تھے۔ قدیم ایران کی ساری تہذیب کو انہوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ اپنے بیٹے کو منتقل کردیا تھا۔

جب نوعمر ذکاء اللہ اپنے عنفوانِ شباب کو پہنچ رہے تھے اس زمانہ میں مغلیہ دربار اور شہر دہلی میں عظیم الشان تبدیلیاں ظہور میں آرہی تھیں۔ تیموری خاندان جو عرصہ دراز سے اپنی سابقہ شان وشوکت اور ٹھاٹھ کا محض ہیولیٰ رہگیا تھا، اب تباہی کے قریب آن لگا تھا۔ دہلی میں برطانوی ریزیڈنسی کے قیام کے ساتھ ساتھ مغلوں کے شہر میں جدید مغربی علوم کی ترویج شروع ہوگئی۔ قدیم دہلی کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور نوعمر منشی ذکاء اللہ جبکہ ان کی عمر صرف بارہ برس کی تھی، اپنے باپ کے ایماء سے وہاں بھیجے گئے اور طالب علم کی حیثیت سے وہاں داخل ہوگئے۔ قدیم درباری علوم کی بجائے یکایک مغربی علوم جدیدہ کا جگہ لے لینا یقیناً پریشان کن ہوا ہوگا۔ ذکاء اللہ نے ابتداہی سے اعلیٰ درجہ کی ذہانت کا اظہار کرنا شروع کردیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ریاضی اور سائنس میں اپنے ذہین ہم سبقوں کی پارٹی میں سب نمایاں رہتے تھے۔

نوعمر طالب علم نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ علوم میں ترقی کی۔ بعض دفعہ بیکن کیطرح ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وہ تمام علوم پر یکساں حاوی ہیں"۔ انہوں نے عربی وفارسی کے اسباق کو برابر جاری رکھا، انگریزی اور تاریخِ ہند میں اپنے مابعد کے علم کی بنیاد ڈالی اور نیچرل سائنس کی تقریباً ہر شاخ کا مطالعہ کیا اور ریاضی میں خاص مہارت پیدا کی۔ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان میں مغربی علم کے مختلف شعبوں میں رہ نوردی کرنے والے طلباء کے دور اول میں تھے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائیگی کہ وہ نصاب کیا کچھ کارنامہ ہوگا۔

اب ہم ان کی زندگی کے شاندار پہلو سے ہٹ کر ان کی گھریلو زندگی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بجائے خود بے انتہا پاکیزہ ہے۔ انہیں اپنی والدہ سے جو گہری عقیدت تھی،

اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی سے انہوں نے دوسروں پر رحم کھانا اور ان کے جذبات کا احترام کرنا سیکھا تھا اور جوں جوں ان کی عمر زیادہ ہوتی گئی یہ صفات ان کی سیرت کا نمایاں جزو بنتی گئیں۔ مزید براں اُن میں حد درجہ کی ایمانداری اور حیرت انگیز محنت پسندی تھی۔ بہت کم ہندوستانی ایسے ہیں جنہوں نے ان کی سی روزانہ محنت کی زندگی بسر کی ہو۔ اپنی تمام عادات میں وہ بہت سادہ تھے۔ ان کا طریق عمل خاص وضع کا پابند تھا۔ وہ بہت باقاعدہ تھے۔ ان کا جسم اگرچہ بظاہر بہت نازک اور نحیف معلوم ہوتا تھا تاہم وہ درحقیقت بہت جوش اور طاقت سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ ان کی محتاط روشِ زندگی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سال تک جبکہ ان کی عمر تقریباً ۸۰ برس کی ہو گئی تھی وہ (جیسا کہ انہوں نے مجھ سے بیان فرمایا) ایک مرتبہ بھی بیمار نہ پڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل بن سکے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں اُن کے چہرے پر شرافت برستی تھی۔ اُن کے چہرے کے ہر خط سے مہربانی اور سادگی ہویدا تھی اور اُن کی آنکھوں کی روشنی میں اس وقت ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی جبکہ وہ اپنے اعزا اور احباب کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونا گویا ادب و اخلاق و خوش مزاجی کا سبق لینا تھا۔ اپنے مہمانوں کو آرام و آسائش پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان میں قدیم وضع کی شرافت اور تہذیب و شائستگی جلوہ گر تھی جو معلوم ہوتا ہے ان کے خاندان میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہونے کے باعث نسلاً بعد نسل چلی آتی تھی۔

نو عمر ذکاء اللہ نے کالج کی زندگی ختم کرتے ہی تعلیمی کام شروع کر دیا اور پروفیسر اور انسپکٹر کی حیثیت سے ان کی محنت و مشقت نہایت مسلسل رہی جس میں غدر کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے خوفناک رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔ غدر کے باعث ذکاء اللہ کا خاندان سخت ترین مصیبت اور عسرت میں مبتلا ہو گیا۔ خود اُن کی زندگی ایک سے زیادہ مرتبہ خطرہ میں پڑ گئی محض اس سبب سے کہ ان کا عوام جدید انگریزی علوم سے وابستہ تھا۔ وہ شاذ و

نادر ہی ان ایام کا ذکر کرتے اور جب وہ کر بیٹھتے تو نہایت ہی خوف و دہشت کے جذبات کے ساتھ ذکر فرماتے اس لئے کہ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اور نیز ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے پرانی حکومت کی تباہی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو، وہ جانتے تھے کہ اگر باغیوں کو کامیابی ہو گئی تو ملک میں کس قدر ابتری و تباہی رونما ہو جائیگی - جدید ہندوستان کی نجات تو کم سے کم ان کے ذریعہ سے ناممکن تھی۔

غدر کے کچھ عرصہ بعد منشی ذکاء اللہ الہ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں وہ میور گورنمنٹ کالج میں "السنۂ مشرقیہ اور سائنس" کے پروفیسر اوّل مقرر کئے گئے تھے - یہاں پر سب سے اول انہوں نے اپنے آپ کو طلبا میں اپنی شرافت طبع اور حُسن اخلاق کے باعث ہر دلعزیز بنایا۔ ان کے سوانح حیات لکھنے کے دوران میں مجھے ایک نہایت ہی محبت آمیز چٹھی ان کے ایک رفیق کار سنسکرت کے پروفیسر کی طرف سے موصول ہوئی تھی جو محنت و مشقت کی ملازمت کے بعد کنارہ کشی اختیار کر کے اب الہ آباد میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں یہ خط ہمدردی کی ان بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جو منشی ذکاء اللہ اور تعلیم یافتہ ہندو شرفا میں پائی جاتی تھی۔

اِس قدیم دوست سے میرے اپنے تعلقات اُس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں جبکہ میں اُن سے دہلی کے ریڈنگ روم میں ملا کرتا تھا۔ موسم گرما میں ہر شب کو لائبریری کی چھت پر ایک قسم کی ادبی کلب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور عام دلچسپی کے مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی۔ شمالی ہندوستان میں اس سے زیادہ شاندار اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آسکتا تھا - ڈاکٹر نذیر احمد اس کلب کے مسلّمہ لیڈر تھے اور ان کے گرداگرد ہندو اور مسلمان دونوں مجتمع ہوا کرتے تھے - اثنائے بحث میں کبھی کبھی کوئی ہمدرد انگریز عہدہ دار بھی شرکت کرنے کے ارادہ سے آ شریک ہوتا تھا۔ منشی ذکاء اللہ ان مباحث میں تمام مسائل کے متعلق حیرت انگیز وسعت معلومات کا اظہار کرتے تھے جو ہمیشہ ان کے آڑے آتی تھی اور میں نے تو شاذ و نادر ہی ایسے شخص

سے ملاقات کی ہے جو ان کی طرح وسیع معلومات رکھتا ہو۔ یہ مجمع اب منتشر ہو چکا ہے ۔ منشی ذکاء اللہ انتقال کر گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور رائے پیارے لال دونوں اپنی خرابی صحت کے باعث شرکت کرنے سے معذور ہیں۔ نئی پود میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو زمانۂ گذشتہ کے ان "دیووں" کا مقابلہ کر سکے۔

اس صحبت میں شریک ہونے والے شخص کے تخیل پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر پڑتا تھا وہ باہمی بردباری کی انتہائی شرافت تھی جو مذہبی تلخی یا تعصب کے ہر داغ سے مبرا تھی اور یہ وہ ماحول تھا جس میں سیاسی فراست ترقی پا سکتی تھی اور معاشرتی درستی پختہ ہو سکتی تھی۔ ان تمام برسوں میں جن میں منشی ذکاء اللہ سے میرے تعلقات رہے، میں نے جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کر سکتا ہے کسی ہندو یا ہندوؤں کی کسی مذہبی رسم کے بارے میں کبھی ان کی زبان سے ایک دفعہ بھی کوئی تلخ یا غیر شریفانہ لفظ نہیں سنا۔ برخلاف اس کے میں نے انہیں ہمیشہ ان لوگوں کا احترام کرتے ہوئے دیکھا ہے جو اعتقادات کے معاملہ میں اُن سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ جہاں کہیں وہ گئے، انھوں نے ہمیشہ صلح جوئی اور رواداری کے حق میں اپنا اثر استعمال کیا۔

ذکاء اللہ اپنے الہ آباد کے زمانۂ قیام میں تحریک علیگڈھ کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہے جو سر سید احمد خاں کی رہنمائی میں شروع کی گئی تھی۔ سر سید ان کے گہرے ذاتی دوست تھے اور ان سے یا ڈاکٹر نذیر احمد سے صلاح لئے بغیر شاذ و نادر ہی کوئی اہم کارروائی انجام دیتے تھے۔ عرصۂ دراز تک تحریک علیگڈھ ڈانواڈول رہی۔ شمال کا رجعت پسند فریق بہت طاقتور تھا اور سر سید احمد کی اپنی زندگی ان کے ترقی یافتہ خیالات کے باعث متعصب ملاؤں کی وجہ سے ہر وقت خطرہ میں رہتی تھی۔ انہیں کھلم کھلا کافر کہا جاتا تھا اور بہت سی مساجد میں وعظوں کے ذریعہ ان پر سختی سے حملے کئے جاتے تھے۔ منشی ذکاء اللہ ظلم و تشدد کے اس دور میں بہادرانہ طریقہ سے ان کی مدافعت کرتے رہے۔ وہ علیگڈھ انسٹیٹیوٹ کے سر برآوردہ ممبروں میں سے تھے اور اسکے

متعلقہ پریس (چھاپہ خانہ) کو انھوں نے اپنی تمام ابتدائی کتابیں بغرض اشاعت دیدی تھیں۔ وہ کالج کے ٹرسٹی اور بہت پرجوش کارکن تھے۔

ذکاء اللہ ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد پورے انہماک کے ساتھ ادبی مشاغل میں مشغول ہو گئے۔ انھوں نے سادہ اور شستہ زبان میں انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ پر بہت سی جلدیں لکھی ہیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کتابیں اور نیز ان کے مضامین اور کتب ریاضی ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیں گی۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ان کی یہ امید کہاں تک بارآور ہوگی۔

انتقال سے پیشتر ذکاء اللہ مجھ سے افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ ابھی سے میری کتابوں کی فروخت تقریباً رک سی گئی ہے لیکن خواہ یہ صحیح صورت حالات ہو یا نہ ہو اور خواہ ان کی ہر دلعزیزی دوبارہ زندہ نہ ہو سکے، یہ حقیقت فراموش نہیں کیجا سکتی کہ وہ ان اولین اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اردو زبان کے ذریعہ مغرب کے علوم جدیدہ کو روشناس کرانے کی اہم خدمت انجام دی۔ جہاں ایک طرف ہندوستان کے دوسرے صوبے خالصتہً انگریزی تعلیم کی رو میں بہے چلے جا رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ انگریزی ہی بہترین ذریعۂ تعلیم ہو سکتی ہے، وہاں دوسری طرف منشی ذکاء اللہ نے اپنی تحریرات کے ذریعہ ثابت کر دکھایا کہ علوم جدیدہ کے نہایت ادق اور انتہائی مضامین بھی اردو کی کتب نصاب کے ذریعہ پڑھائے جا سکتے ہیں۔ آج ہم رابندرا ناتھ ٹیگور کے کارناموں اور زبردست اثر کی وجہ سے بنگال میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ مادری زبان کی محبت از سر نو زندہ ہو رہی ہے اور سائنٹفک کتابیں بنگالی میں تحریر کی جا رہی ہیں۔ جو بات کہ اب بنگالی لٹریچر میں وقوع میں آ رہی ہے بعینہ وہی بات اردو کے لئے ہمیشہ منشی ذکاء اللہ کے پیش نظر رہی اور انھوں نے اس کے حصول تکمیل کے لئے انسانی طاقت سے بڑھ کر کوشش کی۔ بحیثیت انشاپرداز کے وہ اپنے دو دوستوں ڈاکٹر نذیر احمد اور حالی سے بہت پست ہیں، لیکن

ان کی اُردو ان تمام مصنوعی ترکیبوں اور لفاظیوں سے حیرت انگیز طور پر مبرا ہے جن کے بوجھ سے اس دور کی ابتدائی زبان دبی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ درحقیقت موجودہ اُردو لٹریچر کے بانیوں میں سے تھے۔

اگرچہ منشی ذکاء اللہ تحریر، تعلیم اور گفتگو میں اپنی مادری زبان کے سوائے کسی اور زبان میں اظہار خیال کے عادی نہ تھے تاہم وہ ان تمام انگریزی کتب کے پڑھنے کے بیحد شوقین تھے جو انہیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ وہ ریاضی داں ہونے کی حیثیت سے جدید سائنس کے بغایت درجہ معترف تھے اور اس طرح سے وہ ماضی اور حال، مشرق اور مغرب کا حیرت انگیز اجتماع پیش کرتے تھے۔ وہ عربی تہذیب اور ایرانی تمدن کی گذشتہ شاندار روایات کا بیحد احترام کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ علوم جدیدہ کی انتہائی ضرورت کو تسلیم کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ وہ سختی کے ساتھ اپنی مادری زبان کے ساتھ چپکے رہے اور آخر وقت تک اسے انگریزی کے حق میں ترک کر دینے کی خواہش کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی نوع مزاحمت پسند تھے اور اس امر کے خواہشمند تھے کہ کسی طرح زمانہ کی رفتار کو پیچھے کر دیں۔ برخلاف اس کے انہوں نے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اپنی امکانی طاقت کے ساتھ تحریک علیگڈھ کو ترقی دی جس کے طریقے کم سے کم انگریزی تعلیم کے متعلق ان کے ذاتی خیالات سے بیحد مختلف تھے۔

مگر محض قدیم دنیا کی تہذیب، اخلاق اور وضعداری کا نمائندہ ہونا ہی کوئی ایسی بات نہیں جو منشی ذکاء اللہ کو انیسویں[19] صدی کے قابل احترام ہندوستانیوں کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ٹھہراتی ہو۔ اس اعزاز کے لئے ان کے حقیقی دعوی کا انحصار اس امر پر ہے کہ انہوں نے لبرل تعلیم کی اشاعت میں مخلصانہ اور پُرجوش کوشش کی اور اس کے اصولوں کے ساتھ نہ ڈگمگانے والی وفاداری برتی۔ اور یہ سب کچھ ایسے زمانہ میں کیا گیا جبکہ ملک غایت درجہ کی پریشانی اور انقلاب میں سے گذر رہا تھا، جبکہ لوگوں

کے خیالات منتشر اور غیر یقین ہو چکے تھے۔

اولاً انہوں نے حیرت انگیز دوربینی کے ساتھ یہ دیکھ لیا تھا کہ خود ان کی قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ ملک ہی کو اپنا ملک خیال کرلے اور اسے کسی نوع غیر ملک نہ سمجھے۔ وہ مسلمانوں کی جانب سے علیحدگی کی ہر ایسی پالیسی کے سختی کے ساتھ مخالف تھے۔ ان کے اعتقاد میں ایسی علیحدگی ان کے ہم مذہب کی صحیح اسپرٹ کے خلاف تھی۔ وہ اس خیال کو برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ اسلام کے متعلق دوسرے لوگ خواہ وہ اس کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں، یہ خیال کر بیٹھیں کہ اسلام بردباری نہیں سکھاتا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کے دامن سے ہر ایسا دھبہ دور ہو جائے اور تمام دنیا پر اس کی عجیب غریب سادگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اسی غرض سے وہ الہ آباد اور دہلی میں آزادی کیساتھ دوسرے مذاہب کے پیرؤں سے ملا کرتے تھے اور اسی غرض سے وہ ہر بات میں مثلاً لباس طریقہ زندگی، گفتگو اور عادات میں ہندوستانی ہی رہے ان کی رائے تھی کہ وہ مادری زبان جسکا ہندو اور مسلمان یکساں طور پر مطالعہ کریں، جس میں وہ گفتگو کریں اور جس سے انہیں سچی محبت ہو، دونوں قوموں کے درمیان نہایت ہی مقدس رشتہ ہے اور انکی تمام عمر اسی رشتہ کو مضبوط کرنے میں صرف ہوگئی اگرچہ ان جیسی لیاقت کے شخص کے لئے انگریزی میں بولنا اور لکھنا آسان ترین کام تھا۔ میں نے بارہا انہیں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے اور اثنائے گفتگو میں وہ اس شخص کے سے زور اور یقین کا اظہار کرتے تھے جسے اس بارے میں زندگی بھر کا تجربہ ہو۔ انہیں اپنی قوم سے بیحد محبت تھی اور وہ اُن درسگاہوں اور تحریکوں کی مقدور بھر کوشش کرتے تھے جن کی نسبت انہیں یقین ہوتا کہ وہ تعلیمی لحاظ سے اس کی ترقی کا باعث ہونگی لیکن سب سے بڑھ کر انہیں اس تعلیم پر اعتماد تھا جو زندگی کے ذریعہ یعنی ہمسایوں کے تعلقات مہربانی آمیز ہمدردی، معاشرتی روابط اور باہمی میل جول کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ مطالعہ تاریخ نے ان پر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح کردی تھی کہ صرف خیالات کے ایسے امتزاج کے دور میں جبکہ

رائے کی آزادی اور بردباری علانیہ تسلیم کرلی گئی ہو، ترقی، روشنی اور اعلیٰ تمدن بڑھ رہے ہیں۔ تاریخی تقابل کی شکل میں اگر منشی ذکاء اللہ کا اپنا تخیل پیش کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اکبر اعظم کا عہد معدلت گستر جبکہ مغلیہ دربار کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے قابل اشخاص کے لئے یکساں طور پر کھلا ہوا تھا ہی وہ زمانہ تھا جسے وہ آئیڈیل کے طور پر اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر وہ انگلستان میں ہوتے تو وہ گلیڈاسٹون اور برائٹ کی پارٹی کے لبرل ہوتے۔ وہ کیتھولک ایمینسی، پیشن ایکٹ یا آئرش چرچ ڈس ایسٹیبلش مینٹ جیسے قوانین کی پورے طور پر تائید کرتے۔

ثانیاً وہ دہلی کی روبہ تنزل مغلیہ سلطنت کے متعلق اپنے تجربہ سے اور نیز اپنی عظیم الشان تاریخی تحقیقات سے اس بات کے قائل تھے کہ صرف کسی جدید اور مقابلتہً زیادہ نوعمر تہذیب کے اتصال ہی سے زندگی اور طاقت ان کی قوم میں بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان میں آسکتی ہے۔ انہوں نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ مغربی تعلیم ہی اپنی بہترین اور پاکیزہ ترین شکل میں اس اتصال کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور اس لئے وہ اس کے پرجوش حامی اور وکیل ہوگئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی تمام زندگی ہی اپنے ہم قوموں کو یہ اصول ثابت کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہوگئی۔

اس مقام پر وہ تاریخی تقابل پیش کرنے کے عادی تھے۔ اپنی سرگرم آرزوؤں اور مقاصد کی تصدیق کے لئے وہ اسلامی تاریخ کے ان دوروں کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھتے تھے جبکہ مشرق اور مغرب میں باہمی اختلاط بالکل آزادانہ تھا، مثلاً وہ اسپین میں عربوں کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھتے جبکہ قرطبہ مغربی یورپ کے لئے روشنی اور علم کا مرکز بن رہا تھا اور پھر محبہ سے تبسم کے ساتھ فرماتے: "ہم یورپ سے آج اس قرض کی کچھ ادائیگی واپس طلب کرتے ہیں جو اس کام کے سلسلہ میں ہمارا ہاتھ ذمہ نکلتا ہے۔ جسے ہم نے از منۂ وسطیٰ میں تمہارے لئے انجام دیا تھا۔ اسوقت آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبا سائنس اور ریاضی سیکھنے کے لئے اسپین جایا کرتے تھے۔

اب ہم اُس لئے تمہارے پاس آرہے ہیں۔"

اس فقرے میں مہربانی آمیز مذاق سے بڑھکر ایک لطیف حقیقت مضمر ہے۔ اس میں اس سچائی کا اعتراف موجود ہے کہ علم کی دولت سب کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہمہ گیر ملکیت ہے جو اگر آج ایک قوم کے پاس ہے تو کل دوسری کے پاس۔

رابندرا ناتھ ٹیگور نے ایک شریفانہ اور فیاضانہ مضمون کے دوران میں ہندوستان کے مستقبل کا مطمح نظر پیش کیا ہے، ایسا مطمح نظر جس میں ہندو مسلمان اور عیسائی سب مل کر موجودہ ہندوستان سے زیادہ عظیم الشان ملک تعمیر کریں۔ وہ آخری صدی کے بڑے بڑے ہیروز مثلاً راجہ رام موہن رائے جیسے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے اپنی زندگیاں بسر کیں۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہیں:-

"عجیب غریب فیاضانہ دل و دماغ کے ساتھ راجہ رام موہن رائے مشرق سے دست بردار ہی کئے بغیر مغرب کو قبول کر سکتے تھے۔ انہوں نے ہمارے لئے بنی نوع انسان کا دائمی ترکہ یعنی سچائی کا آزاد ورثہ چھوڑا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی روح کو سکڑنے نہیں دیا اور نہ اس کے گرداگرد جھاڑیاں پیدا کرکے اس کی نمو کو ٹھٹھرنے دیا۔ بلکہ انہوں نے اسے جگہ اور وقت کے اعتبار سے پھیلنے دیا۔ انہوں نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کیا، لہٰذا وہ ابھی تک ہندوستان کی از سر نو تعمیر میں ایک قوت ثابت ہو رہے ہیں۔ کوئی اندھی عادت، کوئی بے معنی فخر انہیں زمانہ کی رَو کے خلاف چلنے کے مقصد سے احمقانہ جنگ کرنے پر مائل نہیں کر سکا۔ انہوں نے اس مقصد کا جو ماضی میں ختم نہیں ہوا بلکہ مستقبل کی جانب گامزن ہے، رکاوٹوں اور مشکلات کو ٹھکرا کر ایک ہیرو کی طرح علم بلند کیا ہے۔

یہ الفاظ زندگی کے مقابلۃً کم نمایاں حلقہ میں منشی ذکاء اللہ کے کام پر چسپاں ہو سکتے

ہیں۔ اُنہوں نے بھی مشکلات کی پروانہ کرکے آزاد خیالی کا جھنڈا بلند کیا ہے، اُنہوں نے بھی ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کرنے میں امداد دی ہے اور اُنہوں نے بھی اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا ہے کہ کس طرح سے مشرق کو مسترد کئے بغیر مغرب کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔ اے

خواتین ٹرکی کی آزادی اور تعلیم اسلام

جناب مولوی فضل الرحمٰن خاں صاحب بی۔ اے، ال۔ ال۔ بی (علیگ)

زمانہ حاضرہ میں سلطنت ٹرکی میں جو عظیم انقلاب پیدا ہوا ہے اس نے استبدادیت کا خاتمہ کر دیا اور اب ٹرکی ایک جمہوری نظام کے ماتحت اس ترقی کے دور میں دیگر متمدن اقوام یورپ کا مقابلہ کر رہی ہے فی الواقعی غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹرکی کو تباہی سے بچا لیا اور اپنی ذاتی شجاعت اور حسن تدبیر سے اس زمانہ میں اسلام کی وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں کہ اس غازی اسلام کے کارنامے صفحہ تاریخ پر زرین الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس ملکی انقلاب کے ساتھ ساتھ سلطنت ٹرکی میں معاشرتی۔ اقتصادی اور مذہبی انقلاب بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور ترک قوم ایک حد تک یورپ کی "مہذب اور شائستہ" قوموں کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ جو خبریں ٹرکی سے ہم کو ہندوستان پہونچتی رہتی ہیں اُن کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی قوم نے جن جن اصلاحات کی تجاویز پیش کی ہیں وہ معاشرتی اور مذہبی قوانین کے متعلق ہیں۔ اس مضمون کا مبحث صرف اسقدر ہے کہ ترکوں نے طبقہ نسا کو کہاں تک آزادی دیدی ہے اور اُسکا کیا انجام ہونے والا ہے؟ انشاء اللہ ہم کسی اور موقع پر ترکوں کے مذہب اور اُن کے مذہبی اصلاحات کے مطالبات پر تبصرہ کریں گے۔ کیونکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ترکوں نے اسلامی قانون ازدواج و قانونِ وراثت وغیرہ میں نہایت اہم تبدیلیاں کر کے نئے نئے قوانین و

ضوابط مرتب کئے ہیں اور اُن کو قابل پابندی تسلیم کر دیا جاتا ہے۔

خواتین ٹرکی کی آزادی کے متعلق کاتب الحروف نے ایک مضمون کسی انگریزی سیاح کا ایک انگریزی اخبار میں پڑھا ہے جس کا اقتباس ہدیہ ناظرین کرنا ضروری ہے۔ اس نامہ نگار کا نام مسٹر نیوٹن ہے اور اس نے ایک لنڈن کے اخبار میں اس انقلابی تغیر و تبدل کا فوٹو حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"خواتینِ ٹرکی مدت دراز تک حرم سرا میں پردہ کی حالت میں قید رہے جانے کے بعد اب دور حاضرہ میں بالکل آزاد ہو گئی ہیں۔ خواتین ٹرکی نے اس دور حاضرہ میں ایک غیر قابل یقین تغیر اپنی معاشرت اور تمدن میں پیدا کر لیا ہے۔ جب میں پچھلے موقع پر ٹرکی میں تھا تو میں نے وہاں کی مستورات کو برقع و نقاب پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک مثل ہیولائی شبیہوں کے سیاہ یا ہرے برقعوں اور چادروں میں ڈھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھی بہ مشکل دکھائی دیتی تھیں اور احتیاط اسقدر کیجاتی ہے کہ بسا اوقات اکثر عورتیں اپنے سروں کو چھتری لگا کر چھپا لیتی تھیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ٹرکی خواتین مثل مہذب اور تعلیم یافتہ ملکوں کی خواتین کے پوشاک پہنتی ہیں اور طرزِ عمل رکھتی ہیں۔ اب یہ عورتیں اپنے ہونٹوں۔ رخساروں اور پلکوں کو سُرخ رنگتی ہیں۔ اپنے سر کے بالوں کو بناتی اور کاکلیں نکالتی ہیں۔ اپنی گردنوں اور سینوں کو کھلا چھوڑتی ہیں اور چست چھوٹے چھوٹے فراک پہنتی ہیں جو صرف اُن کے گھٹنوں تک پہونچتی ہیں اور وہ اپنی پنڈلیوں پر ریشمین گلابی رنگ کے موزے پہنتی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہوں۔ فی الواقعی یہ بات قابل تعجب ہے کہ یہ خواتین اپنے آپ کو کس طرح زمانہ کی ضروریات کے مطابق کاربند کریں گی۔ بعض خواتین کو اس آزادی کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑیگا۔ مجھ کو خبر ملی ہے کہ اناطولیہ کے بعض حصوں میں اور دیگر مقامات پر ان آزاد خواتین کی علانیہ توہین کیجاتی ہے اور تمسخر کیا جاتا ہے۔ یہ خواتین پبلک کے روبرو چُرٹ پیتی ہیں اور قہوہ خانوں میں جاتی ہیں اور

رات بھر ناچتی گاتی ہیں اور مردوں سے علانیہ بات چیت کرتی ہیں۔ یہ تمام آزادی ان خواتین کو چند سال کے عرصہ میں ترکی نژاد خاتون خالدہ خانم کی بہادرانہ اور ان تھک کوششوں کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ ٹھیک یہی حال ہمارے ملک کی رائے طلب کرنے والی، عورتوں کا بھی ہوا تھا اور انھوں نے بھی ایک مدت کی کوشش اور ایثار اور قربانیوں کے بعد کریہہ رسمیات اور بیہودہ پابندیوں کی جکڑ بند کو توڑ کر اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔"

ہم ہندی مسلمان قید غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہم کو متمدن اقوام کے تمدن و معاشرت پر نکتہ چینی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے اور ترکوں کے درمیان رشتہ اخوت اسلامی قانون نے پیدا کر دیا ہے اور رسول اکرم صلعم کی تعلیم نے ہم کو خواہ ہم عربی یا ترکی یا ایرانی یا ہندی نژاد ہوں ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم ترکی کی موجودہ معاشرتی اصلاحات پر نظر تنقید ڈالیں کہ آیا یہ قوم اپنے دعاوی میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ اور آیا اس نام نہاد "آزادی" کو حاصل کر لینے میں ترکی قوم خصوصاً ان کی خواتین جادۂ اعتدال سے باہر تو نہیں ہو گئی ہیں؟

یورپ اور ایشیا کی اقوام میں گذشتہ کئی صدیوں سے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے عظیم الشان انقلابات ہوئے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ متمدن اقوام "نظام جمہوریت" قایم کر چکی ہیں یا کرنے والی ہیں۔ ان انقلابات کا نتیجہ اکثر اقوام یورپ کے حق میں سودمند ثابت ہوا ہے۔ مگر خال خال ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جو اقوام اس نظام جمہوریت کی اہل نہ تھیں ان کو قبل از وقت "جمہوریت" قائم کر لینے کی آرزو کی وجہ سے شدید نقصانات بھی پہونچ چکے ہیں۔ چنانچہ اس کی مثالیں روسی، چینی وغیرہ ملکی انقلابات کی موجودہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ملتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سلطنت ٹرکی جمہوریت کی اہل نہ تھی اور نہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ سلطنت ٹرکی نے قبل از وقت استبدادیت کی زنجیروں کو توڑ دیا اور نظام جمہوریت حاصل کر لیا۔ بلکہ اس مضمون میں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس آزادی

کی رو میں ترکی نے اپنے دیرینہ معاشرتی و مذہبی قوانین کو خیرباد کہہ کر یورپ کے معاشرت اور مذہب کو آمنا و صدقنا کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یورپ اس بیسویں صدی کے دور میں مشرق کی "روحانیت" کا قائل ہو رہا ہے اور اُن کے معاشرتی نظام کی وجہ سے جو بداخلاقی اور بربریت کے خصائل ان متمدن اقوام میں پیدا ہو گئے ہیں اُن پر دُنیا نفرین کر رہی ہے۔ جو اخبارات ہم کو بذریعہ کتب و جرائد ہندوستان کو پہونچتے ہیں اُن سے اظہر من الشمس ہے کہ یورپ نے مذہب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نظام معاشرتی و تمدن میں وہ خرابیاں پیدا کر لی ہیں کہ اب اُن کی اصلاح ناممکن ہے اور ایک زمانہ وہ بھی آئیگا کہ اُن کو اپنے عیش پرستی اور بداخلاق زندگی کی بدولت زمانہ کے ہاتھوں سے سخت سے سخت سزا ملیگی لہٰذا اس حالت کو دیکھتے ہوئے اقوام ترک کو یورپ کی اندھی تقلید کرنا اور اُن کے ناقص اور بداخلاقی سکھانے والے قوانین کا اتباع کرنا اُن کے لئے سخت مضر ہے۔ کاش اگر مسلمانان عالم خصوصاً ترک اقوام و ہندی مسلمان "خذ ما صفا و دع ما کدر" پر عمل کرتے تو کیا اُن کو دینی اور دُنیاوی مسرتیں حاصل نہیں ہوتیں؟ بداخلاقی اور بددینی کی زندگی سے گو انسان کے فوری اور جذباتی مقاصد حاصل ہو جاویں مگر قوانین فطرت نے ہم کو سکھلا دیا ہے کہ یہ جذباتی مسرتیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ حقیقی مسرت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے وہ صفات اور اخلاق پیدا کرے جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

میں اس موقع پر دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کسی خاص عقیدہ یا رسم رواج کا پابند نہیں ہے۔ جو تعلیم حریت اور مساوات کی اسلام نے پیش کی ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ پیغمبر خدا صلعم نے سرزمین عرب میں جمہوریت کی بنیاد ڈالی حالانکہ حضورؐ کے زمانہ بعثت کے وقت یورپ اور اقوام یورپ وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام ایک دین فطری ہے یعنی اسلام اس قسم کے اصول اور قوانین پیش کرتا ہے جو خلاف فطرت نہیں ہیں اور

ظاہر ہے کہ اصول فطری غیر متزلزل ہوتے ہیں جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن شریف میں وارد ہے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ اسلام نے حریت اور مساوات کی ایسی زبردست تعلیم دی ہے کہ بنی نوع انسان میں کالے۔ گورے۔ زرد۔ گندمی رنگ والوں کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو شخص دین فطرت یا بدیگر الفاظ اسلام کا قائل ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے اور اُس کو حق حاصل ہے کہ وہ بلا لحاظ قومیت و جنسیت حریت کا مستحق رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حریت مساوات کیا ہے؟ حریت اور مساوات کے یہ معنی نہیں کہ انسان غیر متزلزل قوانین فطرت کی خلاف ورزی کر کے بداخلاقی، اور بربریت کا جامہ پہن لے۔ انسان بہ حیثیت حیوان ناطق اور اشرف المخلوقات ہونے کے حیوان مطلق اور اس سے بھی ادنیٰ ذی حیات یا غیر ذی حیات مخلوق سے بوجوہات خاص متصف اور متبائن ہے۔ کسی سنجیدہ مذہب اور خصوصاً اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہو سکتی کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر حیوان مطلق کی سی زندگی بسر کرے۔ میں اس بارے میں صرف اپنے مضمون کے مبحث کی طرف توجہ کرتا ہوں تاکہ اصلی مقصد فوت نہ ہو جاوے۔ ہمارے بحث حریت اور مساوات اور خصوصاً طبقہ نسواں کی آزادی سے ہے۔ اس مبحث پر دو سوالوں کے حل ہو جانے سے اور خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنے سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ حریت اور مساوات کسے کہتے ہیں؟ اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے اور زیادہ قابل قدر شے ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر حریت اور مساوات قابل قدر شے ہے تو اس آزادی کی جنس وار تخصیص کیوں کی جاتی ہے؟ لہٰذا جو مذہب و ملت آزادی کے صحیح معنوں میں کسی طرح سے رُکاوٹ پیدا کرے وہ دینِ فطری نہیں ہو سکتا۔

پہلے سوال کا جواب گو ہمارے مبحث کا نقطہ نظر نہیں ہے۔ مگر اس پر ضمنی مختصر بحث

کی ضرورت اس وجہ سے لاحق ہے کہ دوسرے سوال کے حل کرنے میں "حریت و مساوات" کے الفاظ بار بار لانا پڑتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے "حریت و مساوات" کا مفہوم سمجھنا چاہئے۔ میرے خیال میں "حریت" یا "آزادی" کا مفہوم یہ ہے کہ ایک انسان اپنے قدرتی حقوق کو اپنی قوت ارادی کی تعمیل میں بلا کم و کاست اور بلا دوسرے شخصوں کے دباؤ کے استعمال کر کے اُن سے متمتع ہو جاوے۔ بنی نوع انسان کے "قدرتی حقوق" بہت سے قسم کے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جسمانی۔ دماغی۔ اخلاقی یا روحانی قویٰ کو قوانین قدرت کے ماتحت رکھ کر بام کمال پر پہنچائے کیونکہ اس میں انسان کی فنا اور بقا کا راز مضمر ہے۔ نظام تمدن یا مذاہب عالم میں اگر کوئی قانون یا اصول اس کے خلاف وضع کیا جاوے تو وہ اس قدرتی حقوق کے متضاد و منافی خیال کیا جاوے گا اور "آزادی" کا مفہوم فوت ہو جاوے گا۔ جو شخص یا کوئی نظام سلطنت اس قدرتی حق کو دبائے یا رخنہ اندازیاں کرے تو اس کی نسبت کہا جاوے گا کہ اس نے "آزادی" کو پامال کر دیا۔ اسی آزادی کے صحیح مفہوم کے اکتساب میں کسی جنس کی قید نہیں ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت دونوں میں سے ہر ایک کو قدرتی حق حاصل ہے کہ وہ اخلاقی۔ روحانی اور جسمانی ترقیاں کریں مگر قانون قدرت کے ماتحت رہکر۔ مرد اور عورت دونوں میں سے اگر کوئی بھی قوانین فطرت سے باہر ہو کر ترقی کرنے کا دعویٰ کرے تو اس ترقی کو صحیح معنوں میں "آزادی" کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ بے شک آزادی ایک بیش قیمت شے ہے کیونکہ وہ قوانین قدرت کا ایک شائبہ ہے اور جو شخص اس صفت یا حق سے محروم ہے یا اسیر کم و بیش قیود اس آزادی کے حصول میں لازم کی گئی ہیں وہ فی الواقع "قدرتی حقوق" کے حصول میں کوتاہ خیال کیا جاوے گا۔ کسی حکیم کا قول ہے "میں دیگر اشخاص کی آرزوؤں اور تمناؤں کے متعلق رائے قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے دریافت کیا جاوے کہ تم کس چیز کے متمنی ہو تو میں صاف کہدونگا کہ مجھے آزادی دیجاوے ورنہ میری خواہش

موت کی ہوگی۔" بے شک یہ فقرات نہایت قابل قدر ہیں اور آزادی کے مفہوم کی قیمت کا اندازہ بحالت آزادی نہ ملنے کے موت جیسی محتتم شے سے کیا گیا ہے جس کے بعد انسانی وجود کا ہی خاتمہ ہو جاتا ہے مگر ان الفاظ سے آزادی کے منشا اور مفہوم پر کافی روشنی نہیں پڑتی جس سے معلوم ہو سکے کہ آزادی کیا شے ہے؟ اور اُس کا صحیح استعمال کیا ہے؟ مجھے انگلستان کے مشہور مدبر برک کا قول نہایت پسند ہے۔ اُس نے نہایت مختصر اور صاف الفاظ میں آزادی کی غایت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "فی نفسہ آزادی بھی ایک قسم کا جوہر ہے جسکے حصول اور جائز استعمال کے لئے کچھ نہ کچھ قیود کی ضرورت لابدی ہے۔" مدبر برک کا یہ قول واقعی نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔ موجودہ زمانہ کی بل چل اور مطلق العنانی کو دیکھتے ہوئے یہ قول سونے کے حرفوں میں لکھے جانے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہے۔ حریت یا آزادی کے یہ معنی نہیں کہ انسان معاشرتی۔ تمدنی۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ قوانین کو توڑ کر مطلق العنان ہو جاوے اور کسی اصول یا قوانین کی پابندی نہ کرے اور مثل بہایم کے اپنی نفسانی خواہشات کا شکار ہو کر تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بلا مہار کے اونٹ کی طرح اپنی زندگی بسر کرے لہٰذا مجھے ناظرین کو اس امر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ جدید اقوام ترکی نے حریت اور آزادی کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا اور یورپ کی کورانہ تقلید کا شکار ہو کر جادۂ اعتدال سے تجاوز کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک قوم کا اخلاق اور منزہ صفات جو اُن کو دیگر اقوام یورپ سے متائز کرتی ہیں مفقود ہو جادیں گی اور مثل پیرس اور لندن والوں کے دنیا انکی بد اخلاقی اور نفس پرستی پر تمسخر اُڑائیگی۔ ممکن ہے کہ ترک قوم کو چند روز میں اپنی اس مطلق العنانی کا سبق مل جاوے اور وہ اس گمراہ راستہ سے ہٹ کر جادۂ اعتدال پر بدستور سابق آجادیں۔ اگر ہم ہندی مسلمان اِن واقعات کو نظر غور سے دیکھیں اور مسٹر نیوٹن سن کے الفاظ اور مضمون کی غایت کو سمجھیں تو ہم کو نہایت شرم آنا چاہئے کہ وہ کنایتہً ترکی خواتین اور ترکی تمدن کا کن مہذب الفاظ میں خاکہ اُڑا رہا ہے۔ مجھے تو اس سیاح کے الفاظ اور

طرز بیان سے یہی غایت نظر آتی ہے کہ وہ در پردہ اسلامی تمدن و تہذیب کا مضحکہ اڑا کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی تمدن و تہذیب ناکارہ اور خام ہے اور یورپ کی نام نہاد "آزادی" بہترین شے اور زمانہ حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!۔

ناظرین کرام نے سمجھ لیا ہوگا کہ حریت اور آزادی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مجھ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حریت اور مساوات کے مضمون پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس مضمون پر ہزاروں کتابیں اور رسائل مجھ سے زیادہ قابل قدر اشخاص کے موجود ہیں۔ میں یہاں صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اسلام نے ہم کو عام تعلیم دی ہے کہ ہر مسلم اور مسلمہ آزاد ہے اور ایک دوسرے کا بھائی بہن ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ اسلام میں یہ حریت کا مسئلہ کوئی نئی شے نہیں ہے۔ لہٰذا میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ ابتدا اسلام سے لیکر آج تک جبکہ اسلام ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے اس حریت اور مساوات کا سبق جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب فردِ اسلام کے دل میں نہ صرف موجزن ہے بلکہ ہمیشہ سے اس پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہیگا۔ علاوہ ازیں میں نے لفظ آزادی کے مفہوم کو انگریزی مدبر برک نامی کے قول سے ثابت کردیا ہے کہ "آزادی" مطلق العنانی کا نام نہیں ہے بلکہ قدرتی حقوق کو قانونِ قدرت کے ماتحت رکھکر اُن کو حاصل کرنے اور اُن سے متمتع ہونے کا نام آزادی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت کا دوسرا نام اسلامی اصطلاح میں سُنَّةُ اللهِ ہے۔ اور یہی سنة الله ہے تو امین قدرت اسلامی مذہب کا سنگ بنیاد ہیں جس کا بار بار تذکرہ قرآن شریف میں آیا ہے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ جبکہ حریت اور مساوات صحیح معنوں میں قابل قدر شے ہیں تو اسلام اور تمدن اسلام اس کی جنس دار تخصیص کیوں کرتا ہے اور عورتوں کو مثل مردوں

کے کیوں آزادی نہیں دیجاتی؟ کیا وجہ ہے کہ اہل اسلام اپنی خاتونوں کو پردہ میں اور حرم
میں رکھکر اور اُن پر طرح طرح کی قیود لگا کر اُن کی آزادی اور حریت کو پائمال کرتے ہیں حتیٰ کہ اُن کو
ناقص العقل کا خطاب بھی دیئے جانے میں کوئی تامل نہیں کیا جاتا؟

یہ مسئلہ بہت کچھ وضاحت طلب ہے مگر مضمون کے طوالانی ہو جانے کی وجہ سے مجھ کو خوف
ہے کہ طولانی بحث اور تمہیدوں سے ناظرین اکتا نہ جاویں۔ لہٰذا اس بارے میں میں نہایت مختصراً
عرض کرتا ہوں کہ اس سوال کے مباحثہ میں ناظرین ہندوستان کی خواتین کی حالت اور اُن کے
موجودہ تمدن و معاشرت کو پیش نظر نہ کریں۔ مسلمانان ہند اپنا ملک و تمدن کھو بیٹھے ہیں اور
اُن کی موجودہ حالت کا مقابلہ اسلام کی اصل تعلیم حریت و نسائیت سے نہیں ہو سکتا۔ مسلمانان
ہند میں اُن کا اصلی مذہب اور تمدن بہت کم باقی رہ گیا ہے جس کے وجوہات چند در چند ہیں
مسلمانانِ ہند پستی اور غلامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک غیر آزاد قوم ہیں۔
لہٰذا صحیح تعلیم اسلامی پر نہ یہاں عمل ہوتا ہے اور نہ وہ بوجہ اپنے دماغی انحطاط کے اس قابل
ہیں کہ وہ اپنا صحیح مسلک زندہ قوموں کیطرح قائم کر سکیں۔ البتہ دور حاضرہ میں چند شخص ایسے ہوئے
ہیں جو اسلامی تواریخ و روایات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے جس کی وجہ
سے اب کچھ بیداری پیدا ہو چلی ہے اور ہماری امیدوں میں ایک جھلک سے پائی جاتی ہے
کہ اگر تعلیمی جد وجہد جاری رہی تو ممکن ہے کہ وہ زمانہ عود کر آئے کہ ہم لوگ اسلام یا دین فطرت
کا صحیح مفہوم سمجھ کر صحیح راستہ پر آجاویں۔ علاوہ ازیں مسلمانان ہند میں زیادہ تر شخص نو مسلم
ہیں اور ہندوستان کی آبادی کا ¾ حصہ غیر مسلم ہے لہٰذا ایسی صورت میں مذہب ہنود اور
اُن کے رسم و رواجات کا رنگ ہم پر اسقدر گہرا چڑھ گیا ہے کہ اہل ہنود کی بہت سی باتیں ہمارے
تمدن اور معاشرت میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور چونکہ اہل ہنود کے قانون یا دھرم شاستر میں
"ہندو عورت" کو مستقل حقوق پیدا نہیں ہوتے اور وہ ایک کمزور اور محکوم ہستی خیال کیجاتی
ہے لہٰذا اُن کے رسم و رواج اور قانون کی تقلید بھی مسلمانوں میں اکثر ہونے لگی ہے جس کا

نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں عورت ناقص العقل خیال کی جانے لگی اور بوجہ انکی تعلیم و تربیت نہ ہونے کے فی الواقعی ہماری مستورات کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے ہم کو اسلامی تعلیم پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے میں عرض کرونگا کہ اسلام یا تمدن اسلام نے حریت یا آزادی کے بارے میں جنس وار کوئی تخصیص نہیں کی۔ جن حقوق اور ذمہ داریوں کا کلام پاک اور رسول اکرمؐ کی تعلیم میں ذکر ہے وہ سب مرد و عورت دونوں پر لازم ہوتی ہیں۔ مرد و عورت کو ہر قسم کے علوم و فنون سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بارے میں کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ طَلَبَ العلم فریضۃ" علی کل مسلم و مسلمۃٍ "یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے قرآن شریف کا یہ حکم بلا کسی تخصیص اور پابندی کے ہے جس کے صاف معنی بلا کسی تاویل کے یہ ہیں کہ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ وہ ہر قسم کا علم سیکھیں۔ مزید براں رسول اکرمؐ نے جن کی حیات ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے اس طرح تعلیم دی ہے کہ اُطلبوا العلم لو کانَ بالصین یعنی اے مسلمان مرد اور عورتو! تم علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین ہی جانا پڑے۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اکرم نے علم کو ایسا قابل قدر اور بہترین شے سمجھا کہ تمام مسلمان مرد اور عورتوں کو ہدایت کر دی کہ علم کے حصول میں مسافت بحری و بری کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئے یہ ایک مثال بطور نمونہ ہے۔ جو لوگ قرآن شریف کو بامعنی اور بغور پڑھتے ہیں اُن کو ظاہر ہوگا کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اکثر جگہ بلا کسی تخصیص کے مخاطب کیا ہے اور کل کلام الٰہی مردوں اور عورتوں دونوں پر قابل پابندی ہے میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ میں نے جہاں تک قرآن شریف کا مطالعہ کیا ہے کوئی آیت بالفاظ ایسا نہیں پاتا جس میں عورتوں کی حریت اور آزادی کے متعلق اُن پر قیود عائد کئے گئے ہوں جن سے انکی ہستی یا حریت پامال ہو جاوے۔ بلکہ حسن معاشرت یا تمدنی زندگی بسر کرنے کے لئے یہاں تک کہدیا ہے۔ ھُنَّ لباسٌ لکم و انتم لباسٌ لھُنَّ (سورۃ بقر)

ترجمہ۔ عورت اور مرد دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں۔ لہٰذا اسلامی تعلیم سے ثابت ہے کہ بانی اسلام نے کوئی جکڑبند عورتوں کی حریت اور آزادی پر نہیں لگائی اور تاریخ اسلام سے یہ ثابت ہے کہ متمدن عرب اور اسلام کی قائم کی ہوئیں جمہوریات اور سلطنتوں میں عورتوں نے ہر شعبہ میں قابل فخر حصے لئے ہیں اور اسلامی تاریخوں کے صفحات بیشتر اُن کے کارناموں سے مملو ہیں۔ اب ہمارے بحث کا صرف اسقدر حصہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمین اپنی خاتونوں کو پردہ اور حرم میں کیوں رکھتے ہیں؟ کیا یہ اُن کی آزادی پر صریح قیود نہیں ہیں؟ اگر اقوام ترک نے اپنی خاتونوں کو اس بارے میں آزاد کر دیا تو کیا بُرا کیا اور ہم ہندی اُن کے فعل پر کیوں معترض ہوتے ہیں؟

قبل اس کے کہ ہم اس اہم مضمون پر کچھ عرض کریں ہمارے لئے بسا ضروری ہے کہ پردہ کے متعلق آیات قرآنی کو نظر تعمق سے دیکھا جاوے کہ آیا اسلام نے اس بارے میں کوئی پابندی کی ہے یا کسی طرح اس بارے میں عورتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ محض پردہ میں بیٹھی رہیں اور کوئی جسمانی۔ دماغی اور روحانی ترقی نہ کریں؟

اس بارے میں کلام پاک کے مطالعہ سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کی عصمت کے متعلق نہایت تنبیہی الفاظ میں اُن کو پاکدامن رہنے کی فہمائش کی ہے اور فحش اور بے حیائی کو بدترین گناہ خیال کیا ہے۔ چنانچہ زانی اور زانیہ کو سخت سزائیں دینے کا حکم ہے۔ فی الواقعی فحش اور بدکاری کی زندگی مرد اور عورت دونوں کے لئے کسقدر نازیبا ہے۔ کیونکہ بغیر تعلق ازدواج کے ناجائز طریقہ سے عورتوں کے ساتھ معاشرت رکھنا کسقدر کریہہ اور مذہبی اور اخلاقی نقطہ نظر سے معیوب ہے۔ جہاں تک میں نے پڑھا اور غور کیا ہے کلام پاک میں عورتوں کو چار دیواری کے اندر رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق قرآن پاک میں حسب ذیل آیات موجود ہیں۔

سورہ نور میں ایک مقام پر صرف مردوں کو یہ حکم دیا ہے قُل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذالک ازکیٰ لھم۔ ان اللہ خبیرٌ بما یصنون (ترجمہ) (اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اس میں اُن کی زیادہ صفائی ہے۔ لوگ جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو سب خبر ہے۔ اس میں دوسری جگہ یہ حکم ہے۔ وَقُل للمومنٰت یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ماظھر منہا ولیضربن بخمرھن علیٰ جیوبھن وَلایبدین زینتھن الا لبعولتھن او آباءھن الخ (ترجمہ) اور (اے پیغمبر) مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر اُس میں سے جو حصہ کھلا رہتا ہے اُس کا ظاہر ہونے دینا مضایقہ کی بات نہیں ہے۔ اور اپنے سینوں پر دوپٹوں کے بکل مارے رہیں اور اپنے زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں یا اپنے باپ وغیرہ پر الخ۔ سورۂ احزاب میں ایک مقام پر یہ آیت ہے کہ یا ایھا النبیّ قُل لِاَزواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین وکان اللہ غفوراً رحیما۔ (ترجمہ) (اے پیغمبر) اپنی بیبیوں۔ بیٹیوں۔ اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑیگی کہ نیک بخت ہیں اور کوئی چھیڑے گا نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں مدینہ کی ایسی حالت تھی۔ جیسے ہمارے یہاں دیہات کی۔ گھروں میں بیت الخلا نہیں تھے۔ شریف زادیاں قضا رحاجت کے لئے جھٹ پٹے کا وقت دیکھ کر آبادی کے باہر چلی جاتی تھیں اور بدکار اور فاجر شخص کسی عورت آتے جاتے دیکھ پاتے تو اُس کو تنگ کرتے تھے اور اُن کو فہمایش کیجاتی تھی تو وہ جواب دیتے تھے

کہ ہم نے لونڈی سمجھا تھا۔ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کی انسداد کے لئے شروع میں یہ حکم دیا گیا کہ شریف زادیاں گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ پھر اسلام کی ترقی کے ساتھ مدینہ بڑا شہر ہو گیا اور لوگوں نے گھروں میں بیت الخلا بنائے۔ اور مستورات کو قضا رحاجت کے لئے بستی کے باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس آیت کے مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ حضور صلعم کے زمانہ میں بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی اور تاریخ اسلام سے بھی ثابت ہے کہ وہ باہر نکل کر ہر طرح کا کام کاج کرتی تھیں اور محض مقتضار وقت کی وجہ سے اُن کو چادریں اوڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا کلام پاک کے اِن احکامات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورتوں کو چہار دیواری میں رہکر زندگی بسر کرنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورت اور مرد بالکل آزاد ہیں مگر عصمت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا دونوں فریق کے لئے اہم ترین فرایض میں سے ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیم کا لُبّ لباب صرف اسقدر ہے کہ مرد و عورت دونوں نگاہ بد جس سے بیحیائی پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے پر نہ ڈالیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھہ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے اور بلا کسی حجاب و رکاوٹ کے شریک جلسہ ہونے سے ایک دوسرے کے حیوانی جذبات کے مشتعل ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے جس کا نتیجہ بداخلاقی اور بددینی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کاش ہم مسلمانان جادۂ اعتدال پر قائم رہتے اور اس مادہ پرستی کے دور میں اہل مغرب کی معاشرتی و مذہبی قوانین و ضوابط کورانہ تقلید سے پہلوتہی کرتے اور محض اسلامی تعلیم اور اس کی روایات کو پیش نظر رکھہ کے دینی و دنیاوی حسنات حاصل کرتے۔

غزل

جناب نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری استاد حضور دکن
خلد اللہ ملکہٗ

گرچہ دل میں کوئی پیکاں نہیں قاتل باقی
ٹوٹتا ہوں کہ ابھی ہے خلشِ دل باقی

بجھ گئی آتشِ گل بادِ خزاں کے ہاتھوں
رہگئی گرمیِ فریادِ عنادل باقی

کام کرتا ہے وہ تجھکو سرِ مقتل جس سے
نام رہجائے لبِ زخم پہ قاتل باقی

جس طرح پارہ اخگر ہو تہِ خاکستر
دل ہوا خاک مگر ہے تپشِ دل باقی

ہو چکی جامہ دری دستِ جنوں بڑھ آگئے
لطف کیا رہگئے گر طوق سلاسل باقی

تم دیئے جاؤ مجھے تیغ ادا کے چرکے
میں کہے جاؤں ابھی ہی ہوسِ دل باقی

تنِ بسمل سے نکلتی جو نہیں جانِ حزیں
بات یہ ہی کہ تری یاد ہے قاتل باقی

رنگ کہتا ہے غریبونکی دل آزاری کا
اُنکے پہلو میں ابھی تک ہی وہی دل باقی

اس تصور سے کہ ہنگام سحر کیا ہوگا
شمع گھلتی رہی جبتک رہی محفل باقی

خون آنکھوں سے ٹپکتا ہی میں خوش ہوتا ہوں
یہ سمجھ کر کہ ابھی ہیں جگر و دل باقی

قدرِ عشاق نہ کیوں شمع رخوں میں ہو جلیل
انہیں پروانوں سے ہی رونقِ محفل باقی

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی ڈاک

(از جناب سید حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا - ایڈیٹر شمع)

(بہ سلسلۂ سابق)

آجکل ڈاک کا جو مفہوم ہے قطعی جدید ہے، ابتدا میں یہ محض سرکاری محکمہ تھا، جو سلطنت کے مختلف مقامات کے درمیان تعلقات کے قیام اور وہاں کی خبریں لینے کی غرض سے جاری ہوا تھا۔

ہندوستان میں ۱۸۳۷ء تک ڈاک، عام طور پر مروج نہ تھی، اور پیام رسانی کا کام سرکاری یا نجی ہرکارے انجام دیتے تھے، امپریل گزیٹیر میں ذکر ہے کہ "قاصد، پیامبر اور ہرکارے ڈاک کا کام اچھی طرح انجام دیتے تھے، اور یہی طریقہ اس ملک میں عرصہ سے رائج تھا اور کامیاب تھا، یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اس کی ابتدا کب سے ہوئی، لیکن تاریخی شہادت کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے پٹھان بادشاہ علاء الدین خلجی کے عہد میں ڈاک کا محکمہ موجود تھا، سلطان علاء الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت نشین ہوا تھا، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان نے گھوڑوں اور پیادوں کے ذریعہ سے ڈاک کا انتظام کیا تھا تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں سلطانی افواج پرچڑھائی کریں، تو ان کے حالات اور جنگ کے واقعات کی اطلاعیں سلطان تک پہنچتی رہیں، اسی محکمہ کے ذریعہ سے

اشیار بازاری کا نرخ، اور سلطنت کے حالات کی اطلاعات دربار میں آتی تھیں،
سلطان محمد تغلق کے عہد میں ڈاک کا محکمہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا چنانچہ اس کی شہادت ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملتی ہے، ابن بطوطہ ۱۳۴۱ء میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے" اس ملک یعنی ہندوستان میں قاصدوں کی دو قسمیں ہیں سوار، اور پیادہ سوار قاصد، سلطانی لشکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر چار میل پر تعینات رہتے ہیں، پیادہ قاصد ایک میل کے فاصلہ سے تعینات رہتے ہیں اور تین میل تک جاتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چابک رہتا ہے جس میں گھونگرو لگے ہوتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا ہوتا ہے۔ یہ لوگ چابک کو ہلاتے ہوئے دوڑتے ہیں اور ڈاک کی قریب ترین چوکی تک جاتے ہیں، اور وہاں چابک کو ہلاتے ہیں، گھونگرو کی آواز سنکر دوسرا قاصد دوڑتا ہے اور ڈاک کا تھیلا لیکر اسی طرح چابک کو بجاتا ہوا آگے کی ڈاک کی چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے، اس طرح پر سلطان تک ڈاک پہنچ جاتی ہے اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔
شہاب الدین ابو العباس احمد نے، جو ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا، اسی قسم کی تفصیل لکھی ہے، ڈاک کے سلسلہ میں مسلمان مورخین نے سکندر لودی (۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۸ء) اور بابر کا بھی نام لیا ہے، سکندر لودی نے تو ہر جگہ ڈاک کی چوکیاں قائم کردی تھیں۔ اس کی فوج جہاں کہیں جاتی تھی، روزانہ دو مرتبہ سلطانی فرامین وصول کرتی تھی، جو فرمان علی الصبح پہنچتا تھا اس میں دن بھر کے کوچ کے بعد قیام کے متعلق ہدایتیں ہوتی تھیں، اور دوسرے پیغام میں جو تیسرے پہر وصول ہوتا تھا احکام ہوتے تھے" یہ طریقہ سختی سے جاری تھا، ڈاک چوکی پر گھوڑے تیار رہتے تھے، اور سلطان کو ملک کے ہر پرگنہ کے حالات، اور اشیار کے نرخ کی اطلاعات روزمرہ پہونچتی تھیں، شہنشاہ بابر نے آگرہ سے کابل تک کی سڑک کی پیمائش کا حکم دیا تھا، چنانچہ بابر نامہ میں ذکر ہے کہ سترہ دسمبر ۱۵۲۸ء کو بادشاہ نے یہ حکم صادر فرمایا، اور اسی دن چماق بیگ روانہ ہوگیا، کام کا طریقہ یہ تھا" ہر نو کروہ کے فصل

پر ایک مینار بنایا جائے جو چوبیس فیٹ بلند ہو، اور اس کی چوٹی پر چار طرف چار دروازے ہوں، اور ہر اٹھارہ کروہ پر چھ گھوڑے تیار رہا کریں، گھوڑوں کے دانہ اور سائیسوں و افسران ڈاک کی تنخواہ کا معقول بندوبست کیا جائے۔“ لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس اسکیم کا کیا نتیجہ نکلا،

شیر شاہ (۱۵۴۰ء لغایۃ ۱۵۴۵ء) کی حکومت مسلمانوں کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اسی عہد میں سیاسی اور اقتصادی ترقیاں ہوئی تھیں، اور حکومت و انتظام کے جدید قواعد بنائے گئے تھے، شیر شاہ نے سراؤں، سڑکوں، اور پلوں کے علاوہ سوار قاصدوں کا انتظام بھی کیا تھا جو ملک کے ہر گوشہ میں موجود رہتے تھے، اور ملک کے بعید ترین مقامات سے بھی اوس کو روزانہ اطلاعات پہنچتی رہتی تھیں، مختلف سڑکوں پر تقریباً سترہ سو سرائین موجود تھے ہر سرا میں دو گھوڑے تیار رہتے تھے تاکہ خبریں جلد پہنچائیں، یعنی صرف خبر رسانی کے لئے ملک میں تین ہزار چار سو گھوڑے روزانہ دوڑتے تھے، شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء لغایۃ ۱۶۰۵ء) غالباً پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد میں ڈاک لیجانے کے لئے اونٹ استعمال ہوئے، آئین اکبری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں ڈاک کے انتظام بہت معقول تھا“ ریباڑی، ہندوں کا ایک فرقہ ہے، یہ لوگ اونٹوں کی عادات سے خوب واقف ہیں، اور دیسی اونٹ یعنی لوک کو تیز قدمی سکھا لیتے ہیں، اگرچہ سلطنت کے حدود سے پایہ تخت تک ہر طرف گھوڑوں کی قطاریں تیار کھڑی رہتی ہیں اور تیز قدم ہرکارے ہر چار کوس پر تعینات رہتے ہیں لیکن محل شاہی میں چند اونٹ بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں۔“ یوروپین سیاحوں میں الگزینڈر ہیملٹن ایسا شخص ہے جس نے سترہویں صدی میں ہندوستان پہنچ کر یہاں کی ڈاک کے حالات کو مشرح طور پر بیان کیا ہے۔

”مغلوں کی سلطنت میں ڈاک بہت تیز جاتی ہے، کیونکہ شاہراہ پر ہر دس میل کے فاصلہ سے کاروان سرائین بنی ہوئی ہیں، جہاں نہایت تیز قدم آدمی ہر وقت تیار کھڑے

رہتے ہیں مطلا تھیلوں میں خطوط رکھ کر اپنے سر پر لیجاتے ہیں، سرائے میں پہنچ کر دوسرا ہرکارہ اس تھیلی کو لے لیتا ہے اور دوسری سرائے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، تمام رات اور دن یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، ان لوگوں کی رفتار پانچ چھ میل فی گھنٹہ ہے، اور آٹھ دن کے اندر سلطنت کے بعید ترین گوشوں سے پائے تخت تک خطوط پہونچ جاتے ہیں۔

مغلوں کے زمانہ میں اخبار نویسوں کی کئی قسمیں تھیں (۱) وقائع نویس، یا وقائع نگار (۲) سوانح نگار (۳) خفیہ نویس اور (۴) ہرکارے۔ یہ لوگ تمام ملک کی خبریں لاتے تھے، ان کے افسر اعلیٰ کا عہدہ دار وغہ ڈاک چوکی کے نام سے موسوم تھا، تمام خطوط اور ڈاک اسی کے پاس آتی تھی اور وہ سربمہر حالت میں اُن کو وزیر کی خدمت میں پیش کرتا تھا تاکہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، ایک فارسی قلمی تاریخ میں مذکور ہے کہ وقائع ہفتہ میں ایک بار، سوانح اور ہرکاروں کے اخبار، مہینہ میں (؟) ایک بار اور نال میں رکھکر تحریرات مہینہ میں دو بار وصول ہوتی تھیں، ضروری امور کی اطلاعات ان کے علاوہ ہوا کرتی تھیں، ملک کے مختلف صوبوں سے پائے تخت کو خبریں پہونچانے کے لئے معقول اور مستقل انتظامات ہوتے ہوں گے، کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی تصنیف مرات احمدی مصنفہ محمد علی خاں، دیوان گجرات میں ڈاک کی ترتیب اور باقاعدگی کا مفصل ذکر ہے، اس تصنیف کی رو سے، صوبہ کا اخبار نویس کے پاس ہر شہر اور ضلع سے اخبار وصول ہوتے تھے شام کو اُس کے پاس تمام اطلاعات جمع ہو جاتی تھیں، اور وہ اونٹ سوار کے ذریعہ سے اُنکو دربار میں بھیجدیتا تھا۔ سوانح نگار کے دفتر میں افواہ قلمبند ہوتی تھیں، اور صوبہ دار کے ساتھ ہرکارے بھی رہتے تھے۔ ڈاک کی چوکیوں کا سلسلہ احمد آباد سے اجمیر کی سرحد تک قائم تھا، جہاں ہر چوکی پر، آدمی اور گھوڑے تیار رہتے تھے اور شاہی ڈاک کو سات دن کے اندر شاہجہاں آباد پہنچا دیتے تھے، اسی طرح ڈاک کا ایک اور سلسلہ تھا جو بھروچ ہو کر دکن تک پھیلا ہوا تھا،

کرنیل ولکس کا بیان ہے کہ راجہ چک دیونے جو ۱۶۷۲ء میں تخت نشین ہوا تھا مسلسل ڈاک رسانی کا انتظام میسور میں کیا تھا، اور وہاں پر ڈاک خانہ صرف خبریں پہنچانے کا کام نہیں کرتا بلکہ خبریں حاصل بھی کرتا تھا، پوسٹ ماسٹر اور اُس کے عملے علاوہ اپنے فرایض کی انجام دہی کے، حکومت کے معتبر ملازم تھے جو اپنے شہروں کی خفیہ باتوں سے حکومت کو مطلع کرتے رہتے تھے، حیدر علی کے زمانہ میں تو اس طریقہ کو بہت زیادہ کامیابی ہو چکی تھی،

ہندوستان میں قرون وسطی میں ڈاک محض سرکاری اغراض کے لئے تھی۔ نجی کاموں کے لئے نہ تھی، نجی خطوط کو خاص آدمی لاتے اور لیجاتے تھے جو مخصوص تجارتی شہروں میں ملتے تھے، ممکن ہے کہ سرکاری ہرکارے بھی نجی خطوط کو معاوضہ لیکر لاتے لیجاتے ہوں، نجی خطوط لیجانے والوں کے نام مختلف تھے، کہیں اُن کو قاصد کہا جاتا تھا کہیں پتامبر اور کہیں ہرکارہ۔

پیٹر منڈی کے زمانہ میں (۱۶۲۸ء لغایتہ ۱۶۳۴ء) بازاری قاصد پٹنہ سے آگرہ تک گیارہ اور پندرہ دن کے درمیان میں خط پہنچا دیتے تھے، اور تیز رفتار قاصد دہلی سے سورت پندرہ بیس دن میں پہنچتے تھے، گواسے ماسولی پٹم تک پتامبر بیس دن میں جاتے تھے۔ ڈاکٹر فرائر کا بیان ہے کہ دکن میں صرف پتامبر پیدل ڈاک لے جاتے تھے۔

۱۷۱۲ء میں عام ڈاک کا رواج ہوا، نجی خطوط کو کمپنی کے چپراسی (قاصد اور پتامبر) محصول ڈاک لیکر جاتے تھے، انگریزوں کو ابتدا میں بہت دقت ہوئی۔ اور مجبوراً قاصدوں کو نوکر رکھنا پڑا، لیکن ۱۶۸۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس اور بمبئی میں ڈاکخانہ قائم کر دیے تاکہ سوداگروں اور خود کمپنی کو سہولت ہو، کمپنی کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا بھی مدنظر تھا۔ کمپنی کی طرف سے بمبئی میں حسب ذیل ہدایات شائع

ہوئی تھیں یہ ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح تم بھی ڈاک خانہ قائم کرو، جہاں سے خطوط روانہ ہوسکیں اور جہاں پہونچ سکیں، اور ایک خط کے مقابلہ میں دو اور تین خطوط پر دوگنا اور تین گنا محصول لگاؤ، تاکہ چند سال کے عرصہ میں کمپنی کی آمدنی بہت زیادہ ہوجائے اور سوداگروں کو بہت زیادہ آرام اور سہولتیں حاصل ہوجائیں۔ اس کام کے لئے تم کو مناسب مقامات پر چوکیاں قائم کرنا، اور کشتیوں کا بھی انتظام رکھنا چاہئے تاکہ سورت اور بمبئی کے درمیان میں خطوط باسانی اور بہ حفاظت بھیجے جاسکیں۔ اور توقف بھی نہ ہو" مدراس کو بھی اسی قسم کی ہدایتیں بھیجی گئی تھیں، چنانچہ وہاں پر ۱۷۱۲ء میں ڈاک خانہ قائم اور مختلف مقامات کے درمیان میں خط و کتابت کے سلسلے جاری ہوگئے۔ پہلے مدراس سے بنگال میں خط دو تین مہینہ میں آتا تھا، لیکن اب تیس ۳۰ دن میں آنے لگا۔ ابتدا میں جو محصول مقرر ہوا تھا اس کا پتہ نہ چل سکا، لیکن ۱۷۲۰ء میں جو محصول رائج تھا حسب ذیل تھا۔

قلعہ سینٹ جارج سے	وزیگا پٹم کو	چار فانم
" " "	بنگال کو	چھ فانم
" " "	بمبئی اور سورت کو	نو فانم

اس کے بعد کے حالات ہم کو معلوم نہیں، لیکن لارڈ کلایو کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ۱۷۶۶ء میں مستقل طور پر ڈاک کا سلسلہ قائم ہوا۔ اس کے متعلق جو حکم ہے اس کی سرخی تھی، "ڈاک کے بہتر انتظام کے لئے"، اور حکم تھا کہ آیندہ سے ڈاک گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ کی جائے۔ پوسٹ ماسٹر یا اس کے ماتحت دن رات حاضر رہکر ڈاک کو چھانٹیں اور روانہ کریں، اندرون ملک کے مختلف مقامات کے خطوط کے الگ الگ گڈیاں بنائی جاویں اور تھیلوں میں بھر کر سربمہر کردیئے جائیں، مہر کمپنی کی ہو، اور سوائے افسران محکمہ کسی کو ان کے کھولنے کی اجازت نہ ہو، نیز یہ بھی حکم تھا کہ بہی قواعد کلکتہ کو ڈاک روانہ کرتے وقت عمل میں لائے جائیں" بعد کو اور بھی قواعد مرتب ہوئے جن کا مقصد ڈاک کو جلد تر اور زیادہ حفاظت

سے پہنچانا تھا، وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں اور زیادہ ترمیم ہوئی۔ اور ۱۷۷۴ء میں کلکتہ میں ایک پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر ہوا، اور ڈاک کا ادنیٰ ترین محصول دو آنہ فی سو میل قرار دیا گیا۔ اور تانبے کے دو آنے والے ٹکٹ خاص طور پر سکوک کئے گئے۔ وارن ہیسٹنگز نے ۱۷۸۴ء میں ڈاک کے قواعد کو ترمیم کیا اور ۱۸۳۷ء تک مختلف قسم کے ردوبدل ہوتے رہے، لیکن اس سنہ میں ڈاک کا انتظام گورنمنٹ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محصول لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حدود کے اندر ڈاک پہنچانے کی خود ذمہ دار ہو گئی۔

۱۷۷۵ء سے کئی سال قبل مدراس اور بنگال کے درمیان ہفتہ میں دو بار ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تھا لیکن اب تک مدراس اور بمبئی یا بمبئی اور کلکتہ کے درمیان کوئی مستقل سلسلہ نہیں تھا۔ یورپین سوداگروں کی عرضداشت کا لحاظ کر کے گورنمنٹ نے مدراس اور بمبئی کے درمیان ۱۷۸۸ء میں سلسلۂ ڈاک جاری کر دیا جو پندرہ روزہ تھا، حیدرآباد اور پونا ہو کر ڈاک آتی جاتی تھی اور پورے پچیس دن لگتے تھے، ۱۷۹۰ء میں ہفتہ وار ڈاک کر دی گئی اور راستہ بھی بدل دیا گیا اب ڈاک بمبئی سے ماسولی پٹم اور وہاں سے کلکتہ اور مدراس کو جانے لگی۔ اس طرح وقت میں بھی کفایت ہو گئی اور کلکتہ سے بمبئی چھبیس یوم میں، اور بمبئی سے مدراس سترہ یوم میں اور مدراس سے کلکتہ کو انیس یوم میں ڈاک آنے جانے لگی۔ ڈاکیہ ہمیشہ پیدل چلتے تھے، اُن کا ایک کوچ سات آٹھ میل کا ہوتا تھا، اور چوبیس گھنٹہ میں عموماً ستر میل کی مسافت طے کرتے تھے۔

ڈاک کے محصول کی شرح فاصلہ اور ڈاک کے وزن کے لحاظ سے مقرر ہوتی تھی لیکن ان میں جلد جلد ردوبدل ہوتا رہتا تھا، ۱۷۸۸ء میں مدراس اور بمبئی کے درمیان حسب ذیل شرح تھی۔

ایک خط	۱۱؍۱
دو خط	۱۲؍

تین خط

پارسل پیکٹ کی شرح ۱۱ء اونس تھی ۱ نومبر ۱۸۵۹ء سے کے بعد ڈھائی تولہ تک کی ڈاک کی شرح یہ تھی۔

بمبئی سے پونا تک ۵۲ کوس ۲ر

" " حیدرآباد تک ۲۲۲ کوس ۸ر

" " ماسولی پٹم تک ۳۳۱ کوس ۱۲ر

ماسولی پٹم سے مدراس تک ۳۲۲ میل ۳ فانم ۴ر

" " گنجم تک ۴۲۸ میل ۴ فانم ۸ر

گنجم سے کلکتہ تک ۳۰۵ میل ۵ر

ڈھائی تولہ سے ساڑھے تین تولہ تک کے خطوط کی شرح دوگنی تھی۔ ساڑھے تین تولہ سے ساڑھے چار تولہ تک شرح تن گنی تھی۔ ساڑھے چار تولہ سے ساڑھے پانچ تولہ تک چوگنی تھی۔ اور علیٰ ہذا القیاس ۱۸۵۹ء میں شرح حسب ذیل تھیں۔

کلکتہ سے	اگر ڈھائی تولہ اور اس سے کم وزن ہو
بارک پور	۱ر
سراج محل	۳ر
پٹنہ	۵ر
بنارس	۶ر
ڈھاکہ	۳ر
چاٹگام	۶ر
بمبئی	عہ ۹ر
مدراس	عہ ۲ر

ڈہائی اور ساڑہے تین تولہ کے درمیان خطوط شرح ڈبل بتی، ساڑہے تین اور چار تولہ کے درمیان تین گنی تہی اور علیٰ ہذا ۱۸۰۹ء میں شرح میں پہر تبدیلی واقع ہوئی روپیہ سے کم وزن کا خط ایک خط روپیہ اور ڈیڑہ روپیہ کے درمیان وزن ہو تو دو خط، اور ڈیڑہ اور ڈہائی کے درمیان وزن ہو تو تین خط شمار ہوتے تھے۔ ایک خط پر سو میل کا محصول ڈیڑہ قائم تھا، لیکن ۱۸۵۴ء میں فاصلہ کا سوال نظرانداز کر دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی سے قبل وزنی پارسلوں کے بہیجنے کا بہی قاعدہ مقرر تھا۔ پارسل بہینگیوں میں جاتے تھے اور اس طریقہ کو بہنگی ڈاک کہتے تھے، اور انگلستان میں پارسل کا قاعدہ رائج ہونے سے ایک سو سال قبل ہندوستان میں اس طریقہ کو رواج تہا، ڈاک کی بہ نسبت پارسل کی رفتار کم تہی۔ لیکن اگر گہڑی کو مرمت کے لئے الہ آباد سے کلکتہ بہیجتے تھے تو وہ ایک مہینہ میں بن کر آجاتی تہی۔ فقط

(ترجمہ)

غزل

(مصورِ جذبات حضرت میرزا ثاقب لکھنوی)

اہلِ غم سے عشرتِ عالم کا ساماں ہو گیا
جب زمیں کے داغ اُبھر آئے گلستاں ہو گیا

اپنی حد سے بڑھ کے جاتا کس طرف کوئی مرا
جان پڑتے ہی یہ مُشتِ خاک بیجاں ہو گیا

اتحادِ باہمی کا ہے نتیجہ زندگی
ذرے کیا شے تھے مگر ملنے سے انساں ہو گیا

مٹ گئے دورِ فلک سے جاں نثارانِ عزا
آپ کا آباد ویرانہ بیاباں ہو گیا

ایک قطرہ بحرِ عصیاں کا تھا جو یوں سر چڑھا
پلتے پلتے دامنِ عالم میں طوفاں ہو گیا

عشق کے بعد اب حوادث کی ضرورت کیا رہی
آسماں دم لے مرے مرنے کا ساماں ہو گیا

کاروانِ اشک کو میں ڈھونڈنے جاؤں کہاں
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

اک بلائے بد تھی ایسی زندگی جو کٹ گئی
زندہ باش اے مرگ دردِ دل کا درماں ہو گیا

زخمِ دل پہلے ہی دامن دار تھا پر حشر میں
موقعِ فریاد پا کر چاکِ داماں ہو گیا

سیرِ عالم کے لئے کچھ چھوڑ اے دستِ جنوں
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

سیکڑوں داغوں کے دھبے ہیں وہ جلوے اب کہاں
دل مٹا اور مٹ کے بھی صحنِ گلستاں ہو گیا

حشر میں پہچان کر قاتل کا منہ تکتا رہا
جب ضرورت ہوش کی دیکھی تو حیراں ہو گیا

خفتگانِ خاک کتنا بے محل سوئے کہ اب
مجمعِ احباب اک خوابِ پریشاں ہو گیا

انقلاب آ کر مدد دیتے ہیں استعداد کو
کروٹیں بدلیں لہو نے اور انساں ہو گیا

راستہ وحشت کو آخر مل گیا تنگی میں بھی
یہ گریباں تھا جو دو ہاتھوں میں داماں ہو گیا

بلبلو نکلے دل گلوں کے ساتھ مٹی میں ملے
جو چمن اُجڑا وہی گورِ غریباں ہو گیا

دل تو ہے سینہ میں پر جمعیتِ خاطر کہاں
اس کا شیرازہ تو زلفوں سے پریشاں ہو گیا

وسعتِ صحنِ جہاں کچھ کم نہ تھی اے عشقِ دوست
کیوں گھٹا اتنا کہ دل والوں کو زنداں ہو گیا

باغباں کی رائے میں۔ میں بے حقیقت تھا مگر
بعد میرے آشیاں داغِ گلستاں ہو گیا

رک چلا ہے بیچ میں خنجر الٰہی خیر ہو
دم نہ نکلے گا اگر قاتل پشیماں ہو گیا

ہم کو صحرا نے غباری پیرہن پہنا دیئے
جن کا کچھ ساماں نہ تھا انکا بھی ساماں ہو گیا

جب کوئی آنسو مژہ پر آ کے چمکا شامِ غم
میں یہ سمجھا صبح کا تارا نمایاں ہو گیا

شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں
زلف تو سمٹی مگر ہاں دل پریشاں ہو گیا

کم سے کم پر آج راضی ہیں شہیدوں کے مزار
آپ ہنس دینگے تو سمجھیں گے چراغاں ہو گیا

جس میں لاکھوں پھول تھے ثاقب وہ گلشن ہائے ہائے
ایک ہی گردش میں گردوں کی بیاباں ہو گیا

علما کی صحبت

تقریر جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے، ناظم محکمۂ آثار قدیمہ حیدر آباد دکن اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر، مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۲۶ء میں فرمائی۔

سید جمیل حسن، ایم۔ اے،

جناب صدر انجمن صاحب و معزز حاضرین اور عزیز طالب علموں! آپ کے لائق صدر نے چند روز ہوئے جب وہ بلدے تشریف لے گئے تھے۔ مجھ سے ازراہ کرم فرمایا تھا کہ یورپ کے علمار کی صحبت سے جو اثر میرے دل پر ہوا۔ اُس کا ذکر اس جلسے میں آپ کے سامنے کردوں، اُن علمار کی سادہ اور بے لوث زندگی، علمی تبحر، مطالعے میں انہماک اور تحقیق کا شوق ایسی خصوصیات ہیں جو ہندوستان کے طالب علم کو خواہ اُس نے مغربی طرز کے مدارس میں تعلیم پائی ہو۔ یا ایشیائی مکتبوں اور آشرموں میں پروان چڑھا ہو، ضرور عجیب نظر آتی ہیں۔ جب کسی قوم میں انحطاط آتا ہے۔ تو اُس کا معیار علم بھی پست ہو جاتا ہے۔ ناداری اور افلاس کی بلا اخلاق کو خراب کر دیتی ہے۔ معلموں کی اور عام پیشہ وروں کی زندگی میں مطلق فرق نہیں رہتا۔ ذاتی مفاد، تحصیل و تدریس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ اور علمی، تلاش کا حقیقی ذوق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ہمارے بدنصیب ملک کی آجکل یہی حالت ہے۔ مغربی تعلیم حاصل کرنے کی غرض محض کسب معاش ہے۔ اور مشرقی مدارس کی غایت ثواب آخرت۔ علم کی جستجو محض علم کے شوق کی وجہ سے اس سرزمین میں آجکل عنقا ہے۔ اس تنزل کے اسباب خواہ سیاسی ہوں خواہ معاشی، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ صحیح معنوں میں علمی چرچوں سے ہم ناآشنا ہو گئے ہیں۔ اور تہی دستی اور بد ذوقی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کہ اگر ہم کسی میں بھولے بسرے یہ شوق دیکھتے بھی ہیں۔ تو ہم کو تعجب ہوتا ہے اور اسکی

غایت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

طالب علم کے دل و دماغ پر استاد کی زندگی اور طرز معاش کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور حقیقی طور سے پوچھئے تو وہ تربیت جو طالب علم کو خود بخود اس اثر سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ قومی فلاح اور کامیاب زندگی کے لئے ایسی تعلیم سے جو امتحانات کے پاس کرنے یا دستار فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے کتابوں کے درس کے ذریعہ سے دی جاتی ہے، بدرجہا ضروری اور لازم ہے۔ ہندوستان والوں کو کیمبرج اور اکسفورڈ یا یورپ کی بعض اور قدیم درسگاہوں میں ایک اور بات جو غیر معمولی نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ پروفیسر طالبعلموں کو اس طور سے سبق نہیں دیتے جیسا کہ ہماری تعلیم گاہوں میں رواج ہے کہ استاد نے طالبعلموں کو ایسی یادداشتیں لکھادیں جو امتحان میں کارآمد ہو سکتی ہیں اور جن کو حفظ کرکے طالب علم، کامیاب ہوگئے وہاں کے پروفیسروں کا وقت زیادہ تر خود اپنی علمی تحقیقات میں گزرتا ہے، طالب علموں کو بھی مناسب ہدایات دی جاتی ہیں لیکن یہ ہدایات تیار لقمے کی صورت میں نہیں ہوتیں بلکہ اُن کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کن ذرائع سے اور کن کتابوں سے اپنے معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کالجوں میں استاد بجائے بچوں کے دودھ پینے کی عادت کے چھڑانے کے جو ایک خاص وقت تک ضروری ہے اس عادت کو آخری وقت تک جاری رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا طالبعلم ایم۔ اے۔ کے امتحان کے واسطے بھی اُسی طرح اُستاد کی یادداشتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ مدرسے کی ابتدائی جماعات میں تھا۔

میں نے آپ سے ابھی عرض کیا کہ استاد کی زندگی کا طالب علم کے اوپر بڑا اثر ہوتا ہے یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں علمی ترقی کا راز دراصل استادوں کی زندگی اُن کا علمی انہماک اور شغف گرد ایک فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں طالب علم خود بخود رنگ جاتا ہے اور حقیقی شوق جو علم کی جستجو کے لئے لازمی ہے اُس میں پیدا ہوجاتا ہے۔ میں اب آپ کو چند اساتذہ سے اپنی ملاقات

کا ذکر سناؤں گا جس سے میرے خیالات اور واضح ہو جائیں گے۔

پروفیسر بیون کا نام آپ نے سنا ہوگا یہ کیمبرج میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ساری عمر عربی لغت کی تحقیق میں صرف ہوئی ہے۔ اور اب اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بدن تیلا دبلا ہے اور مزاج میں زیادہ شگفتگی نہیں۔ اس لئے طالب علم ان کے پاس آنے جانے سے گھبراتے ہیں۔ باہر کم نکلتے ہیں اور زیادہ وقت مطالعے میں اپنی قامت گاہ میں جو کالج کے اندر ہی گذرتا ہے۔ جان مارشل نے جو کیمبرج کے پرانے طالب علم ہیں میرے آنے کے متعلق پروفیسر صاحب موصوف کو لکھ دیا تھا چنانچہ جب میں اُن کی اقامت گاہ پر پہنچا اور دستک دی تو بہت دیر تک کچھ جواب نہ آیا معلوم ہوتا ہے مطالعے میں مستغرق تھے جب دروازہ کھلا تو میں نے اپنا کارڈ شناسائی کی غرض سے دیا اسے ہاتھ میں لے لیا اور بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا لیکن اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا خیال ابھی مطالعے ہی کی طرف تھا یہ کیفیت کوئی پانچ منٹ تک رہی مجھے اُن کے سکوت کو دیکھکر افسوس ہوا کہ میں نے اُن کو ناحق تکلیف دی۔ آخر میں اُٹھنے لگا یکایک کچھ چونک سے پڑے کہنے لگے۔ بیٹھو بیٹھو، کچھ سناؤ کیا کیا کرتا ہے کہاں کہاں جانا ہے؟ میں نے اجمالی طور سے اپنے سفر کی غایت بیان کی اور اسلامی فن تعمیر کی ضمن میں کہیں مسجد کی ابتدا کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے۔ مسجد کا لفظ عبرانی کتابوں میں بھی آیا ہے، اور سریانی زبان میں لفظ مسجد کے معنی تقریباً وہی موجود ہیں، جو اسلام کی اشاعت کے بعد اس لفظ کے عربی زبان میں پیدا ہو گئے۔ پھر اس رائے کی تائید میں اتنے حوالے دیئے اور اتنی دقیق بحث کی کہ میرے فہم سے باہر تھی۔ میں چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ لیکن اُن کے شوق اور انہماک کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور دل میں یہ خیال آیا کہ اے کاش یہ شوق ہمارے ملک کے ہونہاروں میں بھی پیدا ہو جائے۔

اب میں آپ کو پروفیسر براؤن مرحوم کا حال سناتا ہوں اُن کی عجب شخصیت تھی، دیکھنے میں تو ذرا سے آدمی تھے اور کوزپشتی کا عیب بھی موجود تھا، لیکن جب بات کرتے

تھے تو چہرے سے کمال ذہانت ٹپکتی تھی - اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے - طبیعت میں انتہا کا انکسار اور حلم تھا - اسی وجہ سے طالب علم اور آنے جانے والے اُن کا بہت وقت ضائع کرتے تھے - ایشیائیوں کے لئے مہمانی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا - میرے آنے کا جب حال معلوم ہوا تو ڈاکٹر بذل الرحمٰن سے جو اس وقت کیمبرج میں تھے کہا کہ اُن کو سیدھا اسٹیشن سے میرے پاس لے آنا - دو دن تک مہمان رہی، پُر لطف باتیں کرتے تھے - اِن دونوں بیوی کی علالت کی وجہ سے ذرا طبیعت میں انتشار تھا - اور اپنی صحت کی خرابی کو بھی محسوس کر رہے تھے - مسوّدوں کے بستے دکھائے کہ خدا اس ذمہ داری کو پورا کرے - آنکھ میں چونکہ بے حد لحاظ تھا، اس لئے بعض اوقات چھپ چھپکر کام کرتے تھے -

ایران اور اہل ایران کے ساتھ حقیقی عشق تھا - اپنے ملک کی نگاہ جب کبھی بدلی ہوئی دیکھتے تھے، فوراً ایران کی بھلائی کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، اُس پُر خلوص محبت اور شیفتگی کی وجہ سے سیاسی عہدہ دار بھی اُن کا ادب کرتے تھے - سر دو لزے ہیگ ایک قصہ سُناتے تھے - وہ جب مشہد میں قونصل جنرل تھے ایک شاعر کو ایرانی سلطنت نے غداری اور بغاوت کے جرم میں قید کر دیا - شاعر نے پروفیسر براؤن کو عرضی لکھی اور مدد چاہی اُن کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ فوراً سر دو لزے کو خط لکھا کہ جس طرح ممکن ہو، شاعر کو چھوڑا دو، یہ سمجھو کہ براؤن کا بیٹا قید ہو گیا ہے اور دستگیری کا وقت ہے - سر دو لزے کہتے ہیں کہ شاعر کے جرم میں مطلق شبہ نہ تھا، لیکن براؤن کی محبت کو دیکھ کر مجھے شاعر کو بغیر رہا کرائے بن نہ پڑی -

یہ محبت ہی تھی کہ اس فاضل نے ایران کی ادبیات کو اس خوبی سے سمجھا ہے، لیکن باوجود تبحر کے کبھی کسی قسم کی لن ترانی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی - شبلی کی تالیف "شعر العجم" کے متعلق فرمانے لگے کہ "یہ ایسے وقت لکھی گئی، جب میں اپنی کتاب بہت کچھ لکھ چکا تھا -

اور چونکہ یہ اُردو میں لکھی گئی۔ اس لئے اس کے مطالعے میں مجھے بیحد دقت پیش آئی" جب پروفیسر براؤن کے انکسار اور فضیلت کا مقابلہ ہندوستان کے علما رکے مبلغ معلومات اور تعلّی سے کیا جاتا ہے تو ان حضرات کے حال پر تاسف ہوتا ہے، اور ان کے تنگ مایگی پر غیر قوم والوں کے سامنے شرم آنے لگتی ہے۔

کیمبرج کے ایک پروفیسر کا ذکر میں اور کروں گا۔ اُن کا اسم گرامی 'سرولیم رجوے' ہے۔ یہ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ میں نے اُن کی بعض تنقیدیں پڑہی ہیں۔ خلاف واقعہ باتوں اور غلط بیانی کے دشمن ہیں۔ اور اس قسم کی کمزوریوں پر مصنفین اور مؤلفین کی دہجیاں اُڑانے میں مطلق نہیں چوکتے۔ علم الآثار کے پروفیسر ہیں اور سرجان مارشل کے استاد ہیں۔ پروفیسر براؤن، نے جب یہ سُنا کہ مجھے 'سرولیم رجوے' سے بھی ملنا ہے، تو پہلے تو بہت تعجب کیا لیکن پھر مسکرا کر چپ ہو رہے۔ کیمبرج میں اس زمانے میں موسم گرما کی تعطیل ہو گئی تھی۔ اور 'سر ولیم' اپنے ذاتی مکان میں چلے گئے تھے، یہ لب دریا کیمبرج سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں کشتی میں سوار ہو کر اُن سے ملنے گیا۔ یہ بھی عجب سیر تھی۔ لیکن اس وقت اس کا ذکر موجودہ مضمون سے متعلق نہیں۔ 'پروفیسر رجوے' کا سن ستّر سال سے زیادہ ہوگا۔ نہایت بلند قامت ہیں اور ہاتھ پیر خوب مضبوط ہیں لیکن بینائی نے بالکل جواب دے دیا ہے، میرے آنے کی خبر ملی، تو فوراً نکل آئے اور میری پشت پر ہاتھ رکھ کر مجھے سینے سے لگالیا اور کہنے لگے، "مجھے تمہارے آنے سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم میں تیسری پیڑی نظر آتی ہے۔ سرجان مارشل، میرے شاگرد ہیں اور تم اُن" پھر اُن کی بیوی آگئیں، اُن سے بھی اسی طرح متعارف کرایا۔ اور ایسی محبت سے باتیں کرتے رہے، جیسے کوئی اپنے بچوں سے کرتا ہے، پھر اپنے گھر کی ایک ایک چیز دکھائی۔ بصارت کی کمی کی وجہ سے چلنا پھرنا دشوار تھا، لیکن میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صحن میں لے گئے اور ایک دہوپ گھڑی دکھائی، جس کی کچھ تاریخی اہمیت تھی، اس کا سارا حال سُنایا۔

شام کو کھانے کے بعد کہنے لگے کہ مجھ کو ہندوستان کے آثار کے متعلق کچھ معلوم نہیں، سُنتا ہوں وہاں کے فنونِ لطیفہ میں یونانی اثر غالب ہے۔ تم ہندوستان کے رہنے والے ہو۔ کچھ تم بیان کرو۔ جو کچھ میں کہتا تھا نہایت غور سے سُنتے تھے اور کبھی کبھی سوال بھی کرتے تھے۔ لیکن اس تمام بات چیت میں شفقت کا رنگ غالب تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ دو روز اس صحبت میں عجیب لطف سے گذرے اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اہلِ علم کے نزدیک شاگرد اور اولاد میں مطلق فرق نہیں، اور یہی گہرا قلبی تعلق ہے، جو علمی ترقی کا راز ہے۔

کیمبرج کے تین پروفیسروں کی شان آپ نے سُن لی، اب تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کو یورپ سے شام میں لیجاتا ہوں۔ بیروت میں عیسائی پاپاؤں کا جو دارالعلوم قائم ہے اس سے تو آپ شاید واقف ہوں گے۔ یہاں ایک اُستاد "پاپا شیخو" نامی ہیں۔ اسلامی علوم میں فرد ہیں۔ یورپ کے تمام مستشرقین اُن کا بہت احترام کرتے ہیں۔ عرب کی قدیم تاریخ انہیں خوب معلوم ہے۔ اور چند سال ہوئے فرانسیسی زبان میں مکہ معظمہ کے حالات پر ایک ضخیم کتاب بھی تالیف کی ہے "موسیو پروسٹ"، جو خود ایک زبردست "اثری" ہیں، مجھے پاپا شیخو کے پاس لے کر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ خانقاہ میں جہاں پاپا شیخو، اور اور پاپا رہتے ہیں اُسے قلعہ سمجھنا چاہئے۔ ایک برآمدے میں پاپا ٹہل رہے تھے "موسیو پروسٹ" کو آتا ہوا دیکھ کر جلد آگے بڑھے اور فرمایا "دوہرا شکرانہ اور دوگنی مسرت کہ خود بھی آئے اور اپنے ساتھ ایک اور عنایت فرما کو بھی لائے" پاپا شیخو، چھریرے بدن کے ہیں۔ قد میانہ ہے۔ ہونٹ پتلے پتلے اور آنکھیں نہایت روشن بات کرنے میں اکثر مسکراتے رہتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ زہد نے ان میں کسی قسم کی خشکی یا انقباض پیدا نہیں کیا۔ ہم کو اپنے حجرے میں لے گئے، اس میں سوائے پلنگ اور ایک میز اور دو تین کرسیوں کے اور کوئی سامان نہ تھا۔ کرسیاں بھی نہایت چھوٹی چھوٹی

اور ہاتھ رکھنے کے لئے ان میں ڈنڈے وغیرہ نہ تھے، زندگی نہایت سادہ بسر کرتے ہیں اور تمام وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گذرتا ہے۔ اُن کا حجرہ خانقاہ کی اُسی منزل میں ہے، جہاں کتب خانہ ہے۔ مجھ سے مکہ معظمہ، طائف، مدینۂ منورہ، وغیرہ کے حالات پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہم خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اس لئے اکثر لغزش ہوتی ہے۔ مورخ کے واسطے سیاحت اور قدیم مقامات کا دیکھنا ضروری ہے۔ پاپا سے صحبت تو کوئی دو گھنٹے تک ہی رہی۔ لیکن ان میں میں نے ایک عجب مقناطیسی اثر پایا یا خبر نہیں وہ اُن کے زہد یا استغنا کی وجہ سے ہے، یا علمی شوق کی وجہ سے، یا طبیعت کی قدرتی شگفتگی اور سحر بیانی کی وجہ سے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ طالب علم، جن کو ایسے اُستاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہوگا۔

عزیز طالب علمو! آپ کے صدر صاحب نے مجھ سے فقط یورپ اور بیرونی ممالک کے اساتذہ کے حالات بیان کرنے کے متعلق فرمایا تھا۔ لیکن میں اس موقع پر ایک اور عالم کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن کے اخلاق میں گو ہمارے ملک میں رہنے کی وجہ سے وہ کشش نہیں رہی، جو میں اور اساتذہ کی نسبت بیان کر چکا ہوں۔ لیکن وقت کی قدر، عمل میں احتیاط، اور تحقیق کا شوق، اس درجہ ہے کہ اُن کی بدولت وہ دنیا کے مشہور و معروف آدمیوں میں سے ہوگئے ہیں۔ ان عالم کا نام مسٹر آریل ستاین، ہے۔ نسل کے یہودی ہیں، ہنگری کے رہنے والے ہیں، آکسفورڈ، میں تعلیم پائی، ہندوستان میں آکر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے، اور پھر صوبۂ سرحدی کے ناظم تعلیمات ہوگئے۔ تحقیق کا شوق آکسفورڈ سے ساتھ لائے، وہاں پالی اور سنسکرت کا درس لیتے تھے اور وسط ایشیا کے ریگستانوں کی چھان بین کے خواب دیکھتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد، گو ملازمت کرتے رہے، لیکن دل بدھ مت کے کھنڈروں کی تلاش کے شوق میں لگا رہا اور تیاری کرتے رہے۔ آخر جب

موقع ملا تو تین دفعہ وسط ایشیا کا سفر کیا۔ پہاڑ اور ریگ چپہ چپہ زمین کی ساحت کی اور علم وفضل،
فن وکمال کے وہ خزانے ڈھونڈے کہ دنیا حیران ہوگئی۔ سر آریل سٹائن نہ غیر معمولی طور سے
ذہین ہیں، اور نہ بہت بڑے فاضل۔ اُن کی ترقی کا راز وہی صفات ہیں جن کا میں نے اوپر
ذکر کیا۔ وسط ایشیا کی بے آب ریگ سیاحوں کو آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ اُنہوں نے پہلے
سے اندازہ کرلیا کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کتنے پانی کی ضرورت ہوگی۔ رستے کی دقتوں
کے لحاظ سے روزانہ کسقدر مسافت طے کرنی چاہیئے، آخر ڈیڑھ سو اونٹ برف سے لدے
ہوئے ساتھ لے کر کشمیر کے پہاڑوں سے روانہ ہوئے۔ جو رفتار مقرر کرلی تھی۔ اُس میں مطلق
فرق نہ آنے دیا۔ بیمار ہوئے، پیر کا انگوٹھا سردی کی شدت کی وجہ سے گل گیا، لیکن ہیرے
ارادے کا پکا، آگے بڑھے گیا۔ اور آخر ٹھیک اتنی مدت میں جتنا کہ اندازہ کیا تھا اپنی سیاحت
کو کامیابی کے ساتھ ختم کیا۔ خود فرماتے تھے کہ چونکہ وقت کم رہ گیا تھا؛ اس لئے بھائی رام سنگھ کو جو
پیمائش کیواسطے ساتھ گئے تھے یتیے ایک جانب بھیجا اور خود دوسری جانب روانہ ہوا؛ تاکہ کام جلد
ختم ہوجائے۔ چلتے وقت بھائی رام کو ہدایت کردی کہ جو نظام العمل مقرر کیا ہے، اگر
اُس کی پابندی نہ کی گئی تو ہم دونوں ریگستان میں ہلاک ہو جائیں گے۔ کہتے تھے جس روز
ہم دونوں ٹھیک اسی موقع پر اور اسی وقت ملے ہیں جہاں کہ ہم نے اندازہ کیا تھا، تو
ہماری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

سنہ ۱۹۱۹ء میں یہ ممالک محروسہ میں تشریف لائے تھے ایک ہفتہ تک مجھکو اُن کے
ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وقت کی قدر اور احتیاط کا حال آپ سنینگے تو حیران ہونگے وقت
پر سوتے تھے، وقت پر اُٹھتے تھے، اور وقت پر کل کام کرتے تھے۔ اور اتفاق سے
اگر نظام العمل میں فرق آجاتا تھا تو وقت کو ضائع نہونے دیتے تھے۔ صبح کو چائے پلانے
اور ڈاڑھی نہانے کے لئے گرم پانی دینے کا وقت بندھا ہوا تھا۔ ایک روز گرم پانی
لانے میں دیر ہوئی۔ یہ فوراً قلمدان کھول، خط لکھنے میں مشغول ہوگئے جل گاؤں کے اسٹیشن

پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ پنجاب میل دو گھنٹے تاخیر سے آئیگا۔ مجھ سے کہنے لگے: معاف فرمائیے میں اپنی یادداشتوں کو صاف کرلوں۔ ورنہ پھر یہ وقت ضائع جائیگا۔ ہر چیز قفل و کنجی میں رکھتے تھے۔ اور جو کام کرتے تھے، اس کو فوراً اس کی حدتک مکمل کردیتے تھے۔ اجنتا میں مولوی سید احمد صاحب بھی ساتھ تھے، ہم دونوں بعض وقت ہنستے تھے، کیونکہ اُنھوں نے ایک ہی غار میں کئی کئی فوٹو لئے لیکن جہاں ایک فوٹو لے لیا، فوراً صندوق میں کیمرے کو بند کرکے قفل لگادیتے تھے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد دوسرا فوٹو لینا ہوتا تھا تو پھر کیمرے کو نصب کرتے تھے اور پھر قفل لگاتے تھے۔ نوٹ بک کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بار بار تھیلے سے نکالتے تھے اور پھر مقفل ہوجاتی تھی۔ میرے عزیز دوستو! وقت کی قدر اور احتیاط یہی سر آریل اسٹائن کی نمایاں کامیابی کے راز ہیں اور یہ ایسی صفات ہیں کہ ہمارے ملک میں کم نظر آتی ہیں۔

حضرات! علماء کی جو صفات میں نے آپ کے سامنے بیان کیں، یہ طالب علم کی زندگی میں کایا پلٹ کردیتی ہیں، لیکن ایسی نہیں کہ ہمارے امکان سے باہر ہوں۔ فضل و کمال کسی خاص قوم کا ورثہ نہیں، کبھی آپ کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ شمالی یورپ کی اقوام کو جو آج دنیا میں ممتاز ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے میدان میں بلید الذہن، کم فہم اور جاہل سمجھتے تھے۔ اگر آپ کو میرے بیان میں شبہ ہو تو ابن حزم کی کتاب "الفصل فی الملل والاہوا والنحل" کو دیکھئے کہ کیا لکھتے ہیں۔ یا ابن سعید کی تصنیف "طبقات الامم" کو ملاحظہ فرمائیے کہ شمالی یورپ کے باشندوں کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ عروج و زوال ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں، مایوس نہ ہونا چاہئے، عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی غایت یہی ہے کہ ہمارے ملک کے ہونہاروں میں علم کا سچا شوق پیدا ہو۔ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ہم کو ایسا بادشاہ دیا جو علم و فضل کا حقیقی سرپرست اور حامی ہے۔ نصاب کا تقرر اور طریق تعلیم کی اصلاح ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ترقی کے لئے کوئی امر مانع نہیں

اساتذہ کو چاہئے کہ اپنے نصب العین بدل دیں۔ اور وہ شوق وانہماک دکھائیں جو علم کی شمع برداری کے لئے لازم ہے۔ مستقبل بہت خوش آیند ہے۔ ملک میں سر جگدیش بوس اور رابندرناتھ ٹگور پیدا ہو چکے ہیں، طلبا، اورنگ آباد! تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں، تم ایسے خطے میں رہتے ہو جہاں تمہارے بزرگوں کے کارنامے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ تغلق کی اولوالعزمی، بہمنیوں کی شوکت، مغلوں کی تہذیب اور نفیس ذوق سے اپنے کمہلائے ہوئے دلوں میں روح پھونکو! سالباہن کے قصے اور راجہ کرشنا کی حکایات تمہاری گھٹی میں ہیں۔ اجنٹا کی تصاویر اور ایلورہ کے معابد تمہارے ہی اسلاف کے بنائے ہوئے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہمتوں اور مٹے ہوئے ولولوں کو پھر پیدا کرو! تمہیں ایک اور بڑی خصوصیت بھی حاصل ہے، وہ تمہارے صدر کی پاک اور بے لوث ہستی ہے۔ اس کی بے نظیر زندگی کی تقلید کرو۔ علم کی لو جو اس کے دل کو لگی ہوئی ہے اگر تم نے بھی پیدا کر لی تو بیڑا پار ہے۔

کامیابی کا راز

اپنی اصلاح

از

(جناب حسن عابد صاحب جعفری۔ اکسن بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر شمع)

یہ سلسلہ مضامین شمع میں مستقلاً شائع ہوتا رہے گا۔ یقین ہے کہ پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ خیالات اور جذبات کو اکسانے اور اپنی حالت کا اندازہ لگا کر بہتر بننے کا ولولہ ایک مبارک جذبہ ہے، جس کو قایم رکھنا اور ترقی دینا تعلیم کا اصلی مقصد ہے، افسوس کہ ایسی ہی ضروری باتوں سے ہمارے نوجوان بے خبر ہیں، اور فارغ التحصیل ہو کر بھی اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس سلسلہ مضامین کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

مدیران شمع

اگر دو تین آدمیوں سے آپ کی نہیں بنتی تو ممکن ہے اُن کا قصور ہو۔ لیکن اگر دس بارہ آدمیوں سے آپ کی نہیں بنتی ہے تو یقینی طور پر آپ خطاوار ہیں۔

یہ الفاظ امریکہ کے ایک مشہور عالم نفسیات کی زبان سے نکلے ہیں جس کا مقولہ ہے

کہ دنیا رہنے کے قابل ہے، اور یہاں کی خوشیاں اس لایق ہیں کہ انسان جی بھر کر اُن سے لطف حاصل کرے۔

اگر تین سال کے عرصہ میں آپ دو تین کام یا ملازمتیں یکے بادیگرے کریں، تو ممکن ہے کہ آپ ترقی کر رہے ہوں، لیکن اگر ایک سال کے اندر آپ نے متعدد کام اُٹھائے یا ملازمتیں اختیار کیں اور اُن کو چھوڑ دیا تو واقعی آپ نے غلطی کی،

یہ الفاظ بھی اسی زبردست عالم کے ہیں، اور آپ کے ذاتی جانچ کے لئے دو اہم سوالات ہیں، ظاہر ہے کہ آپ یا تو اپنے ملنے والوں کو بُرا کہیں گے یا اپنی ملازمتوں اور اپنے کاموں میں نقائص ہونا ظاہر کریں گے۔ لیکن یہ ذرا مشکل ہے کہ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر آپ سوچیں کہ آپ کی ذات والاصفات کتنی برائیوں کی مرکز ہے، اور اسی کی بدولت آپ نے دُنیا میں کتنی ناکامیاں اٹھائی ہیں! کچھ تو آپ کی عادتیں بچپن میں بگڑیں، اور کچھ اسوقت بگڑیں جبکہ آپ مطلق العنان ہوگئے تھے، ہمیشہ آپ نے دوسروں کا قصور ٹھہرا دیا، اور ہر کام میں نقص نکالا۔ لیکن آپ کبھی اپنی اصلاح پر بھی متوجہ ہوئے؟ آئیے! آج ہم اس موضوع پر آپ سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں۔ اور دکھاتے ہیں کہ معمولی توجہ اور کوشش سے اس دنیا میں آپ کے کتنے ہمدرد، اور مددگار پیدا ہوسکتے ہیں کہ معمولی اور ملازمتیں آج آپ کو وبالِ جان معلوم ہورہی ہیں، کسقدر خوشگوار بن سکتی ہیں؟ ہردلعزیز ہونا یا دوسرے الفاظ میں، اوروں کے ساتھ اچھے اور خوشگوار تعلقات قائم رکھنا ایک فن ہے، اور چونکہ اس کا گہرا تعلق عملی نفسیات سے ہے، اِس لئے جواب تک اس مسئلہ پر تحقیقات ہوچکی ہے اس کو ہم عام فہم زبان میں پیش کریں گے تاکہ قارئین شمع جن میں طلبا بھی شامل ہیں۔ ہمارے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تعلقات کو خوشگوار بنا کر قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پہلا اصول اچھی طرح سمجھ لیا جائے،

(۱) فعل انسانی کے متعلق پیشین گوئی کیجا سکتی ہے، یعنی آپ پہلے سے رائے قائم کر سکتے ہیں کہ خاص حالتوں میں فلاں شخص سے کس قسم کے افعال ظہور میں آئیں گے! اور یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فلاں شخص جو کچھ کرے گا اُس کا تعلق آپ سے ہے کہ پہلے آپ کیا کر چکے ہیں؟ مثلاً میں کہوں کہ آپ جھوٹے ہیں، اس کا آپ ایک طرح پر جواب دیں گے، اسی طرح، اگر آپ کی تعریف کروں، تو آپ دوسری طرح پر جواب دیں گے، حضرت سلیمان نے فرمایا ہے کہ "عاجزی کا جواب غصہ کے سوال کو سوخت کر دیتا ہے، باہمی تعلقات کے قیام کا بہت کچھ انحصار اس امر پر ہے کہ ہم اکثر مواقع پر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہماری پیش قدمی کا جواب دوسری ذات سے کیا ملے گا۔ ابھی چند دنوں کا واقعہ ہے کہ میں سالے کے لئے مضامین چھانٹ رہا تھا، برآمدے میں میرے ایک ملاقاتی ملازم سے ضد کر رہے تھے کہ اُن کی اطلاع کر دی جائے، آواز سُن کر میں نے انہیں بلا لیا۔ اور سمجھایا کہ اس میں ملازم کا قصور بالکل نہ تھا، ایڈیٹری کے فرائض بہت اہم ہیں، اور ملاقتیوں کو مطلق احساس نہیں ہوتا کہ کچہری کے بعد بھی دوسرے لوگ دماغی کام کرنے کے عادی ہیں، وہ معذرت خواہ ہو کر فرمانے لگے "بیرسٹر صاحب! میں تو کام سے آیا تھا! کاروبار کی حالت ابتر ہے، اور گھر کا یہ حال ہے کہ جرمنی کی جنگ میرے ہی گھر میں ہوئی تھی، ہر چیز بے قاعدے ہے۔ نہ گھر میں چین ہے نہ باہر آرام!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے لفافہ نکالا اور فرمانے لگے کہ اس کو رجسٹری کر کے بھیجتا ہوں، اس پر بھی اگر بیوی میکے سے تشریف نہ لائیں تو آپ نالش کر کے دلا پانے زوجہ کی ڈگری کرا دیجئے گا، خط میری طرف بڑھا دیا۔ مضمون پڑھ کر میں نے پوچھا "کیا آپ واقعی اس خط کو بھیج رہے ہیں" انہوں نے جواب میں کسی قدر جوش کے ساتھ فرمایا "بیشک!"

وہ خط میں نے اُن کی طرف بڑھا دیا اور کہا "ذرا اس جملہ کو تو بلند آواز سے پڑھیے" انہوں نے پڑھا، "بس اپنی حماقتوں سے باز آؤ۔ غصہ کو بھاڑ چولھے میں ڈالو، اور سوچو میں تمہارا

شوہر، تمہارا سرتاج، تمہارا مجازی خدا، تم سے کہتا ہوں کہ بس اب چلی آؤ، تم نے جو کچھ کیا بہت بُرا کیا، اور میں تمام عمر تمہاری اس سیہ قلبی، ڈھٹائی، اور حکم عدولی کو کبھی فراموش نہ کرونگا، مگر طول دینے سے کیا فائدہ! میں اب بھی تم کو اپنے گھر میں مثل اپنی بیوی کے رکھنے پر آمادہ ہوں، اور ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد میں تمہاری خطا کو بھی معاف کردوں۔"

میں نے دریافت کیا "کیا جب آپ کی بیوی آپ کے ساتھ رہتی تھیں تو آپ ان سے اسی قسم کی باتیں کرتے تھے؟" جواب ملا "ہاں" اگر میں ضرورت سمجھتا تھا تو اسی قسم کی یا اور قسم کی نصیحت ضرور کرتا تھا، جس کا وہ بہت بُرا مانتی تھیں، اور کئی کئی دن منہ پھولا رہتا تھا، لیکن یہ خط تو بہت ملایم ہے، میں نے تو اس میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس بات کو سمجھ لیں کہ میں ان کا شوہر ہوں اور ان پر قرآن، حدیث، تاریخ، اور روایات کی رو سے فرض ہے کہ وہ میرے احکام کو" میں نے اُن کو یہیں روک کر کہا کہ "میں نے آپ کی سب مشیخت پناہی سُن لی، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے اور اُن کے تعلقات اور خراب ہوں تو بسم اللہ اس خط کو ضرور روانہ کر دیجئے" دنیا میں ایسے ہزاروں شوہر ہیں جو اپنی بیبیوں سے اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں مگر نہیں رکھ سکتے، وہ ایمانداری سے کوشش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ منجملہ اُنکے ایک آپ ہیں جو محض اپنی غلطی کے آپ شکار بنے ہوئے ہیں یہ میں نہیں کہتا کہ آپ کی بیوی فرشتہ خصلت ہیں مگر دنیا میں بہت سے ایسے کام ہیں جو انسان کو ملتوی کرنے پڑتے ہیں، اس خط کو بھیجکر آپ اُن کی طبیعت میں اشتعال پیدا کریں اور کیا نتیجہ ہے؟ آپ کو دیکھنا چاہئے کہ موجودہ حالات کیا ہیں؟ آپ چاہتے ہیں کہ گھر میں خوشی نظر آئے، میاں بیوی میں ہمدردی اور باہمی محبت ہو، لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض الفاظ کے استعمال سے آپ کی بیوی کا مزاج مشتعل ہو جاتا ہے، لیکن آپ اُن کو ترک نہیں کرتے۔ ایک شخص بھینسے کو لال جھنڈی

دکھاتا ہے، اور جب بھینسہ حملہ آور ہوتا ہے تو وہ اُسکے اُس فعل کو احمقانہ سمجھتا ہے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ لال جھنڈی کو دیکھ کر بھینسا ضرور حملہ کرے گا، اور وہ اسی وقت جھنڈی دکھاتا ہے جب کہ وہ بھینسہ کو غصہ میں لانا چاہتا ہے، آپ کی بھی بجنسہ یہی حالت ہے"!

میں نے دوران تقریر میں اُن کو بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ جب میں تقریر ختم کر چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیکار نہیں گئی، اور انہوں نے دریافت فرمایا "تو پھر کیا لکھوں"؟

میں نے کہا کہ فرض کیجئے کہ اسی انداز کا ایک خط آپ کی بیوی کا آپ کے پاس آتا تو آپ کے غصہ کی کیا کیفیت ہوتی اور اگر کوئی شخص ہنس کر اور اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہو تو آپ کی کیا حالت ہوتی ہے؟"

حضرت کی سمجھ میں یہ باتیں آگئیں اور جب دوسری مرتبہ ملنے آئے تو چہرہ پر بشاشت تھی اور جیب سے ایک خط نکال کر کہدیا جو اُن کی بیوی کا جواب تھا اور جس میں اُن لانے کے واسطے بلایا تھا، شکر ہے کہ اب بھی دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تعلقات زن و شو میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ "ہم دونوں نے غلطی کی"، یہاں تک تو ٹھیک ہے، تعلقات خراب نہ ہونگے، لیکن جب یہ کہا جائیگا "یہ غلطی تمہاری تھی"، تو ہزار عمل اور انصاف برتا جائے، میاں بیوی میں کبھی صفائی نہ ہوگی:۔

انسان کا دماغ مشین کی طرح کام کرتا ہے، اور اگر اس کی قابلیت اور اس کی عادت کا علم ہو جائے تو ہم اس کے بارے میں پیشین گوئی بھی کر سکتے ہیں۔ اصول نمبر ۲ یہ ہے۔

"غور سے دیکھتے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس کے جواب میں دوسرا کیا کرتا ہے بالفاظ دیگر مطالعہ کرو کہ تمہارے طرز عمل کا جواب دوسرے کی جانب سے کیا ظہور میں آتا ہے"،

اس طفلانہ خیال کو اپنے پاس کبھی نہ آنے دیجئے کہ دوسرے کو کیا کرنا چاہئے، بلکہ صرف اس امر پر آپ توجہ کریں کہ دوسرا آدمی کیا کرتا ہے، آپ کو حیرت ہو گی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کہہ سکا کریں گے فلاں موقع پر اُس شخص کا کیا طریق عمل ہوگا، اور پھر آپ

اُس کی بہترین صفات سے فائدہ اُٹھاسکا کریں گے۔ اسی اصول کے تحت میں یہ مثال بے موقع نہ ہوگی۔

ایک شخص تھا، اُس خدا کے بندے نے دنیا میں انجن چلانے کے کام سے شروع کرکے مصنف تک کا فرائض کو انجام دینے کی کوشش کی تھی، اور چار پانچ برس کے عرصہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلاجانا اُس کے لئے معمولی بات رہی تھی۔ ہر جگہ چند دن تو وہ اچھی طرح کام کرتا تھا۔ اور پھر کوئی نہ کوئی ایسی افتاد ہوتی تھی کہ اُسے علیٰحدہ ہونا پڑتا تھا اُس کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جہاں میں جاتا ہوں میری ہوشیاری اور قابلیت سے وہاں کا منیجر حاسد ہوجاتا ہے، میں نے جب اُس کے حالات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ محض اپنی زبان کا شکار تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے الفاظ سے اُس کے منیجر یا آقا پر کیا اثر پیدا ہوگا۔ جس معاملہ میں اختلاف ہوتا تو وہ صاف کہہ دیتا کہ تم غلطی کررہے ہو، حالانکہ اُس کو جاننا چاہئے تھا کہ اس قسم کی گفتگو سے دوسرے کے دل پر کوئی خوش آیند اثر نہیں ہوتا ہے، ایک مرتبہ وہ ایسی ہی مصیبت میں مبتلا تھا اور عنقریب اپنی خدمت سے علیحدہ ہونے والا تھا۔ میرے پاس آیا میں نے کہا کہ تم جاؤ اور جو کچھ تمہارے اور منیجر کے درمیان گفت و شنید ہوئی ہو وہ لفظ بہ لفظ لکھ کر لاؤ۔ میں نے اسی طرح اُسکی دوسری ملازمتوں کے بارے میں بھی سوال و جواب لکھوائے۔ اُن کو دیکھ کر وہ خود قائل ہوگیا کہ حقیقت میں ہمیشہ اُس کی جانب سے غلطیاں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اُس کا علاج یہ تجویز کیا کہ وہ دوسروں کی رائے کی عزت کیا کرے اور اُس کو اپنی رائے پر ترجیح دیا کرے، تین مہینہ کی مشق میں وہ شخص تمام بلاؤں سے نجات پاگیا، اور آج بہت اچھی حالت میں ہے، میری صلاح ہے کہ قارئین شمع بھی ایک ہفتہ یہ مشق کریں اور دیکھیں کہ اس عرصہ میں اُن کو کیسی کامیابی ہوتی ہے۔ اور کتنے دوست پیدا ہوتے ہیں۔

ایک اور مثال لیجئے، ان حضرات کو خود بینی کا مرض تھا، ہر موقع اور محل پر اپنی بزرگی، اپنی بڑائی اور کامیابی کی خواہش رہتی تھی۔ اسی خیال سے اُنہوں نے

مذہب کی آڑلی تھی، ممبر پر بیٹھ کر وعظ فرماتے تھے، بڑے بڑے مجمعے آپ کی تقریر کو سنتے تھے
اور آپ ہر جگہ مذہب کے بھیس میں محض ذاتی کامیابی کا کھیل کھیلا کرتے تھے، امر واقعہ یہ ہے کہ
کم بخت کو مذہب سے اُتنا بھی شغف نہ تھا جتنا کہ مجھ کو آپ کو ہے، مجھ سے مل کر بھی اُنہوں
نے اپنا وہی رنگ اختیار کیا اور مجھے بھی اپنے پاک خیالات سے مرعوب فرمانا چاہا۔
اُن کو شکایت یہ تھی کہ لوگ اُن کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے ہیں، اور بالفاظ دیگر اُن کی خود
بینی کو ٹھوکریں لگتی ہیں، اس شخص کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے ایمان تھا، وہ مذہبی
آدمی محض اپنے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے بنا ہوا تھا، اُس کا دل مخلص نہ تھا۔
چنانچہ دوسروں کی جانب سے بھی اُس کو غیر مخلصانہ جواب ملتا تھا، اگر آپ کامیاب
ہونا چاہتے ہیں تو اخلاص پیدا کیجئے۔ اخلاص کا جواب آپ کو اخلاص سے ملے گا، یعنی
جس طرح برتاؤ آپ دوسروں کے ساتھ کریں گے ویسا ہی برتاؤ وہ آپ کے ساتھ کرینگے۔

جو لوگ اپنے حلقہ میں کامیاب نہیں ہیں، اور لوگ اُن سے خوش نہیں ہیں اُن کو
چاہئے کہ تنہائی میں سوچیں کہ "کیا میں ویسا ہی اچھا ہوں جیسا کہ ظاہر کیا کرتا ہوں؟ کیا مجھ میں
ظاہرداری نہیں ہے؟ کیا باتیں کرتے وقت مجھ میں تھوڑی سی مشیخت اور خودداری نہیں
آجاتی ہے اور میں دوسروں کو مرعوب نہیں کرنا چاہتا ہوں؟" اگر آپ میں یہ عیوب موجود
ہیں تو کامیابی کا خواب ترک فرمائیے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہ کثرت ہیں جو طرح طرح کی غلطیوں
میں مبتلا ہیں، لیکن چونکہ وہ اپنی جانچ خود نہیں کرسکتے ہیں اور اس فن سے واقف نہیں ہیں
روزمرہ انواع واقسام کی پریشانیاں اُٹھاتے ہیں، اور دنیا اور اہل دنیا کو مطعون کرتے پھرتے
ہیں ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی اس قسم کی شکایتوں میں سب سے زیادہ مبتلا ہے۔ اس کی
تنگ نظری، اور دل کی کثافت ضرب المثل کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، بہرکیف اس وقت
ہمارے سامنے تین اصول ہیں۔
(۱) انسان کے افعال کے متعلق پیشین ہو سکتی ہے (۲) آپ کو چاہئے کہ دوسروں کے

خیالات کو معلوم کریں۔

(۳) آپ ہمیشہ مخلص رہیں اور ظاہرداری کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ نیز ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زیادہ تر پریشانیوں کا باعث یہ ہے کہ لوگ اپنی جانچ خود نہیں کرتے ہیں۔

"نقشہ امتحان عادات کی بابت"

	علی احمد	علی محمد	محمد اختر	محمد بشیر	عبدالستار	یونس رضا	ادیم حسین	علی سیف اللہ	مشہدی	ضامن رضا
جرأت	+	=	+	—	+	+	+	=	+	+
رضاجوئی	=	=	—	+	=	—	—	=	=	—
ایمانداری	+	=	=	=	—	+	+	+	=	+
اعتبار	+	—	+	=	—	=	+	=	=	=
قوت ارادی	—	=	—	=	—	—	—	+	—	=
حکومت	+	+	=	+	=	=	=	+	+	=
انہماک	=	—	+	—	—	+	=	=	—	=
ذہانت	—	=	=	—	=	+	=	+	=	+
استقلال	+	—	=	=	+	+	=	=	+	—
توجہ	=	=	+	=	=	+	+	—	=	+
خواہش ترقی	—	+	+	+	=	—	—	+	=	=
ضبط		—	—	+	=	=	+	=	—	=

یہ نقشہ ایک شخص نے میری ہدایت سے بناکر اپنی جانچ کی تھی۔ دس دوستوں کے بارہ صفات کو اس نے اپنی رائے سے معلوم کرکے لکھا تھا اور پھر ان سے اپنا مقابلہ کیا تھا، آپ بھی ایک ایسا ہی نقشہ بنائیں اور اپنے احباب کے نام لکھ کر دیکھیں کہ وہ کن صفات میں آپ سے بہتر، برابر، اور کم ہیں۔ تین نشانات -، =، + کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دوست آپ سے بہتر، برابر، اور کم ہیں، اس نقشہ میں ۱۲۰ فیصلے ہیں جو آپ کو اپنے احباب کے بارے میں قائم کرکے نشان لگانے ہوں گے، جس شخص نے اس نقشہ کی خانہ پوری کی تھی وہ ۴۲ میں بہتر، ۴۹ میں برابر، اور ۲۹ میں کم تر ثابت ہوا، اگر آپ کے نقشہ میں + کے نشان زیادہ ہوں تو یا تو آپ خودبین ہیں اور اپنے آپ کو "بڑا آدمی" سمجھتے ہیں، یا آپ کے دوست آپ کے احباب آپ کی قابلیت کے مقابلہ میں کم قابل ہیں، اگر آپ کے نقشہ میں — کے نشان زیادہ ہوں تو آپ ایسے لوگوں سے مل رہے ہیں جو آپ سے زیادہ قابل ہیں یا آپ میں یہ عیب ہے کہ آپ اپنی خوبیوں کو گھٹا کر دیکھنے کے عادی ہیں، بہرکیف ان دونوں میں سے ہر حالت میں آپ کو نہایت سنجیدگی اور سمجھداری کے ساتھ متوجہ ہونا چاہئے۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ ایمانداری کے ساتھ اپنے نقشہ کو پر کریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں گے تو آپ اپنی زندگی کو قطعی طور پر درست کرلیں گے، اور یہ درستی آپ کی کامیابی اور راحت کا باعث ہوگی۔ لہذا آپ کا فرض ہے کہ جن صفات میں آپ کو کمی محسوس ہو ان صفات کو اپنے آپ میں پیدا کریں، اور جن صفات کو آپ اپنے آپ میں پائیں تو پہلے یہ دیکھیں کہ آپ میں واقعی وہ صفات موجود ہیں یا نہیں، اگر موجود ہیں تو انکی حفاظت کریں اور ان کو ضائع نہ ہونے دیں۔

اب میں ایک نوعمر دوست کی مثال پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی جانچ کس طرح کرسکتے ہیں۔ ان کا فرضی نام نواب ہے، ہونہار، ہوشیار، اور ذہین آدمی ہیں۔ مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ نہایت پریشان تھے، ان کی پہلی شکایت تو یہ تھی کہ ان کا افسر اعلیٰ خفا

رہتا تھا، دوسری شکایت یہ تھی کہ محکمہ کے کسی شخص سے اُن کی موافقت نہ تھی! اور انھیں وجوہ سے وہ اپنی لیاقت کا اظہار نہ کرسکتے تھے، تین سال کے عرصہ میں نواب نے مختلف قسم کے کام شروع کئے. کہیں سے تو وہ برخاست ہوئے اور کوئی کام وہ خود چھوڑ آئے ۔ اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی آدمی سے ناراض رہے، یعنی استعفیٰ یا برخاستگی کا باعث یہ ہوتا تھا کہ یا تو محکمہ کے کسی کام ملازم سے ٹکر ہوجاتی تھی یا وہ خود افسر اعلیٰ سے اُلجھ پڑتے تھے، نواب نے جوں توں کرکے تعلیم تو ختم کرلی تھی۔ مگر انکا خیال تھا کہ دنیا بہت بُری جگہ ہے، اور اس میں سخت نقص ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بہت اچھی جگہ ہے صرف ہمارے دوست کی اندرونی دنیا میں نقص تھا، میں نے اُن کی اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا وہ حسب ذیل تھا۔

(۱) پہلے تو میں نے اُن کی ذہنی لیاقت کا اندازہ کیا، کہ وہ کس قسم کی تھی اور کتنے بار کے اُٹھانے کی متحمل ہوسکتی تھی، میری غرض یہ تھی کہ مجھے معلوم ہوسکے کہ وہ جن کاموں میں ہاتھ ڈال رہا تھا وہ اُس کی استعداد سے باہر تھے، یا کم تھے، میں نے مختلف قسم کے سوالات کرکے یہ رائے قائم کی کہ جن کاموں کو وہ کر رہا تھا یا کرچکا تھا اُن سے اس کی لیاقت دس گنا زیادہ تھی! یعنی اُس کا کارہائے منصبی میں اُس کے دماغ کا صرف دسواں حصّہ صرف ہوتا ہے اور بقیہ نوے حصّے شکایتوں اور جنگ و جدال کی نذر ہوتے تھے، چنانچہ اُس نے ایسی خفیف خفیف باتیں سُنائیں جن پر وہ لڑکر یا تو برخواست ہوا تھا یا مستعفی! یہاں یہ نکتہ یاد رہنے کے لایق ہے کہ اگر آپ کو کسی پر غصہ آئے ۔ اور آپ تنہائی میں اُس کا تصور کرکے دانت پیسنے لگیں کہ بغیر بدلہ لئے ہرگز نہ چھوڑونگا، تو آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنی حالت پر ہنسیں، کیونکہ بُرائی کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے، اور آپ اپنا دستورالعمل یہ بنالیں:۔

(۲) ”میں دنیا میں اگر اور لوگوں کے ساتھ رہکر بسر کرنا چاہتا ہوں تو چاہیئے کہ پُرانے قضیوں کو اور شکایتوں کو فراموش کردوں“!

(۳) نواب میں مجھے ایک اور بات نظر آئی جس کی طرف والدین کو ابتدا سے توجہ

کرنی چاہئے۔ وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور تیز تھا، اور جب دوسرے بچے اُس کی بات نہ سمجھتے تھے تو وہ خفا ہوا کرتا تھا، بچپن سے یہ عادت ترقی پاتی رہی اور شباب میں بھی رنگ لائی۔ یعنی اپنی ذہانت سے وہ معاملہ کی تہ پر فوراً پہونچ جاتا تھا، اور اس بات پر خفا ہوتا تھا کہ دوسروں کی سمجھ میں وہ بات کیوں نہیں آئی۔ یہی وجہ محکمہ کے ملازمین اور بعض اوقات افسروں سے بگاڑ کا باعث ہوئی۔ اس مثال سے بھی ہم ایک اور اصول قایم کرتے ہیں۔

"ذہین آدمیوں کو چاہئے کہ وہ سست آدمیوں کے ساتھ صبر اور نیکی کا برتاؤ کریں"

سست ذہن آدمیوں کو اپنی تیزی کے ساتھ کھینچنے میں اُن کا دل دُکھتا ہے، غصہ پیدا ہے، اور اکثر رنجش پیدا ہو جاتی ہیں۔ سست ذہن آدمی فطرتاً مجبور ہے، وہ ذہین آدمی کیساتھ کیونکر سوچ سمجھ سکتا ہے، اس پر خفا ہونا، فطرت سے لڑنا ہے اور سخت حماقت ہے، آپ کبھی دوسروں پر حکومت نہ کر سکیں گے جب تک کہ آپ دوسروں کے دماغی ملکہ کے ساتھ ساتھ چلنا نہ سیکھیں گے۔

اب اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نواب کی زندگی سے آپ کو تین سبق حاصل ہوئے۔

(۱) جو کام آپ کریں وہ آپ کی لیاقت سے نہ تو بہت گرا ہوا ہو، اور نہ بہت بلند ہو،

(۲) اپنے دل میں بغض کو جگہ نہ دینی چاہئے۔

(۳) سست ذہن آدمیوں کے ساتھ تیزی نہ کرنی چاہئے بلکہ اُن کو ساتھ ساتھ رکھنے کے لئے اپنی رفتار کم کرنی چاہئے، اب اگر علاج کی طرف توجہ کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اپنے آپ کو دوبارہ تعلیم کرنی چاہئے، دوبارہ تعلیم کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

(۱) آپ ایمانداری، صفائی، اور انصاف کے ساتھ اپنا مقابلہ دوسروں کے ساتھ

کرنا سیکھیں۔

نقشہ جو اس مضمون کے ساتھ شامل ہے، آپ کے کام آئے گا، اس کی طرف توجہ کیجئے اور خود بھی ویسا ہی نقشہ بنا کر اپنی قابلیتوں کا موازنہ دوسروں کی قابلیتوں سے کیجئے۔ اور یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے۔ میری گفتگو نواب سے ہوئی تھی وہ حسب ذیل تھی۔ اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ آپ اپنی جانچ اور دوسروں سے موازنہ کس طرح کرسکیں گے۔

میں ۔ تم احمد علی سے واقف ہو؟

نواب ۔ ہاں، اچھی طرح واقف ہوں۔

م ۔ جو کام وہ کرسکتے ہیں، تم بھی کرسکتے ہو۔

ن ۔ ہاں بہت سے کام کرسکتا ہوں۔

م ۔ وہ کون سے کام ہیں جن کو تم ان سے بہتر انجام دے سکتے ہو۔

ن ۔ مجھے لوگوں کے نام اور لوگوں کی صورتیں خوب یاد رہتی ہیں، ان کو نام یاد ہی نہیں رہتے،

م ۔ ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کہ اگر کوئی مسئلہ تمہارے سامنے آئے تو تم بہ نسبت اُنکے زیادہ انہماک اور توجہ کے ساتھ اس میں مصروف ہو سکتے ہو؟

ن ۔ نہیں میری رائے میں ان کو فضیلت ہے۔

م ۔ خیر۔ مگر یہ بتاؤ کہ علی محمد، اختر، اور بشیر کے مقابلہ میں تمہاری قوت انہماک اور توجہ کا کیا حال ہے؟

ن ۔ میں ان سے بہتر ہوں۔

م ۔ مگر عبد الستار بھی تو ہیں! آپ کہتے ہیں کہ وہ احمق ہیں؟ لیکن آپ اپنا موازنہ اُن سے بھی کیجئے کہ قوت ارادی میں ان کی کیا حالت ہے؟

ن ۔ قوت ارادی میں تو وہ مجھ سے کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ اپنی رائے ذرا مشکل سے

بدلتے ہیں۔

م - اب آپ یہ بتائیے کہ صفائی، سچائی، دیانداری میں کہ اپنے ان احباب سے موازنہ میں آپ کا کیا مرتبہ ہے؟ ایک ایک کو لیکر رائے قائم کیجئے۔ اچھا پہلے دوستداری کو لیجئے۔ ان لوگوں کے مقابلہ میں دوستوں کے ساتھ آپ کی کیا حالت ہے؟ کیا عبدالستار دوستی کو اچھی طرح بناہتے ہیں؟ اور کیا وہ آپ سے بہتر دوست ثابت ہوتے ہیں!

غرض کہ اس طریق استدلال سے نواب صاحب پندرہ میں دوستوں کا موازنہ ہوگیا، اور جو نتیجہ مرتب ہوا، اُس کو دیکھ کر ان کی ہمت بڑہی، اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا، یہی حال ہر شخص کا ہے، اس قسم کی ذاتی جانچ پڑتال سے خود اعتمادی کو ترقی ہوتی ہے، آپ بھی آزمایش کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کی حالت میں عظیم الشان فرق نظر آئے گا۔

میری اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک اور اصول اخذ کرتے ہیں یعنی :-

"دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی قابلیتوں کا صحیح اندازہ ہو اور نیز اپنی کمزوریوں کا"

تعلیم کا اصلی مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ میں روانی پیدا کردے، اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ آپ اپنی حالت کا صحیح اندازہ کرسکیں، ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم کو اس بات کا علم ہو کہ ہم فلاں کام نہیں کرسکتے ہیں، اور فلاں کام کرسکتے ہیں، اور جب ہم کو صحیح علم ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں، ہم کیا کرسکتے ہیں، اور کیا نہیں کرسکتے ہیں، اُسی وقت ہم دوسروں سے اپنا موازنہ کرسکتے ہیں، انسان کی زندگی میں اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہیں ہے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ نواب کے پیش نظر اُس کی دو تصویریں ہیں - ایک وہ جس میں اُس کو اپنی دماغی قابلیتیں نظر آتی ہیں، ہم اس کو تصویر ذکاوت کہیں گے - اور دوسری وہ تصویر ہے جسمیں اس کی خصلتیں نظر آتی ہیں، یعنی اس کی قوت ارادی - قوت فیصلہ، قوت اعتبار، قوت ایمان،

وغیرہ وغیرہ جلوہ گر ہیں۔ اس کو ہم تصویر خصوصیات کہیں گے، ہم نے نواب کو یہ بھی بتا دیا کہ اُس کی تصویر خصوصیات، دوسروں کی تصاویر خصوصیات کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد، یعنی یہاں تک پہونچکر ہم کو تصویر آرزو وجذبہ ترقی کی طرف متوجہ ہونا چاہئے یہ وہ تصویر ہے جس میں اُس کو آج پانچ یا دس برس آیندہ کی اپنی تصویر نظر آتی ہے انتہائی حیرت کی بات ہے کہ لوگ اپنی پانچ یا دس برس آیندہ کی تصویر قائم نہیں کرتے ہیں اور ذرا تصور سے کام لیکر یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مہینہ، ایک سال، یا دس برس کے بعد کیا ہوں گے اور کیا کرتے ہوں گے۔ اس تصویر کے بنانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان یہ بتا سکے کہ وہ اپنے شوق اور ذوق کے ساتھ کس کام کو کرنا چاہتا ہے، اور اس انتخاب کام کی وجہ کیا ہے، ان دونوں سوالات کا صحیح جواب لیکر میں بتا سکتا ہوں کہ انسان کو کون کام شروع کرنا چاہئے جس میں وہ یقینی طور پر کامیاب ہو سکتا ہے، اس موقع پر صحیح مشورہ دینا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ "میں سمجھتا ہوں میں فلاں کام کر سکوں گا" اور "میں واقعی فلاں کام کر سکوں گا" کے درمیان میں بہت فرق ہے، آپ کا خیال ہے کہ آپ یقینی طور پر فلاں کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکیں گے، لیکن جب کام کرنے کا وقت آتا ہے تو آپ کو اپنی غلطی محسوس ہوتی ہے، اگر آپ پہلے سے سوچ کر اور اپنی جانچ کر کے نتیجہ نکال لیتے تو غالباً آپ کبھی ایسے کام کے پاس بھی نہ پھٹکتے جس میں ناکامی ہی ناکامی تھی۔

سنجیدہ اور سمجھدار آدمی اگر کافی غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ وہ اسی کام کو اچھی طرح کر سکتا ہے جس میں اُس کا دل لگتا ہے اور جس کی طرف اُس کو رغبت ہوتی ہے یہ رغبت، اور "دل لگنے" کا سوال خاصا پیچیدہ ہے، عام طور پر اگر سوال کیا جائے تو نوجوانوں کی کثیر تعداد "سیر و سیاحت" اور "کھیل و تفریح" کی طرف رغبت ظاہر کرے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ سیر و تفریح کے ذریعہ سے کتنے نوجوان معاش کی مستقل صورت پیدا کر سکتے ہیں، نوجوان

کا فرض ہے کہ وہ سنجیدگی سے سوچیں اور طے کریں کہ واقعی کس طرف ان کی طبیعتوں کا میلان ہے۔ دنیا کے شور و شغب، محنت، سختیوں اور کام کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اور اپنی طبیعت اور قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے صرف اُسی کام کی طرف راغب ہونا چاہئے جس کو انسان انجام دے سکتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے میں ہم کو اُن کی معمولی معمولی عادتوں اور خصلتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بادی النظر میں وہ محض معمولی اور ناقابل لحاظ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو وہ دوسروں کی فطرت ثانی بن چکی ہیں اور اس قدر پرانی ہو چکی ہیں کہ اب اُن سے چھیڑ چھاڑ، پوری جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ اسی طرح مجھے ایک اور معاملہ پر بھی چند باتیں لکھنی ضروری ہیں میرا خیال ہے کہ عام طور پر لوگوں کی دماغی حالت اچھی ہوتی ہے لیکن بعض لوگ اپنی ملازمتوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُن کو بتاتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ طریقہ غلط ہے جو کام انسان قوت بازو سے اور اپنے دماغ سے انجام دیتا ہے محنت کرکے روپیہ کماتا ہے وہ قابل عزت ہے اور اگر وہ ذرا توجہ سے سوچے تو اُس کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس عالم اسباب میں جسکی زنجیر کا سلسلہ بہت بڑا ہے، وہ ایک کڑی ہونیکا شرف رکھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے کاموں کو یا اپنی ملازمتوں کو حقیر اور ذلیل سمجھے؟

آخر میں مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ

"اگر آپ دوسروں کی زندگی اور اُن کے کام میں دلچسپی لینا شروع کردیں تو آپ کے ہمدرد احباب کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جائے گا، مگر آپ اس خیال کو دل سے نکال ڈالیں کہ دوسرے لوگ بھی آپ سے دلچسپی پیدا کریں"، جب تک آپ اس وہم میں گرفتار رہیں گے کہ دوسرے لوگ آپ کی ذات سے دلچسپی پیدا کریں آپ کے احباب کبھی پیدا نہ ہونگے، لیکن جس وقت آپ اس غلطی سے مُنہ موڑکر دوسروں کی طرف متوجہ ہو جایں گے دنیا آپ کے پیچھے پیچھے پھرے گی۔

بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے یہ کہنا کہ آپ اس کو پسند کرتے ہیں شرمناک نہیں ہے اور یہ وہ الفاظ ہیں جن کو بادشاہ سے لیکر فقیر تک سُننا پسند کرتا ہے۔

دلچسپی کے معنی یہ ہیں کہ آپ جن لوگوں سے واسطہ رکھیں اُنکی کامیابیوں، اُن کی زندگیوں اور اُن کی ناکامیابیوں میں خلوص اور صداقت کے ساتھ دلچسپی لیں اور اُن سے ہمدردی اور محبت کا برتاؤ رکھیں۔ اور کبھی اس غلطی میں نہ پھنسیں کہ جس طرح آپکو اپنی احباب کی فکر رہتی ہے دوسرے آپ کی فکر کیوں نہیں رکھتے ہیں۔ وہ خود بخود آپ کی طرف متوجہ ہوجائینگے، اور بہت جلد آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ صداقت اور سچائی کے ساتھ ہمدردی کرنیکا صلہ دنیا بہت جلد دے دیتی ہے، جو لوگ ان اصول پر کاربند ہوکر دنیا میں رہیں گے وہ دیکھیں گے کہ احباب کی دنیا میں کمی نہیں ہے اور قدم قدم پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کی زندگی کو خوشگوار اُن کے کاموں کو دلچسپ اور اُن کی مشکلوں کو آسان کرسکتے ہیں۔ اور یہی طریقہ ہے دنیا میں کامیابی کا!

(مختار)

غزل

(لسان الملک حضرت محشر لکھنوی)

ہجر میں نیرنگ ہستی صبر سے دیکھا کریں
چار آنسو رو کے آنکھوں کو عبث رسوا کریں

وقت نظارہ نظر کے سامنے ہیں سو حجاب
آنیوالے جلوہ گاہِ ناز میں آیا کریں

زندگی عشق میں ہنسنا ہے قسمت سے بعید
دل یہ کہتا ہے جہانتک ہو سکے رویا کریں

کوچۂ جاناں سے ہم نکلے تو پھر کیا رہ گیا
اب خدائی بھر کے فتنے سیکڑوں اُٹھا کریں

زندگی اور حسرت ایفائے وعدہ روگ ہے
آنیوالے کا کہانتک راستہ دیکھا کریں

مدتوں سے سن رہی ہیں چارہ سازی آپکی
ہم تو جب جانیں مریض عشق کو اچھا کریں

لائیں محشر جلوہ گاہِ حسن میں وہ قدرتیں
سامنے آئے خدائی بھر تو اب دیکھا کریں

اب فرمائیے حضرات!

(ترجمہ روسی زبان سے)

از جناب محمد مجیب صاحب (آکسن)

خوب! اب میں شراب پینا بالکل چھوڑ دونگا .... کچھ .... کچھ بھی ہو! اب سمجھ سے کام لینے کا وقت آگیا ہے۔ محنت کرنا چاہئے، محنت، تنخواہ وصول کرنا پسند کرتے ہو تو ایمانداری سے کام کرو، دل لگاکر، خدا کا خیال کرکے، چاہے نہ آرام ملے نہ نیند، ہنسی مذاق چھوڑو .... تمہاری مفت میں تنخواہ لینے کی عادت پڑگئی ہے، اور یہ اچھا نہیں.. اچھا نہیں........

اسی طرح اور چند اخلاقی سبق اپنے آپ کو دیکر ٹکٹ کلکٹر پودچیاگن نے محنت اور مشقت کرنے کی ایک عجیب خواہش محسوس کی۔ رات کے دو بجے تھے، لیکن اس پر بھی اس نے اور چند ساتھیوں کو جگایا اور انہیں ساتھ لے کر ٹکٹ چک کرنے کے لئے گاڑی کا گشت لگانا شروع کیا۔

"آپ...... کے ٹکٹ......" وہ چلاتا ہے اور ٹکٹ چک کرنے کے اوزار کو خوشی سے ہلاتا جا رہا ہے۔

اونگھتے، گاڑی کے اندھیرے میں لپٹے ہوئے لوگ، کانپتے ہیں سر ہلاتے ہیں اور اپنے ٹکٹ پیش کرتے ہیں۔

"آپ..... کے ٹکٹ..... پودچیاگن نے سکنڈ کلاس کے ایک مسافر کی طرف مڑکر

کہا۔ یہ شخص بہت دبلا ہے، بدن پر سوا ہڈیوں کے کچھ نہیں، کمبل میں لپٹا ہوا ہے اور چاروں طرف تکیہ لگے ہیں۔

"آپ کے.... ٹکٹ....."

"مسافر کچھ جواب نہیں دیتا۔ وہ نیند میں غرق ہے۔ ٹکٹ کلکٹر اوس کا کندھا ہلاتا ہے اور بے صبری سے کہتا ہے!"

"آپ.... کے..... ٹکٹ!"

مسافر کانپ جاتا ہے، اور آنکھیں کھول کر پودچیاگن پر ایک خوف زدہ نظر ڈالتا ہے۔

"۔ کیا؟ کون؟ ہائیں؟"

"۔ آپ سے آدمیوں کی طرح کہتے ہیں: آپ کے.... ٹکٹ! ذرا تکلیف کیجئے!"

"اے خدا" مسافر روندھا سا چہرہ بنالیتا ہے۔ "اے خدا! مجھے گٹھیا کی بیماری ہے........ تین رات سویا نہیں، جان بوجھ کر (مورفیہ) پھانکا، کہ نیند آجائے..... اور آپ..... ٹکٹ لینے پہونچے! یہ تو ظلم ہے، انسانیت کے خلاف ہے! اگر آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہوتا کہ مجھے نیند کتنی مشکل سے آتی ہے تو آپ اس ذراسی چیز کے لئے مجھے نہ جگاتے...... بے رحمی، بے تکاپن ہے! اور آپ کو میرے ٹکٹ کی کیا پڑی ہے؟ محض حماقت ہے اور کچھ نہیں!"

پودچیاگن سوچتا ہے کہ اس پر خفا ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور یہ ارادہ کرتا ہے کہ خفا ہونا لازم ہے۔

"۔ آپ یہاں مت چلائیے! یہ چنڈو خانہ نہیں!"

مسافر کھانس کر جواب دیتا ہے:۔

"آپ سے تو چنڈو خانہ میں بھی زیادہ بھلے لوگ ملتے ہیں....... اب بتاؤ کہ مجھے نیند پھر کیسے آئے گی! عجیب بات ہے، میں یورپ کے تمام ملکوں میں سفر کرچکا ہوں، وہاں

مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہیں مانگا، لیکن یہاں پہونچتے ہی بس یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں، جیسے کوئی بھوت پریت ان پر سوار ہے، اور اس کے سوا ان کو کچھ نہیں کرنے دیتا!

"جی ہاں، اگر یورپ آپ کو پسند ہو تو وہیں چلے جائیے"!

"حماقت ہے جناب، بس اور کیا کہوں! دھوئیں کے مارے سانس نہیں لیجاتی، ہر طرف سے سرد ہوا آرہی ہے، کیا مسافروں کو یہ تکلیف کافی نہیں؟ اس کے علاوہ کمپنی اپنے تمام قاعدوں پر بھی عمل کرائے گی، خدا اس کو غارت کرے، ان حضرت کو ٹکٹ چاہئے، دیکھئے تو کس دھوم سے ٹکٹ مانگتے ہیں! اور اگر یہ اتنی سختی نہ کرتے تو تو کون اس ملک میں ایسا ایماندار ہے کہ ٹکٹ لے کر چلتا!"

"سنئے جناب، اگر آپ شور مچانے اور دوسرے مسافروں کو دق کرنے سے باز نہ آئیں گے تو میں آپ کو اگلے اسٹیشن پر اوتار دونگا اور آپ پر عدالت پر دعویٰ کرا دونگا!"

"یہ تو عذاب ہے!" چند لوگوں سے نہ رہا گیا، بول اٹھے "بیمار آدمی سے کہڑا تڑا رہا ہے! بات سمجھو جی اور جھگڑا ختم کرو!"

"مگر دیکھئے تو وہ خود برا بھلا کہہ رہے ہیں" پودچیاگن ذرا ڈر کر کہتا ہے۔ بہت اچھا، میں ٹکٹ نہیں لوں گا........ جیسا آپ چاہیں........ لیکن دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہوگا کہ میں اسی کام کے لئے نوکر ہوں اگر میرا فرض نہ ہوتا تو........ آپکا جی چاہے تو اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لیجئے........ جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے۔

پودچیاگن کندھے ہلا کر بیمار کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور اس کی بے عزتی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ دو تین ڈبوں سے گذر چکتا ہے تو اس کے ٹکٹ کلکٹری سینہ میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور اپنی حرکت پر پشیمانی۔

"واقعی اُس مریض کے جگانے کی کوئی ضرورت نہ تھی" وہ اپنے جی میں سوچتا ہے لیکن اس میں میری کوئی خاص غلطی نہ تھی۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ موٹا ہو رہا ہوں اور بیکاری کے سلسلہ میں سب سے ٹکٹ مانگتا پھر رہا ہوں، لیکن انھیں یہ نہیں معلوم کہ میرا کام یہی ہے..... اگر اُن کو اس کا یقین نہیں تو میں اسٹیشن ماسٹر کو اون کے سامنے پیش کر سکتا ہوں"

اسٹیشن، گاڑی پانچ منٹ ٹھہرتی ہے۔ تیسری گھنٹی سے پہلے پوچیاگن اسی درجہ میں جس کا ذکر ہو چکا ہے پہنچتا ہے۔ اُس کے پیچھے اسٹیشن ماسٹر لال ٹوپی پہنے ہوئے۔

"یہ دیکھئے، یہ صاحب ہیں" پوچیاگن کہنا شروع کرتا ہے "جو فرماتے ہیں کہ مجھے اون سے ٹکٹ مانگنے کا کوئی حق نہیں اور..... اور مجھ پر خفا ہوتے ہیں۔ میں آپ سے اسٹیشن ماسٹر صاحب، درخواست کرتا ہوں کہ ان کو سمجھا دیجئے۔ کیا ٹکٹ چیک کرنا میرا فرض ہے یا میں یوں ہی لوگوں کو دق کر رہا ہوں۔ جناب۔ جناب" دبلے پتلے مسافر کی طرف رجوع ہو کر کہتا ہے "لیجئے، اسٹیشن ماسٹر صاحب سے پوچھ لیجئے اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں"

بیمار مسافر کانپ جاتا ہے، جیسے اوس کے کسی بھڑ نے ڈنک مار دیا، آنکھیں کھولدیتا ہے اور روندھا چہرہ بنا کر گدی پر پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔

"اے خدا! دوسری پڑیا پھانکی تھی اور اونگھا ہی تھا کہ وہ پھر آگیا..... پھر آگیا۔ آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھ پر رحم کیجئے!"

"لیجئے آپ اسٹیشن ماسٹر صاحب خود سے پوچھ سکتے ہیں کہ مجھے ٹکٹ چیک کرنے کا حق ہے یا نہیں!"

"بھئی یہ تو مجھ سے نہیں سہا جاتا! آپ آخر ٹکٹ لیکر کیا کریں گے..... کیا کرینگے! میں پانچ ٹکٹ خریدنے کے لئے تیار ہوں، مگر مجھے آرام سے مرنے دیجئے! کیا آپ خود کبھی بیمار نہیں ہوئے! بڑی بے حس قوم ہے!"

"یہ تو صاف ہنسی اڑا رہا ہے" ایک مسافر جو فوجی وردی پہنے ہے خفگی سے کہتا ہے
"اور نہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں اس بات پر اڑا ہوا ہے"
"جانے دو، اسٹیشن ماسٹر تیوریِ چڑھا کر کہتا ہے اور پوچیاگن کی آستین پکڑ اُسے باہر کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

پوچیاگن کندھے ہلاتا ہے اور اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے دھیرے دھیرے چلا جاتا ہے۔

"بھلا ان لوگوں کو کوئی خوش تو کرے،" وہ ناراض ہو کر اپنے آپ سے کہتا ہے میں اسی کی خاطر اسٹیشن ماسٹر کو بھی بلا لایا تھا کہ میری بات سمجھ لے اور اُسے تسکین ہو جائے، اور وہ .... الٹا مجھے برا بھلا کہتا ہے"

دوسرا اسٹیشن۔ گاڑی یہاں پر دس منٹ ٹھہرتی ہے۔ دوسری گھنٹی سے پہلے جب پوچیاگن ریفرشمنٹ روم میں کھڑا سوڈا واٹر پی رہا ہے تو اس کے پاس دو صاحب آتے ہیں، ایک انجنیر کی وردی میں، دوسرا فوجی اوور کوٹ میں۔

"سنئے ٹکٹ کلکٹر صاحب!" انجنیر پوچیاگن سے کہتا ہے ۔ "بیمار مسافر کے ساتھ جو آپ نے حرکت کی ہے اس سے ان تمام لوگوں کو جو وہاں بیٹھے تھے بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ میں انجنیر پوزنیٹسکی ہوں اور یہ ..... کرنیل صاحب ہیں۔ اگر آپ اُن مسافر سے معافی نہ مانگیں گے تو ہم کمپنی کے ڈائرکٹر سے، جس سے ہم دونوں کی جان پہچان ہے، آپکی شکایت کریں گے۔"

پوچیاگن جلدی سے کہتا ہے:
"مگر میں تو ..... مگر آپ تو ....."

"ہم آپ سے بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ نے معافی نہ مانگی تو ہم مسافر کی طرف سے بدلے لیں گے۔"

— بہت اچھا میں..... ہیں، جیسا آپ چاہیں، معافی مانگ لوں گا..... لیجئے.......

آدھے گھنٹے کے اندر پوڈچیاگن، معافی مانگنے کا ایک فقرہ، جس سے مسافر خوش ہو جاتا اور

اوس کی اپنی ہتک بھی نہ ہوتی سوچ کر اسی درجہ میں پہنچا۔

"جناب! —" وہ بیمار کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

"سنئے جناب!"

بیمار کانپ جاتا ہے اور گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"کیا ہے؟"

"میں اس کو..... کیا کہوں؟..... آپ خفا نہ ہو جئے......

"ارے پانی دو، پانی — بیمار ہانپ کر دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے — تیسری پڑیا پھانکی

تھی اور...... پھر! اے خدا یہ عذاب آخر کب دور ہوگا؟

"میں اوسے..... آپ معاف کریں گے......

"سنئے..... آپ مجھے اگلے اسٹیشن پر اُتار دیجئے گا....... مجھ سے اور نہیں

برداشت ہو سکتا..... میں مر رہا ہوں.......

"کیا ذلیل، کمینی حرکت ہے" حاضرین میں سے چند نے کہا — "چلئے، دُور ہو جئے!

اگر پھر ایسا مسخرہ پن کیا تو اس کی سزا ملے گی! چلئے!"

پوڈچیاگن ٹھنڈی سانس بھر کر درجہ سے باہر نکل آتا ہے۔ ریلوے کے ملازموں

کا جو درجہ ہے اس میں آکر بیٹھ جاتا ہے، اور شکایت شروع کرتا ہے۔

"اب فرمائیے، حضرات پبلک! آپ کو بھی خوش کرنے کی کوشش کا کیا نتیجہ ہوتا ہے!

اور کیا خدمت کی جائے! جی بھی نہ چاہتا ہو تب بھی سوا اس سب جھگڑے کے لات

مارنے اور مست ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں....... کچھ نہ کرو — خفا ہوتے ہیں،

کچھ کام شروع کرو، تب بھی خفا ہوتے ہیں؟....... بس پیو،

اور کیا!"

پودچیاگن ایک سانس میں آدھی بوتل پی جاتا ہے اور محنت، فرائض اور ایمانداری کے پھندے میں نہیں پڑتا۔

(چیخوف)

کتب برائے ریویو

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو ہمارے پاس آئی ہیں جن کی رسید شکریہ کے ساتھ پیش کیجاتی ہے عنقریب ان سب کتابوں پر ریویو کیا جائے گا۔

باقیات فانی ۔ دیوان جناب فانی علیگ۔ وکیل اٹاوہ ۲ ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ ۱۰ ر

دور ایام ۔ تاریخ ریاست ٹونک کا دوسرا حصہ۔ امیر الانشاد بیر الملک مولوی سید علی اصغر صاحب ناظم نیاز ہیڈرہ ٹونک ۸

دُر رالبیان ۔ سید محمد حمید صاحب۔ اسٹیشن روڈ نامپلی حیدرآباد دکن۔ ۸ ر

التنبیہ بر حقیقۃ الرسوم ۔ مولوی محمد عبدالشکور صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۸ ر

شمیم حصہ اول و حصہ دوم (افسانہ) مولوی فیاض علی صاحب بی۔ اے علیگ وکیل فیض آباد ۱۲ ر

مراۃ البرار ۔ مسئلہ استرداد برار پر تنقید و تبصرہ سید مبین الرحمن صاحب بی۔ اے ال۔ ال بی وکیل اکولہ۔ برار۔ ۱۲ ر

مخزن توفیق ۔ ابتدائی تعلیم کے لئے۔ محمد حمید اللہ صاحب کل منڈی حیدرآباد دکن ۳ ر

تنقید بر قواعد اردو ۔ از مولوی محمد عبدالغنی صاحب ایم۔ اے۔ پتہ:۔ پروفیسر عبدالقوی صاحب ایم اے آفاق۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱۲ ر

تذکرہ رحمۃ للعالمین (یعنی نامہ میلاد حصہ اول و دوم) مولینا حبیب حسین ساکن ردولی شریف۔ پتہ:۔ سجاد حسین عبدالرزاق تاجران نواب بازار ڈاکخانہ و مقام قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی۔ ۶ ر

ہیملیٹ ۔ (شیکسپیر کا ناٹک) مترجمہ مولوی امتیاز علی صاحب بی اے وکیل فیض آباد پتہ:۔ منشی اصغر علی مکان جناب مترجم محلہ مغلپورہ شہر فیض آباد۔ مجلد ۱۲ غیر مجلد ۸ ر

مینیجر شمع

کفایت شعاری

از

(جناب سید امیر حیدر صاحب تجنت اکبر آبادی)

مداوائے تذلیل و درمانِ خواری ۔۔۔ کفایت شعاری کفایت شعاری

بکار آیدت داشتہ اے برادر ۔۔۔ جو دامے نداری تو جامہ نیاری

"جو پیسہ بچایا وہی پیسہ پایا" ۔۔۔ یہ اک قول[۵] ہے لاکھ تولو پہ بھاری

لئے منہ میں ننھے سو ریزے کو چیونٹی ۔۔۔ وہ دیکھو چلی جا رہی ہے بچاری

اگر تم پس انداز کچھ کر سکو گے ۔۔۔ بسر جائے گی زندگانی تمہاری

کفایت کو تم بخل ہرگز نہ سمجھو ۔۔۔ نہیں آجکل دولت و تاجداری

اگر خرچ آمد سے زائد کرو گے ۔۔۔ تو سوکھے گا دریا جو ہے آج جاری

سکھاتا ہے انسان کو صرف بیجا ۔۔۔ جوا۔ رہزنی، جعل، چوری، چکاری

کُلُوا وَاشْرَبُوا اور لَا تُسْرِفُوا پر ۔۔۔ عمل کیجئے۔ ہے یہ فرمان باری

بشر کو مناسب نہیں صرف بیجا ۔۔۔ ہے شایانِ شان خاک کو خاکساری

نکالو گے پاؤں جو چادر سے باہر ۔۔۔ تو بے چادری تم کو کر دیگی عاری

زمانہ ہے بیزار اگر زر نہیں ہے ۔۔۔ ہے بے سود بے زر کا زہد اور زاری

اگر تم نے پہنا ہے دھاری کا کرتہ ۔۔۔ تو راجہ نہ بنجاؤ تم راجدہاری

یہ دریائے عالم فریب آشنا ہے ۔۔۔ جو آدہی کو چھوڑو تو جاتی ہے ساری

[۵] انگریزی مثل ہے ۱۲

ہے جز بے ایمانی کی اسرافِ بیجا،
کفایت شعاری ہے ایمانداری

شمار آمد و خرچ کا گر نہ رکھا
عجب کیا جو ہو نوبت دم شماری

مناسب ہے پابندِ اوقات رہنا
کہ ہے وقت کھونیں تذلیل و خواری

تباہی نہ لو سر پہ عیاش ہو کر،
کہ بے سود ہے ایسی یاروں کی یاری

تم اندھے رہوگے دمِ واپسیں تک
جو تیر نظر کا لگا زخم کاری

بھروسہ رہے زور بازو پہ اپنے
نہ کام آئیں گے یہ سلاری مداری

کفایت ہو عادت مشقت ہو شیوہ
اگر دل میں ہے عزم مقصد براری

کرو کام اپنا یہ دن کام کے ہیں
جوانی میں کیوں خوابِ غفلت ہے طاری

جو پیدل چلوگے تو طاقت بڑھیگی
بنو تم نہ پابندِ شوقِ سواری

ضعیفی میں پھر آپ پچھتائیے گا
اگر کھیل میں نوجوانی گزاری

جوانی میں تم خوابِ غفلت سے چونکو
ضعیفی میں بے سود ہے آہ و زاری

جو آپ اپنا یار و مددگار ہوگا
کریگا خدا اوس کی بے شبہ یاری

فقط عرضِ احوال ہے اہلِ دل سے
نہ یہ شاعری ہے نہ مضمون نگاری

اثرؔ تجبتِ ناداں کی باتوں میں کیا ہو
نہ عالم، نہ مفتی، نہ واعظ، نہ قاری

(مسلسل)

مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر

از

(حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع)

تاریخ پیدائش

ز دولت خانۂ نواب منصور

۱۱۴۴ھ

برآمد آفتاب از مطلع نور

۱۱۴۴ھ

۱۷۵۴ء میں چوبیس سال کی عمر میں بمقام فیض آباد تخت نشین ہوئے۔ وہ زمانہ نواب کے لئے پرآشوب تھا۔ اسمٰعیل بیگ خاں کابلی کا دور دورہ تھا۔ افواج اس کے قابو میں تھیں اور محمد قلی خاں، برہان الملک مرحوم کے بھتیجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی، کابلی چاہتا تھا کہ نواب کو برائے نام اختیارات دیے جاویں اور وہ خود سلطنت پر حاوی رہے، اسی زمانہ میں ہمت بہادر گوشائیں نے ایک کھتری عورت محل میں پہنچا دی۔ کھتریوں میں واویلا مچ گئی اور افواج کو موقع مل گیا۔ بادشاہ دہلی بھی نواب سے منحرف تھے، اس لئے افواج نے فوراً محمد قلی خاں کو طلب کر لیا۔ اس فتنہ کا دفیہ نواب کے قابو کا نہ تھا، مگر ان کی والدہ نواب بیگم نے کمال

دانشمندی سے برافروختہ اور بدظن سرداروں کو راضی کرلیا۔ محمد قلی خاں طلبی کی خبر پاتے ہی چل کھڑا ہوا، آدھے رستہ میں اس کو اطلاع ملی کہ سرداروں کی کشیدگی رفع ہوگئی ہے اور اس کو الہ آباد واپس جانا چاہئے۔ چونکہ وہ نصف راہ طے کرچکا تھا اور احتمال تھا کہ واپسی کی اطلاع جب نواب کو پہونچے گی تو وہ مشکوک ہونگے اس لئے ارادہ فسخ نہ کیا بلکہ اشتیاق قدمبوسی کا عذر پیش کرکے نواب کی خدمت میں چلا آیا۔ اسمٰعیل بیگ کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ دہلی نواب عمادالملک کے ہاتھوں تنگ آکر لکھنؤ چلے آئے۔ نواب نے ساتھ لاکھ نقد اور ہاتھی اور گھوڑے نذر کئے۔ مگر بداندیشوں کے مشورہ سے متاثر ہوکر بادشاہ نے محمد قلی خاں کو وزارت اودھ کا جائز امیدوار تسلیم کرلیا اور اس کو اپنے ہمراہ لیکر تسخیر بنگالہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ محمد قلی خاں کو بادشاہ کی کمزوریوں کا اور ان کی بدرعبی کا جب علم ہوا تو گھبرایا اور ان سے رخصت ہوکر لکھنؤ چلا آیا۔ اس کو خوف تھا کہ نواب ناراض ہوکر اس کی جاگیر کو ضبط اور اس کے بیوی بچوں کو قید کرلیں گے۔ نواب ان معاملات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ محمد قلی خاں گرفتار کرلیا گیا اور جلال آباد کے قلعہ میں بند کردیا گیا۔ ایک دن نواب، احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں گئے ہوئے تھے، بدخواہوں کو موقع مل گیا، اور محمد قلی خاں کو ہلاک کرکے کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہیں اس کی قبر بنی جو بعد کو اس کے ورثا کی زیارت گاہ ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد نواب کی زندگی میں بعض مشہور معرکہ آرائیاں ہوئیں۔

(۱) ۱۱۷۴ھ میں نواب نے نجیب الدولہ نواب خاں کے ساتھ شریک ہوکر مرہٹوں کو شکست دی۔

(۲) احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شریک ہوکر پانی پت کا میدان مرہٹوں کے مقابلہ میں سر کیا۔ اس جنگ میں اسی ہزار مرہٹے کام آئے۔ اور احمد شاہ ابدالی ہندوستان کا چند روزہ بادشاہ بن گیا۔ ۱۱۷۵ھ میں اس نے نواب کو خلعت وزارت سے سرفراز کیا۔

(۳) ۱۱۷۸ھ میں نواب نے بندیلوں کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر بل بھدر تعلقہ دار کی بغاوت کا حال معلوم کرکے بغیر جنگ کئے ہوئے، مہوبہ سے واپس چلے آئے۔

(۴) امیر الامرا احمد خاں بہادر عالی جنگ بنگش رئیس فرخ آباد کے خلاف ۱۱۷۵ھ میں فوج کشی کی۔

(۵) ۱۱۷۷ھ کے آخر اور ۱۱۷۹ھ کے آغاز میں انگریزوں سے نواب نے مقابلہ کیا۔ اور میجر ایچ منرو کی زیر کمان ۱۳ مئی ۱۷۶۴ء کو بکسر میں شکست کھائی۔ نواب لکھنؤ اور فیض آباد ہوتے ہوئے بریلی پہونچے، اور پٹھانوں، افغانوں اور مرہٹوں کو جمع کرکے ایک مرتبہ پھر انگریزوں کے مقابلہ میں آئے۔ لیکن بریگیڈیر جنرل کارنک کے زیر کمان انگریزی افواج کے ہاتھوں پھر شکست فاش کھائی۔ اور فرخ آباد میں جاکر پناہ لینی پڑی۔ نواب کی زندگی میں یہ وقت سب سے زیادہ سخت گذرا۔ اور ان کی خودداری کا خون ہوگیا۔ کیونکہ انکو جنرل کارنک کے پاس جانا پڑا اور الہ آباد کے صلح نامہ پر دستخط کرنے پڑے جس کی رو سے (۱) کڑا اور الہ آباد نواب سے چھین کر شاہ عالم ثانی کے اخراجات کی مد میں دیدئیے گئے (۲) نواب کو اپنی سلطنت میں انگریزی گماشتوں اور سوداگروں کو بغیر روک ٹوک اور بلا مزاحمت تجارت کی اجازت دینی پڑی، اور (۳) پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا، نواب کے پاس بمشکل تمام دس لاکھ کی مالیت تھی۔ اعیان حکومت اور احباب سے امداد کا طالب ہونا پڑا، مگر کسی نے دل کھول کر نواب کا ساتھ نہ دیا۔ البتہ اس موقع پر ان کی ناموس اور رفیق زندگی بہو بیگم نے وہ کام کیا جو بہ لحاظ شرافت اور بہ لحاظ رفاقت مشرق کے لئے مایۂ ناز ثابت ہوا۔ انھوں نے اپنی کل جائداد۔ اور اپنا کل نقد و زیور فروخت کرکے نواب کو دے ڈالا۔ صلاح کاروں نے منع بھی کیا مگر انھوں نے جواب دیا "اگر نواب زندہ سلامت رہے تو یہ سب انہیں کا ہے، اور اگر خدانخواستہ وہ نہ رہے تو یہ چیزیں میرے کس کام کی"

کہا جاتا ہے کہ بہو بیگم نے اپنی ناک کی کیل تک بیچ ڈالی تھی۔ غرضکہ اس طرح پر چالیس لاکھ روپیہ کی کمی پوری ہوگئی۔ لارڈ کلایو نے بورڈ کے نام اپنے خط مورخہ ۱۱ رجون ۱۷۶۶ء میں نواب کی صادق الاقراری کی تعریف لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ نواب کی دوستی کا اس کو کامل یقین ہے اور یہ دوستی انگریزوں کے لئے از بس مفید اور قابل اعتبار ہے۔

انگریزی گماشتوں اور سوداگروں نے نواب کے سلطنت میں طرح طرح کے مظالم کئے جن کی وجہ سے تنگ آکر نواب کو گورنر جنرل سے شکایت کرنی پڑی اور وہ لوگ سلطنت سے خارج کردئیے گئے۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد کمپنی کو سخت نقصان کا احساس ہوا، اور وارن ہیسٹنگز نے نواب سے مل کر زبانی گفتگو کے ذریعہ سے دوبارہ انگریز گماشتوں اور سوداگروں کے لئے اجازت حاصل کرنی چاہی۔ مگر نواب نے صاف انکار کردیا اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتادیا کہ اگر وہ لوگ آئے تو ان کے اور کمپنی کے درمیان میں مصالحت قائم نہ رہ سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وارن ہیسٹنگز کو سخت مایوسی ہوئی۔

بنارس میں ۸ رستمبر ۱۷۷۳ء کو نواب نے ایک اور صلح نامہ پر دستخط کردیے اور ایک بریگیڈ کے اخراجات یعنی مبلغ اکیس ہزار کی ادائگی منظور کرلی۔ اور کڑہ اور الہ آباد کے واپسی کے لئے پچاس لاکھ روپیہ دینا قبول کرلیا۔ بیس لاکھ اسی وقت انگریزوں کو ادا کردئیے اور پندرہ لاکھ ایک سال اور بقیہ پندرہ لاکھ دو سال کے بعد ادا کرنے کا اقرار کرلیا۔ نواب نے روہیلوں کی امداد مرہٹوں کے خلاف کی تھی اور روہیلوں نے چالیس لاکھ روپیہ نواب کو دینا طے کیا تھا مگر مرہٹوں کی شکست کے بعد وہ انکاری ہوگئے تھے۔ نواب نے کمپنی سے امداد چاہی اور چالیس لاکھ روپیہ کا وعدہ کرکے انگریزوں کی فوج لے کر روہیلوں پر حملہ کردیا ۱۷ راپریل ۱۷۷۴ء کو نواب رحمت خاں روہیلوں کا سردار توپ کے گولہ سے قتل ہوگیا اور اسی روز نواب کی فوج کے ہاتھ میدان آگیا۔ اور روہیلہ مقبوضات کے بڑے حصہ پر نواب قابض ہوگئے۔

چند ماہ کے بعد نواب کی طبیعت خراب ہوگئی اور ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ء کو فیض آباد میں بعمر پینتالیس سال انتقال ہوگیا۔ اُن کی ہڈیاں دہلی بھجوا دی گئیں اور وہیں حضرت شاہ مردان میں جہاں اُن کے اور عزیز بھی دفن تھے، سپرد خاک کردی گئیں۔

نواب نہایت وجیہ، قوی اور دلیر آدمی تھے۔ نواب بہو بیگم سے تمام عمر خوش رہے، آیندہ ماہ میں نواب بہو بیگم پر مفصل مضمون شمع میں شائع ہوگا۔ نواب روزانہ علی الصباح اپنی افواج کی قواعد کا معائنہ کرتے تھے، اور صبح اور دوپہر کو سلطنت کے امور کو انجام دیتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کا عہد حکومت کئی وجہ سے قابل لحاظ ہے۔ بالخصوص انگریزی پالیسی کے مدارج اور انکی کیفیتوں کا انکشاف نہایت واضح طور پر ہوتا ہے۔ اور یہیں سے سلطنت اودھ کی بربادی کا آغاز ہوتا ہے۔

چونکہ شمع کے صفحات بسیط اور مشرح حالات کے متحمل نہ ہوتے اس لئے واقعات کے اظہار کرنے میں حتی الوسع اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ فقط

تبصرے

فرہنگ اصطلاحات علمیہ

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن کی توجہ اور جناب مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ علیگ سکریٹری انجمن مذکور کی علمی کوششوں اور اُن کی دماغی کاوشوں کی داد نہ دینا حقیقت میں اردو زبان پر ظلم ہے۔ جو گرانمایہ علمی خدمت مولوی صاحب سے ظہور میں آ رہی ہے اُس کا جواب نہیں وہ اردو کے مسیحا ہیں۔ انہیں کی توجہ کی برکت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات علمیہ چھپ کر تیار ہو گئی۔ پوری کتاب پانچ سو صفحات سے زیادہ حجم کی ہے۔ اور کم وبیش بائیس مضامین کی علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ ہے۔ علم ہیئت، علم نباتات، اقتصادیات، حکومت ہند، آئینی حکومت، تاریخ انگلستان۔ تاریخ یونان۔ منطق۔ جبر ومقابلہ۔ ہندسی مخروطات، ہندسہ مجسمات، علم مثلث، تفرقی مساواتیں، علم سکون۔ مابعد الطبیعات۔ لغیات۔ طبیعات۔ سیاسیات، آثار قدیمہ، وغیرہ کی اصطلاحات کے ترجمے ہمارے یہاں نہ تھے، اور اگر کہیں پر کچھ ترجمے ہوئے تھے تو وہ شخصی کوششوں کا نتیجہ تھے اور چونکہ ہر شخص نے اپنی طبیعت کے مطابق ترجمے کئے تھے اس لئے ایک ہی لفظ کے مختلف ترجمے ہو گئے تھے جو اصطلاحات کے اعتبار سے سخت مضر تھے اور پڑھنے والوں کو چکر میں ڈال دیتے تھے۔ ضرورت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات کو عام طور پر رواج دیا جائے اور مترجمین کا فرض ہے کہ اصطلاحوں کے ترجموں کو قبول کریں، یا اگر وہ بعض اصطلاحات کے خود ترجمے کریں تو جب تک انجمن ترقی اردو اُن کو قبول نہ کر لے استعمال نہ کریں۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ مکمل نہیں ہیں۔ جن مضامین کی طرف توجہ کی گئی ہے خود انکی بعض اصطلاحات ترجمہ ہونے سے رہ گئی ہیں۔ اسی طرح ابھی دیگر متعدد مضامین سے ہاتھ نہیں لگایا ہے لیکن اچھا ہوا کہ جو کچھ مسالہ تیار رہا شائع کر دیا۔ بقیہ ترجموں کی خاطر موجودہ مواد کو ردک

رکھنا مناسب نہ تھا، بلکہ ترجمہ کرنے والوں کے حق میں مضر ہوتا۔ دیگر مضامین اور اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ جغرافیہ۔ فلسفہ، سائنس وغیرہ وغیرہ کی اصطلاحات جلد شائع کیجائیں گی۔ اور اس عرصہ میں نقد و تبصرہ و دیگر ذرائع سے جو معلومات بہم پہونچی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھا کر فرہنگ کا ایک ضمیمہ بھی شائع کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بعض اصطلاحات کے ترجمے دقیق اور ثقیل ہیں۔ جہاں کہیں عربی کے ثقیل اور سخت الفاظ آئیں اُن کو ترک کرنا بہتر ہے اور اُن کے بجائے چھوٹے الفاظ، یا اصل اصطلاحات کو حتی الوسع پسند کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مغربی علوم کو اصل زبان میں پڑھنا آسان ہو اور طبیعت پر زیادہ بار نہ پڑے، البتہ عربی اور فارسی یا سنسکرت کی اصطلاحات جو ثقیل نہیں ہیں اُن کے اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ وضع اصطلاحات کا کام کرتے وقت یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اصطلاحات اُن لوگوں کے لئے بنائی جارہی ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے، سنسکرت یا عربی نہیں ہے۔ یقین ہے کہ اس تنقید کو نیک نیتی پر محمول کیا جائیگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اعتراض کر دینا بہت آسان ہوا کرتا ہے۔ لیکن اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ اور اس کام کے کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے کیا معنی ہیں۔

بہرکیف فرہنگ اصطلاحات کی اشاعت ایک مہتم بالشان کام تھا جو مستعدی اور عرق ریزی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب اور کارکنان انجمن دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انگریزی اصطلاحات بائیں جانب اور اُنکا ترجمہ داہنی جانب چھپا ہے۔ قیمت صرف ۶/ ہے، ہم اس کی خریداری کے لئے پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کے لئے تو یہ کتاب ازبس ضروری ہے۔

مذاکرات (سال اوّل)

ہمارے دوست سید ہاشمی صاحب فرید آبادی جوان ہیں، اُنکا دل جوان ہے اور

اور قلم بھی جوان ہے، جہاں اتنی جوانیاں جمع ہوں، وہاں جو کام ہوگا اُس پر شباب کی کیفیت ہوگی اور اس میں قوت و توانائی کی دلکشی ہوگی۔

"مذاکرات" حیدرآباد کی ایک جدید انجمن یک سالہ محنت کا نتیجہ ہے، اور زرد جلد کے اندر وہ مضامین ہیں جو انجمن میں پڑھے گئے تھے، کاغذ نفیس لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ جلد بندی قیمتی اور خوش وضع مضامین بہت اچھے، لکھنے والے مستند، غرض مذاکرات کی ظاہری نمایش سے طبیعت شگفتہ، اور اُس کی باطنی خوبیوں سے روح مسرور ہوگئی۔ یہ انجمن قائم رہے گی؟ اس کا جواب تو وہی دے سکیں گے جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ مگر رسالہ کی خوبیوں مضمون نگاروں کی لیاقت اور خود جناب ہاشمی کی توجہ کو دیکھتے ہوئے تو امید پڑتی ہے کہ وہ بڑا کام کرے گی اور اُس میں ہر سال بہتر سے بہتر مضامین پڑھے جائیں گے،

مذاکرات سات مضامین کا مجموعہ ہے تاج المآثر پر سید ہاشمی صاحب نے اور تحفہ سامی، اور جاویدان خرد پر، نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی نے تبصرے تحریر فرما کر انجمن میں پڑھے تھے۔ اُن کی ایک غزل بھی ہے جو بہت خوب ہے، جاپان پر ہمارے محترم دوست نواب مسعود جنگ بہادر کی انگریزی نثر کا ترجمہ ہے۔ شمع میں ہم کئی بار جاپان کے متعلق آپ کے خیالات قارئین کرام تک پہونچا چکے ہیں۔ یہ مضمون بہت لطیف ہے۔ نظریہ اضافیت پر ڈاکٹر مظفر الدین صاحب کا مضمون ہے جو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اُستاذی جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ کا مضمون جغرافیہ اندلس بہت دلکش، دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ آپ نے جغرافیہ اندلس کے متعلق جو تحقیقات کی ہے وہ قابل تعریف ہے اور ہم آپ کی بے مثل کتاب جغرافیہ اندلس کی اشاعت کے منتظر ہیں۔ مذاکرات کی جلدیں عام طور پر قیمتاً فروخت نہیں ہوتی ہیں، لیکن قدردانوں تک پہونچانے کے لئے ۱۲؍ قیمت ہے۔

پتہ:- جناب معتمد صاحب مجلس مذاکرہ - دارالترجمہ حیدرآباد دکن

جلال الدین خوارزم شاہ

مترجمہ جناب مولوی سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے

اردو زبان پر سید صاحب موصوف کا احسان ہے کہ اُنھوں نے اُس میں ترکی لٹریچر کے بیش بہا نمونے پیش کئے، اور غالباً سید صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل ہند کو ترکی لٹریچر سے روشناس کرایا۔ جودت طبع، اور جدت طراز تحریر کے لئے وہ کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے مضامین اور ترجمے برسوں سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں، اور مدت تک ہماری زبان میں موجود رہیں گے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ آپ نے ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے مرحوم کے ایک عدیم المثال تاریخی، ڈرامے کا اردو میں ترجمہ فرمایا تھا۔ اور ہمارے پاس ریویو کے لئے پہنچ گیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ طویل علالت کے باعث ہم ابتک اس مسرت بخش فرض کو ادا نہ کرسکے۔

ہمنے دوران علالت میں ترجمہ کو کئی بار پڑھا۔ اور اب بھی پیش نظر ہے، ہر مرتبہ اس کے مطالعہ سے طبیعت کو نیا لطف آیا۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں یہ ترجمہ ایک نعمت ہے، طبائع انسانی، اور نفسیاتی کیفیات کی جیتی جاگتی تصویروں کو اردو میں ہو بہو اُتار لینا، ادبی کارنامہ ہے جس کے لئے لائق مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں، چنگیز خاں کے خونیں دور میں جلال الدین بادشاہ، حمیت اسلام، اور غیرت وطن سے متاثر ہوکر وہ تمام باتیں کرتا ہے جو سرفروش مسلمان، جانباز سپاہی، اور غیور بادشاہ کے شایان شان ہوتی ہیں، عہد قدیم میں شخصی وقار اور فاتحانہ بے باک حملوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا معمولی کام نہ تھا۔ سپاہ کی فراہمی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں اس کے جوش کو قائم رکھنا، بیوی بچوں اور ذاتی آرام کی مفارقت، طرح طرح کی مصیبتیں اور سب سے زیادہ یہ کہ نفسانی اغراض کے لئے نہیں بلکہ محض مذہب وطن اور ملت کی خاطر، ان سب کو برداشت کرنا، نہایت سبق آموز باتیں ہیں،

واقعات کی تفصیل، اور مختلف جذبات، اور مواقع کی ترجمانی اور مصوری کے لطیف نمونے اسی ڈرامہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب نوجوانوں کے مطالعہ میں رہنی چاہئے اور نصاب میں داخل ہونی چاہئے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے حجم ۲۸۰ صفحے قیمت ۱۲؍

پتہ :- سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

غذائے روح، بالتصویر

شری مدبھگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر کا منظوم ترجمہ پنڈت پربھودیال صاحب مصر عاشق لکھنوی نے کیا ہے حجم ۱۲۰ صفحے۔ قیمت ۸؍

قابل مترجم نے ایک بسیط دیباچہ کے ذریعہ سے بتایا ہے کہ بھگوت گیتا کی تعلیم تارک الجزا ہے اسی رعایت سے ترجمہ کا نام غذائے روح، ہے۔ انہوں نے یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ بھگوت گیتا تارک الدنیا ہونا سکھاتی ہے، بلکہ اس کا مقصد ہے کہ دنیا میں رہو، لیکن اس کی (دنیا کی) محبت میں گرفتار ہو کر اپنی حقیقت اور دنیا میں آنے کی غرض و غایت، کو نہ بھولو۔ اور سچی محبت سے اپنا قلب پروردگار عالم کو نذر کردو۔ لایق مترجم نے کوشش کی ہے کہ سنسکرت کے ایک شعر کا ترجمہ اردو کے ایک شعر میں کیا جائے جابجا حواشی دیکر اواخر میں مشکل الفاظ کے معنی لکھ کر شاعر نے تصنیف کو مفید بنا دیا ہے۔ شروع میں بھگوت گیتا کا خلاصہ سلیس عبارت میں ہے تاکہ ناواقف بھی ترجمہ کو بخوبی سمجھ سکیں۔ البتہ شاعر نے ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کرنے کی قید عائد کرکے اپنے اوپر ظلم کیا ہے بعض مقامات تو بالکل تشنہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ وہ چاہتے تو ترجمہ کو زیادہ شگفتہ بنا سکتے تھے۔ مگر خود عاید کردہ قیود توڑنی پڑیں۔ اسی قسم کی اور قابل قدر سنسکرت تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ادبی اور علمی خدمت ہے اخیر میں مترجم کا عکس ہے۔ جابجا بلاک کی تصویریں ہیں جن کا تعلق نفس کتاب سے ہے۔

پتہ:- پنڈت پربھودیال صاحب مصر، عاشق لکھنوی۔ عرائض نویس۔ عدالت دیوانی۔ لکھنؤ،

دشینت وشکنتلا المعروف بہ مثنوی سحر

(از اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی)

چھوٹی تقطیع پر ۶۷ صفحے کی نظم ہے۔ جناب سحر نے ہندوستان کے سحر نگار شاعر کالی داس کے مشہور قصہ موسومہ شکنتلا کو اردو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے، ابتدا میں منشی دیا نراین صاحب نگم اڈیٹر زمانہ کانپور کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس کے بعض حصے بہت پاکیزہ ہیں۔ مثلاً "شکنتلا کا نام زبان پر آیا اور پردۂ تصور پر ایک تصویر کھنچ گئی۔ کیسی شگفتہ۔ کیسی درد انگیز، حسن اور شباب کا ایک لبھانے والا خواب، پھول کی طرح نازک اور پتی کی طرح کمزور۔

ہرا بھرا جنگل، ندی کا شاداب کنارا، کنول کے پھولوں کا کنج۔ ہرنوں کی کلیلیں، چڑیوں کی خوشنوائیاں، شہد کی مکھیوں کے نغمے اور ہوائے معطر کے جھونکے، ان دلفریبیوں کے بیچ میں شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ کنول کے بھورے پتے پر، راجہ کو خط لکھتی ہے۔ کتنا دلفریب تخیل ہے .... شکنتلا ایک عورت ہی سگھڑ کی۔ درد کی۔ میٹھے الاپ کی۔ اس میں سیتا کی روحانیت نہیں۔ ساوتری کا استقلال نہیں۔ دمن کا صبر نہیں۔ وہ ایک کمزور ہستی ہے۔ تناور درخت نہیں جس پر ہوائیں اثر نہیں کرتیں۔ وہ ایک شاخ ہے جو ہواؤں سے ہلتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی اس کا جوہر ہے اسی نے اسے دلکش بنا دیا ہے"

پہلے بھی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں ہوا تھا، لیکن مترجم کی ہندو معاشرت کی ناواقفیت نے اصلی رنگ کو قائم رہنے سے معذور کر دیا تھا۔ لیکن جناب سحر نے قصہ کی وطنیت کو بدرجہ اتم قائم رکھا ہے۔

منشی صاحب کا خیال ہے کہ "بلاغت اور روانی بیان اور حسن ترکیب کے

اعتبار سے مثنوی سحر گلزار نسیم سے لگا کھاتی ہے"۔ ہمارا خیال ہے کہ منشی صاحب کا یہ جملہ حسن مروت اور اخلاق پر مبنی ہے۔ روانی اور حسن بندش کے لحاظ سے گلزار نسیم بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یعنی اک طفل تھا نمودار　　جیسے کہ صدف سے دُر شہوار
تھا حسن میں اک کمال خوبی　　تھا جسم میں اک مثال خوبی
لیکن جو ہوئی سکنتلا کی　　ممنون تھی بخشش خدا کی

سختی غم فراق سہتی　　مجبور تشددات رہتی
سکھیوں کو بھی رو کے گہہ رُلاتی　　گہہ یاد کا ماجرا سُناتی

مثنوی دلکش ہے۔ اور شاعر کی فکر کا دلپذیر ثبوت ہے۔ بعض اشعار نہایت آبدار ہیں۔ اور کئی موقعے ایسے ہیں جہاں تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے یقین ہے کہ مثنوی مقبول ہوگی۔ قیمت غالباً ۸/ ہے۔

ملنے کا پتہ :- زمانہ بک ایجنسی کانپور

مصباح القوافی

مصنفہ سید محمد نقوی الکرسوی صاحب متخلص بہ سید۔ حجم ۱۶ صفحہ قیمت ۳/

پتہ :- مولوی سید زین العابدین صاحب نقوی محاسب محکمہ عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں تمام القاب حروف وحرکات قافیہ اور ان کے تعریفات مستند اہل فن کی تصانیف سے ماخوذ کر کے نظم کئے ہیں۔ طرز قدیم ہے مگر لایق مصنف اور شاعر کی محنت قابل داد ہے کہ ۶۸ اشعار میں کل مسائل بیان کردیئے۔ معمولی توجہ سے

ان پر عبور ہو سکتا ہے اور محتاط شاگردوں کے لئے ضروری ہے۔ اگر حواشی اور ضروری نوٹ دیدیے جاتے تو رسالہ زیادہ مفید اور دلچسپ بھی ہو جاتا۔

ساربان حجم ۵۰ صفحے قیمت ۴ر۔ **نور ہدایت** حجم ۴۰ صفحے قیمت ۴ر۔ **ارمغان عرب** حجم ۳۰ صفحے قیمت ۴ر۔ **پیمان وفا**۔ حجم ۳۶ صفحے قیمت ۵ر۔ **امانت** حجم ۲۲ صفحے قیمت ۴ر۔ **خط تقدیر** حجم ۵۵ صفحے قیمت ۱ر

یہ چھ رسالے ایم اسلم صاحب کی تصنیف ہیں اور نسیم بک ڈپو بارود خانہ بازار۔ لاہور۔ سے مل سکتے ہیں۔

ساربان = حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا ایک دلچسپ اور مؤثر قصہ ہے۔ اور حقیقت میں مصنف نے خوب لکھا ہے

نور ہدایت = میں حضرت سرورِ کائنات کا ایک صحابی جلیبب شہید کا پاکیزہ کریکٹر دکھایا ہے۔

ارمغان عرب = میں حضرت عمرؓ کے سوانحی حالات لکھ کر ایک بدو عرب کی دلچسپ حکایت ہے اور اسلام کے بعض ضروری اصول بیان کئے ہیں۔

پیمان وفا۔ ایک رقت انگیز تاریخی قصہ ہے جسمیں عہد و پیمان پر قائم رہنے کی خوبیاں دکھائی ہیں۔

امانت = خلیفہ ہارون رشید کے عہد کا واقعہ ہے جس میں ایک لڑکے کے عاقلانہ فیصلہ کا ذکر ہے۔

خط تقدیر = گذشتہ جنگ یورپ کی ایک دلچسپ، پُر درد اور سبق آموز داستان ہے جسکا تعلق حب وطن، ایثار، اور انسانی ہمدردی سے ہے۔

افسوس ہے کہ ہم ان رسائل پر جلد تر ریویو نہ کرسکے۔ ہم نے ان سب کو پڑھا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ طرز بیان صاف اور سلجھا ہوا

ہے ۔عبارت سلیس اور مؤثر ہے ۔ طرز تصنیف سبق آموز ہے ۔ ناصحانہ اور استادانہ نہیں ہے جو بسا غنیمت ہے ۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے یہ سب رسالے کارآمد ہیں ۔ اور اس لایق ہیں کہ والدین خرید کر اولاد کو، اور استاد طالب علموں کو انعام کے طور پر تقسیم کریں توقع ہے کہ آیندہ اڈیشن میں نظرثانی سے عبارت کی بعض خامیاں دُور ہو جائیں گی ۔ مثلاً ساربان میں صفحہ ۸ پر ہے "طیور .... درختوں پر بیٹھے بیٹھے کر ٹکڑے چبا رہے تھے" صفحہ ۱۹ پر ہے "ایک استعمال شدہ کرتا زیب بدن تھا" "چہرہ انوار ایمانی سے نورانی نظر آتا تھا" "پھٹی ہوئی جوتیوں کا جوڑا پڑا تھا" وغیرہ وغیرہ ۔ لیکن یہ غلطیاں اس قسم کی نہیں ہیں کہ رسالوں کی قدر و قیمت کو گھٹا دیں ۔

بہشتی جھومر یا اسباق النسواں

(مصنفہ محمد مرزا خاں صاحب دہلوی ۔ حیدرآباد دکن)

لایق مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستانی خواتین نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب بجائے قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں سبق دینے کے اُن کی اخلاقی کمزوریوں سنجیدگی سے بحث کیجائے، اور اُن کے نقائص اُن کو دکھائے جائیں تاکہ وہ اپنے معائب سے واقف ہو کر چپکے ہی چپکے اپنی اصلاح کرتی رہیں ۔ یہ رسالہ اس مضمون کی پہلی قسط ہے جس میں لڑکی کے سسرال جانے کے بعد اُس سے جن جن کمزوریوں کا ظہور ہوتا ہے ان میں سے چند کی تشریح کر دی گئی ہے ۔ رسالہ میں چار سبق ہیں، اگر مقبول ہوا تو مصنف صاحب دوسرا حصہ بھی جلد شائع کریں گے ۔

مصنف نے اپنے خیالات کو صفائی کے ساتھ ظاہر کیا ہے ۔ البتہ عبارت ذرا دقیق ہے جو معمولی لکھی پڑھی لڑکیوں کو مشکل معلوم ہوگی ۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کا مطالعہ

بہت کچھ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ سسرال جانے سے قبل اور سسرال پہونچ کر ہر تعلیمیافتہ
لڑکی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ کچھ انگریزی داں شوہر یا بیبیاں مصنف کے بعض
خیالات سے اتفاق نہ کریں تاہم بہت سی باتیں سیکھنے کے قابل ملیں گی۔ جن پر عمل کرکے
راحت مل سکے گی۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ہیں حجم ۲۰۰ صفحے قیمت صرف ۱۰ر
چند جلدیں یہ دفتر شمع میں موجود ہیں اور منیجر صاحب سے مل سکتی ہیں۔

صنف نازک

(مصنفہ جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب بسمل)

لائق مؤلف کا بیان ہے "یوں دیکھنے کو آپ اس کو ایک مختصر سا مجموعہ کہدیں گے لیکن
اس کے فراہم کرنے میں اور ترتیب دینے میں اپنی عمر کا بہترین حصہ اس کی نذر کرنا پڑا۔ دُنیا کی
ہر زبان کے شاعرانہ خیالات سے خوشہ چینی کرنی پڑی۔ کہیں سے پتی لی تو کہیں سے پھول، کہیں سے
نکالیا تو کہیں سے رنگ و بو، تب کہیں یہ گلدستہ سدابہار تیار ہوا"

مؤلف کے یہ الفاظ تعلّی پر نہیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور خدا معلوم انہوں نے ان جواہر ریزوں
کو جمع کرنے اور بہترین اسلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کیا کیا زحمتیں اٹھائی ہونگی۔

صنف نازک بجائے خود ایسا نازک موضوع ہے اور اُسکی دلپذیری ایسی عالمگیر
ہے کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونا ظلم ہے، چونکہ جذبات کی تخلیق اور صنف نازک کی مداحی فطری
باتیں ہیں۔ اسلئے صنف نازک کی خوبیوں سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے، انکی تعریف کرنا شاعر کا
کام ہے، ان سے قلب کو منور کرنا عارف کا کام ہے، اور انکی کمزوریوں کو الم نشرح کرنا مذہبی
اور فلسفی دل و دماغ کو مبارک رہے یہ روگ طبائع انسانی کے بس کا نہیں، عورت پھول سے
زیادہ نازک، تصویر سے زیادہ دلکش، موسیقی سے زیادہ مترنم، فلسفہ سے زیادہ سکون بخش،

دولت سے زیادہ راحت رساں، اور عزت سے زیادہ قابل قبول، نعمت ہے، آپ اس کی کمزوریوں کو دیکھنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں۔ اور اُس کی قوت انتقام یا زبان کی درشتی کو کیوں آمادۂ عمل کرتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ اس کی کمزوریوں، کو آمادۂ انتقام بنا لینا اور نقصان اٹھانا مرد کے لئے واجبی سزا ہے کیونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، اور یہ صفت اس سے کسی عمر میں جدا نہیں ہوتی۔ اس کا وجود شیریں ہے بھائیوں سے پیار، باپ سے الفت، شوہر سے محبت، اولاد سے شفقت، ہمسایہ سے مروت، اس کے فطری خوبیاں ہیں، وہ بہترین مونس اور غمخوار ہے حقیقی رازدار ہے، اور حاضر و غائب یکساں جاں نثار ہے۔ مرد کے لئے زیبا ہے کہ اس کی صفات سے روحانی مسرت اور سکون حاصل کرے، نہ کہ اس کی دل آزاری اور تخریب کے درپے ہو،

مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے تقریظ، اور مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے نے دیباچہ پر لطف انداز میں لکھے ہیں۔ لائق مؤلف نے جہاں صنف نازک کی خوبیاں بتائی ہیں وہاں اُن کی کمزوریاں بھی گنوا دی ہیں تاکہ مرد اُن کی صفات پر فریفتہ ہو، اور اُن کی کمزوریوں کی زد سے بچا رہے۔

حجم تقریباً ۸۰ صفحے، لکھائی چھپائی دلکش، اور جلد خوبصورت ہے، صنف نازک کا ایک فوٹو بھی ہے، قیمت عہ

پتہ:۔ مصنف بیرون۔ دبیر پورہ۔ حیدر آباد۔ دکن

سرورِ عالم

(مصنفہ مولوی عبد المجید صاحب۔ دار التصنیف کپورتھلہ)

مولوی عبد المجید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے جناب سرور کائنات کی مقدس سوانحعمری ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ لکھی ہے، تصنیف بذاتہ مختصر ہے لیکن سرور عالم کی حیات کے تمام ضروری پہلو موجود ہیں، اسوۂ حسنہ کو پیش کرکے دوسروں کے

لئے ایک بیش قیمت نمونہ پیش کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ نبی اور بشر ہونے کی حیثیتوں سے سوانح دکھائی جائیں۔ بلاد عرب کا نقشہ ہے اور کوہ حرا کی عکسی تصویر بھی دی گئی ہے۔ کوہ حرا کے متعلق مولوی صاحب نے لکھا ہے "جس کے دیکھتے ہی دیار حبیب کی ایک نمایاں خصوصیت سامنے آجاتی ہے اور انسان عالم تصور میں اس سرزمین میں جا پہونچتا ہے جہاں کوہ حرا کی چوٹیاں اور اس کے گوشہ ہائے عزلت، ایسی خاموش وساکن زبان کے ساتھ جس سے زیادہ کوئی زبان بلند آہنگ نہیں ہو سکتی، دنیا کو بتاتے رہیں گے کہ یہی وہ گھاٹیاں ہیں جہیں وہ غار ہے، جہاں سے سادہ مگر چونکا دینے والا پیغام آیا۔
"یا محمدؐ انت رسول اللہ" اور جس نے زمانہ کی ظلمت کو عالم افروز نور سے بدل دیا۔ ان مقامات کے تصور سے ہی انسان، روح نواز کیفیتوں اور کیفوں میں ڈوب جاتا ہے اور دل روحانی طمانیت کے بار سے تھرتھرانے لگتا ہے"۔ کتاب میں سنہ ہجری کے ساتھ عیسوی بھی دیا گیا ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔ قیمت صرف بارہ آنہ۔

موصوف نے چھوٹا رسالہ "آنا بشرؐ" بھی تصنیف کیا ہے۔ اور کیا خوب لکھا ہے کہ "رسول عربی کے اسوۂ حسنہ جو دنیا کے لئے یہ منزلہ متاع عمومی کے ہیں۔ بنی نوع انسان کے لئے روحانی اور دنیوی زندگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ جب یہ بات ہے تو یہ نمونہ اس قابل ہے کہ ہر وقت ہمارے سامنے رہے"۔ اس خیال سے لائق مصنف نے رسول کی حیات کے مختلف شعبوں پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھنے ارادہ کیا ہے۔ اور یہ رسالہ اس زنجیر کی پہلی کڑی ہے جو بچوں کے لئے نہایت مفید ہے یقین ہے کہ صاحبان مقدرت اس کو خرید کر مکتب کے لڑکوں، اور عزیز رشتہ داروں اور دوستوں کے بچوں کو مفت تقسیم کرینگے۔ حجم ۳۲ صفحے قیمت صرف ار جو کچھ بھی نہیں ہے۔ مصنف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۴۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آلحسن

بیرسٹر ایٹ لا، ایم، آر، اے، ایس، پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و ممبر لیجسلیٹو کونسل

حسن عابد جعفری آلحسن

بیرسٹر ایٹ لا، آگرہ

دار الاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرے ماہ کی تاریخ ۱۵ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔

۳۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہی جو ہر حال میں پیشگی لیجائے گی۔

۴۔ ایک پرچہ کی قیمت معہ محصول ڈاک ۱۰ آنہ ہے ممالک غیر سے عہ، نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا ہے۔

۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔

۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت و ترسیل زرچندہ و اجرت اشتہارات براہ راست مینجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔

۷۔ مضامین و خطوط متعلق مضامین ایڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زرچندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرماکر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔ پی منگواکر واپس نہ فرمائیے۔
جواب کے لیئے ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا لازمی ہے

شرح اجرت حسب ذیل ہے

مدت	¼ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
چھ ماہ	[illegible]	[illegible]	[illegible]
ایک سال	[illegible]	[illegible]	[illegible]

المشتہر:۔ مینجر رسالہ شمع حسن منزل۔ شاہ گنج آگرہ



جلد ۵ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء | نمبر ۳

تصویر } آصف جاہ وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خاں بہادر شجاع الملک

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کے لئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا
اگر آپ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کی جائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون ۱۹۲۷ء تک جو بہترین افسانہ وصول ہوگا اس کے معاوضہ میں چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔
اور اگر آپنے کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپکو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اس کی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائیں گی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپ کی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اس پر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ

جو مضمون، افسانہ، ناول، نظم یا غزل ناپسند ہوگی وہ ارکا ٹکٹ آنے پر واپس کر دی جائے گی، البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے بہ احتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپکا کلام شائع ہوگا، بلالحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جاوے گا۔

مطبوعات جدید

جو ۱۹۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، ان پر دو انعامات ہیں۔
(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجیں گے، اور
(۲) دوسرا انعام حسب تجویز کمیٹی اُن کو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائیں گے۔

خادم منیجر شمع

شمع

ماہ مارچ ۱۹۲۷ء

منشی ذکاء اللہ مرحوم دہلوی

(از مسٹر سی ۔ ایف ۔ اینڈریوز)

ذیل کا مضمون مسٹر اینڈریوز نے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے انتقال کے بعد ہی لکھا تھا اسوقت ڈاکٹر نذیر احمد زندہ تھے۔ لیکن بعد میں مسٹر موصوف نے اس خیال سے اسے شائع نہ کیا کہ جب "منشی صاحب مرحوم کے حالات زندگی کتابی صورت میں مرتب کرینگے تو اسے بطور ضمیمہ شائع کردیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون ابتک شائع نہ ہوسکا۔ اب مکمل حالات زندگی کتابی صورت میں جمع ہوگئے ہیں اور جہاں ایک طرف وہ مشہور انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں ماہ بماہ شائع ہوچکے ہیں وہاں دوسری طرف ان کا ترجمہ اردو کے مشہور رسالہ "زمانہ" میں بھی ماہ بماہ شائع ہوچکا ہے۔ جو مضمون اب

"شمع" میں شائع ہو رہا ہے وہ بعد میں اردو کتاب کا جزو بنا دیا جائے گا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ کتاب زیادہ سے زیادہ ۱۹۲۶ء کے وسط تک شائع ہو جائے۔

مسٹر اینڈریوز منشی صاحب کے مخلص دوستوں میں سے ہیں ادر قارئین کرام مضمون سے اس محبت اور عقیدت کا اندازہ لگا سکیں گے جو اول الذکر کو مؤخر الذکر سے تھی اور ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی

ہندوستان میں اُنیسویں صدی پر کسی قسم کا تبصرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اس میں ایک نہایت اہم حقیقت کو یعنی اُس ذہنی جمود کو شامل نہ کیا جائیگا جس نے کچھ عرصہ تک اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں مسلمانوں کی قومی ترقی کو روکے رکھا۔ ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان ہی سب سے زیادہ مایوس تھے۔ جس شک و شبہ کی نظر سے انگریز اُنہیں اسوقت دیکھتے تھے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے لیڈروں کی اسپرٹ کو کچلا جا رہا ہے۔ اسوقت صرف ردِ عمل کی آوازیں بلند کیجا رہی تھیں۔ اس طرح سے کئی قیمتی سال گذر جانے کے بعد تحریک علیگڈھ کی ابتدا کی گئی لیکن اس نے بھی باوجود اِس حقیقت کے کہ وہ بہت شد و مد کے ساتھ شروع کی گئی تھی۔ ابتدا میں مسلمانوں کے صرف محدود طبقہ پر اپنا اثر ڈالا۔ عرصہ دراز تک مغربی تعلیم اکثر مسلمانوں کے لئے نفرت انگیز چیز رہی۔ غالباً یہ کہنا بجا ہوگا کہ ۱۰-۱۹۱۱ء تک ترقی کی جانب لیجانے والی کوئی عام تحریک موجود نہ تھی۔

جو بیداری حال میں پیدا ہوئی ہے اُس نے اس خیال کو حیرت انگیز طریقہ سے غلط ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں سیاسی تحریک دوسری سمتوں میں ترقی کو روک دینے کا باعث ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری سیاست کی رہین منت رہی ہے۔ لیکن جیسا کہ لبا اوقات ہوا ہے سیاسی ترقی تیزی کے ساتھ ذہنی جدوجہد میں مبدل ہو گئی ہے سیاسی لہروں کے مد نے اُس تعلیمی جمود کو جو اتنے عرصہ سے غیر متحرک رہا ہے، بہا کر دور پھینک دیا ہے اور اب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں نمایاں ترقی ظہور میں آچکی ہے۔

انجام کار سارے ہندوستان کو اسلام کی موجودہ ترقی کرنے والی تحریک سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے بشرطیکہ دانشمندانہ اور فیاضانہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا اور جدید تعلیم سے تمام و کمال استفادہ حاصل کیا گیا۔ بمقابلہ دوسرے اسباب کے سب سے زیادہ ایک چیز نے ہندوستان کی دو عظیم الشان قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کو خطرے میں ڈالدیا ہے اور وہ چیز جہالت ہے، اس لئے کہ جہالت (جہاں کہیں بھی وہ پائی گئی ہے) غیر بردباری کی ماں ثابت ہوئی ہے۔ جب تک ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی جمود رہا اس وقت تک اس امر کا احتمال تھا کہ عدم مفاہمت باہمی بدفرگی اور بے اعتمادی کا باعث ہوگی اور یہ کہ ان عناصر کے باہمی اتصال کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام میں استبداد کی اسپرٹ عام ہوجائیگی۔ اب جبکہ مسلمانوں کی قوتیں دانشمندانہ رہبری کی بدولت تعلیمی جدوجہد کی جانب منعطف کردی گئی ہیں ہر شخص کو جسے ہندوستان سے کچھ بھی محبت ہے، یہ امید پیدا ہوگئی ہے کہ اس خطرہ کا تدارک ہوجائے گا۔ دنیا کے ہر ملک میں رہنمائی کا کام نسبی یا نسلی سیادت سے ہٹ کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آرہا ہے جو ذہانت کی سیادت رکھتے ہیں اور جب لازمی تعلیم عوام تک پہنچ جائے گی اس وقت سیادت کی تبدیلی یقینی ہے۔ ہندوستان میں پُرامن انقلاب کا انحصار کسی اور عنصر کے مقابلہ میں صرف تعلیم کی ترویج پر ہے۔ اور یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قوم جو بہت ہی پسماندہ ہے، تلافی مافات کرے۔

اسلامی تہذیب و ترقی کی نشوونما جن اصولوں اور اسباب پر مبنی تھی ان پر مناسب غور و خوض کرنے سے بھی مقصد برآری ہوسکتی ہے۔

ان اصولوں میں سے ایک اصول جس پر قرآن مجید میں بھی زور دیا گیا ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں پر فرض کردیا گیا ہے کہ وہ علم کی تحصیل کریں خواہ علم چین ہی میں کیوں نہ پایا جائے۔[۱؎]

۱؎ فاضل مضمون نگار نے غلطی سے حدیث کو قرآنی آیت سمجھ لیا ہے۔ (مترجم)

اسی اصول کی مطابقت میں تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ بن گیا ہے کہ جب کبھی اسلامی تہذیب کسی دوسرے ذہنی ماحول سے دوچار ہوئی ہے اس کا نتیجہ لازمی طور پر ترقی اور روشنی کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

مثلاً عربوں کا ایک جانب بازنطینی تہذیب اور دوسری جانب ایرانی تمدن کے ساتھ تعلقات رکھنے کا یہ اثر ہوا کہ عربوں کے تہذیب و تمدن کو قابل یادگار ترقی نصیب ہوئی۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ اور علوم و فنون کے بہت سے خزانے دنیا کے بزرگ ترین خلفا کے ترقی پرور عہد حکومت میں دمشق اور بغداد کے علما و فضلا کے جوش، جد و جہد اور وسیع الخیالی کی ہمہ گیر اسپرٹ کے باعث آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لئے گئے۔ اور جب تک ان کی طاقت قائم و برقرار رہی اس وقت تک بردباری اور آزاد خیالی کی وسیع راہیں ذہنی ترقی کے لئے کھلی رہیں۔

آل عثمان کے زبردست سلاطین کے عہد حکومت سے بھی جو ۱۴۵۳ء میں سقوطِ قسطنطنیہ کے بعد سے شروع ہوا، دوسری مثال اخذ کیجا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں دول یورپ کے ساتھ ترکوں کا جو تعلق پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں باہمی مفاہمت رونما ہو گئی اور معاشرتی آزادی کی روح وسیع تر ہو گئی۔ بلاشبہ یہ امر اس فوجی فتح سے کم حیرت انگیز نہ تھا جس کے باعث وہ تعلق پیدا ہوا۔ پروفیسر بوری رقمطراز ہے کہ "ساری عیسائی دنیا میں اس زمانہ میں غالباً کوئی حاکم ایسا نہ تھا جو سلطان سلیمان کی طرح انصاف کرنے کی غیر تصنع آمیز خواہش یا سچا ارادہ رکھتا ہو۔"

مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ہندوؤں کے تہذیب تمدن کے ساتھ آمیزش کی داستان بھی اسی تاریخی سبق کو پیش کرتی ہے۔ اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کی ترقیاں مغلیہ حملہ آوروں کی نوخیز قوت اور زندگی بخش طاقت کے مقابلہ میں قدیم ہندوستانی تہذیب کے ملاپ کی کچھ کم رہین منت نہ تھیں۔ اس زمانہ میں ذہنی ترقی اطراف و اکناف

میں پھیل گئی تھی اور مذہبی بردباری کا ہر جگہ دور دورہ تھا۔

اس اہم نکتہ کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ امر مسلمہ ہے کہ جہاں کہیں اسلام جدید علوم و فنون کی شاہراہ پر گامزن ہوا وہاں اس نے اپنے ماحول سے مناسبت اور مطابقت کرنے کی اُن قوتوں کا اظہار کیا ہے جو آزاد خیالانہ ترقی کی سچی دلیل ہیں۔

حضرت محمد (صلعم) نے جو حکم اپنے متبعین کو دیا تھا یعنی یہ کہ "علم کی تلاش کرو جہاں کہیں وہ بھی پایا جاوے" اُس کی دانشمندی تجربہ سے ثابت ہو گئی ہے۔ جب کبھی اس حکم کی وسیع مطابقت کی گئی ہے اسلام بے انتہا ترقی کی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی وسیع ترقیاں اس کی شاندار جنگی فتوحات کے بعد عمل میں آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیان اسی کے ابتدائی زمانہ پر بالکل صادق آتا ہو۔ لیکن اس کے سارے زمانوں پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ اور کم سے کم آج تو بالکل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً جو تحریکیں ہم اسلام میں ہر جانب دیکھ رہے ہیں خواہ وہ ٹرکی میں ہوں یا ایران میں، ہندوستان میں ہوں یا شمالی افریقہ میں، وہ کسی عظیم الشان فوجی کارنامہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ تر تعلیمی تحریک کا ماحصل ہیں جسکا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اپنے میں جذب کیا جائے۔

کئی برس ہوئے مجھے کیمبرج میں جدید ترکی انقلاب کے ایک لیڈر کے ساتھ گہری ملاقات کرنے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ تمام تحریک کی تہ میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ مغربی علوم و فنون کی آزادانہ قبولیت اور انجذاب ہے۔ انکا شمار ان سچے مسلمانوں میں ہے جن سے میری کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ میری ان سے ملاقات ایسے زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ وہ پناہ گزیں کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم تھے اور جبکہ ٹرکی میں کسی انقلاب کے امکان یا اس ملک میں اسلام کی کسی اصلاح کے خیال سے بڑھ کر اور کوئی بات مایوسانہ نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے شخص کی حیثیت سے

وہ اس عظیم الشان اصول پر سختی سے جمے رہے اور اپنی تحریرات کے ذریعہ انہوں نے اُن لوگوں میں بھی وہی روح پھونک دی جو اُن کی تعلیمات کے (جن کی تہ میں مذکورہ بالا اصول کام کر رہا تھا) پیرو تھے۔ واقعات نے قطعی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ ان کی تشخیص صحیح تھی اور یہ کہ جس علاج کی اُنہوں نے جا و بیجا تلقین کی تھی وہ ناکافی نہ تھا۔

اسلام کے ترقی کے ساتھ جو گہری دلچسپی مجھے ہوئی اس کا بیشتر حصّہ منشی ذکاء اللہ کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے، یہاں تک کہ جن خیالات کا اظہار میں نے اوپر کیا ہے انہیں بھی انہی کے خیالات کی خوشہ چینی سمجھنا چاہیئے۔ ان کی پوزیشن کو واضح کرنے کی غرض سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔ وہ دار السلطنت دہلی میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سالہائے دراز سے اُن کا خاندان آل تیمور کے شاہی گھرانے کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نگران و ذمہ دار تھا۔ اُنہوں نے تہذیب و شائستگی کی اعلیٰ روایات کو جو عہدِ مغلیہ کے ابتدائی دور سے اُنہوں نے ورثہ میں پائی تھیں، جوں کا توں برقرار رکھا۔ نوعمر ذکاء اللہ کو قدیم دہلی کا وہ زمانہ یاد تھا جبکہ ابھی مغربی تہذیب کا اثر نہ پڑا تھا۔ ان کی زندگی کی مابعد کی روش اور ان کے بڑھاپے کے اعتقادات کا خیال کرتے وقت ضروری ہے کہ اس واقعہ کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

نوعمر لڑکے کی والدہ دہلی کی نہایت مشہور خواتین میں سے تھیں۔ وہ بہت عقلمند اور کیرکٹر کی مضبوط تھیں اور اپنے بچوں کی نہایت شفقت مگر سختی کے ساتھ رہنمائی اور نگرانی کیا کرتی تھیں۔ ذکاء اللہ ان کے بغایت درجہ شکر گزار تھے اور محسوس کرتے تھے کہ وہ فرض شکر گذاری سے کبھی عہدہ برآنہ ہو سکیں گے۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اپنے انتہائی بڑھاپے کے عالم میں جب کبھی وہ اپنی مادرِ مہربان کا ذکر فرماتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ تمام عمر وہ اپنی والدہ سے مشورہ کئے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرتے تھے وہ اُن بڑے ہندوستانیوں میں سے ہیں جن کے کیرکٹر کو ماں کی محبت نے ابتدائی زمانہ

سے سانچہ میں ڈھالدیا تھا۔ ان کے والد علومِ قدیمہ کے زبردست فاضل تھے اور اپنی ایرانی ادبی تہذیب وشائستگی کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور تھے۔ قدیم ایران کی ساری تہذیب کو انہوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ اپنے بیٹے کو منتقل کر دیا تھا۔

جب نوعمر ذکاء اللہ اپنے عنفوانِ شباب کو پہنچ رہے تھے اس زمانہ میں مغلیہ دربار اور شہر دہلی میں عظیم الشان تبدیلیاں ظہور میں آرہی تھیں۔ تیموری خاندان جو عرصہ دراز سے اپنی سابقہ شان وشوکت اور ٹھاٹھ کا محض ہیولیٰ رہگیا تھا، اب تباہی کے قریب آن لگا تھا۔ دہلی میں برطانوی ریزیڈنسی کے قیام کے ساتھ ساتھ مغلوں کے شہر میں جدید مغربی علوم کی ترویج شروع ہوگئی۔ قدیم دہلی کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور نوعمر منشی ذکاء اللہ جبکہ ان کی عمر صرف بارہ برس کی تھی، اپنے باپ کے ایماء سے وہاں بھیجے گئے اور طالب علم کی حیثیت سے وہاں داخل ہوگئے۔ قدیم درباری علوم کی بجائے یکایک مغربی علوم جدیدہ کا جگہ لے لینا یقیناً پریشان کن ہوا ہوگا۔ ذکاء اللہ نے ابتداہی سے اعلیٰ درجہ کی ذہانت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ریاضی اور سائنس میں اپنے ذہین ہم سبقوں کی پارٹی میں سب نمایاں رہتے تھے۔

نوعمر طالب علم نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ علوم میں ترقی کی۔ بعض دفعہ بیکن کیطرح ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وہ تمام علوم پر یکساں حاوی ہیں"۔ انہوں نے عربی وفارسی کے اسباق کو برابر جاری رکھا، انگریزی اور تاریخ ہند میں اپنے مابعد کے علم کی بنیاد ڈالی اور نیچرل سائنس کی تقریباً ہر شاخ کا مطالعہ کیا اور ریاضی میں خاص مہارت پیدا کی۔ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان میں مغربی علم کے مختلف شعبوں میں رہ نوردی کرنے والے طلباء کے دور اول میں تھے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائیگی کہ وہ نصاب کیسا کچھ کارنامہ ہوگا۔

اب ہم ان کی زندگی کے شاندار پہلو سے ہٹ کر ان کی گھریلو زندگی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بجائے خود بے انتہا پاکیزہ ہے۔ انہیں اپنی والدہ سے جو گہری عقیدت تھی،

اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی سے انہوں نے دوسروں پر رحم کھانا اور ان کے جذبات کا احترام کرنا سیکھا تھا اور جوں جوں ان کی عمر زیادہ ہوتی گئی یہ صفات ان کی سیرت کا نمایاں جزو بنتی گئیں۔ مزید براں اُن میں حد درجہ کی ایمانداری اور حیرت انگیز محنت پسندی تھی۔ بہت کم ہندوستانی ایسے ہیں جنہوں نے ان کی سی روزانہ محنت کی زندگی بسر کی ہو۔ اپنی تمام عادات میں وہ بہت سادہ تھے۔ ان کا طریقِ عمل خاص وضع کا پابند تھا۔ وہ بہت باقاعدہ تھے۔ ان کا جسم اگرچہ بظاہر بہت نازک اور نحیف معلوم ہوتا تھا تاہم وہ درحقیقت بہت جوش اور طاقت سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ ان کی محتاط روشِ زندگی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سال تک جبکہ ان کی عمر تقریباً ۸۰ برس کی ہو گئی تھی وہ (جیسا کہ انہوں نے مجھ سے بیان فرمایا) ایک مرتبہ بھی بیمار نہ پڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل بن سکے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں اُن کے چہرے پر شرافت برستی تھی۔ اُن کے چہرے کے ہر خط سے مہربانی اور سادگی ہویدا تھی اور اُن کی آنکھوں کی روشنی میں اس وقت ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی جبکہ وہ اپنے اعزا اور احباب کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونا گویا ادب و اخلاق و خوش مزاجی کا سبق لینا تھا۔ اپنے مہمانوں کو آرام و آسایش پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان میں قدیم وضع کی شرافت اور تہذیب و شائستگی جلوہ گر تھی جو معلوم ہوتا ہے ان کے خاندان میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہونے کے باعث نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی تھی۔

نوعمر ذکاء اللہ نے کالج کی زندگی ختم کرتے ہی تعلیمی کام شروع کر دیا اور پروفیسر اور انسپکٹر کی حیثیت سے ان کی محنت و مشقت نہایت مسلسل رہی جس میں غدر کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے خوفناک رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔ غدر کے باعث ذکاء اللہ کا خاندان سخت ترین مصیبت اور عسرت میں مبتلا ہو گیا۔ خود اُن کی زندگی ایک سے زیادہ مرتبہ خطرہ میں پڑ گئی محض اس سبب سے کہ ان کا عوام جدید انگریزی علوم سے وابستہ تھا۔ وہ شاذ و

نادر ہی ان ایام کا ذکر کرتے اور جب وہ کر بیٹھتے تو نہایت ہی خوف و دہشت کے جذبات کے ساتھ ذکر فرماتے اس لئے کہ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اور نیز ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے پرانی حکومت کی تباہی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو، وہ جانتے تھے کہ اگر باغیوں کو کامیابی ہو گئی تو ملک میں کس قدر ابتری و تباہی رونما ہو جائیگی - جدید ہندوستان کی نجات تو کم سے کم ان کے ذریعہ سے ناممکن تھی۔

غدر کے کچھ عرصہ بعد منشی ذکاءاللہ الہ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں وہ جدید گورنمنٹ کالج میں "السنۂ مشرقیہ اور سائنس" کے پروفیسر اوّل مقرر کئے گئے تھے - یہاں پر سب سے اول انہوں نے اپنے آپ کو طلبا میں اپنی شرافت طبع اور حسن اخلاق کے باعث ہر دلعزیز بنایا۔ ان کے سوانح حیات لکھنے کے دوران میں مجھے ایک نہایت ہی محبت آمیز چٹھی ان کے ایک رفیق کار سنسکرت کے پروفیسر کی طرف سے موصول ہوئی تھی جو محنت و مشقت کی ملازمت کے بعد کنارہ کشی اختیار کرکے اب الہ آباد میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں - یہ خط ہمدردی کی ان بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جو منشی ذکاءاللہ اور تعلیم یافتہ ہندو شرفا میں پائی جاتی تھی۔

اِس قدیم دوست سے میرے اپنے تعلقات اُس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں جبکہ میں اُن سے دہلی کے ریڈنگ روم میں ملا کرتا تھا - موسم گرما میں ہر شب کو لائبریری کی چھت پر ایک قسم کی ادبی کلب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور عام دلچسپی کے مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی - شمالی ہندوستان میں اس سے زیادہ شاندار اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آسکتا تھا - ڈاکٹر نذیر احمد اس کلب کے مسلّمہ لیڈر تھے اور ان کے گرداگرد ہندو اور مسلمان دونوں مجتمع ہوا کرتے تھے - اثنائے بحث میں کبھی کبھی کوئی ہمدرد انگریز عہدہ دار بھی شرکت کرنے کے ارادہ سے آ شریک ہوتا تھا - منشی ذکاءاللہ ان مباحث میں تمام مسائل کے متعلق حیرت انگیز وسعت معلومات کا اظہار کرتے تھے جو ہمیشہ ان کے آڑے آتی تھی اور میں نے تو شاذ و نادر ہی ایسے شخص

سے ملاقات کی ہے جو ان کی طرح وسیع معلومات رکھتا ہو۔ یہ مجمع اب منتشر ہو چکا ہے۔ منشی ذکاء اللہ انتقال کر گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور رائے پیارے لال دونوں اپنی خرابیٔ صحت کے باعث شرکت کرنے سے معذور ہیں۔ نئی پود میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو زمانۂ گذشتہ کے ان "دیووں" کا مقابلہ کر سکے۔

اس صحبت میں شریک ہونے والے شخص کے تخیل پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر پڑتا تھا وہ باہمی بردباری کی انتہائی شرافت تھی جو مذہبی تلخی یا تعصب کے ہر داغ سے مبرا تھی اور یہ وہ ماحول تھا جس میں سیاسی فراست ترقی پا سکتی تھی اور معاشرتی درستی پختہ ہو سکتی تھی۔ ان تمام برسوں میں جن میں منشی ذکاء اللہ سے میرے تعلقات رہے، میں نے جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کر سکتا ہے کسی ہندو یا ہندوؤں کی کسی مذہبی رسم کے بارے میں کبھی ان کی زبان سے ایک دفعہ بھی کوئی تلخ یا غیر شریفانہ لفظ نہیں سنا۔ برخلاف اس کے میں نے انہیں ہمیشہ ان لوگوں کا احترام کرتے ہوئے دیکھا ہے جو اعتقادات کے معاملہ میں ان سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ جہاں کہیں وہ گئے، انہوں نے ہمیشہ صلح جوئی اور رواداری کے حق میں اپنا اثر استعمال کیا۔

ذکاء اللہ اپنے الہ آباد کے زمانۂ قیام میں تحریک علیگڈھ کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہے جو سر سید احمد خاں کی رہنمائی میں شروع کی گئی تھی۔ سر سید ان کے گہرے ذاتی دوست تھے اور ان سے یا ڈاکٹر نذیر احمد سے صلاح لئے بغیر شاذ و نادر ہی کوئی اہم کارروائی انجام دیتے تھے۔ عرصۂ دراز تک تحریک علیگڈھ ڈانواڈول رہی۔ شمال کا رجعت پسند فریق بہت طاقتور تھا اور سر سید احمد کی اپنی زندگی ان کے ترقی یافتہ خیالات کے باعث متعصب بلاؤں کی وجہ سے ہر وقت خطرہ میں رہتی تھی۔ انہیں کھلم کھلا کافر کہا جاتا تھا اور بہت سی مساجد میں وعظوں کے ذریعہ ان پر سختی سے حملے کئے جاتے تھے۔ منشی ذکاء اللہ ظلم و تشدد کے اس دور میں بہادرانہ طریقہ سے ان کی رفاقت کرتے رہے۔ وہ علیگڈھ انسٹیوٹ کے سربرآوردہ ممبروں میں سے تھے اور اسکے

متعلقہ پریس (چھاپہ خانہ) کو اُنھوں نے اپنی تمام ابتدائی کتابیں بغرض اشاعت دیدی تھیں۔ وہ کالج کے ٹرسٹی اور بہت پرجوش کارکن تھے۔

ذکاء اللہ ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد پورے انہماک کے ساتھ ادبی مشاغل میں مشغول ہوگئے۔ انھوں نے سادہ اور شستہ زبان میں انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ پر بہت سی جلدیں لکھی ہیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کتابیں اور نیز ان کے مضامین اور کتب ریاضی ہمیشہ ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیں گی۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ان کی یہ امید کہاں تک بارآور ہوگی۔

انتقال سے پیشتر ذکاء اللہ مجھ سے افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ ابھی سے میری کتابوں کی فروخت تقریباً رک سی گئی ہے لیکن خواہ یہ صحیح صورت حالات ہو یا نہ ہو اور خواہ ان کی ہر دلعزیزی دوبارہ زندہ نہ ہوسکے، یہ حقیقت فراموش نہیں کیجا سکتی کہ وہ اُن اولین اشخاص میں سے تھے جنھوں نے اردو زبان کے ذریعہ مغرب کے علوم جدیدہ کو روشناس کرانے کی اہم خدمت انجام دی۔ جہاں ایک طرف ہندوستان کے دوسرے صوبے خالصتہً انگریزی تعلیم کی رَو میں بہے چلے جا رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ انگریزی ہی بہترین ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہے، وہاں دوسری طرف منشی ذکاء اللہ نے اپنی تحریرات کے ذریعہ ثابت کر دکھایا کہ علوم جدیدہ کے نہایت ادق اور انتہائی مضامین بھی اردو کی کتب نصاب کے ذریعہ پڑھائے جا سکتے ہیں۔ آج ہم رابندرا ناتھ ٹیگور کے کارناموں اور زبردست اثر کی وجہ سے بنگال میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ مادری زبان کی محبت از سرِ نو زندہ ہو رہی ہے اور سائنٹفک کتابیں بنگالی میں تحریر کی جا رہی ہیں۔ جو بات کہ اب بنگالی لٹریچر میں وقوع میں آ رہی ہے بعینہٖ وہی بات اردو کے لئے ہمیشہ منشی ذکاء اللہ کے پیش نظر رہی اور اُنھوں نے اس کے حصولِ تکمیل کے لئے انسانی طاقت سے بڑھ کر کوشش کی۔ یہ حیثیت انشاپرداز کے وہ اپنے دو دوستوں ڈاکٹر نذیر احمد اور حالی سے بہت پست ہیں، لیکن

ان کی اردو ان تمام مصنوعی ترکیبوں اور لفاظیوں سے حیرت انگیز طور پر مبرا ہے جن کے بوجہ سے اس دور کی ابتدائی زبان دبی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ درحقیقت موجودہ اردو لٹریچر کے بانیوں میں سے تھے۔

اگرچہ منشی ذکاء اللہ تحریر تعلیم اور گفتگو میں اپنی مادری زبان کے سوائے کسی اور زبان میں اظہار خیال کے عادی نہ تھے تاہم وہ ان تمام انگریزی کتب کے پڑھنے کے بیحد شوقین تھے جو انہیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ وہ ریاضی داں ہونے کی حیثیت سے جدید سائنس کے بغایت درجہ معترف تھے اور اس طرح سے وہ ماضی اور حال، مشرق اور مغرب کا حیرت انگیز اجتماع پیش کرتے تھے۔ وہ عربی تہذیب اور ایرانی تمدن کی گذشتہ شاندار روایات کا بیحد احترام کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ علوم جدیدہ کی انتہائی ضرورت کو تسلیم کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ وہ سختی کے ساتھ اپنی مادری زبان کے ساتھ چپکے رہے اور آخر وقت تک اسے انگریزی کے حق میں ترک کر دینے کی خواہش کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی نوع مزاحمت پسند تھے اور اس امر کے خواہشمند تھے کہ کسی طرح زمانہ کی رفتار کو پیچھے کر دیں۔ برخلاف اس کے انہوں نے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اپنی امکانی طاقت کے ساتھ تحریک علیگڈھ کو ترقی دی جس کے طریقے کم سے کم انگریزی تعلیم کے متعلق ان کے ذاتی خیالات سے بیحد مختلف تھے۔

مگر محض قدیم دنیا کی تہذیب، اخلاق اور وضعداری کا نمائندہ ہونا ہی کوئی ایسی بات نہیں جو منشی ذکاء اللہ کو انیسویں صدی کے قابل احترام ہندوستانیوں کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ٹھہراتی ہو۔ اس اعزاز کے لئے ان کے حقیقی دعوی کا انحصار اس امر پر ہے کہ انہوں نے لبرل تعلیم کی اشاعت میں مخلصانہ اور پرجوش کوشش کی اور اس کے اصولوں کے ساتھ نہ ڈگمگانے والی وفاداری برتی۔ اور یہ سب کچھ ایسے زمانہ میں کیا گیا جبکہ ملک غایت درجہ کی پریشانی اور انقلاب میں سے گذر رہا تھا، جبکہ لوگوں

کے خیالات منتشر اور غیر یقین ہو چکے تھے۔

اولاً انھوں نے حیرت انگیز دور بینی کے ساتھ یہ دیکھ لیا تھا کہ خود ان کی قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ ملک ہی کو اپنا ملک خیال کرلے اور اسے کسی نوع غیر ملک نہ سمجھے۔ وہ مسلمانوں کی جانب سے علیحدگی کی ہر ایسی پالیسی کے سختی کے ساتھ مخالف تھے۔ ان کے اعتقاد میں ایسی علیحدگی ان کے ہم مذہب کی صحیح اسپرٹ کے خلاف تھی۔ وہ اس خیال کو برداشت نہیں کرسکتے تھے کہ اسلام کے متعلق دوسرے لوگ خواہ وہ اس کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں، یہ خیال کر بیٹھیں کہ اسلام بردباری نہیں سکھاتا۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کے دامن سے ہر ایسا دھبہ دور ہو جائے اور تمام دنیا پر اس کی عجیب غریب سادگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اسی غرض سے وہ الہ آباد اور دہلی میں آزادی کیساتھ دوسرے مذاہب کے پیروں سے ملا کرتے تھے اور اسی غرض سے وہ ہر بات میں مثلاً لباس طریقہ زندگی، گفتگو اور عادات میں ہندوستانی ہی رہے ان کی رائے تھی کہ وہ مادری زبان جسکا ہندو اور مسلمان یکساں طور پر مطالعہ کریں، جس میں وہ گفتگو کریں اور جس سے انہیں سچی محبت ہو، دونوں قوموں کے درمیان نہایت ہی مقدس رشتہ ہے اور انکی تمام عمر اسی رشتہ کو مضبوط کرنے میں صرف ہوگئی اگرچہ ان جیسی لیاقت کے شخص کے لئے انگریزی میں بولنا اور لکھنا آسان ترین کام تھا۔ میں نے بارہا انہیں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے اور اثنائے گفتگو میں وہ اُس شخص کے سے زور اور یقین کا اظہار کرتے تھے جسے اس بارے میں زندگی بھر کا تجربہ ہو۔ انہیں اپنی قوم سے بیحد محبت تھی اور وہ اُن درسگاہوں اور تحریکوں کی مقدور بھر کوشش کرتے تھے جن کی نسبت انہیں یقین ہوتا کہ وہ تعلیمی لحاظ سے اس کی ترقی کا باعث ہونگی لیکن سب سے بڑھ کر انہیں اُس تعلیم پر اعتماد تھا جو زندگی کے ذریعہ یعنی ہمسایوں کے تعلقات مہربانی آمیز ہمدردی، معاشرتی روابط اور باہمی میل جول کے ذریعہ حاصل کیا جائے۔ مطالعہ تاریخ نے انپر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح کردی تھی کہ صرف خیالات کے ایسے امتزاج کے دور میں جبکہ

رائے کی آزادی اور بردباری علانیہ تسلیم کر لی گئی ہو، ترقی، روشنی اور اعلیٰ تمدن خبر گڑتے ہیں۔ تاریخی تقابل کی شکل میں اگر منشی ذکاء اللہ کا اپنا تخیل پیش کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اکبر اعظم کا عہد معدلت گستر جبکہ مغلیہ دربار کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے قابل اشخاص کے لئے یکساں طور پر کھلا ہوا تھا ہی وہ زمانہ تھا جسے وہ آئیڈیل کے طور پر اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر وہ انگلستان میں ہوتے تو وہ گلیڈاسٹون اور براٹ کی پارٹی کے لبرل ہوتے۔ وہ کیتھولک ایمینسپیشن ایکٹ یا آئرش چرچ ڈس ایسٹیبلشمنٹ جیسے قوانین کی پورے طور پر تائید کرتے۔

غالباً وہ دہلی کی رو بہ تنزل مغلیہ سلطنت کے متعلق اپنے تجربہ سے اور نیز اپنی عظیم الشان تاریخی تحقیقات سے اس بات کے قائل تھے کہ صرف کسی جدید اور مقابلتہً زیادہ نو عمر تہذیب کے اتصال ہی سے زندگی اور طاقت ان کی قوم میں بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان میں آسکتی ہے۔ اُنہوں نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ مغربی تعلیم ہی اپنی بہترین اور پاکیزہ ترین شکل میں اس اتصال کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور اس لئے وہ اس کے پرجوش حامی اور وکیل ہو گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی تمام زندگی ہی اپنے ہم قوموں کو یہ اصول ثابت کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہو گئی۔

اس مقام پر وہ تاریخی تقابل پیش کرنے کے عادی تھے۔ اپنی سرگرم آرزوؤں اور مقاصد کی تصدیق کے لئے وہ اسلامی تاریخ کے اُن دوروں کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھتے تھے جبکہ مشرق اور مغرب میں باہمی اختلاط بالکل آزادانہ تھا، مثلاً وہ اسپین میں عربوں کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھتے جبکہ قرطبہ مغربی یورپ کے لئے روشنی اور علم کا مرکز بن رہا تھا اور پھر مُنہ سے تبسم کے ساتھ فرماتے: "ہم یورپ سے آج اس قرض کی کچھ ادائیگی واپس طلب کرتے ہیں جو اس کام کے سلسلہ میں ہمارا ہاتھ ذمہ نکلتا ہے۔ جسے ہم نے ازمنۂ وسطیٰ میں تمہارے لئے انجام دیا تھا۔ اسوقت آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبا سائنس اور ریاضی سیکھنے کے لئے اسپین جایا کرتے تھے۔

اب ہم اُلٹے تمہارے پاس آرہے ہیں "۔

اس فقرے میں مہربانی آمیز مذاق سے بڑھکر ایک لطیف حقیقت مضمر ہے۔ اس میں اس سچائی کا اعتراف موجود ہے کہ علم کی دولت سب کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہمہ گیر ملکیت ہے جو اگر آج ایک قوم کے پاس ہے تو کل دوسری کے پاس۔

رابندرا ناتھہ ٹیگور نے ایک شریفانہ اور فیاضانہ مضمون کے دوران میں ہندوستان کے مستقبل کا مطمح نظر پیش کیا ہے، ایسا مطمح نظر جس میں ہندو مسلمان اور عیسائی سب مل کر موجودہ ہندوستان سے زیادہ عظیم الشان ملک تعمیر کریں۔ وہ آخری صدی کے بڑے بڑے ہیروز مثلاً راجہ رام موہن رائے جیسے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے اپنی زندگیاں بسر کیں۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہیں :-

"عجیب غریب فیاضانہ دل و دماغ کے ساتھہ راجہ رام موہن رائے مشرق سے دست بر داری کئے بغیر مغرب کو قبول کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے ہمارے لئے بنی نوع انسان کا دائمی ترکہ یعنی سچائی کا آزاد ورثہ چھوڑا ہے۔ اُنہوں نے ہندوستان کی روح کو سُکڑنے نہیں دیا اور نہ اس کے گرداگرد جھاڑیاں پیدا کر کے اس کی نمو کو ٹھٹھرنے دیا۔ بلکہ اُنہوں نے اسے جگہ اور وقت کے اعتبار سے پھیلنے دیا۔ اُنہوں نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کیا، لہٰذا وہ ابھی تک ہندوستان کی از سر نو تعمیر میں ایک قوت ثابت ہو رہے ہیں۔ کوئی اندھی عادت، کوئی بے معنی فخر اُنہیں زمانہ کی رَو کے خلاف چلنے کے مقصد سے احمقانہ جنگ کرنے پر مائل نہیں کر سکا۔ اُنہوں نے اس مقصد کا جو ماضی میں ختم نہیں ہوا بلکہ مستقبل کی جانب گامزن ہے، رکاوٹوں اور مشکلات کو ٹھکرا کر ایک ہیرو کی طرح علم بلند کیا ہے۔

یہ الفاظ زندگی کے مقابلۃً کم نمایاں حلقہ میں منشی ذکاء اللہ کے کام پر چسپاں ہو سکتے

ہیں۔ انہوں نے بھی مشکلات کی پروانہ کرکے آزاد خیالی کا جھنڈا بلند کیا ہے، انہوں نے بھی ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کرنے میں امداد دی ہے اور انہوں نے بھی اپنے طرز عمل سے دکھا دیا ہے کہ کس طرح سے مشرق کو متروک کئے بغیر مغرب کو قبول کیا جا سکتا ہے۔

مترجمہ ضیاء الدین احمد برنی۔ بی۔ اے

خواتین ٹرکی کی آزادی اور تعلیم اسلام

جناب مولوی فضل الرحمٰن خاں صاحب بی۔ اے، ال۔ ال۔ بی (علیگ)

زمانہ حاضرہ میں سلطنت ٹرکی میں جو عظیم انقلاب پیدا ہوا ہے اس نے استبداد کا خاتمہ کر دیا اور اب ٹرکی ایک جمہوری نظام کے ماتحت اس ترقی کے دور میں دیگر متمدن اقوام یورپ کا مقابلہ کر رہی ہے فی الواقعی غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹرکی کو تباہی سے بچا لیا اور اپنی ذاتی شجاعت اور حسن تدبیر سے اس زمانہ میں اسلام کی وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں کہ اس غازی اسلام کے کارنامے صفحہ تاریخ پر زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس ملکی انقلاب کے ساتھ ساتھ سلطنت ٹرکی میں معاشرتی۔ اقتصادی اور مذہبی انقلاب بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور ترک قوم ایک حد تک یورپ کی "مہذب اور شائستہ" قوموں کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ جو خبریں ٹرکی سے ہم کو ہندوستان پہونچتی رہتی ہیں ان کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی قوم نے جن جن اصلاحات کی تجاویز پیش کی ہیں وہ معاشرتی اور مذہبی قوانین کے متعلق ہیں۔ اس مضمون کا مبحث صرف اسقدر ہے کہ ترکوں نے طبقہ نسا کو کہاں تک آزادی دیدی ہے اور اسکا کیا انجام ہونے والا ہے؟ انشاء اللہ ہم کسی اور موقع پر ترکوں کے مذہب اور ان کے مذہبی اصلاحات کے مطالبات پر تبصرہ کریں گے۔ کیونکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ترکوں نے اسلامی قانون ازدواج و قانون وراثت وغیرہ میں نہایت اہم تبدیلیاں کر کے نئے نئے قوانین و

ضوابط مرتب کئے ہیں اور اُن کو قابل پابندی تسلیم کر دیا جاتا ہے۔

خواتین ٹرکی کی آزادی کے متعلق کاتب الحروف نے ایک مضمون کسی انگریزی سیاح کا ایک انگریزی اخبار میں پڑھا ہے جس کا اقتباس ہدیہ ناظرین کرنا ضروری ہے۔ اس نامہ نگار کا نام مسٹر نیوٹن سن ہے اور اس نے ایک لنڈن کے اخبار میں اس انقلابی تغیر و تبدل کا فوٹو حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"خواتین ٹرکی مدت دراز تک حرم سرا میں پردہ کی حالت میں قید رکھے جانے کے بعد اب دور حاضرہ میں بالکل آزاد ہو گئی ہیں۔ خواتین ٹرکی نے اس دور حاضرہ میں ایک غیر قابل یقین تغیر اپنی معاشرت اور تمدن میں پیدا کر لیا ہے۔ جب میں پچھلے موقع پر ٹرکی میں تھا تو میں نے وہاں کی مستورات کو برقع و نقاب پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک مثل مومیائی شبیہوں کے سیاہ یا ہرے برقعوں اور چادروں میں ڈھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھی بہ مشکل دکھائی دیتی تھیں اور احتیاط اسقدر کیجاتی ہے کہ بسا اوقات اکثر عورتیں اپنے سروں کو چھتری لگا کر چھپا لیتی تھیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ٹرکی خواتین مثل مہذب اور تعلیم یافتہ ملکوں کی خواتین کے پوشاک پہنتی ہیں اور طرز عمل رکھتی ہیں۔ اب یہ عورتیں اپنے ہونٹوں۔ رخساروں اور پلکوں کو سرخ رنگتی ہیں۔ اپنے سر کے بالوں کو بناتی اور کاکلیں نکالتی ہیں۔ اپنی گردنوں اور سینوں کو کھلا چھوڑتی ہیں اور چست چھوٹے چھوٹے فراک پہنتی ہیں جو صرف اُن کے گھٹنوں تک پہونچتی ہیں اور وہ اپنی پنڈلیوں پر ریشمین گلابی رنگ کے موزے پہنتی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہوں۔ فی الواقعی یہ بات قابل تعجب ہے کہ یہ خواتین اپنے آپ کو کس طرح زمانہ کی ضروریات کے مطابق کار بند کریں گی۔ بعض خواتین کو اس آزادی کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑیگا۔ مجھ کو خبر ملی ہے کہ اناطولیہ کے بعض حصوں میں اور دیگر مقامات پر اِن آزاد خواتین کی علانیہ توہین کیجاتی ہے اور تمسخر کیا جاتا ہے۔ یہ خواتین پبلک کے روبرو چرٹ پیتی ہیں اور قہوہ خانوں میں جاتی ہیں اور

رات بھر ناچتی گاتی ہیں اور مردوں سے علانیہ بات چیت کرتی ہیں۔ یہ تمام آزادی اِن خواتین کو چند سال کے عرصہ میں ترکی نژاد خاتون خالدہ خانم کی بہادرانہ اور اَن تھک کوششوں کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ ٹھیک یہی حال ہمارے ملک کی رائے طلب کرنے والی، عورتوں کا بھی ہوا تھا اور انہوں نے بھی ایک مدت کی کوشش اور ایثار اور قربانیوں کے بعد کریہہ رسمیات اور بیہودہ پابندیوں کی جکڑ بند کو توڑ کر اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا۔"

ہم ہندی مسلمان قید غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہم کو متمدن اقوام کے تمدن و معاشرت پر نکتہ چینی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے اور ترکوں کے درمیان رشتہ اخوت اسلامی قانون نے پیدا کر دیا ہے اور رسول اکرم صلعم کی تعلیم نے ہم کو خواہ ہم عربی یا ترکی یا ایرانی یا ہندی نژاد ہوں ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم ترکی کی موجودہ معاشرتی اصلاحات پر نظر تنقید ڈالیں کہ آیا یہ قوم اپنے دعادی میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ اور آیا اس نام نہاد "آزادی" کو حاصل کر لینے میں ترکی قوم خصوصاً اُن کی خواتین جادۂ اعتدال سے باہر تو نہیں ہو گئی ہیں؟

یورپ اور ایشیا کی اقوام میں گذشتہ کئی صدیوں سے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے عظیم الشان انقلابات ہوئے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ متمدن اقوام "نظام جمہوریت" قایم کر چکی ہیں یا کرنے والی ہیں۔ ان انقلابات کا نتیجہ اکثر اقوام یورپ کے حق میں سود مند ثابت ہوا ہے۔ مگر خال خال ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جو اقوام اس نظام جمہوریت کی اہل نہ تھیں اُن کو قبل از وقت "جمہوریت" قائم کر لینے کی آرزو کی وجہ سے شدید نقصانات بھی پہونچ چکے ہیں۔ چنانچہ اس کی مثالیں روسی، چینی وغیرہ ملکی انقلابات کی موجودہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ملتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سلطنت ٹرکی جمہوریت کی اہل نہ تھی اور نہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ سلطنت ٹرکی نے قبل از وقت استبدادیت کی زنجیروں کو توڑ دیا اور نظام جمہوریت حاصل کر لیا۔ بلکہ اس مضمون میں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس آزادی

کی رو میں ترکی نے اپنے دیرینہ معاشرتی و مذہبی قوانین کو خیرباد کہہ کر یورپ کے معاشرت اور مذہب کو آمنّا و صدقنا کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یورپ اس بیسویں صدی کے دور میں مشرق کی "روحانیت" کا قائل ہو رہا ہے اور اُن کے معاشرتی نظام کی وجہ سے جو بداخلاقی اور بربریت کے خصائل ان متمدن اقوام میں پیدا ہو گئے ہیں اُن پر دنیا نفرین کر رہی ہے۔ جو اخبارات ہم کو بذریعہ کتب و جرائد ہندوستان کو پہونچتے ہیں اُن سے اظہر من الشمس ہے کہ یورپ نے مذہب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نظام معاشرتی و تمدن میں وہ خرابیاں پیدا کر لی ہیں کہ اب اُن کی اصلاح ناممکن ہے اور ایک زمانہ وہ بھی آئیگا کہ اُن کو اپنے عیش پرستی اور بداخلاقانہ زندگی کی بدولت زمانہ کے ہاتھوں سے سخت سے سخت سزا ملیگی لہٰذا اس حالت کو دیکھتے ہوئے اقوام ترک کو یورپ کی اندھی تقلید کرنا اور اُن کے ناقص اور بداخلاقی سکھانے والے قوانین کا اتباع کرنا اُن کے لئے سخت مضر ہے۔ کاش اگر مسلمانانِ عالم خصوصاً ترک اقوام و ہندی مسلمان "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کرتے تو کیا اُن کو دینی اور دنیاوی مسرتیں حاصل نہیں ہوتیں؟ بداخلاقی اور بددینی کی زندگی سے گو انسان کے فوری اور جذباتی مقاصد حاصل ہو جاویں مگر قوانین فطرت نے ہم کو سکھلا دیا ہے کہ یہ جذباتی مسرتیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ حقیقی مسرت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے وہ صفات اور اخلاق پیدا کرے جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

میں اس موقع پر دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کسی خاص عقیدہ یا رسم رواج کا پابند نہیں ہے۔ جو تعلیم حریت اور مساوات کی اسلام نے پیش کی ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ پیغمبر خدا صلعم نے سرزمینِ عرب میں جمہوریت کی بنیاد ڈالی حالانکہ حضورؐ کے زمانہ بعثت کے وقت یورپ اور اقوام یورپ وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام ایک دین فطری ہے یعنی اسلام اس قسم کے اصول اور قوانین پیش کرتا ہے جو خلاف فطرت نہیں ہیں اور

ظاہر ہے کہ اصول فطری غیر متزلزل ہوتے ہیں جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ قرآن شریف میں وارد ہے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیلاً۔ اسلام نے حریت اور مساوات کی ایسی زبردست تعلیم دی ہے کہ بنی نوع انسان میں کالے۔ گورے۔ زرد۔ گندمی رنگ والوں کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو شخص دین فطرت یا بدیگر الفاظ اسلام کا قائل ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے اور اُس کو حق حاصل ہے کہ وہ بلالحاظ قومیت و جنسیت حریت کا مستحق رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حریت مساوات کیا ہے؟ حریت اور مساوات کے یہ معنی نہیں کہ انسان غیر متزلزل قوانین فطرت کی خلاف ورزی کر کے بداخلاقی، اور بربریت کا جامہ پہن لے۔ انسان بہ حیثیت حیوان ناطق اور اشرف المخلوقات ہونے کے حیوان مطلق اور اس سے بھی ادنیٰ ذی حیات یا غیر ذی حیات مخلوق سے بوجوہات خاص متصف اور متبائن ہے۔ کسی سنجیدہ مذہب اور خصوصاً اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہو سکتی کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر حیوان مطلق کی سی زندگی بسر کرے۔ میں اس بارے میں صرف اپنے مضمون کے مبحث کی طرف توجہ کرتا ہوں تاکہ اصلی مقصد فوت نہ ہو جاوے۔ ہمارے بحث حریت اور مساوات اور خصوصاً طبقہ نسواں کی آزادی پر ہے۔ اس مبحث پر دو سوالوں کے حل ہو جانے سے اور خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنے سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ حریت اور مساوات کسے کہتے ہیں؟ اور اُس کا صحیح مفہوم کیا ہے اور زیادہ قابل قدر شے ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر حریت اور مساوات قابل قدر شے ہے تو اس آزادی کی جنس وار تخصیص کیوں کی جاتی ہے؟ لہٰذا جو مذہب و ملت آزادی کے صحیح معنوں میں کسی طرح سے رُکاوٹ پیدا کرے وہ دینِ فطری نہیں ہو سکتا۔

پہلے سوال کا جواب گو ہمارے مبحث کا نقطہ نظر نہیں ہے۔ مگر اس پر ضمنی مختصر بحث

کی ضرورت اس وجہ سے لاحق ہے کہ دوسرے سوال کے حل کرنے میں "حریت ومساوات" کے الفاظ بار بار لانا پڑتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے "حریت ومساوات" کا مفہوم سمجھنا چاہیے۔

میرے خیال میں "حریت" یا "آزادی" کا مفہوم یہ ہے کہ ایک انسان اپنے قدرتی حقوق کو اپنی قوت ارادی کی تعمیل میں بلا کم وکاست اور بلا دوسرے شخصوں کے دباؤ کے استعمال کرکے اُن سے متمتع ہو جاوے۔ بنی نوع انسان کے "قدرتی حقوق" بہت سے قسم کے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جسمانی۔ دماغی۔ اخلاقی یا روحانی قویٰ کو قوانینِ قدرت کے ماتحت رکھکر بام کمال پر پہنچائے کیونکہ اس میں انسان کی فنا اور بقا کا راز مضمر ہے۔ نظام تمدن یا مذاہب عالم میں اگر کوئی قانون یا اصول اس کے خلاف وضع کیا جاوے تو وہ اس قدرتی حقوق کے متضاد ومنافی خیال کیا جاوے گا اور "آزادی" کا مفہوم فوت ہو جاوے گا۔ جو شخص یا کوئی نظام سلطنت اس قدرتی حق کو دبائے یا رخنہ اندازیاں کرے تو اُس کی نسبت کہا جاوے گا کہ اُس نے "آزادی" کو پامال کر دیا۔ اسی آزادی کے صحیح مفہوم کے اکتساب میں کسی جنس کی قید نہیں ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت دونوں میں سے ہر ایک کو قدرتی حق حاصل ہے کہ وہ اخلاقی۔ روحانی اور جسمانی ترقیاں کریں مگر قانون قدرت کے ماتحت رہکر۔ مرد اور عورت دونوں میں سے اگر کوئی بھی قوانین فطرت سے باہر ہو کر ترقی کرنے کا دعویٰ کرے تو اس ترقی کو صحیح معنوں میں "آزادی" کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ بے شک آزادی ایک بیش قیمت شے ہے کیونکہ وہ قوانین قدرت کا ایک شائبہ ہے اور جو شخص اس صفت یا حق سے محروم ہے یا اسیر کم وبیش قیود اس آزادی کے حصول میں لازم کی گئی ہیں وہ فی الواقع "قدرتی حقوق" کے حصول میں کوتاہ خیال کیا جاوے گا۔ کسی حکیم کا قول ہے "میں دیگر اشخاص کی آرزوؤں اور تمناؤں کے متعلق رائے قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے دریافت کیا جاوے کہ تم کس چیز کے متمنی ہو تو میں صاف کہدونگا کہ مجھے آزادی دیجاوے ورنہ میری خواہش

موت کی ہوگی۔" بے شک یہ فقرات نہایت قابل قدر ہیں اور آزادی کے مفہوم کی قیمت کا اندازہ
بحالت آزادی نہ ملنے کے موت جیسی مختتم شے سے کیا گیا ہے جس کے بعد انسانی وجود کا ہی
خاتمہ ہوجاتا ہے مگر ان الفاظ سے آزادی کے منشا اور مفہوم پر کافی روشنی نہیں پڑتی
جس سے معلوم ہوسکے کہ آزادی کیا شے ہے؟ اور اُس کا صحیح استعمال کیا ہے؟ مجھے انگلستان
کے مشہور مدبر برک کا قول نہایت پسند ہے۔ اُس نے نہایت مختصر اور صاف الفاظ میں
آزادی کی غایت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "فی نفسہٖ آزادی بھی ایک قسم کا جوہر ہے جسکے
حصول اور جائز استعمال کے لئے کچھ نہ کچھ قیود کی ضرورت لابدی ہے" مدبر برک کا یہ قول
واقعی نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔ موجودہ زمانہ کی ہل چل اور مطلق العنانی کو دیکھتے ہوئے
یہ قول سونے کے حرفوں میں لکھے جانے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہے۔ حریت
یا آزادی کے یہ معنی نہیں کہ انسان معاشرتی۔ تمدنی۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ قوانین کو توڑ کر مطلق العنان
ہوجاوے اور کسی اصول یا قوانین کی پابندی نہ کرے اور مثل بہایم کے اپنی نفسانی خواہشات
کا شکار ہوکر تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بلا مہار کے اونٹ کی طرح اپنی زندگی بسر کرے لہٰذا
مجھے ناظرین کو اس امر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ جدید اقوام ترکی نے حریت
اور آزادی کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا اور یورپ کی کورانہ تقلید کا شکار ہوکر جادۂ اعتدال
سے تجاوز کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک قوم کا اخلاق اور منزہ صفات جو اُن کو دیگر اقوام
یورپ سے متائز کرتی ہیں مفقود ہوجاویں گی اور مثل پیرس اور لندن والوں کے دنیا انکی
بداخلاقی اور نفس پرستی پر تمسخر اُڑائیگی۔ ممکن ہے کہ ترک قوم کو چند روز میں اپنی اِس
مطلق العنانی کا سبق مل جاوے اور وہ اس گمراہ راستہ سے ہٹ کر جادۂ اعتدال پر بدستور
سابق آجاویں۔ اگر ہم ہندی مسلمان ان واقعات کو نظر غور سے دیکھیں اور مسٹر نیوٹن سن کے
الفاظ اور مضمون کی غایت کو سمجھیں تو ہم کو نہایت شرم آنا چاہیئے کہ وہ کنایتہً ترکی خواتین
اور ترکی تمدن کا کن مہذب الفاظ میں خاکہ اُڑا رہا ہے۔ مجھے تو اس سیاح کے الفاظ اور

طرزِ بیان سے یہی غایت نظر آتی ہے کہ وہ در پردہ اسلامی تمدن و تہذیب کا مضحکہ اڑا کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی تمدن و تہذیب ناکارہ اور خام ہے اور یورپ کی نام نہاد "آزادی" بہترین شے اور زمانہ حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ہے۔ فاعتبروا یااولی الابصار!۔

ناظرین کرام نے سمجھ لیا ہو گا کہ حریت اور آزادی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مجھ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حریت اور مساوات کے مضمون پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس مضمون پر ہزاروں کتابیں اور رسائل مجھ سے زیادہ قابل قدر اشخاص کے موجود ہیں۔ میں یہاں صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اسلام نے ہم کو عام تعلیم دی ہے کہ ہر مسلم اور مسلمہ آزاد ہے اور ایک دوسرے کا بھائی بہن ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ اسلام میں یہ حریت کا مسئلہ کوئی نئی شے نہیں ہے۔ لہٰذا میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ ابتدا ِ اسلام سے لیکر آج تک جبکہ اسلام ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے اس حریت اور مساوات کا سبق جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب فردِ اسلام کے دل میں نہ صرف موجزن ہے بلکہ ہمیشہ سے اس پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہیگا۔ علاوہ ازیں میں نے لفظ آزادی کے مفہوم کو انگریزی مدبر برک نامی کے قول سے ثابت کر دیا ہے کہ "آزادی" مطلق العنانی کا نام نہیں ہے بلکہ قدرتی حقوق کو قانونِ قدرت کے ماتحت رکھکر اُن کو حاصل کرنے اور اُن سے متمتع ہونے کا نام آزادی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت کا دوسرا نام اسلامی اصطلاح میں سُنَّۃُ اللّٰہ ہے۔ اور یہی سنۃ اللّٰہ ہے قوانین قدرت اسلامی مذہب کا سنگ بنیاد ہیں جس کا بار بار تذکرہ قرآن شریف میں آیا ہے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ جبکہ حریت اور مساوات صحیح معنوں میں قابل قدر شے ہیں تو اسلام اور تمدن اسلام اس کی جنس وار تخصیص کیوں کرتا ہے اور عورتوں کو مثل مردوں

کے کیوں آزادی نہیں دیجاتی؟ کیا وجہ ہے کہ اہل اسلام اپنی خاتونوں کو پردہ میں اور حرم میں رکھکر اور اُن پر طرح طرح کی قیود لگا کر اُن کی آزادی اور حریت کو پائمال کرتے ہیں حتیٰ کہ اُن کو ناقص العقل کا خطاب بھی دیئے جانے میں کوئی تامل نہیں کیا جاتا؟

یہ مسئلہ بہت کچھ وضاحت طلب ہے مگر مضمون کے طوالت ہو جانے کی وجہ سے مجھ کو خوف ہے کہ طوالنی بحث اور تمہیدوں سے ناظرین اکتا نہ جاویں۔ لہٰذا اس بارے میں میں نہایت مختصراً عرض کرتا ہوں کہ اس سوال کے مباحثہ میں ناظرین ہندستان کی خواتین کی حالت اور اُن کے موجودہ تمدن و معاشرت کو پیش نظر نہ کریں۔ مسلمانان ہند اپنا ملک و تمدن کھو بیٹھے ہیں اور اُن کی موجودہ حالت کا مقابلہ اسلام کی اصل تعلیم حریت و نسائیت سے نہیں ہو سکتا۔ مسلمانان ہند میں اُن کا اصلی مذہب اور تمدن بہت کم باقی رہ گیا ہے جس کے وجوہات چند در چند ہیں مسلمانانِ ہند پستی اور غلامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک غیر آزاد قوم ہیں۔ لہٰذا صحیح تعلیم اسلامی پر نہ یہاں عمل ہوتا ہے اور نہ وہ بوجہ اپنے دماغی انحطاط کے اس قابل ہیں کہ وہ اپنا صحیح مسلک زندہ قوموں کیطرح قائم کر سکیں۔ البتہ دور حاضرہ میں چند شخص ایسے ہوئے ہیں جو اسلامی تواریخ و روایات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے جس کی وجہ سے اب کچھ بیداری پیدا ہو چلی ہے اور ہماری امیدوں میں ایک جھلک سے پائی جاتی ہے کہ اگر تعلیمی جد و جہد جاری رہی تو ممکن ہے کہ وہ زمانہ عود کر آئے کہ ہم لوگ اسلام یا دین فطرت کا صحیح مفہوم سمجھ کر صحیح راستہ پر آجاویں۔ علاوہ ازیں مسلمانان ہند میں زیادہ تر شخص نومسلم ہیں اور ہندوستان کی آبادی کا ۳/۴ حصہ غیر مسلم ہے لہٰذا ایسی صورت میں مذہب ہنود اور اُن کے رسم و رواجات کا رنگ ہم پر اسقدر گہرا چڑھ گیا ہے کہ اہل ہنود کی بہت سی باتیں ہمارے تمدن اور معاشرت میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور چونکہ اہل ہنود کے قانون یا دھرم شاستر میں "ہندو عورت" کو مستقل حقوق پیدا نہیں ہوتے اور وہ ایک کمزور اور محکوم ہستی خیال کیجاتی ہے لہٰذا اُن کے رسم و رواج اور قانون کی تقلید بھی مسلمانوں میں اکثر ہونے لگی ہے جس کا

نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں عورت ناقص العقل خیال کی جانے لگی اور بوجہ انکی تعلیم و تربیت نہ ہونے کے فی الواقعی ہماری مستورات کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لہذا اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے ہم کو اسلامی تعلیم پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہی۔

سب سے پہلے میں عرض کرونگا کہ اسلام یا تمدن اسلام نے حریت یا آزادی کے بارے میں جنس وار کوئی تخصیص نہیں کی۔ جن حقوق اور ذمہ داریوں کا کلام پاک اور رسول اکرمؐ کی تعلیم میں ذکر ہے وہ سب مرد و عورت دونوں پر لازم ہوتی ہیں۔ مرد و عورت کو ہر قسم کے علوم و فنون سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بارے میں کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ طَلَبَ العلم فریضۃٌ علی کل مسلم و مسلمۃٍ " یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہی قرآن شریف کا یہ حکم بلا کسی تخصیص اور پابندی کے ہے جس کے صاف معنی بلا کسی تاویل کے یہ ہیں کہ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ وہ ہر قسم کا علم سیکھیں۔ مزید براں رسولؐ اکرم نے جن کی حیات ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے اس طرح تعلیم دی ہے کہ اُطلبوا العلم لو کانَ بالصین یعنی اے مسلمان مرد اور عورتو! تم علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین ہی جانا پڑے۔ اس حدیث سی صاف ظاہر ہے کہ رسول اکرم نے علم کو ایسا قابل قدر اور بہترین شئے سمجھا کہ تمام مسلمان مرد اور عورتوں کو ہدایت کردی کہ علم کے حصول میں مسافت بحری و بری کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئیے۔ یہ ایک مثال بطور نمونہ ہے۔ جو لوگ قرآن شریف کو بامعنی اور بغور پڑھتے ہیں اُن کو ظاہر ہوگا کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اکثر جگہ بلا کسی تخصیص کے مخاطب کیا ہے اور کل کلام الٰہی مردوں اور عورتوں دونوں پر قابل پابندی ہے میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ میں نے جہاں تک قرآن شریف کا مطالعہ کیا ہے کوئی آیت یا فقرہ ایسا نہیں پاتا جس میں عورتوں کی حریت اور آزادی کے متعلق اُن پر قیود عائد کئے گئے ہوں جن سی انکی ہستی یا حریت پامال ہوجاوے۔ بلکہ حسن معاشرت یا تمدنی زندگی بسر کرنے کے لئے یہاں تک کہدیا ہے۔ ھُنَّ لباسٌ لکم و انتم لباسٌ لھنّ (سورۃ بقر)

ترجمہ۔ عورت اور مرد دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں۔ لہٰذا اسلامی تعلیم سے ثابت ہے کہ بانی اسلام نے کوئی جکڑبند عورتوں کی حریت اور آزادی پر نہیں لگائی اور تاریخ اسلام سے یہ ثابت ہے کہ متمدن عرب اور اسلام کی قائم کی ہوئیں جمہوریات اور سلطنتوں میں عورتوں نے ہر شعبہ میں قابلِ فخر حصے لئے ہیں اور اسلامی تاریخوں کے صفحات بیشتر اُن کے کارناموں سے مملو ہیں۔ اب ہمارے مبحث کا صرف اسقدر حصہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمین اپنی خاتونوں کو پردہ اور حرم میں کیوں رکھتے ہیں؟ کیا یہ اُن کی آزادی پر صریح قیود نہیں ہیں؟ اگر اقوامِ ترک نے اپنی خاتونوں کو اس بارے میں آزاد کر دیا تو کیا بُرا کیا اور ہم ہندی اُن کے فعل پر کیوں معترض ہوتے ہیں؟

قبل اس کے کہ ہم اس اہم مضمون پر کچھ عرض کریں ہمارے لئے بسا ضروری ہے کہ پردہ کے متعلق آیات قرآنی کو نظر تعمق سے دیکھا جاوے کہ آیا اسلام نے اس بارے میں کوئی پابندی کی ہے یا کسی طرح اس بارے میں عورتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ محض پردہ میں بیٹھی رہیں اور کوئی جسمانی۔ دماغی اور روحانی ترقی نہ کریں؟

اس بارے میں کلام پاک کے مطالعہ سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کی عصمت کے متعلق نہایت تنبیہی الفاظ میں اُن کو پاکدامن رہنے کی فہمائش کی ہے اور فحش اور بے حیائی کو بدترین گناہ خیال کیا ہے۔ چنانچہ زانی اور زانیہ کو سخت سزائیں دینے کا حکم ہے۔ فی الواقعی فحش اور بدکاری کی زندگی مرد اور عورت دونوں کے لئے کسقدر نازیبا ہے۔ کیونکہ بغیر تعلق ازدواج کے ناجائز طریقہ سے عورتوں کے ساتھ معاشرت رکھنا کسقدر کریہہ اور مذہبی اور اخلاقی نقطہ نظر سے معیوب ہے۔ جہاں تک میں نے پڑھا اور غور کیا ہے کلام پاک میں عورتوں کو چاردیواری کے اندر رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق قرآن پاک میں حسب ذیل آیات موجود ہیں۔

سورہ نور میں ایک مقام پر صرف مردوں کو یہ حکم دیا ہے قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ۔ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ (ترجمہ) (اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اس میں اُن کی زیادہ صفائی ہے۔ لوگ جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو سب خبر ہے۔ اس میں دوسری جگہ یہ حکم ہے۔ وَقُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ الخ (ترجمہ) اور (اے پیغمبر) مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر اس میں سے جو چار و ناچار کھلا رہتا ہے اس کا ظاہر ہونے دینا مضایقہ کی بات نہیں ہے۔ اور اپنے سینوں پر دوپٹوں کے بکل مارے رہیں اور اپنے زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں یا اپنے باپ وغیرہ پر الخ۔ سورہ احزاب میں ایک مقام پر یہ آیت ہے کہ یَا اَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا۔ (ترجمہ) (اے پیغمبر) اپنی بیبیوں۔ بیٹیوں۔ اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑیگی کہ نیک بخت ہیں اور کوئی چھیڑے گا نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں مدینہ کی ایسی حالت تھی۔ جیسے ہمارے یہاں دیہات کی۔ گھروں میں بیت الخلا نہیں تھے۔ شریف زادیاں قضاء حاجت کے لئے جھٹ پٹے کا وقت دیکھ کر آبادی کے باہر چلی جاتی تھیں اور بدکار اور فاجر شخص کسی عورت آتے جاتے دیکھ پاتے تو اس کو تنگ کرتے تھے اور اُن کو فہایش کیجاتی تھی تو وہ جواب دیتے تھے

کہ ہم نے لونڈی سمجھا تھا۔ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کی انسداد کے لئے شروع میں یہ حکم دیا گیا کہ شریف زادیاں گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ پھر اسلام کی ترقی کے ساتھ مدینہ بڑا شہر ہو گیا اور لوگوں نے گھروں میں بیت الخلا بنائے۔ اور مستورات کو قضاء حاجت کے لئے بستی کے باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس آیت کے مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ حضور صلعم کے زمانہ میں بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی اور تاریخ اسلام سے بھی ثابت ہے کہ وہ باہر نکل کر ہر طرح کا کام کاج کرتی تھیں اور محض مقتضاء وقت کی وجہ سے اُن کو چادریں اوڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا کلام پاک کے اِن احکامات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورتوں کو چاردیواری میں رہکر زندگی بسر کرنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورت اور مرد بالکل آزاد ہیں مگر عصمت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا دونوں فریق کے لئے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیم کا لبّ لباب صرف اسقدر ہے کہ مرد و عورت دونوں نگاہ بد جس سے بیحیائی پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے پر نہ ڈالیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے اور بلا کسی حجاب و رکاوٹ کے شریک جلسہ ہونے سے ایک دوسرے کے حیوانی جذبات کے مشتعل ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے جس کا نتیجہ بد اخلاقی اور بد دینی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کاش ہم مسلمانان جادۂ اعتدال پر قائم رہتے اور اس مادہ پرستی کے دور میں اہل مغرب کی معاشرتی و مذہبی قوانین و ضوابط کو رائتہ تقلید سے پہلو تہی کرتے اور محض اسلامی تعلیم اور اس کی روایات کو پیش نظر رکھ کے دینی و دنیاوی حسنات حاصل کرتے۔

غزل

جناب نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مانکپوری استاد خسرو دکن
خلد اللہ ملکہ

گرچہ دل میں کوئی پیکاں نہیں قاتل باقی
لوٹتا ہوں کہ ابھی ہے خلش دل باقی

بجھ گئی آتش گل باد خزاں کے ہاتھوں
رہ گئی گرمی فریاد عنادل باقی

کام کرتا ہے وہ تجھکو سر مقتل جس سی
نام رہجائے لب زخم پہ قاتل باقی

جس طرح پارۂ اخگر ہو تہ خاکستر
دل ہوا خاک مگر ہے تپش دل باقی

ہو چکی جامہ دری دست جنوں بڑھ آگے
لطف کیا رہ گئے گر طوق سلاسل باقی

تم دئیے جاؤ مجھے تیغ ادا کے چرکے
میں کہے جاؤں ابھی ہی ہوس دل باقی

تن بسمل سی نکلتی جو نہیں جان حزیں
بات یہ ہی کہ تری یاد ہے قاتل باقی

رنگ کہتا ہے غریبوں کی دل آزاری کا
انکے پہلو میں ابھی تک ہی وہی دل باقی

اس تصور سی کہ ہنگام سحر کیا ہوگا
شمع گھلتی رہی جبتک رہی محفل باقی

خون آنکھوں سے ٹپکتا ہی میں خوش ہوتا ہوں
یہ سمجھ کر کہ ابھی ہیں جگر و دل باقی

قدر عشاق نہ کیوں شمع رخوں میں ہو جلیل
انہیں پروانوں سی ہی رونق محفل باقی

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی ڈاک

(از جناب سید حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا - ایڈیٹر شمع)

(بہ سلسلۂ سابق)

آجکل ڈاک کا جو مفہوم ہے قطعی جدید ہے، ابتدا میں یہ محض سرکاری محکمہ تھا، جو سلطنت کے مختلف مقامات کے درمیان تعلقات کے قیام اور وہاں کی خبریں لینے کی غرض سے جاری ہوا تھا۔

ہندوستان میں ۱۸۳۷ء تک ڈاک، عام طور پر مروج نہ تھی، اور پیام رسانی کا کام سرکاری یا نجی ہرکارے، انجام دیتے تھے، امپیریل گزیٹیر میں ذکر ہے کہ "قاصد، پیامبر اور ہرکارے ڈاک کا کام اچھی طرح انجام دیتے تھے، اور یہی طریقہ اس ملک میں عرصہ سے رائج تھا اور کامیاب تھا، یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اس کی ابتدا کب سے ہوئی، لیکن تاریخی شہادت کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے پٹھان بادشاہ علاء الدین خلجی کے عہد میں ڈاک کا محکمہ موجود تھا، سلطان علاء الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت نشین ہوا تھا، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان نے گھوڑوں اور پیادوں کے ذریعہ سے ڈاک کا انتظام کیا تھا تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں سلطانی افواج پر چڑھائی کریں، تو ان کے حالات اور جنگ کے واقعات کی اطلاعیں سلطان تک پہنچتی رہیں، اسی محکمہ کے ذریعہ سے

اشیاء بازاری کا نرخ، اور سلطنت کے حالات کی اطلاعات دربار میں آتی تھیں،

سلطان محمد تغلق کے عہد میں ڈاک کا محکمہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا چنانچہ اس کی شہادت ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملتی ہے، ابن بطوطہ ۱۳۴۱ء میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے "اس ملک یعنی ہندوستان میں قاصدوں کی دو قسمیں ہیں سوار، اور پیادہ سوار قاصد، سلطانی لشکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر چار میل پر تعینات رہتے ہیں، پیادہ قاصد ایک میل کے فاصلہ سے تعینات رہتے ہیں اور تین میل تک جاتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چابک رہتا ہے جس میں گھونگرو لگے ہوتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا ہوتا ہے۔ یہ لوگ چابک کو ہلاتے ہوئے دوڑتے ہیں اور ڈاک کی قریب ترین چوکی تک جاتے ہیں، اور وہاں چابک کو ہلاتے ہیں، گھونگرو کی آواز سنکر دوسرا قاصد دوڑتا ہے اور ڈاک کا تھیلا لیکر اسی طرح چابک کو بجاتا ہوا آگے کی ڈاک کی چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے، اس طرح پر سلطان تک ڈاک پہنچ جاتی ہے اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔

شہاب الدین ابو العباس احمد نے، جو ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا، اسی قسم کی تفصیل لکھی ہے، ڈاک کے سلسلہ میں مسلمان مورخین نے سکندر لودی (۱۴۸۸ء لغایتہ ۱۵۱۸ء) اور بابر کا بھی نام لیا ہے، سکندر لودی نے تو ہر جگہ ڈاک کی چوکیاں قائم کردی تھیں۔ اس کی فوج جہاں کہیں جاتی تھی، روزانہ دومرتبہ سلطانی فرامین وصول کرتی تھی، جو فرمان علی الصبح پہنچتا تھا اس میں دن بھر کے کوچ کے بعد قیام کے متعلق ہدایتیں ہوتی تھیں، اور دوسرے پیغام میں جو تیسرے پہر وصول ہوتا تھا احکام ہوتے تھے" یہ طریقہ سختی سے جاری تھا، ڈاک چوکی پر گھوڑے تیار رہتے تھے، اور سلطان کو ملک کے ہر پرگنہ کے حالات، اور اشیاء کے نرخ کی اطلاعات روزمرہ پہونچتی تھیں، شہنشاہ بابر نے آگرہ سے کابل تک کی سڑک کی پیمایش کا حکم دیا تھا، چنانچہ بابر نامہ میں ذکر ہے کہ سترہ دسمبر ۱۵۲۸ء کو بادشاہ نے یہ حکم صادر فرمایا، اور اسی دن چقماق بیگ روانہ ہوگیا، کام کا طریقہ یہ تھا" ہر نو کروہ کے فصل

پر ایک مینار بنایا جائے جو چوبیں فیٹ بلند ہو اور اس کی چوٹی پر چار طرف چار دروازے ہوں، اور ہر اٹھارہ کردہ پر چھ گھوڑے تیار رہا کریں (گھوڑوں کے دانہ اور سائیسوں وافسران ڈاک کی تنخواہ کا معقول بندوبست کیا جائے" لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس اسکیم کا کیا نتیجہ نکلا،

شیر شاہ (۱۵۴۰ء لغایتہ ۱۵۴۵ء) کی حکومت مسلمانوں کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اسی عہد میں سیاسی اور اقتصادی ترقیاں ہوئی تھیں، اور حکومت و انتظام کے جدید قواعد بنائے گئے تھے، شیر شاہ نے سراؤں، سڑکوں، اور پلوں کے علاوہ سوار قاصدوں کا انتظام بھی کیا تھا جو ملک کے ہر گوشہ میں موجود رہتے تھے، اور ملک کے بعید ترین مقامات سے بھی اُس کو روزانہ اطلاعات پہنچتی رہتی تھیں مختلف سڑکوں پر تقریباً سترہ سو سرائیں موجود تھے ہر سرا میں دو گھوڑے تیار رہتے تھے تاکہ خبریں جلد پہنچائیں، یعنی صرف خبر رسانی کے لئے ملک میں تین ہزار چار سو گھوڑے روزانہ دوڑتے تھے، شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء لغایتہ ۱۶۰۵ء) غالباً پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد میں ڈاک لیجانے کے لئے اونٹ استعمال ہوئے، آئین اکبری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں ڈاک کے انتظام بہت معقول تھا" ریباڑی، ہندوں کا ایک فرقہ ہے، یہ لوگ اونٹوں کی عادات سے خوب واقف ہیں، اور دیسی اونٹ یعنی لوک کو تیز قدمی سکھا لیتے ہیں، اگرچہ سلطنت کے حدود سے پایہ تخت تک ہر طرف گھوڑوں کی قطاریں تیار کھڑی رہتی ہیں اور تیز قدم ہرکارے ہر چار کوس پر تعینات رہتے ہیں لیکن محل شاہی میں چند اونٹ بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں" یورپین سیاحوں میں انگلینڈ کا ہیلن ایسا شخص ہے جس نے سترہویں صدی میں ہندوستان پہنچ کر یہاں کی ڈاک کے حالات کو مشرح طور پر بیان کیا ہے۔

"مغلوں کی سلطنت میں ڈاک بہت تیز جاتی ہے، کیونکہ شاہراہ پر ہر دس میل کے فاصلہ سے کاروان سرائیں بنی ہوئی ہیں، جہاں نہایت تیز قدم آدمی ہر وقت تیار کھڑے

رہتے ہیں مطلا کبسوں میں خطوط رکھ کر اپنے سر پر لیجاتے ہیں، سرائے میں پہنچ کر دوسرا ہرکارہ اس کبس کو لے لیتا ہے اور دوسری سرائے کی طرف روانہ ہوجاتا ہے، تمام رات اور دن یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، ان لوگوں کی رفتار پانچ چھ میل فی گھنٹہ ہے، اور آٹھ دن کے اندر سلطنت کے بعید ترین گوشوں سے پائے تخت تک خطوط پہونچ جاتے ہیں۔

مغلوں کے زمانہ میں اخبار نویسوں کی کئی قسمیں تھیں (۱) وقائع نویس، یا وقائع نگار (۲) سوانح نگار (۳) خفیہ نویس اور (۴) ہرکارسے۔ یہ لوگ تمام ملک کی خبریں لاتے تھے، ان کے افسر اعلیٰ کا عہدہ دار وغہ ڈاک چوکی کے نام سے موسوم تھا، تمام خطوط اور ڈاک اسی کے پاس آتی تھی اور وہ سربمہر حالت میں اُن کو وزیر کی خدمت میں پیش کرتا تھا تاکہ بادشاہ تک پہنچ جائیں، ایک فارسی قلمی تاریخ میں مذکور ہے کہ وقائع ہفتہ میں ایک بار، سوانح اور ہرکاروں کے اخبار، مہینہ میں (؟) ایک بار اور نالہیں رکھکر تحریرات مہینہ میں دو بار وصول ہوتی تھیں، ضروری امور کی اطلاعات ان کے علاوہ ہوا کرتی تھیں، ملک کے مختلف صوبوں سے پائے تخت کو خبریں پہونچانے کے لئے معقول اور مستقل انتظامات ہوتے ہوں گے، کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی تصنیف مرات احمدی مصنفہ محمد علی خاں، دیوان گجرات میں ڈاک کی ترتیب اور باقاعدگی کا مفصل ذکر ہے، اس تصنیف کی رُو سے، صوبہ کا اخبار نویس کے پاس ہر شہر اور ضلع سے اخبار وصول ہوتے تھے شام کو اُس کے پاس تمام اطلاعات جمع ہوجاتی تھیں، اور وہ اونٹ سوار کے ذریعہ سے انکو دربار میں بھیجدیتا تھا۔ سوانح نگار کے دفتر میں افواہ قلمبند ہوتی تھیں، اور صوبہ دار کے ساتھ ہرکارسے بھی رہتے تھے۔ ڈاک کی چوکیوں کا سلسلہ احمد آباد سے اجمیر کی سرحد تک قائم تھا، جہاں ہر چوکی پر، آدمی اور گھوڑے تیار رہتے تھے اور شاہی ڈاک کو سات دن کے اندر شاہجہاں آباد پہنچا دیتے تھے، اسی طرح ڈاک کا ایک اور سلسلہ تھا جو بہروچ ہوکر دکن تک پھیلا ہوا تھا،

کرنل ولکس کا بیان ہے کہ راجہ چک دیو نے جو ۱۶۷۲ء میں تخت نشین ہوا تھا
مسلسل ڈاک رسانی کا انتظام میسور میں کیا تھا، اور وہاں پر ڈاک خانہ صرف خبریں پہنچانے
کا کام نہیں کرتا بلکہ خبریں حاصل بھی کرتا تھا، پوسٹ ماسٹر اور اس کے عملے علاوہ اپنے فرائض
کی انجام دہی کے، حکومت کے معتبر ملازم تھے جو اپنے شہروں کی خفیہ باتوں سے حکومت
کو مطلع کرتے رہتے تھے، حیدر علی کے زمانہ میں تو اس طریقہ کو بہت زیادہ کامیابی ہو چکی
تھی،

ہندوستان میں قرون وسطی میں ڈاک محض سرکاری اغراض کے لئے تھی۔ نجی
کاموں کے ـــ [illegible] نجی خطوط کو خاص آدمی لاتے اور لیجاتے تھے جو مخصوص تجارتی شہروں
میں ملتے تھے، ممکن ہے کہ سرکاری ہرکارے بھی نجی خطوط کو معاوضہ لیکر لاتے لیجاتے
ہوں، نجی خطوط لیجانے والوں کے نام مختلف تھے، کہیں ان کو قاصد کہا جاتا تھا کہیں پتامبر
اور کہیں ہرکارہ۔

پیٹر منڈی کے زمانہ میں (۱۶۲۸ء لغایتہ ۱۶۳۴ء) بازاری قاصد پٹنہ سے آگرہ
تک گیارہ اور پندرہ دن کے درمیان میں خط پہنچا دیتے تھے، اور تیز رفتار قاصد دہلی
سے سورت پندرہ بیس دن میں پہنچتے تھے، گو اسے ماسولی پٹم تک پتامبر بیس دن
میں جاتے تھے۔ ڈاکٹر فرائر کا بیان ہے کہ دکن میں صرف پتامبر پیدل ڈاک لے
جاتے تھے۔

۱۷۱۲ء میں عام ڈاک کا رواج ہوا، نجی خطوط کو کمپنی کے چپراسی (قاصد اور
پتامبر) محصول ڈاک لیکر جاتے تھے، انگریزوں کو ابتدا میں بہت دقت ہوئی۔ اور
مجبوراً قاصدوں کو نوکر رکھنا پڑا، لیکن ۱۶۸۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس اور
بمبئی میں ڈاکخانہ قائم کر دیئے تاکہ سوداگروں اور خود کمپنی کو سہولت ہو، کمپنی کو اپنی
آمدنی میں اضافہ کرنا بھی مدنظر تھا۔ کمپنی کی طرف سے بمبئی میں حسب ذیل ہدایات شائع

ہوئی تھیں" ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح تم بھی ڈاک خانہ قائم کرو، جہاں سے خطوط روانہ ہو سکیں اور جہاں پہونچ سکیں، اور ایک خط کے مقابلہ میں دو اور تین خطوط پر دوگنا اور تین گنا محصول لگاؤ، تاکہ چند سال کے عرصہ میں کمپنی کی آمدنی بہت زیادہ ہو جائے اور سوداگروں کو بہت زیادہ آرام اور سہولتیں حاصل ہو جائیں۔ اس کام کے لئے تم کو مناسب مقامات پر چوکیاں قائم کرنا، اور کشتیوں کا بھی انتظام رکھنا چاہئے تاکہ سورت اور بمبئی کے درمیان میں خطوط باسانی اور بہ حفاظت بھیجے جا سکیں۔ اور توقف بھی نہ ہو" مدراس کو بھی اسی قسم کی ہدایتیں بھیجی گئی تھیں، چنانچہ وہاں پر ۱۷۱۲ء میں ڈاک خانہ قائم اور مختلف مقامات کے درمیان میں خط و کتابت کے سلسلے جاری ہو گئے۔ پہلے مدراس سے بنگال میں خط دو تین مہینہ میں آتا تھا، لیکن اب تیس۳۰ دن میں آنے لگا۔ ابتدا میں جو محصول مقرر ہوا تھا اس کا پتہ نہ چل سکا، لیکن ۱۷۲۰ء میں جو محصول رائج تھا حسب ذیل تھا۔

قلعہ سینٹ جارج سے	وزیگاپٹم کو	چار فانم
" " "	بنگال کو	چھ فانم
" " "	بمبئی اور سورت کو	نو فانم

اس کے بعد کے حالات ہم کو معلوم نہیں، لیکن لارڈ کلایو کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ۱۷۶۶ء میں مستقل طور پر ڈاک کا سلسلہ قائم ہوا، اس کے متعلق جو حکم ہے اس کی سرخی تھی، "ڈاک کے بہتر انتظام کے لئے"، اور حکم تھا کہ آیندہ سے ڈاک گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ کی جائے۔ پوسٹ ماسٹر یا اس کے ماتحت دن رات حاضر رہکر ڈاک کو چھانٹیں اور روانہ کریں، اندرون ملک کے مختلف مقامات کے خطوط کے الگ الگ گڈیاں بنائی جاویں اور تھیلوں میں بھر کر سر بمہر کر دیئے جائیں، مہر کمپنی کی ہو، اور سوائے افسران محکمہ کسی کو ان کے کھولنے کی اجازت نہ ہو، نیز یہ بھی حکم تھا کہ یہی قواعد کلکتہ کو ڈاک روانہ کرتے وقت عمل میں لائے جائیں" بعد کو اور بھی قواعد مرتب ہوئے جن کا مقصد ڈاک کو جلد تر اور زیادہ حفاظت

سے پہنچانا تھا، وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں اور زیادہ ترمیم ہوئی۔ اور سنہ ۱۷۷۴ء میں کلکتہ میں ایک پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر ہوا، اور ڈاک کا ادنیٰ ترین محصول دو آنہ فی سو میل قرار دیا گیا۔ اور تانبے کے دو آنے والے ٹکٹ خاص طور پر مسکوک کئے گئے۔ وارن ہیسٹنگز نے سنہ ۱۷۸۴ء میں ڈاک کے قواعد کو ترمیم کیا اور سنہ ۱۸۳۷ء تک مختلف قسم کے ردوبدل ہوتے رہے، لیکن اس سنہ میں ڈاک کا انتظام گورنمنٹ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محصول لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حدود کے اندر ڈاک پہنچانے کی خود ذمہ دار ہو گئی۔

سنہ ۱۷۷۵ء سے کئی سال قبل مدراس اور بنگال کے درمیان ہفتہ میں دو بار ڈاک کا سلسلہ جاری ہوا تھا، لیکن اب تک مدراس اور بمبئی یا بمبئی اور کلکتہ کے درمیان کوئی مستقل سلسلہ نہیں تھا۔ یوروپین سوداگروں کی عرضداشت کا لحاظ کرکے گورنمنٹ نے مدراس اور بمبئی کے درمیان سنہ ۱۷۸۸ء میں سلسلۂ ڈاک جاری کر دیا جو پندرہ روزہ تھا، حیدرآباد اور پونا ہو کر ڈاک آتی جاتی تھی اور پورے پچیس ۲۵ دن لگتے تھے، سنہ ۱۷۹۰ء میں ہفتہ وار ڈاک کر دی گئی اور راستہ بھی بدل دیا گیا اب ڈاک بمبئی سے ماسولی پٹم اور وہاں سے کلکتہ اور مدراس کو جانے لگی۔ اس طرح وقت میں بھی کفایت ہو گئی اور کلکتہ سے بمبئی چھبیس ۲۶ یوم میں، اور بمبئی سے مدراس سترہ یوم میں اور مدراس سے کلکتہ کو انیس یوم میں ڈاک آنے جانے لگی۔ ڈاکیہ ہمیشہ پیدل چلتے تھے، اُن کا ایک کوچ سات آٹھ میل کا ہوتا تھا، اور چوبیس گھنٹہ میں عموماً ستر میل کی مسافت طے کرتے تھے۔

ڈاک کے محصول کی شرح فاصلہ اور ڈاک کے وزن کے لحاظ سے مقرر ہوتی تھی لیکن ان میں جلد جلد ردوبدل ہوتا رہتا تھا، سنہ ۱۷۸۸ء میں مدراس اور بمبئی کے درمیان میں حسب ذیل شرح تھی۔

ایک خط	عہ ر
دو خط	للعہ ر

تین خط

پارسل پیکٹ کی شرح للعہ اونس تھی ۱ نومبر ۱۷۸۹ء سے کے بعد ڈھائی تولہ تک کی ڈاک کی شرح یہ تھی۔

بمبئی سے پونا تک ۵۲ کوس ۲/
" " حیدرآباد تک ۲۲۲ کوس ۸/
" " ماسولی پٹم تک ۱۳۳۱ کوس ۱۲/

ماسولی پٹم سے مدراس تک ۳۲۲ میل ۳ فانم ۴/
" " گنجم تک ۴۲۸ میل ۴ فانم ۸/
گنجم سے کلکتہ تک ۳۰۵ میل ۵/

ڈھائی تولہ سے ساڑھے تین تولہ تک کے خطوط کی شرح دوگنی تھی۔ ساڑھے تین تولہ سے ساڑھے چار تولہ تک شرح تن گنی تھی۔ ساڑھے چار تولہ سے ساڑھے پانچ تولہ تک چوگنی تھی۔ اور علیٰ ہٰذا القیاس ۱۷۹۵ء میں شرح حسب ذیل تھیں۔

کلکتہ سے	اگر ڈھائی تولہ اور اس سے کم وزن ہو
بارک پور	۱/
راج محل	۳/
پٹنہ	۵/
بنارس	۶/
ڈھاکہ	۳/
چاٹگام	۶/
بمبئی	عہ ۹/
مدراس	عہ ۱۰۲/

ڈھائی اور ساڑھے تین تولہ کے درمیان خطوط شرح ڈبل تھی، ساڑھے تین اور چار تولہ کے درمیان تین گنی تھی اور علیٰ ہذا ۱۸۰۹ء میں شرح میں پھر تبدیلی واقع ہوئی روپیہ سے کم وزن کا خط ایک خط روپیہ اور ڈیڑھ روپیہ کے درمیان وزن ہو تو دو خط، اور ڈیڑھ اور ڈھائی کے درمیان وزن ہو تو تین خط شمار ہوتے تھے۔ ایک خط پر سو میل کا محصول ڈیڑھ قائم تھا، لیکن ۱۸۵۳ء میں فاصلہ کا سوال نظر انداز کر دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی سے قبل وزنی یا رسلوں کے بھیجنے کا بھی قاعدہ مقرر تھا۔ پارسل بھینگیوں میں جاتے تھے اور اس طریقہ کو بھنگی ڈاک کہتے تھے، اور انگلستان میں پارسل کا قاعدہ رائج ہونے سے ایک سو سال قبل ہندوستان میں اس طریقہ کو رواج تھا، ڈاک کی بہ نسبت پارسل کی رفتار کم تھی۔ لیکن اگر گٹھری کو مرمت کے لئے الہ آباد سے کلکتہ بھیجتے تھے تو وہ ایک مہینہ میں بن کر آجاتی تھی۔ فقط

(ترجمہ)

غزل

(مصورِ جذبات حضرت میرزا ثاقب لکھنوی)

اہلِ غم سے عشرتِ عالم کا ساماں ہوگیا
جب زمیں کے داغ اُبھر آئے گلستاں ہوگیا

اپنی حد سے بڑھ کے جاتا کس طرف کوئی مرا
جان پڑتے ہی یہ مُشتِ خاک بیجاں ہوگیا

اتحادِ باہمی کا ہے نتیجہ زندگی
ذرّے کیا شے تھے مگر ملنے سے انساں ہوگیا

مٹ گئے دورِ فلک سے جاں نثاروں کے مزار
آپ کا آباد ویرانہ بیاباں ہوگیا

ایک قطرہ بحرِ عصیاں کا تھا جو یوں سر چڑھا
ملتے ملتے دامنِ عالم میں طوفاں ہوگیا

عشق کے بعد اب حوادث کی ضرورت کیا رہی
آسماں دم لے مرے مرنے کا ساماں ہوگیا

کاروانِ اشک کو میں ڈھونڈنے جاؤں کہاں
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہوگیا

اک بلائے بدتھی ایسی زندگی جو کٹ گئی
زندہ باش اے مرگ دردِ دل کا درماں ہوگیا

زخمِ دل پہلے ہی دامن دار تھا پر حشر میں
موقعِ فریاد پا کر چاکِ داماں ہوگیا

سیرِ عالم کے لئے کچھ چھوڑ اے دستِ جنوں
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہوگیا

سیکڑوں داغوں کے دھبے ہیں وہ جلوے اب کہاں
دل مٹا اور مٹ کے بھی صحنِ گلستاں ہوگیا

حشر میں پہچان کر قاتل کا منہ تکتا رہا
جب ضرورت ہوش کی دیکھی تو حیراں ہوگیا

خفتگانِ خاک کتنا بے محل سوئے کہ اب
مجمعِ احباب اک خوابِ پریشاں ہوگیا

انقلاب آکر مدد دیتے ہیں استعداد کو
کروٹیں بدلیں لہو نے اور انساں ہوگیا

راستہ وحشت کو آخر مل گیا تنگی میں بھی
یہ گریباں تھا جو دو ہاتھوں میں داماں ہوگیا

بلبلو نکلے دل گلوں کے ساتھ مٹی میں ملے
جو چمن اُجڑا وہی گورِ غریباں ہوگیا

دل تو ہے سینہ میں پر جمعیتِ خاطر کہاں
اس کا شیرازہ تو زلفوں سے پریشاں ہوگیا

وسعتِ صحن جہاں کچھ کم نہ تھی اے عشقِ دوست
کیوں گھٹا اتنا کہ دل والوں کو زنداں ہو گیا

باغباں کی رائے میں۔ میں بے حقیقت تھا مگر
بعد میرے آشیاں داغِ گلستاں ہو گیا

رک چلا ہے بیچ میں خنجر الٰہی خیر ہو
دم نہ نکلے گا اگر قاتل پشیماں ہو گیا

ہم کو صحرا نے غباری پیرہن پہنا دیئے
جن کا کچھ ساماں نہ تھا اُنکا بھی ساماں ہو گیا

جب کوئی آنسو مژہ پر آ کے چمکا شامِ غم
میں یہ سمجھا صبح کا تارا نمایاں ہو گیا

شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں
زلف تو سمٹی مگر ہاں دل پریشاں ہو گیا

کم سے کم پر آج راضی ہیں شہیدوں کے مزار
آپ ہنس دینگے تو سمجھیں گے چراغاں ہو گیا

جس میں لاکھوں پھول تھے ثاقب وہ گلشن ہائے ہائے
ایک ہی گردش میں گردوں کی بیاباں ہو گیا

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

کا

"اطاپیہ اردو ادبیات"

میں کی دوسری قسط اپریل کے رسالہ میں
شائع ہوگی۔　　(منیجر شمع)

علما کی صحبت

تقریر جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے، ناظم محکمۂ آثار قدیمہ حیدر آباد دکن
اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر، مورخہ ۶ر نومبر ۱۹۲۶ء میں فرمائی۔

سید جمیل حسن، ایم۔ اے،

جناب صدر انجمن صاحب و معزز حاضرین اور عزیز طالب علموں! آپ کے لایق صدر نے چند روز ہوئے جب وہ بلدے تشریف لے گئے تھے۔ مجھ سے ازراہ کرم فرمایا تھا کہ یورپ کے علمار کی صحبت سے جو اثر میرے دل پر ہوا۔ اُس کا ذکر اِس جلسے میں آپ کے سامنے کروں، اُن علمار کی سادہ اور بے لوث زندگی، علمی تبحر، مطالعے میں انہماک اور تحقیق کا شوق ایسی خصوصیات ہیں جو ہندوستان کے طالب علم کو خواہ اُس نے مغربی طرز کے مدارس میں تعلیم پائی ہو۔ یا ایشیائی مکتبوں اور آشرموں میں پروان چڑھا ہو ضرور عجیب نظر آتی ہیں۔ جب کسی قوم میں انحطاط آتا ہے۔ تو اُس کا معیار علم بھی پست ہو جاتا ہے۔ ناداری اور افلاس کی بلا اخلاق کو خراب کر دیتی ہے۔ معلموں کی اور عام پیشہ وروں کی زندگی میں مطلق فرق نہیں رہتا۔ ذاتی مفاد، تحصیل و تدریس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ اور علمی، تلاش کا حقیقی ذوق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ہمارے بدنصیب ملک کی آجکل یہی حالت ہے۔ مغربی تعلیم حاصل کرنے کی غرض محض کسب معاش ہے۔ اور مشرقی مدارس کی غایت ثواب اُخروی۔ علم کی جستجو محض علم کے شوق کی وجہ سے اس سرزمین میں آجکل عنقا ہے۔ اس تنزل کے اسباب خواہ سیاسی ہوں خواہ معاشی، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ صحیح معنوں میں علمی چرچوں سے ہم نا آشنا ہو گئے ہیں۔ اور تہی دستی اور بد ذوقی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ کہ اگر ہم کسی میں بھولے بسرے یہ شوق دیکھتے بھی ہیں۔ تو ہم کو تعجب ہوتا ہے اور اسکی

غایت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

طالب علم کے دل و دماغ پر استاد کی زندگی اور طرز معاش کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور حقیقی طور سے پوچھئے تو وہ تربیت جو طالب علم کو خود بخود اس اثر سے حاصل ہوتی ہے ۔ وہ قومی فلاح اور کامیاب زندگی کے لئے ایسی تعلیم سے جو امتحانات کے پاس کرنے یا دستار فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے کتابوں کے درس کے ذریعہ سے دی جاتی ہے، بدرجہا ضروری اور لازم ہے ۔ہندوستان والوں کو کیمبرج اور اکسفورڈ یا یورپ کی بعض اور قدیم درسگاہوں میں ایک اور بات جو غیر معمولی نظر آتی ہے ۔ وہ یہ ہے کہ پروفیسر طالبعلموں کو اس طور سے سبق نہیں دیتے جیسا کہ ہماری تعلیم گاہوں میں رواج ہے کہ استاد نے طالبعلموں کو ایسی یادداشتیں لکھادیں جو امتحان میں کارآمد ہوسکتی ہیں اور جن کو حفظ کرکے طالب علم، کامیاب ہوگئے وہاں کے پروفیسروں کا وقت زیادہ تر خود اپنی علمی تحقیقات میں گزرتا ہے، طالب علموں کو بھی مناسب ہدایات دی جاتی ہیں لیکن یہ ہدایات تیار لقمے کی صورت میں نہیں ہوتیں بلکہ اُن کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کن ذرائع سے اور کن کتابوں سے اپنے معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کالجوں میں استاد بجائے بچوں کے دودھ پینے کی عادت کے چھڑانے کے جو ایک خاص وقت تک ضروری ہے اس عادت کو آخری وقت تک جاری رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا طالبعلم ایم۔ اے۔ کے امتحان کے واسطے بھی اُسی طرح اُستاد کی یادداشتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ مدرسے کی ابتدائی جماعات میں تھا۔

میں نے آپ سے ابھی عرض کیا کہ استاد کی زندگی کا طالب علم کے اوپر بڑا اثر ہوتا ہے یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں علمی ترقی کا راز دراصل استادوں کی زندگی اُن کا علمی انہماک اور شغف گرویدہ ایک رباتی ہے جس میں طالب علم خود بخود رنگ جاتا ہے اور حقیقی شوق جو علم کی جستجو کے لئے لازمی ہے اُس میں پیدا ہوجاتا ہے۔ میں اب آپ کو چند اساتذہ سے اپنی ملاقات

کا ذکر سناؤں گا جس سے میرے خیالات اور واضح ہو جائیں گے۔

پروفیسر بیون کا نام آپ نے سنا ہوگا یہ کیمبرج میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ساری عمر عربی لغت کی تحقیق میں صرف ہوئی ہے۔ اور اب اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بدن تپلا دبلا ہے اور مزاج میں زیادہ شگفتگی نہیں۔ اس لئے طالب علم ان کے پاس آنے جانے سے گھبراتے ہیں۔ باہر کم نکلتے ہیں اور زیادہ وقت مطالعے میں اپنی قامت گاہ میں جو کالج کے اندر ہے گذرتا ہے۔ جان مارشل نے جو کیمبرج کے پرانے طالب علم ہیں میرے آنے کے متعلق پروفیسر صاحب موصوف کو لکھ دیا تھا چنانچہ جب میں اُن کی اقامت گاہ پر پہنچا اور دستک دی تو بہت دیر تک کچھ جواب نہ آیا معلوم ہوتا ہے مطالعے میں مستغرق تھے جب دروازہ کھلا تو میں نے اپنا کارڈ شناسائی کی غرض سے دیا اُسے ہاتھ میں لے لیا اور بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا لیکن اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا خیال ابھی مطالعے ہی کی طرف تھا یہ کیفیت کوئی پانچ منٹ تک رہی مجھے اُن کے سکوت کو دیکھکر افسوس ہوا کہ میں نے اُن کو ناحق تکلیف دی۔ آخر میں اُٹھنے لگا یکایک کچھ چونک سے پڑے کہنے لگے۔ بیٹھو بیٹھو، کچھ سُناؤ کیا کیا کرتا ہے کہاں کہاں جاتا ہے؟ میں نے اجمالی طور سے اپنے سفر کی غایت بیان کی اور اسلامی فن تعمیر کی ضمن میں کہیں مسجد کی ابتدا کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے۔ مسجد کا لفظ عبرانی کتابوں میں بھی آیا ہے، اور سریانی زبان میں لفظ مسجد کے معنی تقریباً وہی موجود ہیں، جو اسلام کی اشاعت کے بعد اس لفظ کے عربی زبان میں پیدا ہو گئے۔ پھر اس رائے کی تائید میں اتنے حوالے دیئے اور اتنی دقیق بحث کی کہ میرے فہم سے باہر تھی۔ میں چپکا بیٹھا سُنتا رہا۔ لیکن اُن کے شوق اور انہماک کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور دل میں یہ خیال آیا کہ اے کاش یہ شوق ہمارے ملک کے ہونہاروں میں بھی پیدا ہو جائے۔

اب میں آپ کو پروفیسر براؤن مرحوم کا حال سُناتا ہوں اُن کی عجب شخصیت تھی، دیکھنے میں تو ذرا سے آدمی تھے اور کوز پشتی کا عیب بھی موجود تھا، لیکن جب بات کرتے

تھے تو چہرے سے کمال ذہانت ٹپکتی تھی۔ اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ طبیعت میں انتہا کا انکسار اور حلم تھا۔ اسی وجہ سے طالب علم اور آنے جانے والے اُن کا بہت وقت ضائع کرتے تھے۔ ایشیائیوں کے لئے مہمانی کا دروازہ ہمیشہ کُھلا رہتا تھا۔ میرے آنے کا جب حال معلوم ہوا تو ڈاکٹر بذل الرحمٰن سے جو اس وقت کیمبرج میں تھے کہا کہ اُن کو سیدھا اسٹیشن سے میرے پاس لے آنا۔ دو دن تک مہمانی رہی، پُرلطف باتیں کرتے تھے۔ اِن دونوں بیوی کی علالت کی وجہ سے ذرا طبیعت میں انتشار تھا۔ اور اپنی صحت کی خرابی کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ مسودوں کے بستے دکھائے کہا کہ خدا اِس ذمہ داری کو پورا کرے۔ آنکھ میں چونکہ بے حد لحاظ تھا، اس لئے بعض اوقات چھپ چھپ کر کام کرتے تھے۔

ایران اور اہل ایران کے ساتھ حقیقی عشق تھا۔ اپنے ملک کی نگاہ جب کبھی بدلی ہوئی دیکھتے تھے، فوراً ایران کی بھلائی کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، اُس پرخلوص محبت اور شیفتگی کی وجہ سے سیاسی عہدہ دار بھی اُن کا ادب کرتے تھے۔ سر دولزے ہیگ ایک قصہ سُناتے تھے۔ وہ جب مشہد میں قونصل جنرل تھے ایک شاعر کو ایرانی سلطنت نے غداری اور بغاوت کے جرم میں قید کر دیا۔ شاعر نے پروفیسر براؤن کو عرضی لکھی اور مدد چاہی اُن کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ فوراً سر دولزے کو خط لکھا کہ جس طرح ممکن ہو، شاعر کو چھوڑ ا دو، یہ سمجھو کہ براؤن کا بیٹا قید ہو گیا ہے اور دستگیری کا وقت ہے۔ سر دولزے کہتے ہیں کہ شاعر کے جرم میں مطلق سبہ نہ تھا، لیکن براؤن کی محبت کو دیکھ کر مجھے شاعر کو بغیر رہا کرائے بن نہ پڑی۔

یہ محبت ہی تھی کہ اس فاضل نے ایران کی ادبیات کو اس خوبی سے سمجھا ہے، لیکن باوجود تبحر کے کبھی کسی قسم کی لن ترانی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ شبلی کی تالیف "شعر العجم" کے متعلق فرمانے لگے کہ "یہ ایسے وقت لکھی گئی، جب میں اپنی کتاب بہت کچھ لکھ چکا تھا۔

اور چونکہ یہ اُردو میں لکھی گئی۔ اس لئے اس کے مطالعے میں مجھے بیحد وقت پیش آئی"۔ جب پروفیسر براؤن کے انکسار اور فضیلت کا مقابلہ ہندوستان کے علما ر کے مبلغ معلومات اور تعلّی سے کیا جاتا ہے تو ان حضرات کے حال پر تاسف ہوتا ہے، اور اُن کے تنگ مایگی پر غیر قوم والوں کے سامنے شرم آنے لگتی ہے۔

کیمبرج کے ایک پروفیسر کا ذکر میں اور کروں گا۔ اُن کا اسم گرامی "سر ویم رجوے" ہے۔ یہ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ میں نے اُن کی بعض تنقیدیں پڑہی ہیں۔ خلاف واقعہ باتوں اور غلط بیانی کے دشمن ہیں۔ اور اس قسم کی کمزوریوں پر مصنفین اور مؤلفین کی دھجیاں اُڑانے میں مطلق نہیں چوکتے۔ علم الآثار کے پروفیسر ہیں اور سر جان مارشل کے استاد ہیں۔ پروفیسر "براؤن" نے جب یہ سُنا کہ مجھے "سر ولیم رجوے" سے بھی ملنا ہے، تو پہلے تو بہت تعجب کیا لیکن پھر مسکرا کر چپ ہو رہے۔ کیمبرج میں اس زمانے میں موسم گرما کی تعطیل ہو گئی تھی۔ اور "سر ولیم" اپنے ذاتی مکان میں چلے گئے تھے، یہ لب دریا کیمبرج سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں کشتی میں سوار ہو کر اُن سے ملنے گیا۔ یہ بھی عجیب سیر تھی۔ لیکن اس وقت اس کا ذکر موجودہ مضمون سے متعلق نہیں۔ "پروفیسر رجوے" کا سن ستر سال سے زیادہ ہوگا۔ نہایت بلند قامت ہیں اور ہاتھ پیر خوب مضبوط ہیں لیکن بینائی نے بالکل جواب دے دیا ہے، میرے آنے کی خبر ملی، تو فوراً نکل آئے اور میری پشت پر ہاتھ رکھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے، "مجھے تمہارے آنے سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم میں تیسری پیڑھی نظر آتی ہے "سر جان مارشل" میرے شاگرد ہیں اور تم اُن کے" پھر اُن کی بیوی آ گئیں، اُن سے بھی اسی طرح تعارف کرایا۔ اور ایسی محبت سے باتیں کرتے رہے، جیسے کوئی اپنے بچوں سے کرتا ہے، پھر اپنے گھر کی ایک ایک چیز دکھائی۔ بصارت کی کمی کی وجہ سے چلنا پھرنا دشوار تھا، لیکن میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صحن میں گئے اور ایک دھوپ گھڑی دکھائی، جس کی کچھ تاریخی اہمیت تھی، اس کا سارا حال سُنایا۔

شام کو کھانے کے بعد کہنے لگے کہ مجھ کو ہندوستان کے آثار کے متعلق کچھ معلوم نہیں، سُنتا ہوں وہاں کے فنون لطیفہ میں یونانی اثر غالب ہے۔ تم ہندوستان کے رہنے والے ہو۔ کچھ تم بیان کرو۔ جو کچھ میں کہتا تھا نہایت غور سے سُنتے تھے اور کبھی کبھی سوال بھی کرتے تھے۔ لیکن اس تمام بات چیت میں شفقت کا رنگ غالب تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ دو روز اس صحبت میں عجیب لطف سے گذرے اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اہل علم کے نزدیک شاگرد اور اولاد میں مطلق فرق نہیں، اور یہی گہرا قلبی تعلق ہے، جو علمی ترقی کا راز ہے۔

کیمبرج کے تین پروفیسروں کی شان آپ نے سُن لی، اب تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کو یورپ سے شام میں لیجاتا ہوں۔ بیروت میں عیسائی پاپاؤں کا جو دار العلوم قائم ہے اس سے تو آپ شاید واقف ہوں گے۔ یہاں ایک اُستاد "پاپا شیخو" نامی ہیں۔ اسلامی علوم میں فرد ہیں۔ یورپ کے تمام مستشرقین اُن کا بہت احترام کرتے ہیں۔ عرب کی قدیم تاریخ انہیں خوب معلوم ہے۔ اور چند سال ہوئے فرانسیسی زبان میں مکہ معظمہ کے حالات پر ایک ضخیم کتاب بھی تالیف کی ہے "موسیو پروسٹ"، جو خود ایک زبردست "اثری" ہیں، مجھے "پاپا شیخو" کے پاس لے کر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ خانقاہ میں جہاں پاپا شیخو، اور اور پاپا رہتے ہیں اُسے قلعہ سمجھنا چاہئے۔ ایک برآمدے میں پاپا ٹہل رہے تھے "موسیو پروسٹ" کو آتا ہوا دیکھ کر جلد آگے بڑھے اور فرمایا "دوہرا شکرانہ اور دوگنی مسرت کہ خود بھی آئے اور اپنے ساتھ ایک اور عنایت فرما کو بھی لائے" پاپا شیخو، چھریرے بدن کے ہیں۔ قد میانہ ہے۔ ہونٹ پتلے پتلے اور آنکھیں نہایت روشن بات کرنے میں اکثر مسکراتے رہتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ زہد نے ان میں کسی قسم کی خشکی یا انقباض پیدا نہیں کیا۔ ہم کو اپنے حجرے میں لے گئے، اس میں سوائے پلنگ اور ایک میز اور دو تین کرسیوں کے اور کوئی سامان نہ تھا۔ کرسیاں بھی نہایت چھوٹی چھوٹی

اور ہاتھ رکھنے کے لئے ان میں ڈنڈے وغیرہ نہ تھے، زندگی نہایت سادہ بسر کرتے ہیں
اور تمام وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گذرتا ہے۔ اُن کا حجرہ خانقاہ کی اسی منزل
میں ہے، جہاں کتب خانہ ہے۔ مجھ سے مکۂ معظمہ، طائف، مدینۂ منورہ، وغیرہ کے حالات
پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہم خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اس لئے اکثر لغزش ہوتی ہے۔
مورخ کے واسطے سیاحت اور قدیم مقامات کا دیکھنا ضروری ہے۔ پاپا سے صحبت تو
کوئی دو گھنٹے تک ہی رہی۔ لیکن ان میں میں نے ایک عجب مقناطیسی اثر پایا یا خبر نہیں
وہ اُن کے زہد یا استغنا کی وجہ سے ہے، یا علمی شوق کی وجہ سے، یا طبیعت کی قدرتی
شگفتگی اور سحر بیانی کی وجہ سے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ طالب علم، جن کو ایسے
اُستاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہوگا۔

عزیز طالب علمو! آپ کے صدر صاحب نے مجھ سے فقط یورپ اور بیرونی ممالک
کے اساتذہ کے حالات بیان کرنے کے متعلق فرمایا تھا۔ لیکن میں اس موقع پر ایک
اور عالم کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن کے اخلاق میں گو ہمارے ملک میں رہنے
کی وجہ سے وہ کشش نہیں رہی، جو میں اور اساتذہ کی نسبت بیان کرچکا ہوں۔
لیکن وقت کی قدر، عمل میں احتیاط، اور تحقیق کا شوق، اس درجہ ہے کہ اُن کی
بدولت وہ دنیا کے مشہور و معروف آدمیوں میں سے ہوگئے ہیں۔ ان عالم کا نام سر
آریل ستاین، ہے۔ نسل کے یہودی ہیں، ہنگری کے رہنے والے ہیں، آکسفورڈ،
میں تعلیم پائی، ہندوستان میں آکر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے، اور پھر صوبۂ
سرحدی کے ناظم تعلیمات ہوگئے۔ تحقیق کا شوق آکسفورڈ سے ساتھ لائے، وہاں
پالی اور سنسکرت کا درس لیتے تھے اور وسط ایشیا کے ریگستانوں کی چھان بین
کے خواب دیکھتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد، گو ملازمت کرتے رہے، لیکن دل
بدھ مت کے کھنڈروں کی تلاش کے شوق میں لگا رہا اور تیاری کرتے رہے۔ آخر جب

موقع ملا تو تین دفعہ وسط ایشیا کا سفر کیا۔ پہاڑ اور ریگ چپہ چپہ زمین کی مساحت کی اور علم و فضل، فن و کمال کے وہ خزانے ڈہونڈے کہ دنیا حیران ہوگئی۔ سر آریل سٹائن نہ غیر معمولی طور سے ذہین ہیں، اور نہ بہت بڑے فاضل۔ اُن کی ترقی کا راز وہی صفات ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ وسط ایشیا کی بے آب ریگ سیاحوں کو آگے نہ بڑہنے دیتی تہی۔ اُنہوں نے پہلے سے اندازہ کرلیا کہ منزل مقصود تک پہنچنے میں کتنے پانی کی ضرورت ہوگی۔ رستے کی دقتوں کے لحاظ سے روزانہ کسقدر مسافت طے کرنی چاہئے، آخر ڈیڑہ سو اونٹ برف سے لدے ہوئے ساتھ لے کر کشمیر کے پہاڑوں سے روانہ ہوئے۔ جو رفتار مقرر کرلی تہی۔ اُس میں مطلق فرق نہ آنے دیا۔ بیمار ہوئے، پیر کا انگوٹھا سردی کی شدت کی وجہ سے گل گیا، لیکن بہہ ارادے کا پکا، آگے بڑہے گیا۔ اور آخر ٹھیک اتنی مدت میں جتنا کہ اندازہ کیا تھا اپنی سیاحت کو کامیابی کے ساتھ ختم کیا۔ خود فرماتے تھے کہ چونکہ وقت کم رہ گیا تھا، اس لئے بھائی رام سنگہ کو جو پیمائش کیواسطے ساتھ گئے تھے مینے ایک جانب بہیجا اور خود دوسری جانب روانہ ہوا، تاکہ کام جلد ختم ہو جائے۔ چلتے وقت بھائی رام کو ہدایت کردی کہ جو نظام العمل مقرر کیا ہے، اگر اُس کی پابندی نہ کی گئی تو ہم دونوں ریگستان میں ہلاک ہو جائیں گے۔ کہتے تھے جس روز ہم دونوں ٹھیک اسی موقع پر اور اسی وقت ملے ہیں جہاں کہ ہم نے اندازہ کیا تھا، تو ہماری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

۱۹۱۹ء میں یہ ممالک محروسہ میں تشریف لائے تھے ایک ہفتہ تک مجھکو اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وقت کی قدر اور احتیاط کا حال آپ سُنینگے تو حیران ہونگے وقت پر سوتے تھے، وقت پر اُٹھتے تھے، اور وقت پر کل کام کرتے تھے۔ اور اتفاق سے اگر نظام العمل میں فرق آجاتا تھا تو وقت کو ضائع نہونے دیتے تھے۔ صبح کو چائے پلانے اور ڈاڑھی نہانے کے لئے گرم پانی دینے کا وقت بندھا ہوا تھا۔ ایک روز گرم پانی لانے میں دیر ہوئی۔ یہ فوراً قلمدان کھول، خط لکھنے میں مشغول ہوگئے جل گاؤں کے اسٹیشن

پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ پنجاب میل دو گھنٹے تاخیر سے آئیگا۔ مجھ سے کہنے لگے: معاف فرمانا
میں اپنی یادداشتوں کو صاف کرلوں۔ ورنہ پھر یہ وقت ضائع جائیگا۔ ہر چیز قفل و
کنجی میں رکھتے تھے۔ اور جو کام کرتے تھے، اس کو فوراً اس کی حد تک مکمل کردیتے
تھے۔ اجنتا میں مولوی سید احمد صاحب بھی ساتھ تھے، ہم دونوں بعض وقت
ہنستے تھے، کیونکہ اُنھوں نے ایک ہی غار میں کئی کئی فوٹو لئے لیکن جہاں ایک فوٹو لے لیا،
فوراً صندوق میں کیمرے کو بند کرکے قفل لگا دیتے تھے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد دوسرا فوٹو
لینا ہوتا تھا تو پھر کیمرے کو نصب کرتے تھے اور پھر قفل لگاتے تھے۔ نوٹ بک کا بھی یہی حال تھا
کہ وہ بار بار تھیلے سے نکالتے تھے اور پھر مقفل ہوجاتی تھی۔ میرے عزیز دوستو! وقت کی قدر
اور احتیاط یہی سر آریل اسٹائن کی نمایاں کامیابی کے راز ہیں اور یہ ایسی صفات ہیں کہ ہمارے
ملک میں کم نظر آتی ہیں۔

حضرات! عملی زندگی جو صفات میں نے آپ کے سامنے بیان کیں، یہ طالب علم کی زندگی
میں کایا پلٹ کردیتی ہیں، لیکن ایسی نہیں کہ ہمارے امکان سے باہر ہوں۔ فضل و کمال
کسی خاص قوم کا ورثہ نہیں، کبھی آپ کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ شمالی یورپ کی اقوام کو
جو آج دنیا میں ممتاز ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے میدان میں بلید الذہن، کم فہم اور جاہل سمجھتے
تھے۔ اگر آپ کو میرے بیان میں شبہ ہو تو ابن حزم کی کتاب "الفصل فی الملل والاہوا
والنحل" کو دیکھئے کہ کیا لکھتے ہیں۔ یا ابن سعید کی تصنیف "طبقات الامم" کو ملاحظہ فرمائیے
کہ شمالی یورپ کے باشندوں کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ عروج و زوال
ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں، مایوس نہ ہونا چاہیے، عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی غایت
یہی ہے کہ ہمارے ملک کے ہونہاروں میں علم کا سچا شوق پیدا ہو۔ خدا کی رحمت
ہے کہ اس نے ہم کو ایسا بادشاہ دیا جو علم و فضل کا حقیقی سرپرست اور حامی ہے۔ نصاب
کا تقرر اور طریق تعلیم کی اصلاح ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ترقی کے لئے کوئی امر مانع نہیں

اساتذہ کو چاہئے کہ اپنے نصب العین بدل دیں۔ اور وہ شوق و انہماک دکھائیں جو علم کی شمع برداری کے لئے لازم ہے۔ مستقبل بہت خوش آیند ہے۔ ملک میں سر جگدیش بوس اور رابندرناتھ ٹگور پیدا ہو چکے ہیں، طلبا، اورنگ آباد! تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں، تم ایسے خطے میں رہتے ہو جہاں تمہارے بزرگوں کے کارنامے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ تغلق کی اولوالعزمی، بہمنیوں کی شوکت، مغلوں کی تہذیب اور نفیس ذوق سے اپنے کمہلائے ہوئے دلوں میں روح پھونکو! سالباہن کے قصے اور راجہ کرشنا کی حکایات تمہاری گھٹی میں ہیں۔ اجنٹا کی تصاویر اور ایلورہ کے معابد تمہارے ہی اسلاف کے بنائے ہوئے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہمتوں اور مٹے ہوئے ولولوں کو پھر پیدا کرو! تمہیں ایک اور بڑی خصوصیت بھی حاصل ہے، وہ تمہارے صدر کی پاک اور بے لوث ہستی ہے۔ اس کی بے نظیر زندگی کی تقلید کرو۔ علم کی لو جو اس کے دل کو لگی ہوئی ہے اگر تم نے بھی پیدا کر لی تو بیڑا پار ہے۔

کامیابی کا راز

اپنی اصلاح

از

(جناب حسن عابد صاحب جعفری - اکسن بیرسٹر ایٹ لا - ایڈیٹر شمع)

یہ سلسلہ مضامین شمع میں مستقلاً شائع ہوتا رہے گا - یقین ہے کہ پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا - خیالات اور جذبات کو اکسانے اور اپنی حالت کا انداز ہ لگا کر بہتر بننے کا ولولہ ایک مبارک جذبہ ہے، جس کو قایم رکھنا اور ترقی دینا تعلیم کا اصلی مقصد ہے، افسوس کہ ایسی ہی ضروری باتوں سے ہمارے نوجوان بے خبر ہیں، اور فارغ التحصیل ہو کر بھی اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس سلسلہ مضامین کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

مدیران شمع

اگر دو تین آدمیوں سے آپ کی نہیں بنتی تو ممکن ہے اُن کا قصور ہو۔ لیکن اگر دس بارہ آدمیوں سے آپ کی نہیں بنتی ہے تو یقینی طور پر آپ خطاوار ہیں۔

یہ الفاظ امریکہ کے ایک مشہور عالم نفسیات کی زبان سے نکلے ہیں جس کا مقولہ ہے

کہ دنیا رہنے کے قابل ہے، اور یہاں کی خوشیاں اس لایق ہیں کہ انسان جی بھر کر اُن سے لطف حاصل کرے۔

اگر تین سال کے عرصہ میں آپ دو تین کام یا ملازمتیں یکے بادیگرے کریں، تو ممکن ہے کہ آپ ترقی کر رہے ہوں، لیکن اگر ایک سال کے اندر آپ نے متعدد کام اُٹھائے یا ملازمتیں اختیار کیں اور اُن کو چھوڑ دیا تو واقعی آپ نے غلطی کی،

یہ الفاظ بھی اُسی زبردست عالم کے ہیں، اور آپ کے ذاتی جانچ کے لئے دو اہم سوالات ہیں، ظاہر ہے کہ آپ یا تو اپنے ملنے والوں کو بُرا کہیں گے یا اپنی ملازمتوں اور اپنے کاموں میں نقائص ہونا ظاہر کریں گے۔ لیکن یہ ذرا مشکل ہے کہ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر آپ سوچیں کہ آپ کی ذات والاصفات کتنی برائیوں کی مرکز ہے، اور اسی کی بدولت آپ نے دُنیا میں کتنی ناکامیاں اٹھائی ہیں! کچھ تو آپ کی عادتیں بچپن میں بگڑیں، اور کچھ اُس وقت بگڑیں جبکہ آپ مطلق العنان ہو گئے تھے ہمیشہ آپ نے دوسروں کا دُکھڑا رو دیا، اور ہر کام میں نقص نکالا۔ لیکن آپ کبھی اپنی اصلاح پر بھی متوجہ ہوئے؟ آیئے! آج ہم اس موضوع پر آپ سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں۔ اور دکھاتے ہیں کہ معمولی توجہ اور کوشش سے اس دنیا میں آپ کے کتنے ہمدرد، اور مددگار پیدا ہو سکتے ہیں کہ معمولی اور ملازمتیں آج آپ کو وبالِ جان معلوم ہو رہی ہیں، کسقدر خوشگوار بن سکتی ہیں؟ ہر دلعزیز ہونا یا دوسرے الفاظ میں، اوروں کے ساتھ اچھے اور خوشگوار تعلقات قائم رکھنا ایک فن ہے، اور چونکہ اس کا گہرا تعلق عملی نفسیات سے ہے، اس لئے جواب تک اس مسئلہ پر تحقیقات ہو چکی ہے اس کو ہم عام فہم زبان میں پیش کریں گے تاکہ قارئین شمع جن میں طلبا بھی شامل ہیں۔ ہمارے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تعلقات کو خوشگوار بنا کر قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پہلا اصول اچھی طرح سمجھ لیا جائے،

(۱) فعل انسانی کے متعلق پیشین گوئی کیجا سکتی ہے۔ یعنی آپ پہلے سے رائے قایم کر سکتے ہیں کہ خاص حالتوں میں فلاں شخص سے کس قسم کے افعال ظہور میں آئیں گے! اور یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ فلاں شخص جو کچھ کرے گا اُس کا تعلق آپ سے ہے کہ پہلے آپ کیا کر چکے ہیں؟ مثلاً میں کہوں کہ آپ جھوٹے ہیں، اس کا آپ ایک طرح پر جواب دیں گے، اسی طرح، اگر آپ کی تعریف کروں، تو آپ دوسری طرح پر جواب دیں گے، حضرت سلیمان نے فرمایا ہے کہ" عاجزی کا جواب غصہ کے سوال کو سوخت کر دیتا ہے، باہمی تعلقات کے قیام کا بہت کچھ انحصار اس امر پر ہے کہ ہم اکثر مواقع پر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہماری پیش قدمی کا جواب دوسری ذات سے کیا ملے گا۔ ابھی چند دنوں کا واقعہ ہے کہ میں رسالے کے لئے مضامین چھانٹ رہا تھا، برآمدے میں میرے ایک ملاقاتی ملازم سے ضد کر رہے تھے کہ اُن کی اطلاع کر دی جائے، آواز سُن کر میں نے انہیں بلا لیا۔ اور سمجھایا کہ اس میں ملازم کا قصور بالکل نہ تھا، ایڈیٹری کے فرائض بہت اہم ہیں، اور ملاقتیوں کو مطلق احساس نہیں ہوتا کہ کچہری کے بعد بھی دوسرے لوگ دماغی کام کرنے کے عادی ہیں، وہ معذرت خواہ ہو کر فرمانے لگے "بیرسٹر صاحب! میں تو کام سے آیا تھا! کاروبار کی حالت ابتر ہے، اور گھر کا یہ حال ہے کہ جرمنی کی جنگ میرے ہی گھر میں ہوئی تھی، ہر چیز بے قاعدے ہے۔ نہ گھر میں چین ہے نہ باہر آرام!" یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب سے لفافہ نکالا اور فرمانے لگے کہ اس کو رجسٹری کر کے بھیجتا ہوں، اس پر بھی اگر بیوی میکے سے تشریف نہ لائیں تو آپ نالش کر کے دِلا پانے زوجہ کی ڈگری کرا دیجئے گا، خط میری طرف بڑھا دیا۔ مضمون پڑھ کر میں نے پوچھا "کیا آپ واقعی اس خط کو بھیج رہے ہیں" انہوں نے جواب میں کسی قدر جوش کے ساتھ فرمایا "بیشک!"

وہ خط میں نے اُن کی طرف بڑھا دیا اور کہا "ذرا اس جملہ کو تو بلند آواز سے پڑھیئے" انہوں نے پڑھا "بس اپنی حماقتوں سے باز آؤ۔ غصہ کو بھاڑ چولھے میں ڈالو، اور سوچ کر میں تمہارا

شوہر، تمہارا سرتاج، تمہارا مجازی خدا، تم سے کہتا ہوں کہ بس اب چلی آؤ، تم نے جو کچھ کیا
بہت بُرا کیا، اور میں تمام عمر تمہاری اس سیہ قلبی، ڈھٹائی، اور حکم عدولی کو کبھی فراموش
نہ کرونگا، مگر طول دینے سے کیا فائدہ! میں اب بھی تم کو اپنے گھر میں مثل اپنی بیوی کے
رکھنے پر آمادہ ہوں، اور ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد میں تمہاری خطا کو بھی معاف
کردوں۔"

میں نے دریافت کیا، "کیا جب آپ کی بیوی آپ کے ساتھ رہتی تھیں تو آپ
اُن سے اسی قسم کی باتیں کرتے تھے؟" جواب ملا "ہاں" اگر میں ضرورت سمجھتا تھا تو
اسی قسم کی یا اور قسم کی نصیحت ضرور کرتا تھا، جس کا وہ بہت بُرا مانتی تھیں، اور کئی
کئی دن منہ پھُولا رہتا تھا، لیکن یہ خط تو بہت ملایم ہے، میں نے تو اس میں کچھ بھی نہیں
لکھا ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس بات کو سمجھ لیں کہ میں اُن کا شوہر ہوں اور اُن پر
قرآن، حدیث، تاریخ، اور روایات کی رو سے فرض ہے کہ وہ میرے احکام کو۔" میں نے
اُن کو یہیں روک کر کہا کہ "میں نے آپ کی سب مشیخت پناہی سُن لی، اگر آپ چاہتے ہیں
کہ آپ کے اور اُن کے تعلقات اور خراب ہوں تو بسم اللہ اس خط کو ضرور روانہ کر دیجئے۔ دنیا
میں ایسے ہزاروں شوہر ہیں جو اپنی بیبیوں سے اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں مگر نہیں رکھ
سکتے، وہ ایمانداری سے کوشش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ منجملہ اُنکے ایک آپ ہیں جو
محض اپنی غلطی کے آپ شکار بنے ہوئے ہیں، یہ میں نہیں کہتا کہ آپ کی بیوی فرشتہ
خصلت ہیں مگر دنیا میں بہت سے ایسے کام ہیں جو انسان کو ملتوی کرنے پڑتے ہیں، اس
خط کو بھیجکر آپ اُن کی طبیعت میں اشتعال پیدا کریں اور کیا نتیجہ ہے؟ آپ کو دیکھنا چاہیے
کہ موجودہ حالات کیا ہیں؟ آپ چاہتے ہیں کہ گھر میں خوشی نظر آئے، میاں بیوی میں ہمدردی
اور باہمی محبت ہو، لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض الفاظ کے استعمال سے آپ کی بیوی
کا مزاج مشتعل ہوجاتا ہے، لیکن آپ اُن کو ترک نہیں کرتے۔ ایک شخص بھینسے کو لال جھنڈی

دکھاتا ہے، اور جب بھینسہ حملہ آور ہوتا ہے تو وہ اُسکے اُس فعل کو احمقانہ سمجھتا ہے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ لال جھنڈی کو دیکھ کر بھینسا ضرور حملہ کرے گا، اور وہ اسی وقت جھنڈی دکھاتا ہے جب کہ وہ بھینسہ کو غصہ میں لانا چاہتا ہے، آپ کی بھی بجنسہ یہی حالت ہے"

میں نے دوران تقریر میں اُن کو بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ جب میں تقریر ختم کر چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیکار نہیں گئی، اور انہوں نے دریافت فرمایا "تو پھر کیا لکھوں"

میں نے کہا کہ فرض کیجئے کہ اسی انداز کا ایک خط آپ کی بیوی کا آپ کے پاس آتا تو آپ کے غصہ کی کیا کیفیت ہوتی اور اگر کوئی شخص ہنس کر اور اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہو تو آپ کی کیا حالت ہوتی ہے؟"

حضرت کی سمجھ میں یہ باتیں آگئیں اور جب دوسری مرتبہ ملنے آئے تو چہرہ پر بشاشت تھی اور جیب سے ایک خط نکال کر دیا جو اُن کی بیوی کا جواب تھا اور جس میں اُن لانے کے واسطے بلایا تھا، شکر ہے کہ اب بھی دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، تعلقات زن و شو میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ "ہم دونوں نے غلطی کی"، یہاں تک تو ٹھیک ہے، تعلقات خراب نہ ہونگے، لیکن جب یہ کہا جائیگا "یہ غلطی تمہاری تھی"، تو ہزار عقل اور انصاف برتا جائے، میاں بیوی میں کبھی صفائی نہ ہوگی۔

انسان کا دماغ مشین کی طرح کام کرتا ہے، اور اگر اس کی قابلیت اور اس کی عادت کا علم ہو جائے تو ہم اس کے بارے میں پیشین گوئی بھی کر سکتے ہیں۔ اصول نمبر ۲ یہ ہے۔

"غور سے دیکھتے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس کے جواب میں دوسرا کیا کرتا ہے بالفاظ دیگر مطالعہ کرو کہ تمہارے طرز عمل کا جواب دوسرے کی جانب سے کیا ظہور میں آتا ہے"

اس طفلانہ خیال کو اپنے پاس کبھی نہ آنے دیجئے کہ دوسرے کو کیا کرنا چاہئیے، بلکہ صرف اس امر پر آپ توجہ کریں کہ دوسرا آدمی کیا کرتا ہے، آپ کو حیرت ہوگی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کہہ سکا کریں گے فلاں موقع پر اُس شخص کا کیا طریق عمل ہوگا، اور پھر آپ

اُس کی بہترین صفات سے فائدہ اُٹھا سکا کریں گے۔ اسی اصول کے تحت میں یہ مثال بے موقع نہ ہو گی۔

ایک شخص تھا، اُس خدا کے بندے نے دنیا میں انجن چلانے کے کام سے شروع کر کے مصنف تک کا فرائض کو انجام دینے کی کوشش کی تھی، اور چار پانچ برس کے عرصہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جانا اُس کے لئے معمولی بات رہی تھی۔ ہر جگہ چند دن تو وہ اچھی طرح کام کرتا تھا۔ اور پھر کوئی نہ کوئی ایسی افتاد ہوتی تھی کہ اُسے علیحدہ ہونا پڑتا تھا اُس کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جہاں میں جاتا ہوں میری ہوشیاری اور قابلیت سے وہاں کا منیجر جلے ہو جاتا ہے، میں نے جب اُس کے حالات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص اپنی زبان کا شکار تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے الفاظ سے اُس کے منیجر یا آقا پر کیا اثر پیدا ہو گا۔ جس معاملہ میں اختلاف ہوتا وہ صاف کہہ دیتا کہ تم غلطی کر رہے ہو، حالانکہ اُس کو جاننا چاہئے تھا کہ اس قسم کی گفتگو سے دوسرے کے دل پر کوئی خوش آیند اثر نہیں ہوتا ہے، ایک مرتبہ وہ ایسی ہی مصیبت میں مبتلا تھا اور عنقریب اپنی خدمت سے علیحدہ ہونے والا تھا۔ میرے پاس آیا میں نے کہا کہ تم جاؤ اور جو کچھ تمہارے اور منیجر کے درمیان گفت و شنید ہوئی ہو وہ لفظ بہ لفظ لکھ کر لاؤ۔ میں نے اسی طرح اُسکی دوسری ملازمتوں کے بارے میں بھی سوال و جواب لکھوائے۔ اُن کو دیکھ کر وہ خود قائل ہو گیا کہ حقیقت میں ہمیشہ اُس کی جانب سے غلطیاں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اُس کا علاج یہ تجویز کیا کہ وہ دوسروں کی رائے کی عزت کیا کرے اور اُس کو اپنی رائے پر ترجیح دیا کرے، تین مہینہ کی مشق میں وہ شخص تمام بلاؤں سے نجات پا گیا، اور آج بہت اچھی حالت میں ہے، میری صلاح ہے کہ قارئین شمع بھی ایک ہفتہ یہ مشق کریں اور دیکھیں کہ اس عرصہ میں اُن کو کیسی کامیابی ہوتی ہے۔ اور کتنے دوست پیدا ہوتے ہیں۔

ایک اور مثال لیجئے، ان حضرات کو خود بینی کا مرض تھا، ہر موقع اور محل پر اپنی بزرگی، اپنی بڑائی اور کامیابی کی خواہش رہتی تھی۔ اسی خیال سے اُنھوں نے

مذہب کی آڑلی تھی، ممبر پر بیٹھ کر وعظ فرماتے تھے، بڑے بڑے مجمعے آپ کی تقریر کو سنتے تھے اور آپ ہر جگہ مذہب کے بھیس میں محض ذاتی کامیابی کا کھیل کھیلا کرتے تھے، امر واقعہ یہ ہے کہ کم بخت کو مذہب سے اُتنا بھی شغف نہ تھا جتنا کہ مجھ کو آپ کو ہے، مجھ سے مل کر بھی اُنھوں نے اپنا وہی رنگ اختیار کیا اور مجھے بھی اپنے پاک خیالات سے مرعوب فرمانا چاہا۔ اُن کو شکایت یہ تھی کہ لوگ اُن کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے ہیں، اور بالفاظ دیگر اُن کی خود بینی کو ٹھوکریں لگتی ہیں، اس شخص کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے ایمان تھا، وہ مذہبی آدمی محض اپنے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے بنا ہوا تھا، اُس کا دل مخلص نہ تھا۔ چنانچہ دوسروں کی جانب سے بھی اُس کو غیر مخلصانہ جواب ملتا تھا، اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اخلاص پیدا کیجئے۔ اخلاص کا جواب آپ کو اخلاص ملے گا، یعنی جس طرح برتاؤ آپ دوسروں کے ساتھ کریں گے ویسا ہی برتاؤ وہ آپ کے ساتھ کرینگے۔

جو لوگ اپنے حلقہ میں کامیاب نہیں ہیں، اور لوگ اُن سے خوش نہیں ہیں اُن کو چاہئے کہ تنہائی میں سوچیں کہ "کیا میں ویسا ہی اچھا ہوں جیسا کہ ظاہر کیا کرتا ہوں؟ کیا مجھ میں ظاہرداری نہیں ہے؟ کیا باتیں کرتے وقت مجھ میں تھوڑی سی مشیخت اور خودداری نہیں آجاتی ہے اور میں دوسروں کو مرعوب نہیں کرنا چاہتا ہوں؟" اگر آپ میں یہ عیوب موجود ہیں تو کامیابی کا خواب ترک فرمائیے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہ کثرت ہیں جو طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہیں، لیکن چونکہ وہ اپنی جانچ خود نہیں کر سکتے ہیں اور اس فن سے واقف نہیں ہیں روزمرہ انواع واقسام کی پریشانیاں اُٹھاتے ہیں، اور دنیا اور اہل دنیا کو مطعون کرتے پھرتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی اس قسم کی شکایتوں میں سب سے زیادہ مبتلا ہے۔ اس کی تنگ نظری، اور دل کی کثافت ضرب المثل کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، بہرکیف اسوقت ہمارے سامنے تین اصول ہیں۔

(۱) انسان کے افعال کے متعلق پیشین ہو سکتی ہے (۲) آپ کو چاہئے کہ دوسروں کے

خیالات کو معلوم کریں۔

(۳) آپ ہمیشہ مخلص رہیں اور ظاہر داری کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ نیز ہم کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زیادہ تر پریشانیوں کا باعث یہ ہے کہ لوگ اپنی جانچ خود نہیں کرتے ہیں۔

"نقشہ امتحان عادات کی بابت"

	علی احمد	علی محمد	محمد اختر	محمد بشیر	عبدالستار	یونس رضا	ادیم حسین	علی سیف اللہ	مشهدی	ضامن رضا
جدت	+	=	+	.	+	+	+	=	+	+
رضاجوئی	=	=	−	+	=	−	−	=	=	−
ایمانداری	+	=	=	=	−	+	+	+	=	+
اعتبار	+	−	−	=	−	=	+	=	=	=
قوت ارادی	−	=	−	=	−	−	−	+	−	−
حکومت	+	+	=	+	=	=	=	+	+	=
انہماک	=	−	+	−	−	+	=	=	−	=
ذہانت	−	=	=	−	=	+	=	+	=	+
استقلال	+	−	=	=	+	+	=	=	+	−
سوجھ بوجھ	=	=	+	=	=	+	+	−	=	+
خواہش ترقی	−	+	+	+	=	−	−	+	=	=
ضبط	.	−	−	+	=	=	+	=	−	=

یہ نقشہ ایک شخص نے میری ہدایت سے بنا کر اپنی جانچ کی تھی۔ دس دوستوں کے بارہ صفات کو اُس نے اپنی رائے سے معلوم کرکے لکھا تھا اور پھر اُن سے اپنا مقابلہ کیا تھا، آپ بھی ایک ایسا ہی نقشہ بنائیں اور اپنے احباب کے نام لکھ کر دیکھیں کہ وہ کن صفات میں آپ سے بہتر، برابر، اور کم ہیں، تین نشانات ــ ، = ، + کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دوست آپ سے بہتر، برابر، اور کم ہیں، اس نقشہ میں ۱۲۰ فیصلے ہیں جو آپ کو اپنے احباب کے بارے میں قائم کرکے نشان لگانے ہوں گے، جس شخص نے اس نقشہ کی خانہ پوری کی تھی وہ ۴۲ میں بہتر، ۴۹ میں برابر، اور ۲۹ میں کم تر ثابت ہوا، اگر آپ کے نقشہ میں + کے نشان زیادہ ہوں تو یا تو آپ خودبین ہیں اور اپنے آپ کو "بڑا آدمی" سمجھتے ہیں، یا آپ کے دوست آپ کے احباب آپ کی قابلیت کے مقابلہ میں کم قابل ہیں، اگر آپ کے نقشہ میں ــ کے نشان زیادہ ہوں تو آپ ایسے لوگوں سے مل رہے ہیں جو آپ سے زیادہ قابل ہیں یا آپ میں یہ عیب ہے کہ آپ اپنی خوبیوں کو گھٹا کر دیکھنے کے عادی ہیں، بہرکیف ان دونوں میں سے ہر حالت میں آپ کو نہایت سنجیدگی اور سمجھداری کے ساتھ متوجہ ہونا چاہیے۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ ایمانداری کے ساتھ اپنے نقشہ کو پُر کریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ اُس پر غور کریں گے تو آپ اپنی زندگی کو قطعی طور پر درست کرلیں گے، اور یہ درستی آپ کی کامیابی اور راحت کا باعث ہوگی۔ لہٰذا آپ کا فرض ہے کہ جن صفات میں آپ کو کمی محسوس ہو اُن صفات کو اپنے آپ میں پیدا کریں، اور جن صفات کو آپ اپنے آپ میں پائیں تو پہلے یہ دیکھیں کہ آپ میں واقعی وہ صفات موجود ہیں یا نہیں، اگر موجود ہیں تو اُنکی حفاظت کریں اور اُن کو ضائع نہ ہونے دیں۔

اب میں ایک نوعمر دوست کی مثال پیش کرکے بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی جانچ کس طرح کر سکتے ہیں۔ ان کا فرضی نام نواب ہے، ہونہار، ہوشیار، اور ذہین آدمی ہیں۔ مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ نہایت پریشان تھے، ان کی پہلی شکایت تو یہ تھی کہ اُن کا افسر اعلیٰ خفا

رہتا تھا، دوسری شکایت یہ تھی کہ محکمہ کے کسی شخص سے اُن کی موافقت نہ تھی! اور انھیں وجوہ سے وہ اپنی لیاقت کا اظہار نہ کر سکتے تھے، تین سال کے عرصہ میں نواب نے مختلف قسم کے کام شروع کئے۔ کہیں سے تو وہ برخاست ہوئے اور کوئی کام وہ خود چھوڑ آئے۔ اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی آدمی سے ناراض رہے، یعنی استعفیٰ یا برخاستگی کا باعث یہ ہوتا تھا کہ یا تو محکمہ کے کسی کام ملازم سے ٹکر ہو جاتی تھی یا وہ خود افسر اعلیٰ سے اُلجھ پڑتے تھے، نواب نے جوں توں کر کے تعلیم تو ختم کر لی تھی۔ مگر انکا خیال تھا کہ دنیا بہت بُری جگہ ہے، اور اس میں سخت نقص ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بہت اچھی جگہ ہے صرف ہمارے دوست کی اندرونی دنیا میں نقص تھا، میں نے اُن کی اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا وہ حسب ذیل تھا۔

(۱) پہلے تو میں نے اُن کی ذہنی لیاقت کا اندازہ کیا، کہ وہ کس قسم کی تھی اور کتنے بار کے اُٹھانے کی متحمل ہو سکتی تھی، میری غرض یہ تھی کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ وہ جن کاموں میں ہاتھ ڈال رہا تھا وہ اس کی استعداد سے باہر تھے یا کم تھے، میں نے مختلف قسم کے سوالات کر کے یہ رائے قائم کی کہ جن کاموں کو وہ کر رہا تھا یا کر چکا تھا اُن سے اس کی لیاقت دس گنا زیادہ تھی! یعنی اُس کا کار ہائے منصبی میں اس کے دماغ کا صرف دسواں حصہ صرف ہوتا ہے اور بقیہ نوے حصے شکایتوں اور جنگ و جدال کی نذر ہوتے تھے، چنانچہ اُس نے ایسی خفیف خفیف باتیں سنائیں جن پر وہ لڑ کر یا تو برخواست ہوا تھا یا مستعفی! یہاں یہ نکتہ یاد رہنے کے لایق ہے کہ اگر آپ کو کسی پر غصہ آئے۔ اور آپ تنہائی میں اس کا تصور کر کے دانت پیسنے لگیں کہ بغیر بدلہ لئے ہرگز نہ چھوڑونگا، تو آپ کو چاہیئے کہ آپ اپنی حالت پر ہنسیں، کیونکہ بُرائی کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے، اور آپ اپنا دستور العمل یہ بنا لیں:-

(۲) "میں دنیا میں اگر اور لوگوں کے ساتھ رہکر بسر کرنا چاہتا ہوں تو چاہیئے کہ پُرانے قضیوں کو اور شکایتوں کو فراموش کر دوں"

(۳) نواب میں مجھے ایک اور بات نظر آئی جس کی طرف والدین کو ابتدا سے توجہ

کرنی چاہئے۔ وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور تیز تھا، اور جب دوسرے بچے اس کی بات نہ سمجھتے تھے تو وہ خفا ہوا کرتا تھا بچپن سے یہ عادت ترقی پاتی رہی اور شباب میں بھی رنگ لائی۔ یعنی اپنی ذہانت سے وہ معاملہ کی تہہ پر فوراً پہونچ جاتا تھا، اور اس بات پر خفا ہوتا تھا کہ دوسروں کی سمجھ میں وہ بات کیوں نہیں آئی۔ یہی وجہ محکمہ کے ملازمین اور بعض اوقات افسروں سے بگاڑ کا باعث ہوئی۔ اس مثال سے بھی ہم ایک اور اصول قایم کرتے ہیں۔

"ذہین آدمیوں کو چاہئے کہ وہ سست آدمیوں کے ساتھ صبر اور نیکی کا برتاؤ کریں"

سست ذہن آدمیوں کو اپنی تیزی کے ساتھ کھینچنے میں ان کا دل دُکھتا ہے، غصہ پیدا ہے، اور اکثر رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سست ذہن آدمی فطرتاً مجبور ہے، وہ ذہین آدمی کیساتھ کیونکر سوچ سمجھ سکتا ہے، اس پر خفا ہونا، فطرت سے لڑنا ہے اور سخت حماقت ہے، آپ کبھی دوسروں پر حکومت نہ کر سکیں گے جب تک کہ آپ دوسروں کے دماغی ملکے کے ساتھ ساتھ چلنا نہ سیکھیں گے۔

اب اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نواب کی زندگی سے آپ کو تین سبق حاصل ہوئے۔

(۱) جو کام آپ کریں وہ آپ کی لیاقت سے نہ تو بہت گرا ہوا ہو، اور نہ بہت بلند ہو،

(۲) اپنے دل میں بغض کو جگہ نہ دینی چاہئے۔

(۳) سست ذہن آدمیوں کے ساتھ تیزی نہ کرنی چاہئے بلکہ ان کو ساتھ ساتھ رکھنے کے لئے اپنی رفتار کم کرنی چاہئے، اب اگر علاج کی طرف توجہ کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اپنے آپ کو دوبارہ تعلیم کرنی چاہئے، دوبارہ تعلیم کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

(۱) آپ ایمانداری، صفائی، اور انصاف کے ساتھ اپنا مقابلہ دوسروں کے ساتھ

کرنا سیکھیں۔

نقشہ جو اس مضمون کے ساتھ شامل ہے، آپ کے کام آئے گا، اس کی طرف توجہ کیجئے اور خود بھی ویسا ہی نقشہ بنا کر اپنی قابلیتوں کا موازنہ دوسروں کی قابلیتوں سے کیجئے۔ اور یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے، میری گفتگو نواب سے ہوئی تھی وہ حسب ذیل تھی۔ اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ آپ اپنی جانچ اور دوسروں سے موازنہ کس طرح کر سکیں گے۔

میں ۔ تم احمد علی سے واقف ہو؟

نواب ۔ ہاں، اچھی طرح واقف ہوں۔

م ۔ جو کام وہ کر سکتے ہیں، تم بھی کر سکتے ہو۔

ن ۔ ہاں بہت سے کام کر سکتا ہوں۔

م ۔ وہ کون سے کام ہیں جن کو تم اُن سے بہتر انجام دے سکتے ہو۔

ن ۔ مجھے لوگوں کے نام اور لوگوں کی صورتیں خوب یاد رہتی ہیں، اُن کو نام یاد ہی نہیں رہتے،

م ۔ ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کہ اگر کوئی مسئلہ تمہارے سامنے آئے تو تم بہ نسبت اُنکے زیادہ انہماک اور توجہ کے ساتھ اس میں مصروف ہو سکتے ہو؟

ن ۔ نہیں میری رائے میں اُن کو فضیلت ہے۔

م ۔ خیر۔ مگر یہ بتاؤ کہ علی محمد، اختر، اور بشیر کے مقابلہ میں تمہاری قوت انہماک اور توجہ کا کیا حال ہے؟

ن ۔ میں ان سے بہتر ہوں۔

م ۔ مگر عبد الستار بھی تو ہیں! آپ کہتے ہیں کہ وہ احمق ہیں؟ لیکن آپ اپنا موازنہ اُن سے بھی کیجئے کہ قوت ارادی میں ان کی کیا حالت ہے؟

ن ۔ قوت ارادی میں تو وہ مجھ سے کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ اپنی رائے ذرا مشکل سے

بدلتے ہیں۔

م ۔ اب آپ یہ بتائیے کہ صفائی، سچائی، دیانداری میں کہ اپنے ان احباب سے موازنہ میں آپ کا کیا مرتبہ ہے؟ ایک ایک کو لیکر رائے قائم کیجئے۔ اچھا پہلے دوستداری کو لیجئے۔ ان لوگوں کے مقابلہ میں دوستوں کے ساتھ آپ کی کیا حالت ہے؟ کیا عبدالستار دوستی کو اچھی طرح بناہتے ہیں؟ اور کیا وہ آپ سے بہتر دوست ثابت ہوتے ہیں!

غرض کہ اس طریق استدلال سے نواب صاحب پندرہ میں دوستوں کا موازنہ ہو گیا، اور جو نتیجہ مرتب ہوا، اُس کو دیکھ کر ان کی ہمت بڑھی، اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا، یہی حال ہر شخص کا ہے، اس قسم کی ذاتی جانچ پڑتال سے خود اعتمادی کو ترقی ہوتی ہے، آپ بھی آزمایش کیجئے اور دیکھیے کہ آپ کی حالت میں عظیم الشان فرق نظر آئے گا۔

میری اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک اور اصول اخذ کرتے ہیں یعنی :۔

"دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی قابلیتوں کا صحیح اندازہ ہو اور نیز اپنی کمزوریوں کا"

تعلیم کا اصلی مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ میں روانی پیدا کر دے، اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ آپ اپنی حالت کا صحیح اندازہ کر سکیں، ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم کو اس بات کا علم ہو کہ ہم فلاں کام نہیں کر سکتے ہیں، اور فلاں کام کر سکتے ہیں، اور جب ہم کو صحیح علم ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں، اور کیا نہیں کر سکتے ہیں، اُسی وقت ہم دوسروں سے اپنا موازنہ کر سکتے ہیں، انسان کی زندگی میں اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہیں ہے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ نواب کے پیش نظر اُس کی دو تصویریں ہیں ۔ ایک وہ جس میں اُس کو اپنی دماغی قابلیتیں نظر آتی ہیں، ہم اس کو تصویر ذکاوت کہیں گے ۔ اور دوسری وہ تصویر ہے جس میں اُس کی خصلتیں نظر آتی ہیں، یعنی اس کی قوت ارادی ۔ قوت فیصلہ، قوت اعتبار، قوت ایمان،

وغیرہ وغیرہ جلوہ گر ہیں۔ اس کو ہم تصویرِ خصوصیات کہیں گے، ہم نے نواب کو یہ بھی بتا دیا کہ اُس کی تصویرِ خصوصیات، دوسروں کی تصاویرِ خصوصیات کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد، یعنی یہاں تک پہونچکر ہم کو تصویر آرزو وجذبہ ترقی کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے یہ وہ تصویر ہے جس میں اُس کو آج پانچ یا دس برس آیندہ کی اپنی تصویر نظر آتی ہے انتہائی حیرت کی بات ہے کہ لوگ اپنی پانچ یا دس برس آیندہ کی تصویر قائم نہیں کرتے ہیں اور ذرا تصور سے کام لیکر یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مہینہ، ایک سال، یا دس برس کے بعد کیا ہوں گے اور کیا کرتے ہوں گے۔ اس تصویر کے بنانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان یہ بتا سکے کہ وہ اپنے شوق اور ذوق کے ساتھہ کس کام کو کرنا چاہتا ہے، اور اس انتخاب کام کی وجہ کیا ہے، ان دونوں سوالات کا صحیح جواب لیکر میں بتا سکتا ہوں کہ انسان کو کون کام شروع کرنا چاہیئے جس میں وہ یقینی طور پر کامیاب ہو سکتا ہے، اس موقع پر صحیح مشورہ دینا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ "میں سمجھتا ہوں میں فلاں کام کرسکوں گا" اور "میں واقعی فلاں کام کرسکوں گا" کے درمیان میں بہت فرق ہے، آپ کا خیال ہے کہ آپ یقینی طور پر فلاں کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکیں گے، لیکن جب کام کرنے کا وقت آتا ہے تو آپ کو اپنی غلطی محسوس ہوتی ہے، اگر آپ پہلے سے سوچ کر اور اپنی جانچ کر کے نتیجہ نکال لیتے تو غالباً آپ کبھی ایسے کام کے پاس بھی نہ پھٹکتے جس میں ناکامی ہی ناکامی تھی۔

سنجیدہ اور سمجھ دار آدمی اگر کافی غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ وہ اسی کام کو اچھی طرح کر سکتا ہے جس میں اُس کا دل لگتا ہے اور جس کی طرف اُس کو رغبت ہوتی ہے "رغبت" اور "دل لگنے" کا سوال خاصا پیچیدہ ہے، عام طور پر اگر سوال کیا جائے تو نوجوانوں کی کثیر تعداد "سیر و سیاحت" اور "کھیل و تفریح" کی طرف رغبت ظاہر کرے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ سیر و تفریح کے ذریعہ سے کتنے نوجوان معاش کی مستقل صورت پیدا کر سکتے ہیں، نوجوان

کا فرض ہے کہ وہ سنجیدگی سے سوچیں اور طے کریں کہ واقعی کس طرف ان کی طبیعتوں کا میلان ہے۔ دُنیا کے شور و شعب، محنت، سختیوں اور کام کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اور اپنی طبیعت اور قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے صرف اُسی کام کی طرف راغب ہونا چاہئے جس کو انسان انجام دے سکتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے میں ہم کو اُن کی معمولی معمولی عادتوں اور خصلتوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ بادی النظر میں وہ محض معمولی اور ناقابل لحاظ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو وہ دوسروں کی فطرت ثانی بن چکی ہیں اور اس قدر پرانی ہو چکی ہیں کہ اب اُن سے چھیڑ چھاڑ، پوری جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اسی طرح مجھے ایک اور معاملہ پر بھی چند باتیں لکھنی ضروری ہیں میرا خیال ہے کہ عام طور پر لوگوں کی دماغی حالت اچھی ہوتی ہے لیکن بعض لوگ اپنی ملازمتوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُن کو بتاتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ طریقہ غلط ہے جو کام انسان قوت بازو سے اور اپنے دماغ سے انجام دیتا ہے محنت کرکے روپیہ کماتا ہے وہ قابل عزت ہے اور اگر وہ ذرا توجہ سے سوچے تو اُس کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس عالم اسباب میں جسکی زنجیر کا سلسلہ بہت بڑا ہے وہ ایک کڑی ہونیکا شرف رکھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے کاموں کو یا اپنی ملازمتوں کو حقیر اور ذلیل سمجھے؟

آخر میں مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ

"اگر آپ دوسروں کی زندگی اور اُن کے کام میں دلچسپی لینا شروع کردیں تو آپ کے ہمدرد احباب کی تعداد میں بہت اضافہ ہوجائے گا، مگر آپ اس خیال کو دل سے نکال ڈالیں کہ دوسرے لوگ بھی آپ سے دلچسپی پیدا کریں"، جب تک آپ اس وہم میں گرفتار رہیں گے کہ دوسرے لوگ آپ کی ذات سے دلچسپی پیدا کریں آپ کے احباب کبھی پیدا نہ ہونگے، لیکن جس وقت آپ اس غلطی سے مُنہ موڑکر دوسروں کی طرف متوجہ ہوجایں گے دنیا آپ کے پیچھے پیچھے پھرے گی۔

بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے یہ کہنا کہ آپ اس کو پسند کرتے ہیں شرمناک نہیں ہے اور یہ وہ الفاظ ہیں جن کو بادشاہ سے لیکر فقیر تک سننا پسند کرتا ہے۔

دلچسپی کے معنی یہ ہیں کہ آپ جن لوگوں سے واسطہ رکھیں اُنکی کامیابیوں، اُن کی زندگیوں اور اُن کی ناکامیابیوں میں خلوص اور صداقت کے ساتھ دلچسپی لیں اور اُن سے ہمدردی اور محبت کا برتاؤ رکھیں۔ اور کبھی اس غلطی میں نہ پڑیں کہ جس طرح آپکو اپنے احباب کی فکر رہتی ہے دوسرے آپ کی فکر کیوں نہیں رکھتے ہیں۔ وہ خود بخود آپ کی طرف متوجہ ہوجائینگے، اور بہت جلد آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ صداقت اور سچائی کے ساتھ ہمدردی کرنیکا صلہ دنیا بہت جلد دے دیتی ہے، جو لوگ ان اصول پر کاربند ہوکر دنیا میں رہیں گے وہ دیکھیں گے کہ احباب کی دنیا میں کمی نہیں ہے اور قدم قدم پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کی زندگی کو خوشگوار اُن کے کاموں کو دلچسپ اور اُن کی مشکلوں کو آسان کرسکتے ہیں۔ اور یہی طریقہ ہے دنیا میں کامیابی کا!

(مختار)

غزل

(لسان الملک حضرت محشر لکھنوی)

ہجر میں نیرنگ ہستی صبر سے دیکھا کریں
چار آنسو روکے آنکھوں کو عبث رسوا کریں

وقت نظارہ نظر کے سامنے ہیں سو حجاب
آنیوالے جلوہ گاہ ناز میں آیا کریں

زندگی عشق میں ہنسنا ہے قسمت سے بعید
دل یہ کہتا ہے جہانتک ہو سکے رویا کریں

کوچۂ جاناں سے ہم نکلے تو پھر کیا رہ گیا
اب خدائی بھر کے فتنے سیکڑوں اٹھا کریں

زندگی اور حسرت ایفائے وعدہ روگ ہے
آنیوالے کا کہانتک راستہ دیکھا کریں

مدتوں سے سن رہے ہیں چارہ سازی آپکی
ہم تو جب جانیں مریض عشق کو اچھا کریں

لائیں محشر جلوہ گاہ حسن میں وہ قدرتیں
سامنے آئے خدائی بھر تو اب دیکھا کریں

اب فرمائیے حضرات!

(ترجمہ روسی زبان سے)

از جناب محمد مجیب صاحب (آکسن)

خوب! اب میں شراب پینا بالکل چھوڑ دونگا.... کچھ.... کچھ بھی ہو! اب سمجھ سے کام لینے کا وقت آگیا ہے۔ محنت کرنا چاہیئے، محنت، تنخواہ وصول کرنا پسند کرتے ہو تو ایمانداری سے کام کرو، دل لگاکر، خدا کا خیال کرکے، چاہے نہ آرام ملے نہ نیند ہنسی مذاق چھوڑو.... تمہاری مفت میں تنخواہ لینے کی عادت پڑگئی ہے، اور یہ اچھا نہیں.. اچھا نہیں.......

اسی طرح اور چند اخلاقی سبق اپنے آپ کو دیکر ٹکٹ کلکٹر پودچیاگن نے محنت اور مشقت کرنے کی ایک عجیب خواہش محسوس کی۔ رات کے دو بجے تھے، لیکن اس پر بھی اس نے اور چند ساتھیوں کو جگایا اور انہیں ساتھ لے کر ٹکٹ چک کرنے کے لئے گاڑی کا گشت لگانا شروع کیا۔

"آپ..... کے ٹکٹ......" وہ چلاتا ہے اور ٹکٹ چک کرنے کے اوزار کو خوشی سے ہلاتا جا رہا ہے۔

اونگھتے، گاڑی کے اندھیرے میں لپٹے ہوئے لوگ، کانپتے ہیں سر ہلاتے ہیں اور اپنے ٹکٹ پیش کرتے ہیں۔

"آپ..... کے ٹکٹ...." پودچیاگن نے سکنڈ کلاس کے ایک مسافر کی طرف مڑکر

کہا۔ یہ شخص بہت دبلا ہے، بدن پر سوا ہڈیوں کے کچھ نہیں، کمبل میں لپٹا ہوا ہے اور چاروں طرف تکیے لگے ہیں۔

"آپ کے.... ٹکٹ.....!"

"مسافر کچھ جواب نہیں دیتا۔ وہ نیند میں غرق ہے۔ ٹکٹ کلکٹر اوس کا کندھا ہلاتا ہے اور بے صبری سے کہتا ہے!"

"آپ.... کے..... ٹکٹ!"

مسافر کانپ جاتا ہے، اور آنکھیں کھول کر پودچیاگن پر ایک خوف زدہ نظر ڈالتا ہے۔

"۔کیا؟ کون؟ ہائیں؟"

"۔آپ سے آدمیوں کی طرح کہتے ہیں: آپ کے..... ٹکٹ! ذرا تکلیف کیجئے!"

"اے خدا" مسافر روندھا سا چہرہ بنالیتا ہے۔" اے خدا! مجھے گٹھیا کی بیماری ہے........ تین رات سویا نہیں، جان بوجھ کر (مورفیہ) پھانکا، کہ نیند آجائے..... اور آپ..... ٹکٹ لینے پہونچے! یہ تو ظلم ہے، انسانیت کے خلاف ہے! اگر آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہوتا کہ مجھے نیند کتنی مشکل سے آتی ہے تو آپ اس ذراسی چیز کے لئے مجھے نہ جگاتے...... بے رحمی، بے تکاپن ہے! اور آپ کو میرے ٹکٹ کی کیا پڑی ہے؟ محض حماقت ہے اور کچھ نہیں!"

پودچیاگن سوچتا ہے کہ اس پر خفا ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور یہ ارادہ کرتا ہے کہ خفا ہونا لازم ہے۔

"۔آپ یہاں مت چلّائیے! یہ چنڈوخانہ نہیں!"

مسافر کھانس کر جواب دیتا ہے:۔

"آپ سے تو چنڈوخانہ میں بھی زیادہ بھلے لوگ ملتے ہیں...... اب بتاؤ کہ مجھے نیند پھر کیسے آئے گی! عجیب بات ہے، میں یورپ کے تمام ملکوں میں سفر کرچکا ہوں، وہاں

مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہیں مانگا، لیکن یہاں پہونچتے ہی بس یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں، جیسے کوئی بھوت پریت ان پر سوار ہے، اور اس کے سوا ان کو کچھ نہیں کرنے دیتا!

"جی ہاں، اگر یورپ آپ کو پسند ہو تو وہیں چلے جائیے!"

"حماقت ہے جناب، بس اور کیا کہوں! دھوئیں کے مارے سانس نہیں لیجاتی، ہر طرف سے سرد ہوا آرہی ہے، کیا مسافروں کو یہ تکلیف کافی نہیں؟ اس کے علاوہ کمپنی اپنے تمام قاعدوں پر بھی عمل کرائے گی، خدا اس کو غارت کرے، ان حضرت کو ٹکٹ چاہئے، دیکھئے تو کس دھوم سے ٹکٹ مانگتے ہیں! اور اگر یہ اتنی سختی نہ کرتے تو تو کون اس ملک میں ایسا ایماندار ہے کہ ٹکٹ لے کر چلتا!"

"سُنئے جناب، اگر آپ شور مچانے اور دوسرے مسافروں کو دق کرنے سے باز نہ آئیں گے تو میں آپ کو اگلے اسٹیشن پر اتار دونگا اور آپ پر عدالت پر دعوی کرا دونگا!"

"یہ تو عذاب ہے!" چند لوگوں سے نہ رہا گیا، بول اُٹھے "بیمار آدمی سے کھڑا ٹر رہا ہے! بات سمجھو جی اور جھگڑا ختم کرو!"

"مگر دیکھئے تو وہ خود بُرا بھلا کہہ رہے ہیں"، پوداچیاگن ذرا ڈر کر کہتا ہے۔ بہت اچھا، میں ٹکٹ نہیں لوں گا .... جیسا آپ چاہیں .... لیکن دیکھئے تو، آپ کو خود معلوم ہوگا کہ میں اسی کام کے لئے نوکر ہوں اگر میرا فرض نہ ہوتا تو .... آپ کا جی چاہے تو اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لیجئے .... جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے۔

پوداچیاگن کندھے ہلا کر بیمار کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھتا ہے کہ اُس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور اُس کی بے عزتی ہوئی ہے۔ لیکن اس کے بعد جب وہ دو تین ڈبوں سے گذر چکتا ہے تو اس کے ٹکٹ کلکٹری سینہ میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور اپنی حرکت پر پشیمانی۔

— بہت اچھا ہیں.... ہیں، جیسا آپ چاہیں، معافی مانگ لوں گا..... لیجئے......

آدھے گھنٹے کے اندر پوچیاگن، معافی مانگنے کا ایک فقرہ، جس سے مسافر خوش ہو جاتا اور اوس کی اپنی ہتک بھی نہ ہوتی سوچ کر اسی درجہ میں پہنچا۔

"جناب! —" وہ بیمار کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

"سنئے جناب!"

بیمار کانپ جاتا ہے اور گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"کیا ہے؟"

"میں اس کو.... کیا کہوں؟.... آپ خفا نہ ہوجئے......

"ارے پانی دو، پانی — بیمار ہانپ کر دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہے — تیسری ٹریا پھانکی تھی اور...... پھر! اے خدا یہ عذاب آخر کب دور ہوگا؟

"میں اوسے..... آپ معاف کریں گے......

"سنئے..... آپ مجھے اگلے اسٹیشن پر اُتار دیجئے گا....... مجھ سے اور نہیں برداشت ہو سکتا.... میں مر رہا ہوں......

"کیا ذلیل، کمینی حرکت ہے" حاضرین میں سے چند نے کہا۔ "چلئے، دور ہو جئے! اگر پھر ایسا مسخرہ پن کیا تو اس کی سزا ملے گی! چلئے!"

پوچیاگن ٹھنڈی سانس بھر کر درجہ سے باہر نکل آتا ہے۔ ریلوے کے ملازموں کا جو درجہ ہے اس میں آکر بیٹھ جاتا ہے، اور شکایت شروع کرتا ہے۔

"اب فرمائیے، حضرات پبلک! آپ کو بھی خوش کرنے کی کوشش کا کیا نتیجہ ہوتا ہے! اور کیا خدمت کی جائے! جی بھی نہ چاہتا ہو تب بھی سوا اس سب جھگڑے کے لات مارنے اور مست ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں...... کچھ نہ کرو — خفا ہوتے ہیں، کچھ کام شروع کرو، تب بھی خفا ہوتے ہیں...... بس پیو،

اور کیا!"

پوچیاگن ایک سانس میں آدھی بوتل پی جاتا ہے اور محنت، فرایض اور ایمانداری کے پھندے میں نہیں پڑتا۔

(چیخوف)

کتب بغرض ریویو

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو ہمارے پاس آئی ہیں جن کی رسید شکریہ کے ساتھ پیش کیجاتی ہے عنقریب ان سب کتابوں پر ریویو کیا جائے گا:-

باقیات فانی - دیوان جناب فانی علیگ۔ وکیل اٹاوہ ۱ر

ہندو تہواروں کی اصلیت منشی رام پرشاد صاحب بی۔اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ ۹؎ ۱ر

دور ایام - تاریخ ریاست ٹونک کا دوسرا حصہ۔ امیر الانشاد بیر الملک مولوی سید علی اصغر صاحب ناظم نیا ہیڈ ٹونک ۸؎

دُر الیتیان - سید محمد حمید صاحب۔ اسٹیشن روڈ نام پلی حیدر آباد دکن ۸؎ ۱ر

التبذیر حقیقۃ الرسوم - مولوی محمد عبدالشکور صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۸؎ ۱ر

یتیم حصہ اول حصہ دویم (افسانہ) مولوی فیاض علی صاحب بی۔اے علیگ وکیل فیض آباد ۱ر

مرآۃ البرار - مسئلہ استرداد بہار پر تنقید و تبصرہ سید مبین الرحمن صاحب بی۔اے ال۔ال بی وکیل نولہ۔ بہار۔ ۱ر

مخزن توفیق - ابتدائی تعلیم کے لئے۔ محمد حمید اللہ صاحب کتل منڈی حیدر آباد دکن ۳؎ ۱ر

تنقید بر قواعد اردو - از مولوی محمد عبدالغنی صاحب ایم۔اے۔ پتہ:- پروفیسر عبدالقوی صاحب ایم۔اے فانی۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱ر

تذکرہ رحمۃ للعالمین (یعنی زمانہ میلاد حصہ اول و دوم)۔ مولینا حبیب حسین ساکن ردولی شریف۔ پتہ:- ... عبدالرزاق تاجران نواب بازار ڈاکخانہ ومقام قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی۔ ۲؎ ۱ر

ہملیٹ - شیکسپیر کا ناٹک، مترجمہ مولوی امتیاز علی صاحب بی۔اے وکیل فیض آباد پتہ:- منشی اصغر علی مکان جناب مترجم محلہ مغل پورہ شہر فیض آباد۔ مجلد ۱۲ر غیر مجلد ۸ر

منیجر شمع

کفایت شعاری

از

(جناب سید امیر حیدر صاحب تجنت اکبرآبادی)

مداوائے تذلیل و درمانِ خواری — کفایت شعاری کفایت شعاری

بکار آیدت داشتہ اے برادر — جو دامے نداری تو جامہ نیاری

"جو پیسہ بچایا وہی پیسہ پایا" — یہ اک قول[1] ہے لاکھ تولہ بھاری

لئے منہ میں ننھے سے ریزے کو چیونٹی — وہ دیکھو چلی جا رہی ہے بچاری

اگر تم پس انداز کچھ کر سکو گے — سدھر جائے گی زندگانی تمہاری

کفایت کو تم بخل ہرگز نہ سمجھو — نہیں آجکل دولت و تاجداری

اگر خرچ آمد سے زائد کروگے — تو سوکھے گا دریا جو ہے آج جاری

سکھاتا ہے انسان کو صرف بیجا — جوا، رہزنی، جعل، چوری، چکاری

کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا پر — عمل کیجئے۔ ہے یہ فرمان باری

بشر کو مناسب نہیں صرف بیجا — ہے شایانِ شان خاک کو خاکساری

نکالوگے پاؤں جو چادر سے باہر — تو بے چادری تم کو کر دیگی عاری

زمانہ ہے بیزار اگر زر نہیں ہے — ہے سب سو ہے زر کا زور اور زاری

اگر تم نے پہنا ہے دھاری کا کرتہ — تو راجہ نہ سمجھاؤ تم راجدھاری

یہ دریائے عالم فریب آشنا ہے — جو آدھی کو چھوڑو تو جاتی ہے ساری

---

[1] انگریزی مثل ہے ۱۲۰

ہے جو بے ایمانی کی اسراف بیجا — کفایت شعاری ہے ایمانداری

شمار آمد و خرچ کا گر نہ رکھا — عجب کیا جو ہو نوبت دم شماری

مناسب ہے پابندِ اوقات رہنا — کہ ہے وقت کھونے میں تذلیل و خواری

تباہی نہ لو سر پہ عیاش ہو کر — کہ بے سود ہے ایسی یاروں کی یاری

تم اندھے رہوگے دمِ واپسیں تک — جو تیرِ نظر کا لگا زخم کاری

بھروسہ رہے زور بازو پہ اپنے — نہ کام آئیں گے یہ سلاری مداری

کفایت ہو عادت مشقت ہو شیوہ — اگر دل میں ہے عزم مقصد براری

کرو کام اپنا یہ دن کام کے ہیں — جوانی میں کیوں خواب غفلت ہو طاری

جو پیدل چلوگے تو طاقت بڑھیگی — نہ ہو تم نہ پابندِ شوق سواری

ضعیفی میں پھر آپ پچھتائیے گا — اگر کھیل میں نوجوانی گزاری

جوانی میں تم خواب غفلت سے چونکو — ضعیفی میں بے سود ہے آہ و زاری

جو آپ اپنا یار و مددگار ہوگا — کریگا خدا اوس کی بے شبہ یاری

فقط عرض احوال ہے اہل دل سے — نہ یہ شاعری ہے نہ مضمون نگاری

اثر تجھتِ ناداں کی باتوں میں کیا ہو

نہ عالم، نہ مفتی، نہ واعظ، نہ قاری

(مسلسل)

مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر

از
(حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع)

تاریخ پیدائش

ز دولت خانۂ نواب منصور
۱۱۴۴ھ

برآمد آفتاب از مطلع نور
۱۱۴۴ھ

۱۷۵۴ء میں چوبیس سال کی عمر میں بمقام فیض آباد تخت نشین ہوئے۔ وہ زمانہ نواب کے لئے پر آشوب تھا۔ اسمٰعیل بیگ خاں کابلی کا دور دورہ تھا۔ افواج اس کے قابو میں تھیں اور محمد قلی خاں، برہان الملک مرحوم کے بھتیجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی۔ کابلی چاہتا تھا کہ نواب کو برائے نام اختیارات دیے جادیں اور وہ خود سلطنت پر حاوی رہے، اسی زمانہ میں ہمت بہادر گوشائیں نے ایک کھتری عورت محل میں پہنچادی۔ کھتریوں میں واسے ویلا مچ گئی اور افواج کو موقع مل گیا۔ بادشاہ دہلی بھی نواب سے منحرف تھے، اس لئے افواج نے فوراً محمد قلی خاں کو طلب کرلیا۔ اس فتنہ کا دفیہ نواب کے قابو کا نہ تھا، مگر ان کی والدہ نواب بیگم نے کمال

دانشمندی سے برافروختہ اور بدظن سرداروں کو راضی کرلیا۔ محمد قلی خاں طلبی کی خبر پاتے ہی چل کھڑا ہوا، آدھے رستہ میں اُس کو اطلاع ملی کہ سرداروں کی کشیدگی رفع ہوگئی ہے اور اُس کو الہ آباد واپس جانا چاہئے۔ چونکہ وہ نصف راہ طے کرچکا تھا اور احتمال تھا کہ واپسی کی اطلاع جب نواب کو پہونچے گی تو وہ مشکوک ہونگے اس لئے ارادہ فسخ نہ کیا بلکہ اشتیاق قدمبوسی کا عذر پیش کرکے نواب کی خدمت میں چلا آیا۔ اسمٰعیل بیگ کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ دہلی نواب عمادالملک کے ہاتھوں تنگ آکر لکھنؤ چلے آئے۔ نواب نے ساتھ لاکھ نقد اور ہاتھی اور گھوڑے نذر کئے۔ مگر بداندیشوں کے مشورہ سے متاثر ہوکر بادشاہ نے محمد قلی خاں کو وزارت اودھ کا جائز امیدوار تسلیم کرلیا اور اُس کو اپنے ہمراہ لیکر تسخیر بنگالہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ محمد قلی خاں کو بادشاہ کی کمزوریوں کا اور اُن کی بدرعبی کا جب علم ہوا تو گھبرایا اور اُن سے رخصت ہوکر لکھنؤ چلا آیا۔ اُس کو خوف تھا کہ نواب ناراض ہوکر اُس کی جاگیر کو ضبط اور اُس کے بیوی بچوں کو قید کرلیں گے۔ نواب ان معاملات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ محمد قلی خاں گرفتار کرلیا گیا اور جلال آباد کے قلعہ میں بند کردیا گیا۔ ایک دن نواب، احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں گئے ہوئے تھے، بدخواہوں کو موقع مل گیا، اور محمد قلی خاں کو ہلاک کرکے کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہیں اُس کی قبر بنی جو بعد کو اُس کے ورثا کی زیارت گاہ ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد نواب کی زندگی میں بعض مشہور معرکہ آرائیاں ہوئیں۔

(۱) ۱۱۷۳ھ میں نواب نے نجیب الدولہ نواب خاں کے ساتھ شریک ہوکر مرہٹوں کو شکست دی۔

(۲) احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شریک ہوکر پانی پت کا میدان مرہٹوں کے مقابلہ میں سر کیا۔ اس جنگ میں اسّی ہزار مرہٹے کام آئے۔ اور احمد شاہ ابدالی ہندوستان کا چند روزہ بادشاہ بن گیا۔ ۱۱۷۵ھ میں اُس نے نواب کو خلعت وزارت سے سرفراز کیا۔

(۳) ۱۱۸۰ھ میں نواب نے بُندیلوں کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر بل بعد تعلقہ دار کی بغاوت کا حال معلوم کر کے بغیر جنگ کئے ہوئے، مہوبہ سے واپس چلے آئے۔

(۴) امیر الامرا احمد خاں بہادر غالب جنگ بنگش رئیس فرخ آباد کے خلاف ۱۱۷۸ھ میں فوج کشی کی۔

(۵) ۱۱۷۸ھ کے آخر اور ۱۱۷۹ھ کے آغاز میں انگریزوں سے نواب نے مقابلہ کیا۔ اور میجر ایچ منرو کی زیر کمان ۱۳ مئی ۱۷۶۴ء کو بکسر میں شکست کھائی۔ نواب لکھنؤ اور فیض آباد ہوتے ہوئے بریلی پہونچے، اور پٹھانوں، افغانوں اور مرہٹوں کو جمع کر کے ایک مرتبہ پھر انگریزوں کے مقابلہ میں آئے۔ لیکن بریگیڈیر جنرل کارنک کے زیر کمان انگریزی افواج کے ہاتھوں پھر شکست فاش کھائی۔ اور فرخ آباد میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ نواب کی زندگی میں یہ وقت سب سے زیادہ سخت گذرا۔ اور اُن کی خودداری کا خون ہوگیا۔ کیونکہ انکو جنرل کارنیک کے پاس جانا پڑا اور الہ آباد کے صلح نامہ پر دستخط کرنے پڑے جس کی رُو سے (۱) کڑا اور الہ آباد نواب سے چھین کر شاہ عالم ثانی کے اخراجات کی مد میں دیدیئے گئے (۲) نواب کو اپنی سلطنت میں انگریزی گماشتوں اور سوداگروں کو بغیر روک ٹوک اور بلا مزاحمت تجارت کی اجازت دینی پڑی، اور (۳) پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا، نواب کے پاس بہ مشکل تمام دس لاکھ کی مالیت تھی۔ اعیان حکومت اور احباب سے امداد کا طالب ہونا پڑا، مگر کسی نے دل کھول کر نواب کا ساتھ نہ دیا۔ البتہ اس موقع پر اُن کی ناموس اور رفیق زندگی بہو بیگم نے وہ کام کیا جو بلحاظ شرافت اور بلحاظ رفاقت مشرق کے لئے مایۂ ناز ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنی کل جائداد۔ اور اپنا کل نقد و زیور فروخت کر کے نواب کو دے ڈالا۔ صلاح کاروں نے منع بھی کیا مگر انہوں نے جواب دیا "اگر نواب زندہ سلامت رہے تو یہ سب انہیں کا ہے، اور اگر خدانخواستہ وہ نہ رہے تو یہ چیزیں میرے کس کام کی"

کہا جاتا ہے کہ بہو بیگم نے اپنی ناک کی کیل تک بیچ ڈالی تھی۔ غرضکہ اس طرح پر چالیس لاکھ روپیہ کی کمی پوری ہو گئی۔ لارڈ کلایو نے بورڈ کے نام اپنے خط مورخہ ۱۱ جون ۱۷۶۶ء میں نواب کی صادق الاقراری کی تعریف لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ نواب کی دوستی کا اس کو کامل یقین ہے اور یہ دوستی انگریزوں کے لئے از بس مفید اور قابل اعتبار ہے۔

انگریزی گماشتوں اور سوداگروں نے نواب کے سلطنت میں طرح طرح کے مظالم کئے جن کی وجہ سے تنگ آکر نواب کو گورنر جنرل سے شکایت کرنی پڑی اور وہ لوگ سلطنت سے خارج کر دیئے گئے۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد کمپنی کو سخت نقصان کا احساس ہوا، اور وارن ہیسٹنگز نے نواب سے مل کر زبانی گفتگو کے ذریعہ سے دوبارہ انگریز گماشتوں اور سوداگروں کے لئے اجازت حاصل کرنی چاہی۔ مگر نواب نے صاف انکار کر دیا اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا دیا کہ اگر وہ لوگ آئے تو ان کے اور کمپنی کے درمیان میں مصالحت قائم نہ رہ سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وارن ہیسٹنگز کو سخت مایوسی ہوئی۔

بنارس میں ۸ ستمبر ۱۷۷۳ء کو نواب نے ایک اور صلح نامہ پر دستخط کر دیے اور ایک بریگیڈ کے اخراجات یعنی مبلغ اکیس ہزار کی ادائگی منظور کر لی۔ اور کڑہ اور الہ آباد کے واپسی کے لئے پچاس لاکھ روپیہ دینا قبول کر لیا۔ بیس لاکھ اسی وقت انگریزوں کو ادا کر دیئے اور پندرہ لاکھ ایک سال اور بقیہ پندرہ لاکھ دو سال کے بعد ادا کرنے کا اقرار کر لیا۔ نواب نے روہیلوں کی امداد مرہٹوں کے خلاف کی تھی اور روہیلوں نے چالیس لاکھ روپیہ نواب کو دینا طے کیا تھا مگر مرہٹوں کی شکست کے بعد وہ انکاری ہو گئے تھے۔ نواب نے کمپنی سے امداد چاہی اور چالیس لاکھ روپیہ کا وعدہ کر کے انگریزوں کی فوج لے کر روہیلوں پر حملہ کر دیا ۱۰ اپریل ۱۷۷۴ء کو نواب رحمت خاں روہیلوں کا سردار توپ کے گولہ سے قتل ہو گیا اور اسی روز نواب کی فوج کے ہاتھ میدان آ گیا۔ اور روہیلہ مقبوضات کے بڑے حصہ پر نواب قابض ہو گئے۔

چندماہ کے بعد نواب کی طبیعت خراب ہوگئی اور ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ء کو فیض آباد میں بعمر پنتالیس سال انتقال ہوگیا۔ ان کی ہڈیاں دہلی بھجوا دی گئیں اور وہیں حضرت شاہ مرداں میں جہاں ان کے اور عزیز بھی دفن تھے، سپرد خاک کردی گئیں۔

نواب نہایت وجیہ، قوی اور دلیر آدمی تھے۔ نواب بہو بیگم سے تمام عمر خوش رہے، آیندہ ماہ میں نواب بہو بیگم پر مفصل مضمون شمع میں شائع ہوگا۔ نواب روزانہ علی الصباح اپنی افواج کی قواعد کا معائنہ کرتے تھے، اور صبح اور دوپہر کو سلطنت کے امور کو انجام دیتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کا عہد حکومت کئی وجہ سے قابل لحاظ ہے۔ بالخصوص انگریزی پالیسی کے مدارج اور انکی کیفیتوں کا انکشاف نہایت واضح طور پر ہوتا ہے۔ اور یہیں سے سلطنت اودھ کی بربادی کا آغاز ہوتا ہے۔

چونکہ شمع کے صفحات بسیط اور مشرح حالات کے متحمل نہ ہوتے اس لئے واقعات کے اظہار کرنے میں حتی الوسع اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ فقط

تبصرے

فرہنگ اصطلاحات علمیہ

انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد دکن کی توجہ اور جناب مولوی محمد عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ علیگ سکریٹری انجمن مذکور کی علمی کوششوں اور اُن کی دماغی کاوشوں کی داد نہ دینا حقیقت میں اردو زبان پر ظلم ہے۔ جو گرانمایہ علمی خدمت مولوی صاحب سے ظہور میں آرہی ہے اس کا جواب نہیں وہ اُردو کے مسیحا ہیں۔ انہیں کی توجہ کی برکت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات علمیہ چھپ کر تیار ہو گئی۔ پوری کتاب پانچ سو صفحات سے زیادہ حجم کی ہے۔ اور کم وبیش بیس بائیس مضامین کی علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ ہے۔ علم ہیئت، علم نباتات، اقتصادیات، حکومت ہند، آئینی حکومت، تاریخ انگلستان۔ تاریخ یونان۔ منطق۔ جبر ومقابلہ۔ ہندسی مخروطات، ہندسہ مجسمات، علم مثلث، تفرقی مساواتیں، علم سکون۔ مابعد الطبیعات۔ نفسیات۔ طبیعات۔ سیاسیات۔ آثار قدیمہ، وغیرہ کی اصطلاحات کے ترجمے ہمارے یہاں نہ تھے، اور اگر کہیں پر کچھ ترجمے ہوئے تھے تو وہ شخصی کوششوں کا نتیجہ تھے اور چونکہ ہر شخص نے اپنی طبیعت کے مطابق ترجمے کئے تھے اس لئے ایک ہی لفظ کے مختلف ترجمے ہو گئے تھے جو اصطلاحات کے اعتبار سے سخت مضر تھے اور پڑھنے والوں کو چکر میں ڈال دیتے تھے۔ ضرورت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات کو عام طور پر رواج دیا جائے اور مترجمین کا فرض ہے کہ اصطلاحوں کے ترجموں کو قبول کریں، یا اگر وہ بعض اصطلاحات کے خود ترجمے کریں تو جب تک انجمن ترقی اردو اُن کو قبول نہ کرلے استعمال نہ کریں۔ فرہنگ اصطلاحات علمیہ مکمل نہیں ہیں۔ جن مضامین کی طرف توجہ کی گئی ہے خود انکی بعض اصطلاحات ترجمہ ہونے سے رہگئی ہیں۔ اسی طرح ابھی دیگر متعدد مضامین سے ہاتھ نہیں لگایا ہے لیکن اچھا ہوا کہ جو کچھ مسالہ تیار تھا شائع کردیا۔ بقیہ ترجموں کی خاطر موجودہ مواد کو روک

سکتا مناسب نہ تھا، بلکہ ترجمہ کرنے والوں کے حق میں مضر ہوتا۔ دیگر مضامین اور اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ جغرافیہ۔ فلسفہ، سائنس وغیرہ وغیرہ کی اصطلاحات جلد شائع کیجائیں گی۔ اور اس عرصہ میں نقد و تبصرہ و دیگر ذرائع سے جو معلومات بہم پہونچی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھاکر فرہنگ کا ایک ضمیمہ بھی شائع کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بعض اصطلاحات کے ترجمے دقیق اور ثقیل ہیں۔ جہاں کہیں عربی کے ثقیل اور سخت الفاظ آئیں اُن کو ترک کرنا بہتر ہے اور اُن کے بجائے چھوٹے الفاظ، یا اصل اصطلاحات کو حتی الوسع ہند کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مغربی علوم کو اصل زبان میں پڑھنا آسان ہو اور طبیعت پر زیادہ بار نہ پڑے، البتہ عربی اور فارسی یا سنسکرت کی اصطلاحات جو ثقیل نہیں ہیں اُن کے اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ وضع اصطلاحات کا کام کرتے وقت یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اصطلاحات اُن لوگوں کے لئے بنائی جا رہی ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے، سنسکرت یا عربی نہیں ہے۔ یقین ہے کہ اس تنقید کو نیک نیتی پر محمول کیا جائیگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اعتراض کر دینا بہت آسان ہوا کرتا ہے۔ لیکن اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ اور اس کام کے کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کوہ کندن و کاہ بر آوردن،، کے کیا معنی ہیں۔

بہرکیف فرہنگ اصطلاحات کی اشاعت ایک مہتم بالشان کام تھا جو مستعدی اور عرق ریزی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب اور کارکنان انجمن دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انگریزی اصطلاحات بائیں جانب اور انکا ترجمہ داہنی جانب چھپا ہے۔ قیمت صرف ۱۲؎ ہے، ہم اس کی خریداری کے لئے پرزور سفارش کرتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کے لئے تو یہ کتاب ازبس ضروری ہے۔

مذاکرات (سال اوّل)

ہمارے دوست سید ہاشمی صاحب فریدآبادی جوان ہیں، انکا دل جوان ہے اور

اور قلم بھی جوان ہے، جہاں اتنی جوانیاں جمع ہوں، وہاں جو کام ہوگا اس پر شباب کی کیفیت ہوگی اور اس میں قوت و توانائی کی دلکشی ہوگی۔

"مذاکرات" حیدرآباد کی ایک جدید انجمن یک سالہ محنت کا نتیجہ ہے، اور زرد جلد کے اندر وہ مضامین ہیں جو انجمن میں پڑھے گئے تھے، کاغذ نفیس لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ جلد بندی قیمتی اور خوش وضع مضامین بہت اچھے، لکھنے والے مستند، غرض مذاکرات کی ظاہری نمایش سے طبیعت شگفتہ، اور اس کی باطنی خوبیوں سے روح مسرور ہوگئی۔ یہ انجمن قائم رہے گی؟ اس کا جواب تو وہی دے سکیں گے جو حیدرآباد میں رہتے ہیں۔ مگر رسالہ کی خوبیوں مضمون نگاروں کی لیاقت اور خود جناب ہاشمی کی توجہ کو دیکھتے ہوئے تو امید پڑتی ہے کہ وہ بڑا کام کرے گی اور اس میں ہر سال بہتر سے بہتر مضامین پڑھے جائیں گے،

مذاکرات سات مضامین کا مجموعہ ہے تاج الماثر پر سید ہاشمی صاحب نے اور تحفہ سامی، اور جاویدان خرد پر، نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی نے تبصرے تحریر فرما کر انجمن میں پڑھے تھے۔ ان کی ایک غزل بھی ہے جو بہت خوب ہے، جاپان پر ہمارے محترم دوست نواب مسعود جنگ بہادر کی انگریزی نثر کا ترجمہ ہے۔ شمع میں ہم کئی بار جاپان کے متعلق آپ کے خیالات قارئین کرام تک پہونچا چکے ہیں۔ یہ مضمون بہت لطیف ہے۔ نظریہ اضافیت پر ڈاکٹر مظفر الدین صاحب کا مضمون ہے جو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اُستاذی جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ کا مضمون جغرافیہ اندلس بہت دلکش، دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ آپ نے جغرافیہ اندلس کے متعلق جو تحقیقات کی ہے وہ قابل تعریف ہے اور ہم آن کی بے مثل کتاب جغرافیہ اندلس کی اشاعت کے منتظر ہیں۔ مذاکرات کی جلدیں عام طور پر قیمتاً فروخت نہیں ہوتی ہیں، لیکن قدر دانوں تک پہونچانے کے لئے عام قیمت ہے۔

پتہ:- جناب معتمد صاحب مجلس مذاکرہ۔ دارالترجمہ حیدرآباد دکن

جلال الدین خوارزم شاہ

مترجمہ جناب مولوی سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے

اردو زبان پر سید صاحب موصوف کا احسان ہے کہ اُنہوں نے اُس میں ترکی لٹریچر کے بیش بہا نمونے پیش کئے، اور غالباً سید صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے اہل ہند کو ترکی لٹریچر سے روشناس کرایا۔ جودتِ طبع، اور جدتِ طرازِ تحریر کے لئے وہ کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے مضامین اور ترجمے برسوں سے خراجِ تحسین حاصل کر رہے ہیں، اور مدت تک ہماری زبان میں موجود رہیں گے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ آپ نے ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے مرحوم کے ایک عدیم المثال تاریخی، ڈرامے کا اردو میں ترجمہ فرمایا تھا۔ اور ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیج گیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ طویل علالت کے باعث ہم ابتک اس مسرت بخش فرض کو ادا نہ کر سکے۔

ہمنے دورانِ علالت میں ترجمہ کو کئی بار پڑھا۔ اور اب بھی پیش نظر ہے، ہر مرتبہ اس کے مطالعہ سے طبیعت کو نیا لطف آیا۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں یہ ترجمہ ایک نعمت ہے، طبائع انسانی، اور نفسیاتی کیفیات کی جیتی جاگتی تصویر کو اُردو میں ہو بہو اُتار لینا، ادبی کارنامہ ہے جس کے لئے لائق مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں، چنگیز خاں کے خونیں دور میں جلال الدین بادشاہ، حمیت اسلام، اور غیرت وطن سے متاثر ہو کر وہ تمام باتیں کرتا ہے جو سر فروش مسلمان، جاں باز سپاہی، اور غیور بادشاہ کے شایانِ شان ہوتی ہیں، عہد قدیم میں شخصی دغا، اور فاتحانہ بے باک حملوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا معمولی کام نہ تھا۔ سپاہ کی فراہمی، بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں اس کے جوش کو قائم رکھنا، بیوی بچوں اور ذاتی آرام کی مفارقت، طرح طرح کی مصیبتیں اور سب سے زیادہ یہ کہ نفسانی اغراض کے لئے نہیں بلکہ محض مذہب وطن اور ملت کی خاطر، ان سب کو برداشت کرنا، نہایت سبق آموز باتیں ہیں،

واقعات کی تفصیل، ادبی مختلف جذبات، اور مواقع کی ترجمانی اور مصوری کے لطیف نمونے اسی ڈرامہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب نوجوانوں کے مطالعہ میں رہنی چاہیے اور نصاب میں داخل ہونی چاہیے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے حجم ۲۸۰ صفحے قیمت ۱۲؍
پتہ:- سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

غذائے روح، بالتصویر

شری مدبھگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر کا منظوم ترجمہ پنڈت پربھودیال صاحب مصرعاشق لکھنوی نے کیا ہے حجم ۱۲۰ صفحے۔ قیمت ۸؍
قابل مترجم نے ایک بسیط دیباچہ کے ذریعہ سے بتایا ہے کہ بھگوت گیتا کی تعلیم تارک الجزا ہے اسی رعایت سے ترجمہ کا نام غذائے روح، ہے۔ انھوں نے یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ بھگوت گیتا تارک الدنیا ہونا سکھاتی ہے بلکہ اس کا مقصد ہے کہ دُنیا میں رہو، لیکن اس کی (دنیا کی) محبت میں گرفتار ہوکر اپنی حقیقت اور دُنیا میں آنے کی غرض و غایت، کو نہ بھولو۔ اور سچی محبت سے اپنا قلب پروردگار عالم کو نذر کردو۔ لائق مترجم نے کوشش کی ہے کہ سنسکرت کے ایک شعر کا ترجمہ اردو کے ایک شعر میں کیا جا۔ جابجا حواشی دیکر اور آخیر میں مشکل الفاظ کے معنی لکھکر شاعر نے تصنیف کو مفید بنادیا ہے۔ شروع میں بھگوت گیتا کا خلاصہ سلیس عبارت میں ہے تاکہ ناواقف بھی ترجمہ کو بخوبی سمجھ سکیں۔ البتہ شاعر نے ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کرنے کی قید عائد کرکے اپنے اوپر ظلم کیا ہے بعض مقامات تو بالکل تشنہ معلوم ہوتے ہیں اور اُن کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ وہ چاہتے تو ترجمہ کو زیادہ شگفتہ بناسکتے تھے۔ مگر خود عاید کردہ قیود توڑنی پڑتیں۔ اسی قسم کی اور قابل قدر سنسکرت تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ اور ادبی اور علمی خدمت ہو۔ اخیر میں مترجم کا عکس ہے۔ جابجا بلاک کی تصویریں ہیں جن کا تعلق نفس کتاب سے ہے۔

پتہ :- پنڈت پربھو دیال صاحب مصر، عاشق لکھنوی - عرائض نویس - عدالت دیوانی - لکھنؤ۔

دشینت وشکنتلا المعروف بہ مثنوی سحر

(از اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی)

چھوٹی تقطیع پر ۶۰ صفحے کی نظم ہے - جناب سحر نے ہندوستان کے سحر نگار شاعر کالی داس کے مشہور قصہ موسومہ شکنتلا کو اردو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے، ابتدا میں منشی دیا نرائن صاحب نگم اڈیٹر زمانہ کانپور کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس کے بعض حصے بہت پاکیزہ ہیں۔ مثلاً "شکنتلا کا نام زبان پر آیا اور پردۂ تصور پر ایک تصویر کھنچ گئی - کیسی شگفتہ - کیسی درد انگیز، حسن اور شباب کا ایک لبھانے والا خواب، پھول کی طرح نازک اور پتی کی طرح کمزور۔

ہرا بھرا جنگل، ندی کا شاداب کنارا، کنول کے پھولوں کا کنج - ہرنوں کی کلیلیں، چڑیوں کی خوشنوائیاں، شہد کی مکھیوں کے نغمے اور ہوائے معطر کے جھونکے، ان دلفریبیوں کے بیچ میں شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ کنول کے بھورے پتے پر، راجہ کو خط لکھتی ہے - کتنا دلفریب تخیل ہے .... شکنتلا ایک عورت ہی سغر کی - درد کی - میٹھے الاپ کی - اس میں سیتا کی روحانیت نہیں - ساوتری کا استقلال نہیں - دمن کا صبر نہیں - وہ ایک کمزور ہستی ہے - تناور درخت نہیں جس پر ہوائیں اثر نہیں کرتیں - وہ ایک شاخ ہے جو ہواؤں سے ہلتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے - یہی اس کا جوہر ہے اسی نے اسے دلکش بنا دیا ہے۔"

پہلے بھی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں ہوا تھا، لیکن مترجم کی ہندو معاشرت کی ناواقفیت نے اصلی رنگ کو قائم رکھنے سے معذور کر دیا تھا - لیکن جناب سحر نے قصہ کی وطنیت کو بدرجہ اتم قائم رکھا ہے۔

منشی صاحب کا خیال ہے کہ "دربلاغت اور روانی بیان اور حسن ترکیب کے

اعتبار سے مثنوی سحر گلزار نسیم سے لگا کھاتی ہے "۔ ہمارا خیال ہے کہ منشی صاحب کا یہ جملہ حسن مروت اور اخلاق پر مبنی ہے۔ روانی اور حسن بندش کے لحاظ سے گلزار نسیم بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یعنی اک طفل تھا نمودار، جیسے کہ صدف سے دُرِ شہوار
تھا حسن میں اک کمال خوبی تھا جسم میں اک مثال خوبی
تسکیں جو ہوئی سکنتلا کی ممنون تھی بخشش خدا کی

سختی غم فراق سہتی، محبوس تشددات رہتی
سکھیوں کو بھی رو کے کہہ سُناتی کہہ یاہ کا ماجرا سُناتی

مثنوی دلکش ہے۔ اور شاعر کی فکر کا دلپذیر ثبوت ہے۔ بعض اشعار نہایت آبدار ہیں۔ اور کئی موقعے ایسے ہیں جہاں تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے یقین ہے کہ مثنوی مقبول ہوگی۔ قیمت غالباً ۸ ر ہے۔

ملنے کا پتہ :- زمانہ بک ایجنسی کانپور

مُصباح القوافی

مصنفہ سید محمد نقوی السرسوی صاحب متخلص بہ سید۔ حجم ۱۶ صفحہ قیمت ۳ر

پتہ :- مولوی سید زین العابد صاحب نقوی محاسب محکمہ عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں تمام القاب حروف و حرکات قافیہ اور ان کے تعریفات مستند اہل فن کی تصانیف سے ماخوذ کر کے نظم کئے ہیں۔ طرز قدیم ہے مگر لایق مصنف اور شاعر کی محنت قابل داد ہے کہ ۶۸ اشعار میں کل مسائل بیان کردئیے۔ معمولی توجہ سے

ان پر عبور ہو سکتا ہے اور محتاط شاعروں کے لئے ضروری ہے۔ اگر حواشی اور ضروری نوٹ دیدیئے جاتے تو رسالہ زیادہ مفید اور دلچسپ بھی ہو جاتا۔

ساربان حجم ۳۵ صفحے قیمت ۴ر۔ نورِ ہدایت حجم ۳۱ صفحے قیمت ۴۔ ارمغان عرب حجم ۳۰ صفحے قیمت ۴ر۔ پیمانِ وفا۔ حجم ۲۶ صفحے قیمت ۵ر۔ امانت حجم ۲۲ صفحے قیمت ۳ر۔ خطِ تقدیر حجم ۵۵ صفحے قیمت ۶ر

یہ چھ رسالے ایم اسلم صاحب کی تصنیفات ہیں اور نسیم بک ڈپو بارودخانہ بازار۔ لاہور۔ سے مل سکتے ہیں۔

ساربان = حضرت عمر کے عہدِ خلافت کا ایک دلچسپ اور مُوثر قصہ ہے۔ اور حقیقت میں مصنف نے خوب لکھا ہے۔

نورِ ہدایت = میں حضرت سرورِ کائنات کا ایک صحابی جلیبب شہید کا پاکیزہ کریکٹر دکھایا ہے۔

ارمغان عرب = میں حضرت عمر کے سوانحی حالات لکھ کر ایک بدو عرب کی دلچسپ حکایت ہے اور اسلام کے بعض ضروری اصول بیان کئے ہیں۔

پیمانِ وفا۔ ایک رقت انگیز تاریخی قصہ ہے جس میں عہد و پیمان پر قائم رہنے کی خوبیاں دکھائی ہیں۔

امانت = خلیفہ ہارون رشید کے عہد کا واقعہ ہے جس میں ایک لڑکے کے عاقلانہ فیصلہ کا ذکر ہے۔

خطِ تقدیر = گذشتہ جنگ یورپ کی ایک دلچسپ، پُر درد اور سبق آموز داستان ہے جسکا تعلق حبِ وطن، ایثار، اور انسانی ہمدردی سے ہے۔

افسوس ہے کہ ہم ان رسائل پر جلد تریویو نہ کر سکے۔ ہم نے ان سب کو پڑھا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ طرزِ بیان صاف اور سلجھا ہوا

ہے۔عبارت سلیس اور مؤثر ہے۔طریق تصنیف سبق آموز ہے۔ناصحانہ اور استادانہ نہیں ہے جو بسا غنیمت ہے۔لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے یہ سب رسالے کار آمد ہیں۔اور اس لایق ہیں کہ والدین خرید کر اولاد کو، اور استاد طالب علموں کو انعام کے طور پر تقسیم کریں توقع ہے کہ آیندہ اڈیشن میں نظر ثانی سے عبارت کی بعض خامیاں دور ہو جائیں گی۔ مثلاً ساربان میں صفحہ ۸ اپر ہے "طیور.......... درختوں پر بیٹھے بیٹھے کر ٹکڑ مچا رہے تھے" صفحہ ۱۹ پر ہے "ایک استعمال شدہ کرتا زیب بدن تھا" "چہرہ انوار ایمانی سے نورانی نظر آتا تھا" "پھٹی ہوئی جوتیوں کا جوڑا پڑا تھا" وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہ غلطیاں اس قسم کی نہیں ہیں کہ رسالوں کی قدر و قیمت کو گھٹا دیں۔

بہشتی جھومر یا اسباق النسواں

(مصنفہ محمد مرزا خاں صاحب دہلوی۔حیدر آباد دکن)

لایق مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستانی خواتین نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اب بجائے قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں سبق دینے کے اُن کی اخلاقی کمزوریوں سنجیدگی سے بحث کیجائے، اور ان کے نقائص اُن کو دکھائے جائیں تاکہ وہ اپنے معائب سے واقف ہو کر چپکے ہی چپکے اپنی اصلاح کرتی رہیں۔یہ رسالہ اس مضمون کی پہلی قسط ہے جس میں لڑکی کے سسرال جانے کے بعد اُس سے جن جن کمزوریوں کا ظہور ہوتا ہے ان میں سے چند کی تشریح کردی گئی ہے۔رسالہ میں چار سبق ہیں، اگر مقبول ہوا تو مصنف صاحب دوسرا حصہ بھی جلد شائع کریں گے۔

مصنف نے اپنے خیالات کو صفائی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔البتہ عبارت ذرا دقیق ہے جو معمولی لکھی پڑھی لڑکیوں کو مشکل معلوم ہوگی۔مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کا مطالعہ

بہت کچھ فائدہ بخش ثابت ہوگا سسرال جانے سے قبل اور سسرال پہونچ کر ہر تعلیمیافتہ لڑکی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ کچھ انگریزی داں شوہر یا بیبیاں مصنف کے بعض خیالات سے اتفاق نہ کریں تاہم بہت سی باتیں سیکھنے کے قابل ملیں گی۔ جن پر عمل کرکے راحت مل سکے گی۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ہیں حجم ۲۰ صفحے۔ قیمت صرف ۱۰/
چند جلدیں دفتر شمع میں موجود ہیں اور منیجر صاحب سے مل سکتی ہیں۔

صنف نازک

(مصنفہ جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب بسمل)

لائق مؤلف کا بیان ہے ”دیوں دیکھنے کو آپ اس کو ایک مختصر سا مجموعہ کہدیں گے لیکن اس کے فراہم کرنے میں اور ترتیب دینے میں اپنی عمر کا بہترین حصہ اس کی نذر کرنا پڑا۔ دنیا کی ہر زبان کے شاعرانہ خیالات سے خوشہ چینی کرنی پڑی۔ کہیں سے پتی لی تو کہیں سے پھول، کہیں سے تنکا لیا تو کہیں سے رنگ و بو، تب کہیں یہ گلدستہ سدا بہار تیار ہوا۔“

مؤلف کے یہ الفاظ تعلی پر نہیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور خدا معلوم انہوں نے ان جواہر ریزوں کو جمع کرنے اور بہترین اصلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کیا کیا زحمتیں اٹھائی ہونگی۔

صنف نازک بجائے خود ایسا نازک موضوع ہے اور اُسکی دلپذیری ایسی عالمگیر ہے کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونا ظلم ہے، چونکہ جذبات کی تخلیق اور صنف نازک کی مداحی فطری باتیں ہیں۔ اسلئے صنف نازک کی خوبیوں سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے، انکی تعریف کرنا شاعر کا کام ہے، ان سے قلب کو منور کرنا عارف کا کام ہے۔ اور انکی کمزوریوں کو الم نشرح کرنا مذہبی اور فلسفی دل و دماغ کو مبارک رہے یہ روگ طبائع انسانی کے بس کا نہیں، عورت پھول سے زیادہ نازک، تصویر سے زیادہ دلکش، موسیقی سے زیادہ مترنم، فلسفہ سے زیادہ سکون بخش،

دولت سے زیادہ راحت رساں، اور عزت سے زیادہ قابل قبول نعمت ہے، آپ اُس کی کمزوریوں کو دیکھنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں۔ اور اُس کی قوت انتقام یا زبان کی درشتی کو کیوں آمادہ عمل کرتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ اُس کی کمزوریوں کو آمادہ انتقام بنا لینا اور نقصان اُٹھانا مرد کے لئے واجبی سزا ہے کیونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، اور یہ صفت اُس سے کسی عمر میں جدا نہیں ہوتی۔ اُس کا وجود شیریں ہے بھائیوں سے پیار، باپ سے الفت، شوہر سے محبت، اولاد سے شفقت، ہمسایہ سے مروت، اُس کے فطری خوبیاں ہیں، وہ بہترین مونس اور غمخوار ہے حقیقی رازدار ہے، اور حاضر و غائب یکساں جاں نثار ہے۔ مرد کے لئے زیبا ہے کہ اُس کی صفات سے روحانی مسرت اور سکون حاصل کرے، نہ کہ اُس کی دل آزاری اور تخریب کے درپے ہو،

مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے تقریظ، اور مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے نے دیباچہ پرلطف انداز میں لکھے ہیں۔ لائق مؤلف نے جہاں صنف نازک کی خوبیاں بتائی ہیں وہاں اُن کی کمزوریاں بھی گنوا دی ہیں تاکہ مرد اُن کی صفات پر فریفتہ ہو، اور اُن کی کمزوریوں کی زد سے بچا رہے۔

حجم تقریباً ۸۰ صفحے، لکھائی چھپائی دلکش، اور جلد خوبصورت ہے، صنف نازک کا ایک فوٹو بھی ہے، قیمت ۱۲؍

پتہ:- مصنف بیرون- دبیر پورہ- حیدرآباد- دکن

سرورِ عالم

(مصنفہ مولوی عبدالمجید صاحب۔ دارالتصنیف۔ کپورتھلہ)

مولوی عبدالمجید صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اُنہوں نے جناب سرور کائنات کی مقدس سوانحعمری ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ لکھی ہے، تصنیف بذاتہ مختصر ہے لیکن سرورِ عالم کی حیات کے تمام ضروری پہلو موجود ہیں، اسوۂ حسنہ کو پیش کرکے دوسروں کے

لئے ایک بیش قیمت نمونہ پیش کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ نبی اور بشر ہونے کی حیثیتوں
سے سوانح دکھائی جائیں۔ بلاد عرب کا نقشہ ہے اور کوہ حرا کی عکسی تصویر بھی دیگئی ہے۔
کوہ حرا کے متعلق مولوی صاحب نے لکھا ہے "جس کے دیکھتے ہی دیار حبیب کی ایک نمایاں
خصوصیت سامنے آجاتی ہے اور انسان عالم تصور میں اس سرزمین میں جا پہونچتا ہے جہاں
کوہ حرا کی چوٹیاں اور اس کے گوشہ ہائے عزلت، ایسی خاموش و ساکن زبان کے ساتھ
جس سے زیادہ کوئی زبان بلند آہنگ نہیں ہوسکتی، دنیا کو بتاتے رہیں گے کہ یہی وہ گھاٹیاں
ہیں. یہیں وہ غار ہے، جہاں سے سادہ مگر چونکا دینے والا پیغام آیا۔
"یا محمد انت رسول اللہ" اور جس نے زمانہ کی ظلمت کو عالم افروز نور سے بدل دیا۔
ان مقامات کے تصور سے ہی انسان، روح نواز کیفیتوں اور کیفوں میں ڈوب جاتا ہے اور
دل روحانی طمانیت کے بار سے تھرتھرانے لگتا ہے"، کتاب میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ
عیسوی بھی دیا گیا ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔ قیمت صرف بارہ آنہ۔

موصوف نے چھوٹا رسالہ "انا بشرہ" بھی تصنیف کیا ہے۔ اور کیا خوب لکھا ہے کہ "رسول
عربی کے اسوۂ حسنہ جو دنیا کے لئے بمنزلہ متاع عمومی کے ہیں۔ بنی نوع انسان کے لئے روحانی اور
دنیوی زندگی کا بہترین نمونہ ہیں جب یہ بات ہے تو یہ نمونہ اس قابل ہے کہ ہر وقت ہمارے
سامنے رہے"۔ اس خیال سے لائق مصنف نے رسول کی حیات کے مختلف شعبوں پر چھوٹے
چھوٹے رسالے لکھنے ارادہ کیا ہے۔ اور یہ رسالہ اس زنجیر کی پہلی کڑی ہے جو بچوں کے لئے
نہایت مفید ہے یقین ہے کہ صاحبان مقدرت اس کو خرید کر مکتب کے لڑکوں، اور عزیز رشتہ
داروں اور دوستوں کے بچوں کو مفت تقسیم کرینگے۔ حجم ۳۲ صفحے قیمت صرف ۱ر جو کچھ بھی نہیں
ہے۔ مصنف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتا ہے۔

جناب ... ٹھاکر دت شرما صاحب موجد امرت دھارا کی تیار کردہ

چند ادویات متعلقہ خوبصورتی

ابٹن جیت موہنی

اس ابٹن کو لگانا کیفیت استعمال کرنے سے چہرے کے داغ کیل چھائیاں وغیرہ دور ہو جاتی ہیں چہرے کی رنگت دن بدن نکھرتی جاتی ہے اور جھریاں نہیں پڑتیں
قیمت ایک روپیہ نمونہ ۲ /

مصالحہ پان

پان کھانے والے اصحاب کو سفر میں جہاں پان نہیں ملتا از حد تکلیف ہوتی ہے اسواسطے یہ مصالحہ بنایا گیا ہے ایک پان پر تھوڑا سا رکھ لیجئے پان تیار ہے ویسے ہی رنگ و مزا دے گا اسکے علاوہ یہ بوئے دہن کو دور کریگا اور مساکین بڑھا دے گا
قیمت ایک روپیہ نمونہ ۲ /

گولی پان

وہ لوگ جو پان کھا کر پیک منہ میں ڈالنے بغیر پان کا مزا لینا چاہتے ہیں وہ ان گولیوں کو کھا دیں ایک گولی منہ میں رکھنے سے پان کا مزا بھی آویگا اور رنگ بھی باقی اوصاف مصالحہ پان جیسے ہیں
قیمت ۶۰ گولی ایک روپیہ نمونہ ۳ /

دل سندری حسن افزا کریم

غسل کے بعد استعمال ہوتا ہے یہ ایک قسم کا روغن ہے جو چہرے کو چمکاتا ہے اور داغ کیل وغیرہ دور ہو کر چہرہ صاف ہو جاتا ہے غسل سے پہلے ابٹن اور غسل کے بعد حسن افزا استعمال ہو تو بس کہنا کیا ہے
قیمت ۱۲ / نمونہ ۴ /

بال دور کرنے کی دوائی

(بال عمر بھر نہ اگیں)

اس دوائی کے استعمال سے بال عمر بھر نہیں اگتے ہیں بالوں کو صاف کر کے لگایا جاتا ہے اس سے آئندہ بال نکلنے موقوف ہو جاتے ہیں۔
قیمت ڈیڑھ روپیہ نمونہ نہیں ملتا

باغ پھول تیل

بالوں پر تمام تیلوں کا سرتاج ہے بالوں کو سیاہ نرم و ملائم کر بناتا ہے اور بڑھاتا ہے سر کو ٹھنڈا رکھتا ہے صرف خوشبودار ہی نہیں بلکہ دماغ کیلئے مفید ہے!
قیمت ایک روپیہ

شیریں حسن کریم

یہ دوائی صرف چہرے کی چھائیوں کیواسطے ہے اس سے تمام چھائیاں دور ہو جاتی ہیں قیمت ۲ روپے نمونہ ۸ /

مکھ رعنائی کریم

جسم بڑھانے کا تیل ہے یہ تیل نہ صرف مونچھوں کو بڑھاتا ہے بلکہ ہر ایک جگہ کے بالوں کو بخوبی بڑھاتا ہے اور ان کو سیاہ ملائم رکھتا ہے رعبدار چہرہ کیا بھلا معلوم ہوتا ہے
قیمت ۲ روپے نمونہ ۶ /

پران سکھ جو ڈھیلے پستانوں کو

ڈھلکنے سے بچاتا ہے اور ڈھلکے ہوؤں کو اصلی حالت پر لاتا ہے بڑے پستان واقعی عورت کیلئے وبال جان ہوتے ہیں +
قیمت ۴ روپے نمونہ ایک روپیہ

بال اڑانے کی بے نظیر دوائی

اس دوائی کو پانی میں گھول کر لگانے سے ایک منٹ کے اندر نرم سے نرم جگہ کے بال صفائی کے ساتھ جڑ سے دور ہو جاتے ہیں جسنے منگوایا تعریف کی!
قیمت ۸ / نمونہ ڈیڑھ آنہ

المشتہر منیجر امرت دھارا اوشدھالیہ امرت دھارا بھون امرت دھارا روڈ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

خط و کتابت و تار کیلئے پتہ امرت دھارا ۸۹ لاہور

سنہ ۱۹۲۶ء

ضمیمہ شمع

تار کا پتہ ریاست دہلی | THE RIYASAT DELHI | ٹیلیفون نمبر ۵۲

ہندوستان کا بہترین باتصویر ہفتہ وار اخبار

ریاست دہلی

ایڈیٹر دیوان سنگھ مفتوں

جلد | ہر سنیچر کو ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے شائع ہوتا ہے | نمبر

لوکل ایجنٹوں اور ریلوے سٹیشنوں پر بک سٹالوں سے بھی ملتا ہے

اورنٹیل کالج میگزین

ایک سہ ماہی علمی رسالہ

اغراض و مقاصد اس رسالہ کے اجراء سے غرض یہ ہے کہ احیا و ترویج علوم مشرقیہ کی تحریک کو تا حد امکان تقویت دیجائے اور خصوصیت کے ساتھ ان طلباء میں شوق تحقیق پیدا کیا جائے جو سنسکرت۔ عربی۔ فارسی و دیسی زبانوں کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

کس قسم کے مضامین کا شائع کرنا مقصود ہے فقط انہی مضامین کو شائع کیا جاتا ہے جو مضمون نگاروں کی ذاتی تحقیق کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ غیر زبانوں مثلاً فرنچ جرمنی۔ اطالی وغیرہا سے مفید مضامین کا ترجمہ بھی وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے اور کم ضخامت کے بعض مفید علمی رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔

رسالے کے دو حصے یہ رسالہ دو حصوں میں شائع ہوتا ہے حصہ اُردو حصہ ہندی۔ ہر ایک حصہ الگ الگ بھی مل سکتا ہے

وقت اشاعت۔ یہ رسالہ ہر سال میں چار بار یعنی نومبر۔ فروری اور مئی میں شائع ہوتا ہے۔

قیمت اشتراک۔ سالانہ چندہ مکمل رسالہ کیلئے ہے۔ ہر سہ حصہ کیلئے الگ الگ ہے۔

خط و کتابت و ترسیل زر۔ خرید رسالہ کے متعلق جملہ خط و کتابت و ترسیل زر پرنسپل اورنٹیل کالج لاہور کے نام ہونی چاہئے۔ مضامین کے متعلق۔ جملہ مراسلات چیف ایڈیٹر کے نام بھیجنے چاہئیں۔

محل فروخت۔ یہ رسالہ اورنٹیل کالج لاہور کے دفتر سے خریدا جاسکتا ہے۔

قلم تحریر۔ چیف ایڈیٹر پروفیسر محمد شفیع ایم۔ اے وائس پرنسپل کالج لاہور۔ حصہ اردو ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی کی اعانت سے مرتب ہوتا ہے۔ حصہ سنسکرت و ہندی کے ایڈیٹر ڈاکٹر لکشمن سروپ ایم۔ اے پی۔ ایچ۔ ڈی اور حصہ پنجابی کے ایڈیٹر بھائی جے انت سنگھ بی۔ اے ہیں۔

مینجر اورنٹیل کالج میگزین لاہور

سر سید فاؤنٹن پن

یہ قلم خاص طور پر لندن کی سب سے مشہور کمپنی سے بنوا کر صرف اس لئے منگائے گئے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی بپنجاہ سالہ جوبلی کی یادگار ہمیشہ قائم رہے

اپنے عزیز دوستوں اور بچوں کو تحفہ دینے کیلئے عمدہ چیز ہے



سر سید قلم کی خصوصیات

۱۔ ہر قلم پر لفظ سر سید اور مسلم یونیورسٹی جوبلی ۱۹۲۵ عیسوی کندہ ہے۔

۲۔ ایک نہایت خوبصورت بکس میں معہ پرچہ ہدایات بند ہے۔

۳۔ نب اصل چودہ کیرٹ گولڈ کی ہے جس کی نوک ایک ایسی دھات کی ہے جس سے نب برسوں نہیں گھستی۔

۴۔ ہر قلم کے ساتھ ایک خوبصورت کلپ دیا جاتا ہے۔

۵۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت قسم اول چار روپیہ آٹھ آنہ اور سپیشل کوالٹی چھ روپیہ

مسرز نظام الدین حسین اینڈ سنز بدایوں

زبان

صوبہ بمبئی کا واحد علمی وادبی ماہوار رسالہ

اگر آپ کا مذاق سلجھا ہوا ہے اور آپ ہر ماہ ملک کے بہترین انشا پردازوں کے اعلیٰ علمی تنقیدی اور تاریخی مضامین سے اپنی علمی استعداد بڑھانا چاہتے ہیں تو رسالہ "زبان" کے **مقالات** کا مطالعہ ضرور فرمائیں۔

اگر آپ ادب عالیہ جذبات لطیفہ اور شاعرانہ بلند خیالیوں اور دلچسپ اخلاقی فسانوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں تو رسالہ "زبان" کے **ادبیات** کے صفحات ملاحظہ فرمائیں۔

اگر آپ مصر وشام اور یورپ کے عربی وانگریزی رسائل کے اعلیٰ مضامین کے تراجم دیکھنا چاہتے ہیں تو رسالہ "زبان" کے **مترجمات** ضرور پڑھیں۔

اگر آپ دلچسپ معلومات اور سائنس کے جدید وحیرت انگیز انکشافات سے بہرہ اندوز ہونا چاہتے ہیں تو رسالہ "زبان" کے **اخبار علمیہ** کے کالم ضرور پڑھیں۔

اگر آپ اردو کے سچے بہی خواہ وہمدرد ہیں اور زبان اردو کی ترقی کے دل سے خواہاں ہیں تو رسالہ **زبان** کے آج ہی خریدار بن جائیے۔

کیونکہ

رسالہ زبان بلا کسی جلب منفعت کے محض زبان اردو کی خدمات انجام دینے کی غرض سے ملک کے ایک ایسے گوشہ سے جاری کیا گیا ہے جہاں اردو کو ترویج دینے کی سخت ضرورت ہے اور جس کی اشاعت ہر اردو داں کا فرض ہے۔

لہذا

رسالہ زبان کی خریداری سے اپنے زبان اردو کے محسن ومعاون ہونے کا آج ہی ثبوت دیجئے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ تقطیع ۲۰×۳۰ حجم ۴۸ صفحے سالانہ للعہ ششماہی ۱۲ نمونہ ۲

مینجر رسالہ زبان۔ منگرول (کاٹھیاواڑ)

جرمنی کی حیرت انگیز اشیاء

سگرٹ بنانے کی مشین

حیرت انگیز قینچی!

محصول ڈاک معاف

انگریزی حروف والا تالا

کپڑوں پر بیل بوٹے بنانے کی مشین

محصول معاف

کیمرہ

محصول معاف

رسٹ واچ

نہایت کارآمد چولہا

محصول معاف

خوشبودار سنٹ

کپڑے سینے کی مشین!

پاکٹ پریس یا جیبی چھاپہ خانہ

لڑکا ہوگا یا لڑکی

آگ جلانے کی مشین

محصول ڈاک معاف

ترکر اینڈ کمپنی

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۳۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن
بیرسٹرایٹ لا، ایم، آر، اے، ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ ممبر لیجسلیٹو کونسل
حسن عابد جعفری آکسن
بیرسٹرایٹ لا، آگرہ

دار الاشاعت
حسن منزل شاہ گنج آگرہ

SHAMA



جلد ۵ فہرست مضامین رسالہ شمع بابتہ ماہ مارچ ۱۹۲۷ء نمبر ۳

تصویر } آصف جاہ وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ جلال الدین حیدر خاں بہادر شجاع الملک

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کے لئے عنایت فرمائیے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا
اگر آپ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب نذر کی جائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری سے شوق ہے تو

جون ۲۷ء تک جو بہترین افسانہ وصول ہوگا اس کے معاوضہ میں چھ ماہ تک شمع مفت ارسال خدمت ہوگا۔
اور اگر آپنے کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپکو فن مصوری سے شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمائیے۔ بعد اشاعت اس کی بیس کاپیاں مفت حاضر کی جائیں گی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپ کی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اس پر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائے گا۔

واضح رہے کہ

جو مضمون، افسانہ، ناول، نظم یا غزل ناپسند ہوگی وہ ار کا ٹکٹ آنے پر واپس کردی جائے گی، البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے بہ احتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپکا کلام شائع ہوگا، بلا لحاظ اس کے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جاوے گا۔

مطبوعات جدیدہ

جو ۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، اُن پر دو انعامات ہیں۔
(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائیگا جو بہترین کتاب بھیجیں گے، اور
(۲) دوسرا انعام حسب تجویز کمیٹی اُن کو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائیں گے۔

خادم منیجر شمع

شمع

ماہ مارچ ۱۹۲۷ء

منشی ذکاء اللہ مرحوم دہلوی

(از مسٹر سی۔ ایف۔ اینڈریوز)

ذیل کا مضمون مسٹر اینڈریوز نے منشی ذکاء اللہ مرحوم کے انتقال کے بعد ہی لکھا تھا اسوقت ڈاکٹر نذیر احمد زندہ تھے۔ لیکن بعد میں مسٹر موصوف نے اس خیال سے اسے شائع نہ کیا کہ جب "منشی صاحب مرحوم کے حالات زندگی کتابی صورت میں مرتب کرینگے تو اسے بطور ضمیمہ شائع کردیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مضمون ابتک شائع نہ ہو سکا۔ اب مکمل حالات زندگی کتابی صورت میں جمع ہو گئے ہیں اور جہاں ایکطرف وہ مشہور انگریزی رسالہ "ماڈرن ریویو" میں ماہ بماہ شائع ہو چکے ہیں وہاں دوسری طرف ان کا ترجمہ اردو کے مشہور رسالہ "زمانہ" میں بھی ماہ بماہ شائع ہو چکا ہے۔ جو مضمون اب

"شمع" میں شائع ہو رہا ہے وہ بعد میں اُردو کتاب کا جزو بنا دیا جائے گا۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ کتاب زیادہ سے زیادہ ۱۹۲۶ء کے وسط تک شائع ہو جائے۔

مسٹر اینڈریوز منشی صاحب کے مخلص دوستوں میں سے ہیں اور قارئین کرام مضمون سے اُس محبت اور عقیدت کا اندازہ لگا سکیں گے جو اول الذکر کو موخر الذکر سے تھی اور ہے۔

ضیاء الدین احمد برنی

ہندوستان میں اُنیسویں صدی پر کسی قسم کا تبصرہ اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک کہ اس میں ایک نہایت اہم حقیقت کو یعنی اُس ذہنی جمود کو شامل نہ کیا جائیگا جس نے کچھ عرصہ تک اعلیٰ تعلیم کے معاملہ میں مسلمانوں کی قومی ترقی کو روکے رکھا۔ ہندوستان کی دیگر اقوام کے مقابلہ میں مسلمان ہی سب سے زیادہ مایوس تھے۔ جس شک و شبہ کی نظر سے انگریز اُنہیں اسوقت دیکھتے تھے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے لیڈروں کی اسپرٹ کو کچلا جا رہا ہے۔ اسوقت صرف ردِعمل کی آوازیں بلند کیجا رہی تھیں۔ اس طرح سے کئی قیمتی سال گذر جانے کے بعد تحریک علیگڈھ کی ابتدا کی گئی لیکن اس نے بھی باوجود اس حقیقت کے کہ وہ بہت شدومد کے ساتھ شروع کی گئی تھی۔ ابتدا میں مسلمانوں کے صرف محدود طبقہ پر اپنا اثر ڈالا۔ عرصہ دراز تک مغربی تعلیم اکثر مسلمانوں کے لئے نفرت انگیز چیز رہی۔ غالباً یہ کہنا بجا ہو گا کہ ۱۹۱۰-۱۱ء تک ترقی کی جانب لیجانے والی کوئی عام تحریک موجود نہ تھی۔

جو بیداری حال میں پیدا ہوئی ہے اُس نے اس خیال کو حیرت انگیز طریقہ سے غلط ثابت کر دیا ہے کہ ہندوستان میں سیاسی تحریک دوسری سمتوں میں ترقی کو روک دینے کا باعث ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ بیداری سیاست کی رہین منت رہی ہے۔ لیکن جیسا کہ بسا اوقات ہوا ہے سیاسی ترقی تیزی کے ساتھ ذہنی جدوجہد میں مبدل ہو گئی ہے سیاسی لہروں کے مدنے اُس تعلیمی جمود کو جو اتنے عرصہ سے غیر متحرک رہا ہے، بہا کر دور پھینکدیا ہے، اور اب

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے اس نہایت اہم شعبہ میں نمایاں ترقی ظہور میں آچکی ہے۔

انجام کار سارے ہندوستان کو اسلام کی موجودہ ترقی کرنے والی تحریک سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے بشرطیکہ دانشمندانہ اور فیاضانہ طرز عمل اختیار کیا گیا اور جدید تعلیم سے تمام و کمال استفادہ حاصل کیا گیا۔ بمقابلہ دوسرے اسباب کے سب سے زیادہ ایک چیز نے ہندوستان کی دو عظیم الشان قوموں کے درمیان باہمی مفاہمت کو خطرے میں ڈالدیا ہے اور وہ چیز جہالت ہے، اس لئے کہ جہالت (جہاں کہیں بھی وہ پائی گئی ہے) غیر بردباری کی ماں ثابت ہوئی ہے۔ جب تک ہندوستانی مسلمانوں میں تعلیمی جمود رہا اس وقت تک اس امر کا احتمال تھا کہ عدم مفاہمت باہمی بدفرگی اور بے اعتمادی کا باعث ہوگی اور یہ کہ ان عناصر کے باہمی اتصال کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ عوام میں استبداد کی اسپرٹ عام ہو جائیگی۔ اب جبکہ مسلمانوں کی قوتیں دانشمندانہ رہبری کی بدولت تعلیمی جدوجہد کی جانب منعطف کر دی گئی ہیں ہر شخص کو جسے ہندوستان سے کچھ بھی محبت ہے، یہ امید پیدا ہو گئی ہے کہ اس خطرہ کا تدارک ہو جائے گا۔ دنیا کے ہر ملک میں رہنمائی کا کام نسبی یا نسلی سیادت سے ہٹ کر ان لوگوں کے ہاتھ میں آرہا ہے جو ذہانت کی سیادت رکھتے ہیں اور جب لازمی تعلیم عوام تک پہنچ جائے گی اس وقت سیادت کی تبدیلی یقینی ہے۔ ہندوستان میں پرامن انقلاب کا انحصار کسی اور عنصر کے مقابلہ میں صرف تعلیم کی ترویج پر ہے۔ اور یہ نہایت ضروری ہے کہ مسلمانوں کی قوم جو بہت ہی پسماندہ ہے، تلافی مافات کرے۔

اسلامی تہذیب و ترقی کی نشو و نما جن اصولوں اور اسباب پر مبنی تھی ان پر مناسب غور و خوض کرنے سے بھی مقصد برآری ہو سکتی ہے۔

ان اصولوں میں سے ایک اصول جس پر قرآن مجید میں بھی زور دیا گیا ہے، یہ ہے کہ مسلمانوں پر فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ علم کی تحصیل کریں خواہ علم چین ہی میں کیوں نہ پایا جائے۔[۱]

---

[۱] فاضل مضمون نگار نے غلطی سے حدیث کو قرآنی آیت سمجھ لیا ہے۔ (مترجم)

اسی اصول کی مطابقت میں تاریخ کا یہ ایک مسلمہ واقعہ بن گیا ہے کہ جب کبھی اسلامی تہذیب کسی دوسری ذہنی ماحول سے دوچار ہوئی ہے اس کا نتیجہ لازمی طور پر ترقی اور روشنی کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

مثلاً عربوں کا ایک جانب بازنطینی تہذیب اور دوسری جانب ایرانی تمدن کے ساتھ تعلقات رکھنے کا یہ اثر ہوا کہ عربوں کے تہذیب و تمدن کو قابل یادگار ترقی نصیب ہوئی۔ یونانی اور ایرانی فلسفہ اور علوم و فنون کے بہت سے خزانے دنیا کے بزرگ ترین خلفا کے ترقی پرور عہد حکومت میں دمشق اور بغداد کے علما و فضلا کے جوش، جدوجہد اور وسیع الخیالی کی ہمہ گیر سپرٹ کے باعث آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر لئے گئے۔ اور جب تک اُن کی طاقت قائم و برقرار رہی اس وقت تک بردباری اور آزادخیالی کی وسیع راہیں ذہنی ترقی کے لئے کھلی رہیں۔

آل عثمان کے زبردست سلاطین کے عہد حکومت سے بھی جو ۱۴۵۳ء میں سقوط قسطنطنیہ کے بعد سے شروع ہوا، دوسری مثال اخذ کیجا سکتی ہے۔ اس زمانہ میں دول یورپ کے ساتھ ترکوں کا جو تعلق پیدا ہو گیا تھا اس کی وجہ سے مشرق اور مغرب میں باہمی مفاہمت رونما ہو گئی اور معاشرتی آزادی کی روح وسیع تر ہو گئی۔ بلاشبہ یہ امر اُس فوجی فتح سے کم حیرت انگیز نہ تھا جس کے باعث وہ تعلق پیدا ہوا۔ پروفیسر بوری رقمطراز ہے کہ "ساری عیسائی دنیا میں اُس زمانہ میں غالباً کوئی حاکم ایسا نہ تھا جو سلطان سلیمان کی طرح انصاف کرنے کی غیر تصنع آمیز خواہش یا سچا ارادہ رکھتا ہو"

مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ہندوؤں کے تہذیب تمدن کے ساتھ آمیزش کی داستان بھی اسی تاریخی سبق کو پیش کرتی ہے۔ اکبر اور اس کے قریبی جانشینوں کی ترقیاں مغلیہ حملہ آوروں کی نوخیز قوت اور زندگی بخش طاقت کے مقابلہ میں قدیم ہندوستانی تہذیب کے ملاپ کی کچھ کم رہین منت نہ تھیں۔ اس زمانہ میں ذہنی ترقی اطراف و اکناف

میں پھیل گئی تھی اور مذہبی بردباری کا ہر جگہ دور دورہ تھا۔

اس اہم نکتہ کو زیادہ واضح کرنے کی غرض سے دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ امر مسلمہ ہے کہ جہاں کہیں اسلام جدید علوم و فنون کی شاہراہ پر گامزن ہوا وہاں اس نے اپنے ماحول سے مناسبت اور مطابقت کرنے کی ان تھک کوشش کا اظہار کیا ہے جو آزاد خیالانہ ترقی کی سچی دلیل ہیں۔

حضرت محمدؐ (صلعم) نے جو حکم اپنے متبعین کو دیا تھا یعنی یہ کہ "علم کی تلاش کرو جہاں کہیں وہ بھی پایا جائے" اُس کی دانشمندی تجربہ سے ثابت ہو گئی ہے۔ جب کبھی اس حکم کی وسیع مطابعت کی گئی ہے اسلام بے انتہا ترقی کی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی وسیع ترقیاں اس کی شاندار جنگی فتوحات کے بعد عمل میں آئی ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ بیان اسی کے ابتدائی زمانہ پر بالکل صادق آتا ہو۔ لیکن اس کے سارے زمانوں پر کسی طرح صادق نہیں آتا۔ اور کم سے کم آج تو بالکل صحیح نہیں ہے۔ مثلاً جو تحریکیں ہم اسلام میں ہر جانب دیکھ رہے ہیں خواہ وہ ٹرکی میں ہوں یا ایران میں، ہندوستان میں ہوں یا شمالی افریقہ میں، وہ کسی عظیم الشان فوجی کارنامہ کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ وہ زیادہ تر تعلیمی تحریک کا ماحصل ہیں جسکا مقصد یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اپنے میں جذب کیا جائے۔

کئی برس ہوئے مجھے کیمبرج میں جدید ترکی انقلاب کے ایک لیڈر کے ساتھ گہری ملاقات کرنے کی عزت نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے بیان کیا تھا کہ تمام تحریک کی تہ میں جو اصول کام کر رہا ہے وہ مغربی علوم و فنون کی آزادانہ قبولیت اور انجذاب ہے۔ انکا شمار ان سچے مسلمانوں میں ہے جن سے میری کبھی ملاقات ہوئی ہو۔ میری ان سے ملاقات ایسے زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ وہ پناہ گزیں کی حیثیت سے انگلستان میں مقیم تھے اور جبکہ ٹرکی میں کسی انقلاب کے امکان یا اس ملک میں اسلام کی کسی اصلاح کے خیال سے بڑھکر اور کوئی بات مایوسانہ نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اسلامی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے شخص کی حیثیت سے

وہ اس عظیم الشان اصول پر سختی سے جمے رہے اور اپنی تحریات کے ذریعہ انہوں نے اُن لوگوں میں بھی وہی روح پھونک دی جو اس کی تعلیمات کے (جن کی تہ میں مذکورہ بالا اصول کام کررہا تھا) پیرو تھے۔ واقعات نے قطعی طور پر ثابت کردیا ہے کہ ان کی تشخیص صحیح تھی اور یہ کہ جس علاج کی انہوں نے جا و بیجا تلقین کی تھی وہ ناکافی نہ تھا۔

اسلام کے ترقی کے ساتھ جو گہری دلچسپی مجھے ہوئی اس کا بیشتر حصہ منشی ذکاء اللہ کی فیض صحبت کا نتیجہ ہے، یہاں تک کہ جن خیالات کا اظہار میں نے اوپر کیا ہے انہیں بھی انہی کے خیالات کی خوشہ چینی سمجھنا چاہیئے۔ ان کی پوزیشن کو واضح کرنے کی غرض سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا ایک خاکہ پیش کیا جائے۔ وہ دارالسلطنت دہلی میں ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سالہائے دراز سے اُن کا خاندان آلِ تیمور کے شاہی گھرانے کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا نگران و ذمہ دار تھا۔ انہوں نے تہذیب و شائستگی کی اعلیٰ روایات کو جو عہدِ مغلیہ کے ابتدائی دور سے اُنہوں نے ورثہ میں پائی تھیں، جوں کا توں برقرار رکھا۔ نوعمر ذکاء اللہ کو قدیم دہلی کا وہ زمانہ یاد تھا جبکہ اس پر مغربی تہذیب کا اثر نہ پڑا تھا۔ ان کی زندگی کی مابعد کی روش اور ان کے بڑھاپے کے اعتقادات کا خیال کرتے وقت ضروری ہے کہ اس واقعہ کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

نوعمر لڑکے کی والدہ دہلی کی نہایت مشہور خواتین میں سے تھیں۔ وہ بہت عقلمند اور کیرکٹر کی مضبوط تھیں اور اپنے بچوں کی نہایت شفقت مگر سختی کے ساتھ رہنمائی اور نگرانی کیا کرتی تھیں۔ ذکاء اللہ ان کے بغایت درجہ شکر گزار تھے اور محسوس کرتے تھے کہ وہ فرض شکر گزاری سے کبھی عہدہ برآ نہ ہوسکیں گے۔ میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ اپنے انتہائی بڑھاپے کے عالم میں جب کبھی وہ اپنی مادرِ مہربان کا ذکر فرماتے تو ان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے۔ تمام عمر وہ اپنی والدہ سے مشورہ کئے بغیر کوئی اہم فیصلہ نہ کرتے تھے وہ اُن بڑے ہندوستانیوں میں سے ہیں جن کے کیرکٹر کو ماں کی محبت نے ابتدائی زمانہ

سے سانچہ میں ڈھالدیا تھا۔ ان کے والد علوم قدیمہ کے زبردست فاضل تھے اور اپنی ایرانی ادبی تہذیب و شائستگی کے لئے خصوصیت کے ساتھ مشہور تھے۔ قدیم ایران کی ساری تہذیب کو انہوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ اپنے بیٹے کو منتقل کر دیا تھا۔

جب نوعمر ذکاء اللہ اپنے عنفوانِ شباب کو پہنچ رہے تھے اس زمانہ میں مغلیہ دربار اور شہر دہلی میں عظیم الشان تبدیلیاں ظہور میں آرہی تھیں۔ تیموری خاندان جو عرصہ دراز سے اپنی سابقہ شان و شوکت اور ٹھاٹھ کا محض ہیولیٰ رہگیا تھا، اب تباہی کے قریب آن لگا تھا۔ دہلی میں برطانوی ریزیڈنسی کے قیام کے ساتھ ساتھ مغلوں کے شہر میں جدید مغربی علوم کی ترویج شروع ہو گئی۔ قدیم دہلی کالج کی بنیاد ڈالی گئی اور نوعمر منشی ذکاء اللہ جبکہ ان کی عمر صرف بارہ برس کی تھی، اپنے باپ کے ایما سے وہاں بھیجے گئے اور طالب علم کی حیثیت سے وہاں داخل ہو گئے۔ قدیم درباری علوم کی بجائے یکایک مغربی علوم جدیدہ کا جگہ لے لینا یقیناً پریشان کن ہوا ہوگا۔ ذکاء اللہ نے ابتدا ہی سے اعلیٰ درجہ کی ذہانت کا اظہار کرنا شروع کر دیا تھا اور اسی وجہ سے وہ ریاضی اور سائنس میں اپنے ذہین ہم سبقوں کی پارٹی میں سب سے نمایاں رہتے تھے۔

نوعمر طالب علم نے غیر معمولی سرعت کے ساتھ علوم میں ترقی کی۔ بعض دفعہ بیکن کیطرح ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "وہ تمام علوم پر یکساں حاوی ہیں"۔ انہوں نے عربی و فارسی کے اسباق کو برابر جاری رکھا، انگریزی اور تاریخ ہند میں اپنے مابعد کے علم کی بنیاد ڈالی اور نیچرل سائنس کی تقریباً ہر شاخ کا مطالعہ کیا اور ریاضی میں خاص مہارت پیدا کی۔ جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان میں مغربی علم کے مختلف شعبوں میں رہ نوردی کرنے والے طلبا کے دور اول میں تھے تو یہ بات بخوبی سمجھ میں آجائیگی کہ وہ نصاب کیسا کچھ کارنامہ ہوگا۔

اب ہم ان کی زندگی کے شاندار پہلو سے ہٹ کر ان کی گھریلو زندگی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو بجائے خود بے انتہا پاکیزہ ہے۔ انہیں اپنی والدہ سے جو گہری عقیدت تھی،

اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ انہی سے انہوں نے دوسروں پر رحم کھانا اور ان کے جذبات کا احترام کرنا سیکھا تھا اور جوں جوں ان کی عمر زیادہ ہوتی گئی یہ صفات ان کی سیرت کا نمایاں جزو بنتی گئیں۔ مزید براں اُن میں حد درجہ کی ایمانداری اور حیرت انگیز محنت پسندی تھی۔ بہت کم ہندوستانی ایسے ہیں جنہوں نے ان کی سی روزانہ محنت کی زندگی بسر کی ہو۔ اپنی تمام عادات میں وہ بہت سادہ تھے۔ ان کا طریق عمل خاص وضع کا پابند تھا۔ وہ بہت باقاعدہ تھے۔ ان کا جسم اگرچہ بظاہر بہت نازک اور نحیف معلوم ہوتا تھا تاہم وہ درحقیقت بہت جوش اور طاقت سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کی وجہ ان کی محتاط روشِ زندگی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سال تک جبکہ ان کی عمر تقریباً ۸۰ برس کی ہو گئی تھی وہ (جیسا کہ انہوں نے مجھ سے بیان فرمایا) ایک مرتبہ بھی بیمار نہ پڑے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تمام کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے قابل بن سکے۔ بڑھاپے کے زمانہ میں اُن کے چہرے پر شرافت برستی تھی۔ اُن کے چہرے کے ہر خط سے مہربانی اور سادگی ہویدا تھی اور اُن کی آنکھوں کی روشنی میں اس وقت ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہو جاتی تھی جبکہ وہ اپنے اعزا اور احباب کا تذکرہ فرماتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضر ہونا گویا ادب و اخلاق و خوش مزاجی کا سبق لینا تھا۔ اپنے مہمانوں کو آرام و آسایش پہنچانے کے لئے وہ ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان میں قدیم وضع کی شرافت اور تہذیب و شایستگی جلوہ گر تھی جو معلوم ہوتا ہے ان کے خاندان میں مغلیہ دربار سے وابستہ ہونے کے باعث نسلاً بعد نسلٍ چلی آتی تھی۔

نوعمر ذکاء اللہ نے کالج کی زندگی ختم کرتے ہی تعلیمی کام شروع کر دیا اور پروفیسر اور انسپکٹر کی حیثیت سے ان کی محنت و مشقت نہایت مسلسل رہی جس میں غدر کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے خوفناک رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔ غدر کے باعث ذکاء اللہ کا خاندان سخت ترین مصیبت اور عسرت میں مبتلا ہو گیا۔ خود اُن کی زندگی ایک سے زیادہ مرتبہ خطرہ میں پڑ گئی محض اس سبب سے کہ ان کا عوام جدید انگریزی علوم سے وابستہ تھا۔ وہ شاذ و

نادرہی ان ایام کا ذکر کرتے اور جب وہ کر بیٹھتے تو نہایت ہی خوف و دہشت کے جذبات کے ساتھ ذکر فرماتے اس لئے کہ تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اور نیز ایسے شخص کی حیثیت سے جس نے پرانی حکومت کی تباہی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہو، وہ جانتے تھے کہ اگر باغیوں کو کامیابی ہوگئی تو ملک میں کس قدر ابتری و تباہی رونما ہو جائیگی - جدید ہندوستان کی نجات تو کم سے کم ان کے ذریعہ سے ناممکن تھی۔

غدر کے کچھ عرصہ بعد منشی ذکاء اللہ الہ آباد میں سکونت پذیر ہو گئے جہاں وہ جدید گورنمنٹ کالج میں "السنۂ مشرقیہ اور سائنس" کے پروفیسر اوّل مقرر کئے گئے تھے - یہاں پر سب سے اول انھوں نے اپنے آپ کو طلبا میں اپنی شرافت طبع اور حسن اخلاق کے باعث ہر دلعزیز بنایا - ان کے سوانح حیات لکھنے کے دوران میں مجھے ایک نہایت ہی محبت آمیز چٹھی ان کے ایک رفیق کار سنسکرت کے پروفیسر کی طرف سے موصول ہوئی تھی جو محنت و مشقت کی ملازمت کے بعد کنارہ کشی اختیار کرکے اب الہ آباد میں گوشہ نشین ہو گئے ہیں - یہ خط ہمدردی کی ان بہت سی مثالوں میں سے ایک ہے جو منشی ذکاء اللہ اور تعلیم یافتہ ہندو شرفا میں پائی جاتی تھی۔

اس قدیم دوست سے میرے اپنے تعلقات اس زمانہ سے شروع ہوتے ہیں جبکہ میں ان سے دہلی کے ریڈنگ روم میں ملا کرتا تھا - موسم گرما میں ہر شب کو لائبریری کی چھت پر ایک قسم کی ادبی کلب کا اجتماع ہوا کرتا تھا اور عام دلچسپی کے مسائل پر بحث ہوا کرتی تھی - شمالی ہندوستان میں اس سے زیادہ شاندار اجتماع کبھی دیکھنے میں نہیں آسکتا تھا - ڈاکٹر نذیر احمد اس کلب کے مسلّم لیڈر تھے اور ان کے گرد اگرد ہندو اور مسلمان دونوں مجتمع ہوا کرتے تھے - اثنائے بحث میں کبھی کبھی کوئی ہمدرد انگریز عہدہ دار بھی شرکت کرنے کے ارادہ سے آ شریک ہوتا تھا - منشی ذکاء اللہ ان مباحث میں تمام مسائل کے متعلق حیرت انگیز وسعت معلومات کا اظہار کرتے تھے جو ہمیشہ ان کے آڑے آتی تھی اور میں نے تو شاذ و نادر ہی ایسے شخص

سے ملاقات کی ہے جو ان کی طرح وسیع معلومات رکھتا ہو۔ یہ مجمع اب منتشر ہو چکا ہے ۔ منشی ذکاء اللہ انتقال کر گئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد اور رائے پیارے لال دونوں اپنی خرابی صحت کے باعث شرکت کرنے سے معذور ہیں۔ نئی پود میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو زمانۂ گذشتہ کے ان "دیووں" کا مقابلہ کر سکے۔

اس صحبت میں شریک ہونے والے شخص کے تخیل پر جس چیز کا سب سے زیادہ اثر پڑتا تھا وہ باہمی بردباری کی انتہائی شرافت تھی جو مذہبی تلخی یا تعصب کے ہر داغ سے مبرا تھی اور یہ وہ ماحول تھا جس میں سیاسی فراست ترقی پا سکتی تھی اور معاشرتی درستی پختہ ہو سکتی تھی۔ ان تمام برسوں میں جن میں منشی ذکاء اللہ سے میرے تعلقات رہے ، میں نے جہاں تک میرا حافظہ میری مدد کر سکتا ہے کسی ہندو یا ہندوؤں کی کسی مذہبی رسم کے بارے میں کبھی ان کی زبان سے ایک دفعہ بھی کوئی تلخ یا غیر شریفانہ لفظ نہیں سُنا۔ برخلاف اس کے میں نے انہیں ہمیشہ ان لوگوں کا احترام کرتے ہوئے دیکھا ہے جو اعتقادات کے معاملہ میں اُن سے بنیادی اختلاف رکھتے تھے۔ جہاں کہیں وہ گئے ، اُنہوں نے ہمیشہ صلح جوئی اور رواداری کے حق میں اپنا اثر استعمال کیا۔

ذکاء اللہ اپنے الہ آباد کے زمانۂ قیام میں تحریک علیگڈھ کے ساتھ گہرے طور پر وابستہ رہے جو سرسید احمد خاں کی رہنمائی میں شروع کی گئی تھی۔ سرسید ان کے گہرے ذاتی دوست تھے اور ان سے یا ڈاکٹر نذیر احمد سے صلاح لئے بغیر شاذ و نادر ہی کوئی اہم کارروائی انجام دیتے تھے ۔ عرصۂ دراز تک تحریک علیگڈھ ڈانواڈول رہی۔ شمال کا رجعت پسند فریق بہت طاقتور تھا اور سرسید احمد کی اپنی زندگی ان کے ترقی یافتہ خیالات کے باعث متعصب ملاؤں کی وجہ سے ہر وقت خطرہ میں رہتی تھی۔ انہیں کھلم کھلا کافر کہا جاتا تھا اور بہت سی مساجد میں وعظوں کے ذریعہ ان پر سختی سے حملے کئے جاتے تھے۔ منشی ذکاء اللہ ظلم و تشدد کے اس دور میں بہادرانہ طریقہ سے ان کی رفاقت کرتے رہے۔ وہ علیگڈھ انسٹیٹوٹ کے سربرآوردہ ممبروں میں سے تھے اور اسکے

متعلقہ پریس (چھاپہ خانہ) کو انہوں نے اپنی تمام ابتدائی کتابیں بغرض اشاعت دیدی تھیں۔ وہ کالج کے ٹرسٹی اور بہت پرجوش کارکن تھے۔

ذکاء اللہ ملازمت سے دستکش ہونے کے بعد پورے انہماک کے ساتھ ادبی مشاغل میں مشغول ہوگئے۔ انہوں نے علاوہ اور شستہ زبان میں انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ پر بہت سی جلدیں لکھی ہیں اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کتابیں؛ در نیز ان کے مضامین اور کتب ریاضی ہمیشہ ہمیشہ ان کا نام زندہ رکھیں گی۔ یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ ان کی یہ امید کہاں تک بارآور ہوگی۔

انتقال سے پیشتر ذکاء اللہ مجھ سے افسوس کے ساتھ فرماتے تھے کہ ابھی سے میری کتابوں کی فروخت تقریباً رک سی گئی ہے لیکن خواہ یہ صحیح صورت حالات ہو یا نہ ہو اور خواہ ان کی ہردلعزیزی دوبارہ زندہ نہ ہوسکے، یہ حقیقت فراموش نہیں کیجا سکتی کہ وہ ان اولین اشخاص میں سے تھے جنہوں نے اردو زبان کے ذریعہ مغرب کے علوم جدیدہ کو روشناس کرانے کی اہم خدمت انجام دی۔ جہاں ایک طرف ہندوستان کے دوسرے صوبے خالصتاً انگریزی تعلیم کی رَو میں بہے چلے جارہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ انگریزی ہی بہترین ذریعۂ تعلیم ہوسکتی ہے، وہاں دوسری طرف منشی ذکاء اللہ نے اپنی تحریرات کے ذریعہ ثابت کر دکھایا کہ علوم جدیدہ کے نہایت ادق اور انتہائی مضامین بھی اردو کی کتب نصاب کے ذریعہ پڑھائے جاسکتے ہیں۔ آج ہم رابندرناتھ ٹیگور کے کارناموں اور زبردست اثر کی وجہ سے بنگال میں یہ دیکھ رہے ہیں کہ مادری زبان کی محبت ازسرنو زندہ ہورہی ہے اور سائنٹفک کتابیں بنگالی میں تحریر کی جارہی ہیں۔ جو بات کہ اب بنگالی لٹریچر میں وقوع میں آرہی ہے بعینہ وہی بات اردو کے لئے ہمیشہ منشی ذکاء اللہ کے پیش نظر رہی اور انہوں نے اس کے حصولِ تکمیل کے لئے انسانی طاقت سے بڑھ کر کوشش کی حیثیت انشاپرداز کے وہ اپنے دو دوستوں ڈاکٹر نذیر احمد اور حالی سے بہت پست ہیں، لیکن

ان کی اُردو ان تمام مصنوعی ترکیبوں اور لفاظیوں سے حیرت انگیز طور پر مبرا ہے جن کے بوجہ سے اُس دور کی ابتدائی زبان دبی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ درحقیقت موجودہ اُردو لٹریچر کے بانیوں میں سے تھے۔

اگرچہ منشی ذکاء اللہ تحریر تعلیم اور گفتگو میں اپنی مادری زبان کے سوائے کسی اور زبان میں اظہار خیال کے عادی نہ تھے تاہم وہ ان تمام انگریزی کتب کے پڑھنے کے بیحد شوقین تھے جو انہیں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ وہ ریاضی داں ہونے کی حیثیت سے جدید سائنس کے بغایت درجہ معترف تھے اور اس طرح سے وہ ماضی اور حال، مشرق اور مغرب کا حیرت انگیز اجتماع پیش کرتے تھے۔ وہ عربی تہذیب اور ایرانی تمدن کی گذشتہ شاندار روایات کا بیحد احترام کرتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ علوم جدیدہ کی انتہائی ضرورت کو تسلیم کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ وہ سختی کے ساتھ اپنی مادری زبان کے ساتھ چپکے رہے اور آخر وقت تک اسے انگریزی کے حق میں ترک کر دینے کی خواہش کا مقابلہ کرتے رہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی نوع مزاحمت پسند تھے اور اس امر کے خواہشمند تھے کہ کسی طرح زمانہ کی رفتار کو پیچھے کر دیں۔ برخلاف اس کے انہوں نے (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اپنی امکانی طاقت کے ساتھ تحریک علیگڈھ کو ترقی دی جس کے طریقے کم سے کم انگریزی تعلیم کے متعلق ان کے ذاتی خیالات سے بیحد مختلف تھے۔

مگر محض قدیم دنیا کی تہذیب، اخلاق اور وضعداری کا نمائندہ ہونا ہی کوئی ایسی بات نہیں جو منشی ذکاء اللہ کو انیسویں صدی کے قابل احترام ہندوستانیوں کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ٹھراتی ہو۔ اس اعزاز کے لئے ان کے حقیقی دعوی کا انحصار اس امر پر ہے کہ انہوں نے لبرل تعلیم کی اشاعت میں مخلصانہ اور پُرجوش کوشش کی اور اس کے اصولوں کے ساتھ نہ ڈگمگانے والی وفاداری برتی۔ اور یہ سب کچھ ایسے زمانہ میں کیا گیا جبکہ ملک غایت درجہ کی پریشانی اور انقلاب میں سے گزر رہا تھا، جبکہ لوگوں

کے خیالات منتشر اور غیر یقین ہو چکے تھے ۔

اولاً انہوں نے حیرت انگیز دور بینی کے ساتھ یہ دیکھ لیا تھا کہ خود ان کی قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ ملک ہی کو اپنا ملک خیال کرے اور اسے کسی نوع غیر ملک نہ سمجھے ۔ وہ مسلمانوں کی جانب سے علیحدگی کی ہر پالیسی کے سختی کے ساتھ مخالف تھے ۔ ان کے اعتقاد میں ایسی علیحدگی ان کے ہم مذہب کی صحیح اسپرٹ کے خلاف تھی ۔ وہ اس خیال کو برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ اسلام کے متعلق دوسرے لوگ خواہ وہ اس کے دشمن ہی کیوں نہ ہوں، یہ خیال کر بیٹھیں کہ اسلام بُردباری نہیں سکھاتا ۔ وہ چاہتے تھے کہ اسلام کے دامن سے ہر ایسا دھبّہ دور ہو جائے اور تمام دُنیا پر اس کی عجیب غریب سادگی کا نقش بیٹھ جائے ۔ اسی غرض سے وہ الہ آباد اور دہلی میں آزادی کیساتھ دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے ملا کرتے تھے اور اسی غرض سے وہ ہر بات میں مثلاً لباس طریقہ زندگی، گفتگو اور عادات میں ہندوستانی ہی رہے ان کی رائے تھی کہ وہ مادری زبان جسکا ہندو اور مسلمان یکساں طور پر مطالعہ کریں، جس میں وہ گفتگو کریں اور جس سے انہیں سچی محبت ہو، دونوں قوموں کے درمیان نہایت ہی مقدس رشتہ ہے اور انکی تمام عمر اسی رشتہ کو مضبوط کرنے میں صرف ہو گئی اگرچہ ان جیسی لیاقت کے شخص کے لئے انگریزی میں بولنا اور لکھنا آسان ترین کام تھا ۔ میں نے بارہا انہیں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سنا ہے اور اثنائے گفتگو میں وہ اُس شخص کے سے زور اور یقین کا اظہار کرتے تھے جسے اس بارے میں زندگی بھر کا تجربہ ہو ۔ انہیں اپنی قوم سے بیحد محبت تھی اور وہ اُن درسگاہوں اور تحریکوں کی مقدور بھر کوشش کرتے تھے جن کی نسبت انہیں یقین ہوتا کہ وہ تعلیمی لحاظ سے اس کی ترقی کا باعث ہونگی لیکن سب سے بڑھ کر انہیں اُس تعلیم پر اعتماد تھا جو زندگی کے ذریعہ یعنی ہمسایوں کے تعلقات مہربانی آمیز ہمدردی، معاشرتی روابط اور باہمی میل جول کے ذریعہ حاصل کیا جائے ۔ مطالعۂ تاریخ نے انپر یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح کر دی تھی کہ صرف خیالات کے ایسے امتزاج کے دَور میں جبکہ

رائے کی آزادی اور بردباری علانیہ تسلیم کرلی گئی ہو، ترقی، روشنی اور اعلیٰ تمدن ترقی کرتے ہیں۔ تاریخی تقابل کی شکل میں اگر منشی ذکاء اللہ کا اپنا تخیل پیش کیا جائے تو یوں کہا جائے گا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اکبر اعظم کا عہد معدلت گستر جبکہ مغلیہ دربار کا دروازہ ہر مذہب و ملت کے قابل اشخاص کے لئے یکساں طور پر کھلا ہوا تھا ہی وہ زمانہ تھا جسے وہ آئیڈیل کے طور پر اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ اگر وہ انگلستان میں ہوتے تو وہ گلیڈاسٹون اور برائٹ کی پارٹی کے لبرل ہوتے۔ وہ کیتھولک ایمینسی، پیشن ایکٹ یا آئرش چرچ ڈس ایسٹیبلش مینٹ جیسے قوانین کی پورے طور پر تائید کرتے۔

ثانیاً وہ دہلی کی رو بہ تنزل مغلیہ سلطنت کے متعلق اپنے تجربہ سے اور نیز اپنی عظیم الشان تاریخی تحقیقات سے اس بات کے قائل تھے کہ صرف کسی جدید اور مقابلۃً زیادہ نو عمر تہذیب کے اتصال ہی سے زندگی اور طاقت ان کی قوم میں بہ حیثیت مجموعی تمام ہندوستان میں آسکتی ہے۔ انہوں نے شروع سے بھانپ لیا تھا کہ مغربی تعلیم ہی اپنی بہترین اور پاکیزہ ترین شکل میں اس اتصال کا موقع بہم پہنچاتی ہے اور اس لئے وہ اس کے پرجوش حامی اور وکیل ہو گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کی تمام زندگی ہی اپنے ہم قوموں کو یہ اصول ثابت کرنے اور اسے عملی جامہ پہنانے میں صرف ہو گئی۔

اس مقام پر وہ تاریخی تقابل پیش کرنے کے عادی تھے۔ اپنی سرگرم آرزوؤں اور مقاصد کی تصدیق کے لئے وہ اسلامی تاریخ کے ان دوروں کو اپنی نگاہ کے سامنے رکھتے تھے جبکہ مشرق اور مغرب میں باہمی اختلاط بالکل آزادانہ تھا، مثلاً وہ اسپین میں عربوں کے حیرت انگیز کارناموں کو دیکھتے جبکہ قرطبہ مغربی یورپ کے لئے روشنی اور علم کا مرکز بن رہا تھا اور پھر مجھ سے تبسم کے ساتھ فرماتے: "ہم یورپ سے آج اس قرض کی کچھ ادائیگی واپس طلب کرتے ہیں جو اس کام کے سلسلہ میں ہمارا ان کے ذمہ نکلتا ہے۔ جسے ہم نے ازمنۂ وسطیٰ میں تمہارے لئے انجام دیا تھا۔ اس وقت آکسفورڈ اور کیمبرج کے طلبا سائنس اور ریاضی سیکھنے کے لئے اسپین جایا کرتے تھے۔

اب ہم اُسلئے تمہارے پاس آرہے ہیں"

اس فقرے میں مہربانی آمیز مذاق سے بڑھکر ایک لطیف حقیقت مضمر ہے۔ اس میں اس سچائی کا اعتراف موجود ہے کہ علم کی دولت سب کی بھلائی اور بہبودی کے لئے ہمہ گیر ملکیت ہے جو اگر آج ایک قوم کے پاس ہے تو کل دوسری کے پاس۔

رابندرا ناتھ ٹیگور نے ایک شریفانہ اور فیاضانہ مضمون کے دوران میں ہندوستان کے مستقبل کا مطلع نظر پیش کیا ہے، ایسا مطمح نظر جس میں ہندو مسلمان اور عیسائی سب مل کر موجودہ ہندوستان سے زیادہ عظیم الشان ملک تعمیر کریں۔ وہ آخری صدی کے بڑے بڑے ہیروز مثلاً راجہ رام موہن رائے جیسے اشخاص کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے ہندوستان میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی غرض سے اپنی زندگیاں بسر کیں۔ اس کے بعد وہ رقمطراز ہیں :-

"عجیب غریب فیاضانہ دل و دماغ کے ساتھ راجہ رام موہن رائے مشرق سے دست بر داری کئے بغیر مغرب کو قبول کر سکتے تھے۔ انہوں نے ہمارے لئے بنی نوع انسان کا دائمی ترکہ یعنی سچائی کا آزاد ورثہ چھوڑا ہے۔ اُنہوں نے ہندوستان کی روح کو سکڑنے نہیں دیا اور نہ اس کے گرداگرد جھاڑیاں پیدا کرکے اس کی نمو کو ٹھٹھرنے دیا۔ بلکہ اُنہوں نے اسے جگہ اور وقت کے اعتبار سے پھیلنے دیا۔ اُنہوں نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کیا، لہٰذا وہ ابھی تک ہندوستان کی ازسرنو تعمیر میں ایک قوت ثابت ہو رہے ہیں۔ کوئی اندھی عادت، کوئی بے معنی فخر اُنہیں زمانہ کی رَو کے خلاف چلنے کے مقصد سے احمقانہ جنگ کرنے پر مائل نہیں کر سکا۔ اُنہوں نے اس مقصد کا جو ماضی میں ختم نہیں ہوا بلکہ مستقبل کی جانب گامزن ہے، رکاوٹوں اور مشکلات کو ٹھکرا کر ایک ہیرو کی طرح علم بلند کیا ہے۔

یہ الفاظ زندگی کے مقابلۃً کم نمایاں حلقہ میں منشی ذکاءاللہ کے کام پر چسپاں ہو سکتے

ہیں۔ اُنہوں نے بھی مشکلات کی پروانہ کرکے آزاد خیالی کا جھنڈا بلند کیا ہے، اُنہوں نے بھی ہندوستان اور یورپ کے درمیان پل تعمیر کرنے میں امداد دی ہے اور اُنہوں نے بھی اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا ہے کہ کس طرح سے مشرق کو مسترد کئے بغیر مغرب کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

مترجمہ ضیاءالدین احمد برنی۔ بی۔ اے

خواتین ٹرکی کی آزادی اور تعلیم اسلام

جناب مولوی فضل الرحمٰن خاں صاحب بی۔ اے، ال۔ ال۔ بی (علیگ)

زمانہ حاضرہ میں سلطنت ٹرکی میں جو عظیم انقلاب پیدا ہوا ہے اس نے استبدادیت کا خاتمہ کر دیا اور اب ٹرکی ایک جمہوری نظام کے ماتحت اس ترقی کے دور میں دیگر متمدن اقوام یورپ کا مقابلہ کر رہی ہے فی الواقعی غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے ٹرکی کو تباہی سے بچا لیا اور اپنی ذاتی شجاعت اور حسن تدبیر سے اس زمانہ میں اسلام کی وہ بیش بہا خدمات انجام دی ہیں کہ اس غازی اسلام کے کارنامے صفحہ تاریخ پر زریں الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

اس ملکی انقلاب کے ساتھ ساتھ سلطنت ٹرکی میں معاشرتی۔ اقتصادی اور مذہبی انقلاب بھی شروع ہو گیا ہے۔ اور ترک قوم ایک حد تک یورپ کی "مہذب اور شائستہ" قوموں کے دوش بدوش شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے پر آمادہ معلوم ہوتی ہے۔ جو خبریں ٹرکی سے ہم کو ہندوستان پہونچتی رہتی ہیں اُن کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹرکی قوم نے جن جن اصلاحات کی تجاویز پیش کی ہیں وہ معاشرتی اور مذہبی قوانین کے متعلق ہیں۔ اس مضمون کا مبحث صرف اسقدر ہے کہ ترکوں نے طبقہ نسا کو کہاں تک آزادی دیدی ہے اور اسکا کیا انجام ہونے والا ہے؟ انشاء اللہ ہم کسی اور موقع پر ترکوں کے مذہب اور اُن کے مذہبی اصلاحات کے مطالبات پر تبصرہ کریں گے۔ کیونکہ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ترکوں نے اسلامی قانون ازدواج و قانونِ وراثت وغیرہ میں نہایت اہم تبدیلیاں کرکے نئے نئے قوانین و

ضوابط مرتب کئے ہیں اور اُن کو قابل پابندی تسلیم کر دیا جاتا ہے۔

خواتین ٹرکی کی آزادی کے متعلق کاتب الحروف نے ایک مضمون کسی انگریزی سیاح کا ایک انگریزی اخبار میں پڑھا ہے جس کا اقتباس ہدیہ ناظرین کرنا ضروری ہے۔ اس نامہ نگار کا نام مسٹر نیوٹن سن ہے اور اس نے ایک لنڈن کے اخبار میں اس انقلابی تغیر و تبدل کا فوٹو حسب ذیل الفاظ میں کھینچا ہے۔

"خواتین ٹرکی مدت دراز تک حرم سرا میں پردہ کی حالت میں قید رہنے کے بعد اب دور حاضرہ میں بالکل آزاد ہو گئی ہیں۔ خواتین ٹرکی نے اس دور حاضرہ میں ایک غیر قابل یقین تغیر اپنی معاشرت اور تمدن میں پیدا کر لیا ہے۔ جب میں پچھلے موقع پر ٹرکی میں تھا تو میں نے وہاں کی مستورات کو برقع و نقاب پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اور وہ سر سے پاؤں تک مثل مومیائی شبیہوں کے سیاہ یا ہرے برقعوں اور چادروں میں ڈھکی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بھی بمشکل دکھائی دیتی تھیں اور احتیاط اسقدر کیجاتی ہے کہ بسا اوقات اکثر عورتیں اپنے سروں کو چھتری لگا کر چھپا لیتی تھیں۔ اب یہ حالت ہے کہ ٹرکی خواتین مثل مہذب اور تعلیم یافتہ ملکوں کی خواتین کے پوشاک پہنتی ہیں اور طرز عمل رکھتی ہیں۔ اب یہ عورتیں اپنے ہونٹوں۔ رخساروں اور پلکوں کو سُرخ رنگتی ہیں۔ اپنے سر کے بالوں کو بناتی اور کاکلیں نکالتی ہیں۔ اپنی گردنوں اور سینوں کو کھلا چھوڑتی ہیں اور چست چھوٹے چھوٹے فراک پہنتی ہیں جو صرف اُن کے گھٹنوں تک پہونچتے ہیں اور وہ اپنی پنڈلیوں پر ریشمین گلابی رنگ کے موزے پہنتی ہیں۔ میں ان تمام باتوں کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہوں۔ فی الواقعی یہ بات قابل تعجب ہے کہ یہ خواتین اپنے آپ کو کس طرح زمانہ کی ضروریات کے مطابق کار بند کریں گی۔ بعض خواتین کو اس آزادی کا خمیازہ ضرور بھگتنا پڑیگا۔ مجھ کو خبر ملی ہے کہ اناطولیہ کے بعض حصوں میں اور دیگر مقامات پر ان آزاد خواتین کی علانیہ توہین کیجاتی ہے اور تمسخر کیا جاتا ہے۔ یہ خواتین پبلک کے روبرو چوٹ پیتی ہیں اور قہوہ خانوں میں جاتی ہیں اور

رات بھر ناچتی گاتی ہیں اور مردوں سے علانیہ بات چیت کرتی ہیں۔ یہ تمام آزادی ان خواتین کو چند سال کے عرصہ میں ترکی نژاد خاتون خالدہ خانم کی بہادرانہ اور ان تھک کوششوں کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ ٹھیک یہی حال ہمارے ملک کی رائے طلب کرنے والی، عورتوں کا بھی ہوا تھا اور انہوں نے بھی ایک مدت کی کوشش اور ایثار اور قربانیوں کے بعد کریہہ رسمیات اور بیہودہ پابندیوں کی جکڑ بند کو توڑ کر اپنے آپ کو آزاد کر لیا تھا"

ہم ہندی مسلمان قید غلامی میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہم کو متمدن اقوام کے تمدن و معاشرت پر نکتہ چینی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ چونکہ ہمارے اور ترکوں کے درمیان رشتہ اخوت اسلامی قانون نے پیدا کر دیا ہے اور رسول اکرم صلعم کی تعلیم نے ہم کو خواہ ہم عرب یا ترکی یا ایرانی یا ہندی نژاد ہوں ایک سلسلہ میں منسلک کر دیا ہے۔ لہٰذا بحیثیت مسلمان ہونے کے ہم کو حق حاصل ہے کہ ہم ترکی کی موجودہ معاشرتی اصلاحات پر نظر تنقید ڈالیں کہ آیا یہ قوم اپنے دعاوی میں کہاں تک حق بجانب ہیں؟ اور آیا اس نام نہاد "آزادی" کو حاصل کر لینے میں ترکی قوم خصوصاً اُن کی خواتین جادۂ اعتدال سے باہر تو نہیں ہو گئی ہیں؟

یورپ اور ایشیا کی اقوام میں گذشتہ کئی صدیوں سے آزادی حاصل کرنے کی غرض سے عظیم الشان انقلابات ہوئے ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ متمدن اقوام "نظام جمہوریت" قایم کر چکی ہیں یا کرنے والی ہیں۔ ان انقلابات کا نتیجہ اکثر اقوام یورپ کے حق میں سود مند ثابت ہوا ہے۔ مگر خال خال ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ جو اقوام اس نظام جمہوریت کی اہل نہ تھیں اُن کو قبل از وقت "جمہوریت" قائم کر لینے کی آرزو کی وجہ سے شدید نقصانات بھی پہونچ چکے ہیں۔ چنانچہ اس کی مثالیں روسی، چینی وغیرہ ملکی انقلابات کی موجودہ تاریخ پر نظر ڈالنے سے ملتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سلطنت ٹرکی جمہوریت کی اہل نہ تھی اور نہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ سلطنت ٹرکی نے قبل از وقت استبدادیت کی زنجیروں کو توڑ دیا اور نظام جمہوریت حاصل کر لیا۔ بلکہ اس مضمون میں میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس آزادی

کی رو میں ترکی نے اپنے دیرینہ معاشرتی و مذہبی قوانین کو خیرباد کہہ کر یورپ کے معاشرت اور مذہب کو آمنّا و صدقنا کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ یورپ اس بیسویں صدی کے دور میں مشرق کی "روحانیت" کا قائل ہو رہا ہے اور اُن کے معاشرتی نظام کی وجہ سے جو بداخلاقی اور بربریت کے خصائل ان متمدن اقوام میں پیدا ہو گئے ہیں اُن پر دُنیا نفرین کر رہی ہے۔ جو اخبارات ہم کو بذریعہ کتب و جرائد ہندوستان کو پہونچتے ہیں اُن سے اظہر من الشمس ہے کہ یورپ نے مذہب اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر اپنے نظام معاشرتی و تمدن میں وہ خرابیاں پیدا کر لی ہیں کہ اب اُن کی اصلاح ناممکن ہے اور ایک زمانہ وہ بھی آئیگا کہ اُن کو اپنے عیش پرستی اور بداخلاقانہ زندگی کی بدولت زمانہ کے ہاتھوں سے سخت سے سخت سزا ملیگی لہٰذا اس حالت کو دیکھتے ہوئے اقوام ترک کو یورپ کی اندھی تقلید کرنا اور اُن کے ناقص اور بداخلاقی سکھانے والے قوانین کا اتباع کرنا اُن کے لئے سخت مضر ہے۔ کاش اگر مسلمانان عالم خصوصاً ترک اقوام و ہندی مسلمان "خُذ مَا صَفَا وَ دَعْ مَا کَدِر" پر عمل کرتے تو کیا اُن کو دینی اور دُنیاوی مسرتیں حاصل نہیں ہوتیں؟ بداخلاقی اور بددینی کی زندگی سے گو انسان کے فوری اور جذباتی مقاصد حاصل ہو جاویں مگر قوانین فطرت نے ہم کو سکھلا دیا ہے کہ یہ جذباتی مسرتیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ حقیقی مسرت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے وہ صفات اور اخلاق پیدا کرے جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مستحق ہے۔

میں اس موقع پر دعوی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام کسی خاص عقیدہ یا رسم رواج کا پابند نہیں ہے۔ جو تعلیم حریت اور مساوات کی اسلام نے پیش کی ہے اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ پیغمبر خدا صلعم نے سرزمین عرب میں جمہوریت کی بنیاد ڈالی حالانکہ حضورؐ کے زمانہ بعثت کے وقت یورپ اور اقوام یورپ وحشیانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلام ایک دین فطری ہے یعنی اسلام اس قسم کے اصول اور قوانین پیش کرتا ہے جو خلاف فطرت نہیں ہیں اور

ظاہر ہے کہ اصول فطری غیر متزلزل ہوتے ہیں جن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا چنانچہ قرآن شریف میں وارد ہے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰہِ تَبْدِیلا۔ اسلام نے حریت اور مساوات کی ایسی زبردست تعلیم دی ہے کہ بنی نوع انسان میں کالے۔ گورے۔ زرد۔ گندمی رنگ والوں کا کوئی امتیاز نہیں۔ جو شخص دین فطرت یا بدیگر الفاظ اسلام کا قائل ہے وہ ہر طرح سے آزاد ہے اور اس کو حق حاصل ہے کہ وہ بلالحاظ قومیت و جنسیت حریت کا مستحق رہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حریت مساوات کیا ہے؟ حریت اور مساوات کے یہ معنی نہیں کہ انسان غیر متزلزل قوانین فطرت کی خلاف ورزی کر کے بداخلاقی اور بربریت کا جامہ پہن لے۔ انسان بہ حیثیت حیوان ناطق اور اشرف المخلوقات ہونے کے حیوان مطلق اور اس سے بھی ادنیٰ ذی حیات یا غیر ذی حیات مخلوق سے بوجوہات خاص متصف اور متبائن ہے۔ کسی سنجیدہ مذہب اور خصوصاً اسلام کی یہ تعلیم نہیں ہو سکتی کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر حیوان مطلق کی سی زندگی بسر کرے۔ میں اس بارے میں صرف اپنے مضمون کے مبحث کی طرف توجہ کرتا ہوں تاکہ اصلی مقصد فوت نہ ہو جاوے۔ ہمارے بحث حریت اور مساوات اور خصوصاً طبقہ نسواں کی آزادی پر ہے۔ اس مبحث پر دو سوالوں کے حل ہو جانے سے اور خصوصاً اسلامی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنے سے مقصد حاصل ہو جاتا ہے۔

(۱) پہلا سوال یہ ہے کہ حریت اور مساوات کسے کہتے ہیں؟ اور اس کا صحیح مفہوم کیا ہے اور زیادہ قابل قدر شئے ہے؟

(۲) دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر حریت اور مساوات قابل قدر شئے ہے تو اس آزادی کی خصوصیت کیوں کی جاتی ہے؟ لہٰذا جو مذہب ملت آزادی کے صحیح معنوں میں کسی طرح سے رکاوٹ پیدا کرے وہ دینِ فطری نہیں ہو سکتا۔

پہلے سوال کا جواب گو ہمارے مبحث کا نقطہ نظر نہیں ہے۔ مگر اس پر ضمنی مختصر بحث

کی ضرورت اس وجہ سے لاحق ہے کہ دوسرے سوال کے حل کرنے میں "حریت و مساوات" کے الفاظ بار بار لانا پڑتے ہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے "حریت و مساوات" کا مفہوم سمجھنا چاہئے۔ میرے خیال میں "حریت" یا "آزادی" کا مفہوم یہ ہے کہ ایک انسان اپنے قدرتی حقوق کو اپنی قوت ارادی کی تعمیل میں بلا کم و کاست اور بلا دوسرے شخصوں کے دباؤ کے استعمال کر کے اُن سے متمتع ہو جاوے۔ بنی نوع انسان کے "قدرتی حقوق" بہت سے قسم کے ہیں منجملہ اُن کے ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے جسمانی۔ دماغی۔ اخلاقی یا روحانی قوی کو قوانین قدرت کے ماتحت رکھ کر بام کمال پر پہنچائے کیونکہ اس میں انسان کی فنا اور بقا کا راز مضمر ہے۔ نظام تمدن یا مذاہب عالم میں اگر کوئی قانون یا اصول اس کے خلاف وضع کیا جاوے تو وہ اس قدرتی حقوق کے متضاد و منافی خیال کیا جاوے گا اور "آزادی" کا مفہوم فوت ہو جاوے گا۔ جو شخص یا کوئی نظام سلطنت اس قدرتی حق کو دبائے یا رخنہ اندازیاں کرے تو اُس کی نسبت کہا جاوے گا کہ اُس نے "آزادی" کو پامال کر دیا۔ اسی آزادی کے صحیح مفہوم کے اکتساب میں کسی جنس کی قید نہیں ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت دونوں میں سے ہر ایک کو قدرتی حق حاصل ہے کہ وہ اخلاقی۔ روحانی اور جسمانی ترقیاں کریں مگر قانون قدرت کے ماتحت رہکر۔ مرد اور عورت دونوں میں سے اگر کوئی بھی قوانین فطرت سے باہر ہو کر ترقی کرنے کا دعویٰ کرے تو اس ترقی کو صحیح معنوں میں "آزادی" کے لفظ سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ بے شک آزادی ایک بیش قیمت شے ہے کیونکہ وہ قوانین قدرت کا ایک شائبہ ہے اور جو شخص اس صفت یا حق سے محروم ہے یا اُس پر کم و بیش قیود اس آزادی کے حصول میں لازم کی گئی ہیں وہ فی الواقعی "قدرتی حقوق" کے حصول میں کوتاہ خیال کیا جاوے گا۔ کسی حکیم کا قول ہے "میں دیگر اشخاص کی آرزوؤں اور تمناؤں کے متعلق رائے قائم نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر مجھ سے دریافت کیا جاوے کہ تم کس چیز کے متمنی ہو تو میں صاف کہدونگا کہ مجھے آزادی دیجاوے ورنہ میری خواہش

موت کی ہوگی۔" بے شک یہ فقرات نہایت قابل قدر ہیں اور آزادی کے مفہوم کی قیمت کا اندازہ بحالت آزادی نہ ملنے کے موت جیسی مختتم شے سے کیا گیا ہے جس کے بعد انسانی وجود کا ہی خاتمہ ہوجاتا ہے مگر ان الفاظ سے آزادی کے منشا اور مفہوم پر کافی روشنی نہیں پڑتی جس سے معلوم ہوسکے کہ آزادی کیا شے ہے؟ اور اُس کا صحیح استعمال کیا ہے؟ مجھے انگلستان کے مشہور مُدبر برک کا قول نہایت پسند ہے۔ اُس نے نہایت مختصر اور صاف الفاظ میں آزادی کی غایت کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ "فی نفسہ آزادی بھی ایک قسم کا جوہر ہے جسکے حصول اور جائز استعمال کے لئے کچھ نہ کچھ قیود کی ضرورت لابدی ہے"۔ مدبر برک کا یہ قول واقعی نہایت قابل تحسین و آفرین ہے۔ موجودہ زمانہ کی ہل چل اور مطلق العنانی کو دیکھتے ہوئے یہ قول سونے کے حرفوں میں لکھے جانے اور اُن پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہے۔ حریت یا آزادی کے یہ معنی نہیں کہ انسان معاشرتی۔ تمدنی۔ مذہبی۔ اخلاقی۔ قوانین کو توڑ کر مطلق العنان ہوجائے اور کسی اصول یا قوانین کی پابندی نہ کرے اور مثل بہائم کے اپنی نفسانی خواہشات کا شکار ہوکر تمدنی اور معاشرتی زندگی میں بلا مہار کے اونٹ کی طرح اپنی زندگی بسر کرے لہٰذا مجھے ناظرین کو اس امر کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ جدید اقوام ترکی نے حریت اور آزادی کے صحیح مفہوم کو نہیں سمجھا اور یورپ کی کورانہ تقلید کا شکار ہوکر جادۂ اعتدال سے تجاوز کرلیا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ترک قوم کا اخلاق اور منزہ صفات جو اُن کو دیگر اقوام یورپ سے متاثر کرتی ہیں مفقود ہوجاویں گی اور مثل پیرس اور لندن والوں کے دنیا انکی بد اخلاقی اور نفس پرستی پر تمسخر اُڑائیگی۔ ممکن ہے کہ ترک قوم کو چند روز میں اپنی اس مطلق العنانی کا سبق مل جاوے اور وہ اس گمراہ راستہ سے ہٹ کر جادۂ اعتدال پر بدستور سابق آجاویں۔ اگر ہم ہندی مسلمان ان واقعات کو نظر غور سے دیکھیں اور مسٹر نیوٹن سن کے الفاظ اور مضمون کی غایت کو سمجھیں تو ہم کو نہایت شرم آنا چاہیے کہ وہ کنایتہً ترکی خواتین اور ترکی تمدن کا کن مہذب الفاظ میں خاکہ اُڑا رہا ہے۔ مجھے تو اس سیاح کے الفاظ اور

طرز بیان سے یہی غایت نظر آتی ہے کہ وہ در پردہ اسلامی تمدن و تہذیب کا مضحکہ اڑا کر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ اسلامی تمدن و تہذیب ناکارہ اور خام ہے اور یورپ کی نام نہاد "آزادی" بہترین شے اور زمانہ حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار!۔

ناظرین کرام نے سمجھ لیا ہوگا کہ حریت اور آزادی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ مجھ کو اسلامی نقطۂ نظر سے حریت اور مساوات کے مضمون پر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس مضمون پر ہزاروں کتابیں اور رسائل مجھ سے زیادہ قابل قدر اشخاص کے موجود ہیں۔ میں یہاں صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اسلام نے ہم کو عام تعلیم دی ہے کہ ہر مسلم اور مسلمہ آزاد ہے اور ایک دوسرے کا بھائی بہن ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ اسلام میں یہ حریت کا مسئلہ کوئی نئی شے نہیں ہے۔ لہٰذا میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ ابتدا اسلام سے لیکر آج تک جبکہ اسلام ہر طرف سے دشمنوں کے نرغہ میں گھرا ہوا ہے اس حریت اور مساوات کا سبق جاہل سے جاہل اور غریب سے غریب فردِ اسلام کے دل میں نہ صرف موجزن ہے بلکہ ہمیشہ سے اس پر عملدرآمد ہوتا رہا ہے اور انشاء اللہ ہوتا رہیگا۔ علاوہ ازیں میں نے لفظ آزادی کے مفہوم کو انگریزی مدبر برک نامی کے قول سے ثابت کر دیا ہے کہ "آزادی" مطلق العنانی کا نام نہیں ہے بلکہ قدرتی حقوق کو قانونِ قدرت کے ماتحت رکھکر اُن کو حاصل کرنے اور اُن سے متمتع ہونے کا نام آزادی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت کا دوسرا نام اسلامی اصطلاح میں سُنَّۃُ اللہ ہے۔ اور یہی سنۃ اللہ ہے قوانین قدرت اسلامی مذہب کا سنگ بنیاد ہیں جس کا بار بار تذکرہ قرآن شریف میں آیا ہے۔

ہمارا دوسرا سوال یہ ہے کہ جبکہ حریت اور مساوات صحیح معنوں میں قابل قدر شے ہیں تو اسلام اور تمدن اسلام اس کی جنس وار تخصیص کیوں کرتا ہے اور عورتوں کو مثل مردوں

کے کیوں آزادی نہیں دیجاتی؟ کیا وجہ ہے کہ اہل اسلام اپنی خاتونوں کو پردہ میں اور حرم میں رکھکر اور اُن پر طرح طرح کی قیود لگا کر اُن کی آزادی اور حریت کو پائمال کرتے ہیں حتیٰ کہ اُن کو ناقص العقل کا خطاب بھی دیئے جانے میں کوئی تامل نہیں کیا جاتا؟

یہ مسئلہ بہت کچھ وضاحت طلب ہے مگر مضمون کے طوالانی ہو جانے کی وجہ سے مجھ کو خوف ہے کہ طوالانی بحث اور عقیدوں سے ناظرین اکتا نہ جاویں۔ لہٰذا اس بارے میں میں نہایت مختصراً عرض کرتا ہوں کہ اس سوال کے مباحثہ میں ناظرین ہندوستان کی خواتین کی حالت اور اُن کے موجودہ تمدن و معاشرت کو پیش نظر نہ کریں۔ مسلمانان ہند اپنا ملک و تمدن کھو بیٹھے ہیں اور اُن کی موجودہ حالت کا مقابلہ اسلام کی اصل تعلیم حریت و نسائیت سے نہیں ہو سکتا۔ مسلمانان ہند میں اُن کا اصلی مذہب اور تمدن بہت کم باقی رہگیا ہے جس کے وجوہات چند در چند ہیں مسلمانانِ ہند پستی اور غلامی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ایک غیر آزاد قوم ہیں۔ لہٰذا صحیح تعلیم اسلامی پر نہ یہاں عمل ہوتا ہے اور نہ وہ بوجہ اپنے دماغی انحطاط کے اس قابل ہیں کہ وہ اپنا صحیح مسلک زندہ قوموں کیطرح قائم کر سکیں۔ البتہ دور حاضرہ میں چند شخص ایسے ہوئے ہیں جو اسلامی تواریخ و روایات سے متاثر ہو کر قوم کی اصلاح پر آمادہ ہوئے جن کی وجہ سے اب کچھ بیداری پیدا ہو چلی ہے اور ہماری امیدوں میں ایک جھلک سے پائی جاتی ہے کہ اگر تعلیمی جد وجہد جاری رہی تو ممکن ہے کہ وہ زمانہ عود کر آئے کہ ہم لوگ اسلام یا دین فطرت کا صحیح مفہوم سمجھ کر صحیح راستہ پر آجاویں۔ علاوہ ازیں مسلمانان ہند میں زیادہ تر شخص نومسلم ہیں اور ہندوستان کی آبادی کا ¾ حصہ غیر مسلم ہے لہٰذا ایسی صورت میں مذہب ہنود اور اُن کے رسم و رواجات کا رنگ ہم پر اسقدر گہرا چڑھ گیا ہے کہ اہلِ ہنود کی بہت سی باتیں ہمارے تمدن اور معاشرت میں داخل ہو گئی ہیں۔ اور چونکہ اہل ہنود کے قانون یا دھرم شاستر میں "ہندو عورت" کو مستقل حقوق پیدا نہیں ہوتے اور وہ ایک کمزور اور محکوم ہستی خیال کیجاتی ہے لہٰذا اُن کے رسم و رواج اور قانون کی تقلید بھی مسلمانوں میں اکثر ہونے لگی ہے جس کا

نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں عورت ناقص العقل خیال کی جانے لگی اور بوجہ اُنکی تعلیم و تربیت نہ ہونے کے فی الواقعی ہماری مستورات کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے ہم کو اسلامی تعلیم پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلے میں عرض کرونگا کہ اسلام یا تمدن اسلام نے حریت یا آزادی کے بارے میں جنس وار کوئی تخصیص نہیں کی۔ جن حقوق اور ذمہ داریوں کا کلام پاک اور رسول اکرمؐ کی تعلیم میں ذکر ہے وہ سب مرد و عورت دونوں پر لازم ہوتی ہیں۔ مرد و عورت کو ہر قسم کے علوم و فنون سیکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بارے میں کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ طَلَبُ العلم فریضۃٌ علیٰ کلِ مسلمٍ و مسلمۃٍ" یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے قرآن شریف کا یہ حکم بلا کسی تخصیص اور پابندی کے ہے جس کے صاف معنی بلا کسی تاویل کے یہ ہیں کہ ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ وہ ہر قسم کا علم سیکھیں۔ مزید براں رسولؐ اکرم نے جن کی حیات ہمارے لئے اسوہ حسنہ ہے اس طرح تعلیم دی ہے کہ اُطلبوُا العلم لو کانَ بالصین یعنی اُے مسلمان مرد اور عورتو! تم علم حاصل کرو اگرچہ تمہیں چین ہی جانا پڑے۔ اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ رسول اکرم نے علم کو ایسا قابل قدر اور بہترین شے سمجھا کہ تمام مسلمان مرد اور عورتوں کو ہدایت کر دی کہ علم کے حصول میں مسافت بحری و بری کا مطلق خیال نہ کرنا چاہئے یہ ایک مثال بطور نمونہ ہے۔ جو لوگ قرآن شریف کو بامعنی اور بغور پڑھتے ہیں اُن کو ظاہر ہوگا کہ اسلام نے مردوں اور عورتوں دونوں کو اکثر جگہ بلا کسی تخصیص کے مخاطب کیا ہے اور کل کلام الٰہی مردوں اور عورتوں دونوں پر قابل پابندی ہے میں بلا خوف تردید عرض کرتا ہوں کہ میں نے جہاں تک قرآن شریف کا مطالعہ کیا ہے کوئی آیت یا فقرہ ایسا نہیں پاتا جس میں عورتوں کی حریت اور آزادی کے متعلق اُن پر قیود عائد کئے گئے ہوں جن سے انکی ہستی یا حریت پامال ہو جاوے۔ بلکہ حسن معاشرت یا تمدنی زندگی بسر کرنے کے لئے یہاں تک کہدیا ہے۔ هُنَّ لباسٌ لکم و انتم لباسٌ لهنّ (سورۃ بقر)

ترجمہ - عورت اور مرد دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے یعنی معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں۔ لہٰذا اسلامی تعلیم سے ثابت ہے کہ بانی اسلام نے کوئی جکڑ بند عورتوں کی حریت اور آزادی پر نہیں لگائی اور تاریخ اسلام سے یہ ثابت ہے کہ متمدن عرب اور اسلام کی قائم کی ہوئیں جمہوریات اور سلطنتوں میں عورتوں نے ہر شعبہ میں قابلِ فخر حصے لئے ہیں اور اسلامی تاریخوں کے صفحات بیشتر اُن کے کارناموں سے مملو ہیں - اب ہمارے مبحث کا صرف اسقدر حصہ سوال باقی رہتا ہے کہ مسلمین اپنی خاتونوں کو پردہ اور حرم میں کیوں رہتے ہیں؟ کیا یہ اُن کی آزادی پر صریح قیود نہیں ہیں؟ اگر اقوامِ ترک نے اپنی خاتونوں کو اس بارے میں آزاد کر دیا تو کیا بُرا کیا اور ہم ہندی اُن کے فعل پر کیوں معترض ہوتے ہیں؟

قبل اس کے کہ ہم اس اہم مضمون پر کچھ عرض کریں ہمارے لئے بسا ضروری ہے کہ پردہ کے متعلق آیات قرآنی کو نظر تعمق سے دیکھا جاوے کہ آیا اسلام نے اس بارے میں کوئی پابندی کی ہے یا کسی طرح اس بارے میں عورتوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ محض پردہ میں بیٹھی رہیں اور کوئی جسمانی - دماغی اور روحانی ترقی نہ کریں؟

اس بارے میں کلام پاک کے مطالعہ سے مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کی عصمت کے متعلق نہایت تنبیہی الفاظ میں اُن کو پاکدامن رہنے کی فہمائش کی ہے اور فحش اور بے حیائی کو بدترین گناہ خیال کیا ہے - چنانچہ زانی اور زانیہ کو سخت سزائیں دینے کا حکم ہے - فی الواقعی فحش اور بدکاری کی زندگی مرد اور عورت دونوں کے لئے کسقدر نازیبا ہے - کیونکہ بغیر تعلق ازدواج کے ناجائز طریقہ سے عورتوں کے ساتھ معاشرت رکھنا کسقدر کریہہ اور مذہبی اور اخلاقی نقطہ نظر سے معیوب ہے - جہاں تک میں نے پڑھا اور غور کیا ہے کلام پاک میں عورتوں کو چار دیواری کے اندر رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق قرآن پاک میں حسب ذیل آیات موجود ہیں۔

سورہ نور میں ایک مقام پر صرف مردوں کو یہ حکم دیا ہے قُل للمؤمنینَ یغضوا من ابصارِھِم ویحفظوا فروجھم ذالک ازکیٰ لھم۔ ان اللہ خبیرٌ بما یصنعون (ترجمہ) (اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ اس میں اُن کی زیادہ صفائی ہے۔ لوگ جو کچھ بھی کیا کرتے ہیں اللہ کو سب خبر ہے۔ اس میں دوسری جگہ یہ حکم ہے۔ وَقُل للمومنت یغضُضنَ مِن ابصارِھن ویحفظنَ فروجھن ولا یُبدینَ زینتھِنّ الا ما ظھر منہا ولیضربن بخمرھنّ علیٰ جیوبھنّ وَلَا یُبدِینَ زینتھنّ الّا لبعولتھنّ اَوْ آبائِھنّ الخ (ترجمہ) اور (اے پیغمبر) مسلمان عورتوں سے کہو کہ وہ بھی اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنے زینت کے مقامات کو ظاہر نہ ہونے دیں مگر اس میں سے جو چار و ناچار کھلا رہتا ہے اس کا ظاہر ہونے دینا مضائقہ کی بات نہیں ہے۔ اور اپنے سینوں پر دوپٹوں کے بکل مارے رہیں اور اپنے زینت کے مقامات کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں یا اپنے باپ وغیرہ پر الخ۔ سورۂ احزاب میں ایک مقام پر یہ آیت ہے کہ یا ایھا النبیّ قُل لِاَزواجِکَ وَبناتِکَ وَنِساءِ المومنین یُدنینَ علیھنّ مِن جلابیبھنّ ذالک ادنیٰ اَن یُعرفن فلا یُوذینَ۔ وکانَ اللہ غفوراً رحیما۔ (ترجمہ) (اے پیغمبر) اپنی بیبیوں۔ بیٹیوں۔ اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہدو کہ اپنی چادروں کے گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ اس سے غالباً یہ الگ پہچان پڑینگی کہ نیک بخت ہیں اور کوئی چھیڑے گا نہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس آیت کا شان نزول یہ ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں مدینہ کی ایسی حالت تھی۔ جیسے ہمارے یہاں دیہات کی۔ گھروں میں بیت الخلا نہیں تھے۔ شریف زادیاں قضاء حاجت کے لئے جھٹ پٹے کا وقت دیکھ کر آبادی کے باہر چلی جاتی تھیں اور بدکار اور فاجر شخص کسی عورت آتے جاتے دیکھ پاتے تو اس کو تنگ کرتے تھے اور اُن کو فہمائش کیجاتی تھی تو وہ جواب دیتے تھے

کہ ہم نے لونڈی سمجھا تھا۔ اس طرح کی چھیڑ چھاڑ کی انسداد کے لئے شروع میں یہ حکم دیا گیا کہ شریف زادیاں گھونگھٹ نکال لیا کریں۔ پھر اسلام کی ترقی کے ساتھ مدینہ بڑا شہر ہو گیا اور لوگوں نے گھروں میں بیت الخلا بنائے۔ اور مستورات کو قضاء حاجت کے لئے بستی کے باہر جانے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ اس آیت کے مطالب سے صاف ظاہر ہے کہ حضور صلعم کے زمانہ میں بھی عورتوں کو باہر نکلنے کی کوئی ممانعت نہیں تھی اور تاریخ اسلام سے بھی ثابت ہے کہ وہ باہر نکل کر ہر طرح کا کام کاج کرتی تھیں اور محض مقتضاء وقت کی وجہ سے اُن کو چادریں اوڑھنے کا حکم ہوا تھا۔ لہٰذا کلام پاک کے اِن احکامات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ عورتوں کو چاردیواری میں رہکر زندگی بسر کرنے کا کہیں حکم نہیں ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ عورت اور مرد بالکل آزاد ہیں مگر عصمت اور پاکدامنی کی زندگی بسر کرنا دونوں فریق کے لئے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ اس بارے میں اسلام کی تعلیم کا لبّ لباب صرف اسقدر ہے کہ مرد و عورت دونوں نگاہ بد جس سے بیحیائی پیدا ہوتی ہے ایک دوسرے پر نہ ڈالیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے اور بلا کسی حجاب و رکاوٹ کے شریک جلسہ ہونے سے ایک دوسرے کے حیوانی جذبات کے مشتعل ہو جانے کا ہر وقت اندیشہ رہتا ہے جس کا نتیجہ بداخلاقی اور بددینی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کاش ہم مسلمانان جادۂ اعتدال پر قائم رہتے اور اس مادہ پرستی کے دور میں اہل مغرب کی معاشرتی و مذہبی قوانین و ضوابط کو راتہ تقلید سے پہلوتہی کرتے اور محض اسلامی تعلیم اور اس کی روایات کو پیش نظر رکھ کے دینی و دنیاوی حسنات حاصل کرتے۔

غزل

جناب نواب فصاحت جنگ حضرت جلیلؔ مانکپوری استاد خسرو دکن
خلد اللہ ملکہٗ

گرچہ دل میں کوئی پیکاں نہیں قاتل باقی
لوٹتا ہوں کہ ابھی ہے خلش دل باقی

بجھ گئی آتش گل باد خزاں کے ہاتھوں
رہ گئی گرمی فریاد عنادل باقی

کام کرتا ہے وہ تجھکو سر مقتل جس سے
نام رہ جائے لب زخم پہ قاتل باقی

جس طرح پارہ اخگر ہو تہ خاکستر
دل ہوا خاک مگر ہے تپش دل باقی

ہو چکی جامہ دری دست جنوں بڑھ آگے
لطف کیا رہ گئے گر طوق سلاسل باقی

تم دئیے جاؤ مجھے تیغ ادا کے چرکے
میں کہے جاؤں ابھی ہے ہوس دل باقی

تن بسمل سے نکلتی جو نہیں جان حزیں
بات یہ ہے کہ تری یاد ہے قاتل باقی

رنگ کہتا ہے غریبوں کی دل آزاری کا
انکے پہلو میں ابھی تک ہے وہی دل باقی

اس تصور سے کہ ہنگام سحر کیا ہوگا
شمع گھلتی رہی جبتک رہی محفل باقی

خون آنکھوں سے ٹپکتا ہے میں خوش ہوتا ہوں
یہ سمجھ کر کہ ابھی ہیں جگر و دل باقی

قدر عشاق نہ کیوں شمع رخوں ہو جلیلؔ
انہیں پروانوں سے ہے رونق محفل باقی

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

قرونِ وسطیٰ میں ہندوستان کی ڈاک

(از جناب سید حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر شمع)

(بہ سلسلۂ سابق)

آجکل ڈاک کا جو مفہوم ہے قطعی جدید ہے، ابتدا میں یہ محض سرکاری محکمہ تھا، جو سلطنت کے مختلف مقامات کے درمیان تعلقات کے قیام اور وہاں کی خبریں لینے کی غرض سے جاری ہوا تھا۔

ہندوستان میں ۱۸۳۷ء تک ڈاک، عام طور پر مروج نہ تھی، اور پیام رسانی کا کام سرکاری یا نجی ہرکارے انجام دیتے تھے، امپیریل گزیٹیر میں ذکر ہے کہ "قاصد، نامہ بر اور ہرکارے ڈاک کا کام اچھی طرح انجام دیتے تھے، اور یہی طریقہ اس ملک میں عرصہ تک رائج تھا اور کامیاب تھا، یہ کہنا مشکل ہے کہ ہندوستان میں اس کی ابتدا کب سے ہوئی، لیکن تاریخی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے پٹھان بادشاہ علاء الدین خلجی کے عہد میں ڈاک کا محکمہ موجود تھا، سلطان علاء الدین خلجی ۱۲۹۶ء میں تخت نشین ہوا تھا، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ سلطان نے گھوڑوں اور پیادوں کے ذریعہ سے ڈاک کا انتظام کیا تھا تاکہ جب کبھی اور جہاں کہیں سلطانی افواج پر چڑھائی کریں، تو ان کے حالات اور جنگ کے واقعات کی اطلاعیں سلطان تک پہنچتی رہیں، اسی محکمہ کے ذریعہ سے

اشیار بازاری کا نرخ، اور سلطنت کے حالات کی اطلاعات دربار میں آتی تھیں،

سلطان محمد تغلق کے عہد میں ڈاک کا محکمہ کامیابی کے ساتھ جاری تھا چنانچہ اس کی شہادت ابن بطوطہ کے سفرنامہ میں ملتی ہے، ابن بطوطہ ۱۳۴۱ء میں ہندوستان آیا تھا اس کا بیان ہے "اس ملک یعنی ہندوستان میں قاصدوں کی دو قسمیں ہیں سوار، اور پیادہ سوار قاصد، سلطانی لشکر سے تعلق رکھتے ہیں اور ہر چار میل پر تعینات رہتے ہیں، پیادہ قاصد ایک میل کے فاصلہ سے تعینات رہتے ہیں اور تین میل تک جاتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں چابک رہتا ہے جس میں گھونگرو لگے ہوتے ہیں، اور دوسرے ہاتھ میں ڈاک کا تھیلا ہوتا ہے۔ یہ لوگ چابک کو ہلاتے ہوئے دوڑتے ہیں اور ڈاک کی قریب ترین چوکی تک جاتے ہیں، اور وہاں چابک کو ہلاتے ہیں، گھونگرو کی آواز سنکر دوسرا قاصد دوڑتا ہے اور ڈاک کا تھیلا لیکر اسی طرح چابک کو بجاتا ہوا آگے کی ڈاک کی چوکی کی طرف روانہ ہوتا ہے، اس طرح پر سلطان تک ڈاک پہنچ جاتی ہے اور وقت بھی کم صرف ہوتا ہے۔

شہاب الدین ابو العباس احمد نے، جو ابن بطوطہ کا ہمعصر تھا، اسی قسم کی تفصیل لکھی ہے، ڈاک کے سلسلہ میں مسلمان مورخین نے سکندر لودی (۱۴۸۸ء لغایتہ ۱۵۱۸ء) اور بابر کا بھی نام لیا ہے، سکندر لودی نے "ہر جگہ ڈاک کی چوکیاں قائم کردی تھیں۔ اس کی فوج جہاں کہیں جاتی تھی، روزانہ دو مرتبہ سلطانی فرامین وصول کرتی تھی، جو فرمان علی الصبح پہنچتا تھا اس میں دن بھر کے کوچ کے بعد قیام کے متعلق ہدایتیں ہوتی تھیں، اور دوسرے پیغام میں جو تیسرے پہر وصول ہوتا تھا احکام ہوتے تھے" یہ طریقہ سختی سے جاری تھا، ڈاک چوکی پر گھوڑے تیار رہتے تھے، اور سلطان کو ملک کے ہر پرگنہ کے حالات، اور اشیار کے نرخ کی اطلاعات روزمرہ پہونچتی تھیں، شہنشاہ بابر نے آگرہ سے کابل تک کی سڑک کی پیمایش کا حکم دیا تھا، چنانچہ بابر نامہ میں ذکر ہے کہ ستر دسمبر ۱۵۲۸ء کو بادشاہ نے یہ حکم صادر فرمایا، اور اسی دن چقماق بیگ روانہ ہوگیا، کام کا طریقہ یہ تھا "ہر نو کروہ کے فصل

پر ایک مینار بنایا جائے جو چوبیس فیٹ بلند ہو، اور اس کی چوٹی پر چار طرف چار دروازے ہوں، اور ہر اشارہ کردہ پرچہ گھوڑے تیار رہا کریں۔ گھوڑوں کے دانہ اور سائیسوں وافسران ڈاک کی تنخواہ کا معقول بندوبست کیا جائے" لیکن یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس اسکیم کا کیا نتیجہ نکلا،

شیر شاہ (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) کی حکومت مسلمانوں کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتی ہے، اسی عہد میں سیاسی اور اقتصادی ترقیاں ہوئی تھیں، اور حکومت و انتظام کے جدید قواعد بنائے گئے تھے، شیر شاہ نے سراؤں، سڑکوں، اور پلوں کے علاوہ سوار قاصدوں کا انتظام بھی کیا تھا جو ملک کے ہر گوشہ میں موجود رہتے تھے، اور ملک کے بعید ترین مقامات سے بھی اس کو روزانہ اطلاعات پہنچتی رہتی تھیں، مختلف سڑکوں پر تقریباً سترہ سو سرائیں موجود تھے ہر سرا میں دو گھوڑے تیار رہتے تھے تاکہ خبریں جلد پہنچائیں، یعنی صرف خبر رسانی کے لئے ملک میں تین ہزار چار سو گھوڑے روزانہ دوڑتے تھے، شہنشاہ اکبر (۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء) غالباً پہلا بادشاہ تھا جس کے عہد میں ڈاک لیجانے کے لئے اونٹ استعمال ہوئے، آئین اکبری کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی میں ڈاک کے انتظام بہت معقول تھا" ریباڑی، ہندوں کا ایک فرقہ ہے، یہ لوگ اونٹوں کی عادات سے خوب واقف ہیں، اور دیسی اونٹ یعنی لوک کو تیز قدمی سکھا لیتے ہیں، اگرچہ سلطنت کے حدود سے پایہ تخت تک ہر طرف گھوڑوں کی قطاریں تیار کھڑی رہتی ہیں اور تیز قدم ہرکارے ہر چار کوس پر تعینات رہتے ہیں لیکن محل شاہی میں چند اونٹ بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں" یوروپین سیاحوں میں انگزینڈر ہیملٹن ایسا شخص ہے جس نے سترہویں صدی میں ہندوستان پہنچ کر یہاں کی ڈاک کے حالات کو مشرح طور پر بیان کیا ہے۔

"مغلوں کی سلطنت میں ڈاک بہت تیز جاتی ہے، کیونکہ شاہراہ پر ہر دس میل کے فاصلہ سے کاروان سرائیں بنی ہوئی ہیں، جہاں نہایت تیز قدم آدمی ہر وقت تیار کھڑے

رہتے ہیں مطلا بکسوں میں خطوط رکھ کر اپنے سر پر لیجاتے ہیں، سرائے میں پہنچ کر دوسرا ہرکارہ اس بکس کو لے لیتا ہے اور دوسری سرائے کی طرف روانہ ہو جاتا ہے، تمام رات اور دن یہی سلسلہ جاری رہتا ہے، ان لوگوں کی رفتار پانچ چھ میل فی گھنٹہ ہے، اور آٹھ دن کے اندر سلطنت کے بعید ترین گوشوں سے پائے تخت تک خطوط پہونچ جاتے ہیں۔

مغلوں کے زمانہ میں اخبار نویسوں کی کئی قسمیں تھیں (۱) وقائع نویس، یا وقائع نگار (۲) سوانح نگار (۳) خفیہ نویس اور (۴) ہرکارے۔ یہ لوگ تمام ملک کی خبریں لاتے تھے، ان کے افسر اعلیٰ کا عہدہ دار وغہ ڈاک چوکی کے نام سے موسوم تھا، تمام خطوط اور ڈاک اسی کے پاس آتی تھی اور وہ سربمہر حالت میں اُن کو وزیر کی خدمت میں پیش کرتا تھا تاکہ پادشاہ تک پہنچ جائیں، ایک فارسی قلمی تاریخ میں مذکور ہے کہ وقائع ہفتہ میں ایک بار، سوانح اور ہرکاروں کے اخبار، مہینہ میں (؟) ایک بار اور نال میں رکھکر تحریرات مہینہ میں دو بار وصول ہوتی تھیں، ضروری امور کی اطلاعات ان کے علاوہ ہوا کرتی تھیں، ملک کے مختلف صوبوں سے پائے تخت کو خبریں پہونچانے کے لئے معقول اور مستقل انتظامات ہوتے ہوں گے، کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی کی تصنیف مراتِ احمدی مصنفہ محمد علی خاں، دیوان گجرات میں ڈاک کی ترتیب اور باقاعدگی کا مفصل ذکر ہے، اس تصنیف کی رُو سے، صوبہ کا اخبار نویس کے پاس ہر شہر اور ضلع سے اخبار وصول ہوتے تھے شام کو اُس کے پاس تمام اطلاعات جمع ہو جاتی تھیں، اور وہ اونٹ سوار کے ذریعہ سے اُنکو دربار میں بھیجدیتا تھا۔ سوانح نگار کے دفتر میں افواہ قلمبند ہوتی تھیں، اور صوبہ دار کے ساتھ ہرکارے بھی رہتے تھے۔ ڈاک کی چوکیوں کا سلسلہ احمد آباد سے اجمیر کی سرحد تک قائم تھا، جہاں ہر چوکی پر، آدمی اور گھوڑے تیار رہتے تھے اور شاہی ڈاک کو سات دن کے اندر شاہجہاں آباد پہنچا دیتے تھے، اسی طرح ڈاک کا ایک اور سلسلہ تھا جو بھروچ ہو کر دکن تک پھیلا ہوا تھا،

کرنل ولکس کا بیان ہے کہ راجہ چک دیو نے جو ۱۶۷۲ء میں تخت نشین ہوا تھا مسلسل ڈاک رسانی کا انتظام میسور میں کیا تھا، اور وہاں پر ڈاک خانہ صرف خبریں پہنچانے کا کام نہیں کرتا بلکہ خبریں حاصل بھی کرتا تھا، پوسٹ ماسٹر اور اس کے عملے علاوہ اپنے فرائض کی انجام دہی کے، حکومت کے معتبر ملازم تھے جو اپنے شہروں کی خفیہ باتوں سے حکومت کو مطلع کرتے رہتے تھے، حیدر علی کے زمانہ میں تو اس طریقہ کو بہت زیادہ کامیابی ہو چکی تھی،

ہندوستان میں قرون وسطیٰ میں ڈاک محض سرکاری اغراض کے لئے تھی۔ نجی کاموں کے لئے نہ تھی، نجی خطوط کو خاص آدمی لاتے اور لیجاتے تھے جو مخصوص تجارتی شہروں میں ملتے تھے، ممکن ہے کہ سرکاری ہرکارے بھی نجی خطوط کو معاوضہ لیکر لاتے لیجاتے ہوں، نجی خطوط لیجانے والوں کے نام مختلف تھے، کہیں اُن کو قاصد کہا جاتا تھا کہیں پتامبر اور کہیں ہرکارہ۔

پیٹر منڈی کے زمانہ میں (۱۶۲۸ء لغایتہ ۱۶۳۴ء) بازاری قاصد پٹنہ سے آگرہ تک گیارہ اور پندرہ دن کے درمیان میں خط پہنچا دیتے تھے، اور تیز رفتار قاصد دہلی سے سورت پندرہ بیس دن میں پہنچتے تھے، گوا سے ماسولی پٹم تک پتامبر بیس دن میں جاتے تھے۔ ڈاکٹر فرائر کا بیان ہے کہ دکن میں صرف پتامبر پیدل ڈاک لے جاتے تھے۔

۱۶۱۲ء میں عام ڈاک کا رواج ہوا، نجی خطوط کو کمپنی کے چپراسی (قاصد اور پتامبر) بمحصول ڈاک لیکر جاتے تھے، انگریزوں کو ابتدا میں بہت دقت ہوئی۔ اور مجبوراً قاصدوں کو نوکر رکھنا پڑا، لیکن ۱۶۸۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے مدراس اور بمبئی میں ڈاکخانہ قائم کر دیئے تاکہ سوداگروں اور خود کمپنی کو سہولت ہو، کمپنی کو اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا بھی مدنظر تھا۔ کمپنی کی طرف سے بمبئی میں حسب ذیل ہدایات شائع

ہوئی تھیں "ہم چاہتے ہیں کہ اس طرح تم بھی ڈاک خانہ قائم کرو، جہاں سے خطوط روانہ ہو سکیں اور جہاں پہونچ سکیں، اور ایک خط کے مقابلہ میں دو اور تین خطوط پر دوگنا اور تین گنا محصول لگاؤ، تاکہ چند سال کے عرصہ میں کمپنی کی آمدنی بہت زیادہ ہو جائے اور سوداگروں کو بہت زیادہ آرام اور سہولتیں حاصل ہو جائیں۔ اس کام کے لئے تم کو مناسب مقامات پر چوکیاں قائم کرنا، اور کشتیوں کا بھی انتظام رکھنا چاہئے تاکہ سورت اور بمبئی کے درمیان میں خطوط باسانی اور بہ حفاظت بھیجے جا سکیں۔ اور توقف بھی نہ ہو" مدراس کو بھی اسی قسم کی ہدایتیں بھیجی گئی تھیں، چنانچہ وہاں پر ۱۷۱۲ء میں ڈاک خانہ قائم اور مختلف مقامات کے درمیان میں خط و کتابت کے سلسلے جاری ہو گئے۔ پہلے مدراس سے بنگال میں خط دو تین مہینہ میں آتا تھا، لیکن اب تیس ۳۰ دن میں آنے لگا۔ ابتدا میں جو محصول مقرر ہوا تھا اس کا پتہ نہ چل سکا، لیکن ۱۷۲۰ء میں جو محصول رائج تھا حسب ذیل تھا۔

قلعہ سینٹ جارج سے	وزیگا پٹم کو	چار فانم
" " " "	بنگال کو	چھ فانم
" " " "	بمبئی اور سورت کو	نو فانم

اس کے بعد کے حالات ہم کو معلوم نہیں، لیکن لارڈ کلایو کے زمانہ میں پہلی مرتبہ ۱۷۶۶ء میں مستقل طور پر ڈاک کا سلسلہ قائم ہوا، اس کے متعلق جو حکم ہے اس کی سرخی تھی، "ڈاک کے بہتر انتظام کے لئے"، اور حکم تھا کہ آئندہ سے ڈاک گورنمنٹ ہاؤس سے روانہ کی جائے۔ پوسٹ ماسٹر یا اس کے ماتحت دن رات حاضر رہکر ڈاک کو چھانٹیں اور روانہ کریں، اندرون ملک کے مختلف مقامات کے خطوط کے الگ الگ گڈیاں بنائی جاویں اور تھیلوں میں بھر کر سربمہر کر دیئے جائیں، مہر کمپنی کی ہو، اور سوائے افسران محکمہ کسی کو ان کے کھولنے کی اجازت نہ ہو، نیز یہ بھی حکم تھا کہ یہی قواعد کلکتہ کو ڈاک روانہ کرتے وقت عمل میں لائے جائیں،" بعد کو اور بھی قواعد مرتب ہوئے جن کا مقصد ڈاک کو جلد تر اور زیادہ حفاظت

سے پہنچانا تھا، وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں اور زیادہ ترمیم ہوئی۔ اور ۱۷۷۴ء میں کلکتہ
میں ایک پوسٹ ماسٹر جنرل مقرر ہوا، اور ڈاک کا ادنیٰ ترین محصول دو آنہ فی سو میل قرار
دیا گیا۔ اور تانبے کے دو آنے والے ٹکٹ خاص طور پر سکوک کئے گئے۔ وارن ہیسٹنگز
نے ۱۷۸۴ء میں ڈاک کے قواعد کو ترمیم کیا اور ۱۸۳۷ء تک مختلف قسم کے ردوبدل ہوتے
رہے۔ لیکن اس سنہ میں ڈاک کا انتظام گورنمنٹ نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور محصول
لیکر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حدود کے اندر ڈاک پہنچانے کی خود ذمہ دار ہو گئی۔

۱۷۸۵ء سے کئی سال قبل مدراس اور بنگال کے درمیان ہفتہ میں دو بار ڈاک کا
سلسلہ جاری ہوا تھا، لیکن اب تک مدراس اور بمبئی یا بمبئی اور کلکتہ کے درمیان کوئی مستقل
سلسلہ نہیں تھا۔ یورپین سوداگروں کی عرضداشت کا لحاظ کر کے گورنمنٹ نے مدراس اور بمبئی
کے درمیان ۱۷۸۸ء میں سلسلۂ ڈاک جاری کر دیا جو پندرہ روزہ تھا، حیدرآباد اور پونا ہو کر ڈاک
آتی جاتی تھی اور پورے پچیس ۲۵ دن لگتے تھے ۱۷۹۰ء میں ہفتہ وار ڈاک کر دی گئی اور راستہ
بھی بدل دیا گیا اب ڈاک بمبئی سے ماسولی پٹم اور وہاں سے کلکتہ اور مدراس کو جانے لگی۔ اس
طرح وقت میں بھی کفایت ہو گئی اور کلکتہ سے بمبئی چھبیس ۲۶ یوم میں، اور بمبئی سے مدراس
سترہ یوم میں اور مدراس سے کلکتہ کو انیس یوم میں ڈاک آنے جانے لگی۔ ڈاکیہ ہمیشہ پیدل
چلتے تھے، اُن کا ایک کوس سات آٹھ میل کا ہوتا تھا، اور چوبیس گھنٹہ میں عموماً ستر میل
کی مسافت طے کرتے تھے۔

ڈاک کے محصول کی شرح فاصلہ اور ڈاک کے وزن کے لحاظ سے مقرر ہوتی تھی لیکن
ان میں جلد جلد ردوبدل ہوتا رہتا تھا ۱۷۸۸ء میں مدراس اور بمبئی کے درمیان میں
حسب ذیل شرح تھی۔

ایک خط	عہ ر
دو خط	للعہ ر

تین خط

پارسل پیکٹ کی شرح للعہ/ اونس تھی ۱ نومبر ۱۸۵۹ء کے بعد ڈھائی تولہ تک کی ڈاک کی شرح یہ تھی۔

بمبئی سے پونا تک ۵۲ کوس ۲/
" " حیدرآباد تک ۲۲۲ کوس ۸/
" " ماسولی پٹم تک ۴۳۱ کوس ۱۲/

ماسولی پٹم سے مدراس تک ۳۲۳ میل ۳ فانم ۴/
" " گنجم تک ۴۲۸ میل ۴ فانم ۸/
گنجم سے کلکتہ تک ۳۰۵ میل ۵/

ڈھائی تولہ سے ساڑھے تین تولہ تک کے خطوط کی شرح دوگنی تھی۔ ساڑھے تین تولہ سے ساڑھے چار تولہ تک شرح تن گنی تھی۔ ساڑھے چار تولہ سے ساڑھے پانچ تولہ تک چوگنی تھی۔ اور علیٰ ہذا القیاس ۱۸۵۹ء میں شرح حسب ذیل تھیں۔

کلکتہ سے	اگر ڈھائی تولہ اور اس سے کم وزن ہو
بارک پور	۱/
راج محل	۳/
پٹنہ	۵/
بنارس	۷/
ڈھاکہ	۳/
چاٹگام	۶/
بمبئی	۹/
مدراس	۰۲/

ڈہائی اور ساڑہے تین تولہ کے درمیان خطوط شرح ڈبل تھی، ساڑہے تین اور چار تولہ کے درمیان تین گنی تھی اور علیٰ ہذا ۱۸۰۹ء میں شرح میں پھر تبدیلی واقع ہوئی روپیہ سے کم وزن کا خط ایک خط روپیہ اور ڈیڑھ روپیہ کے درمیان وزن ہو تو دو خط، اور ڈیڑھ اور ڈہائی کے درمیان وزن ہو تو تین خط شمار ہوتے تھے ۔ ایک خط پر سو میل کا محصول ڈیڑھ قائم تھا، لیکن ۱۸۵۴ء میں فاصلہ کا سوال نظر انداز کر دیا گیا ۔ اٹھارہویں صدی سے قبل وزنی پارسلوں کے بھیجنے کا بھی قاعدہ مقرر تھا ۔ پارسل بہنگیوں میں جاتے تھے اور اس طریقہ کو بہنگی ڈاک کہتے تھے، اور انگلستان میں پارسل کا قاعدہ رائج ہونے سے ایک سو سال قبل ہندوستان میں اس طریقہ کو رواج تھا، ڈاک کی بہ نسبت پارسل کی رفتار کم تھی ۔ لیکن اگر گھڑی کو مرمت کے لئے الہ آباد سے کلکتہ بھیجتے تھے تو وہ ایک مہینہ میں بن کر آجاتی تھی ۔ فقط

(ترجمہ)

غزل

(مصوّرِ جذبات حضرت میرزا ثاقب لکھنوی)

اہلِ غم سے عشرتِ عالم کا ساماں ہو گیا
جب زمیں کے داغ اُبھر آئے گلستاں ہو گیا

اپنی حد سے بڑھ کے جاتا کس طرف کو دل مرا
جان پڑتے ہی یہ مُشتِ خاک ہیجاں ہو گیا

اتحادِ باہمی کا ہے نتیجہ زندگی
ذرّے کیا شے تھے مگر ملنے سے انساں ہو گیا

مٹ گئے دورِ فلک سے جاں نثاروں کے مزار
آپ کا آباد ویرانہ بیاباں ہو گیا

ایک قطرہ بحرِ عصیاں کا تھا جو یوں سر چڑھا
چلتے چلتے دامنِ عالم میں طوفاں ہو گیا

عشق کے بعد اب حوادث کی ضرورت کیا رہی
آسماں دم لے مرے مرنے کا ساماں ہو گیا

کاروانِ اشک کو میں ڈھونڈنے جاؤں کہاں
دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے پنہاں ہو گیا

اک بلائے بد تھی ایسی زندگی جو کٹ گئی
زندہ باش اے مرگ دردِ دل کا درماں ہو گیا

زخمِ دل پہلے ہی دامن دار تھا پر حشر میں
موقعِ فریاد پا کر چاکِ داماں ہو گیا

سیرِ عالم کے لئے کچھ چھوڑ اے دستِ جنوں
اب تو دامن کی جگہ میرا گریباں ہو گیا

سیکڑوں داغوں کے دھبّے ہیں وہ جگر اب کہاں
دل مٹا اور مٹ کے بھی صحنِ گلستاں ہو گیا

حشر میں پہچان کر قاتل کا منہ تکتا رہا
جب ضرورت ہوش کی دیکھی تو حیراں ہو گیا

خفتگانِ خاک کتنا بے محل سوئے کہ اب
مجمعِ احباب اک خوابِ پریشاں ہو گیا

انقلاب آ کر مدد دیتے ہیں استعداد کو
کروٹیں بدلیں لہو نے اور انساں ہو گیا

راستہ وحشت کو آخر مل گیا تنگی میں بھی
یہ گریباں تھا جو دو ہاتھوں میں داماں ہو گیا

بلبلو نکلے دل گلوں کے ساتھ مٹی میں ملے
جو چمن اُجڑا وہی گورِ غریباں ہو گیا

دل تو ہے سینہ میں پر جمعیتِ خاطر کہاں
اس کا شیرازہ تو زلفوں سے پریشاں ہو گیا

وسعتِ صحنِ جہاں کچھ کم نہ تھی اے عشق دوست
کیوں گھٹا اتنا کہ دل والوں کو زنداں ہو گیا

باغباں کی رائے میں میں بے حقیقت تھا مگر
بعد میرے آشیاں داغِ گلستاں ہو گیا

رک چلا ہے بیچ میں خنجر الٰہی خیر ہو
دم نہ نکلے گا اگر قاتل پشیماں ہو گیا

ہم کو صحرا نے غباری پیرہن پہنا دیئے
جن کا کچھ ساماں نہ تھا انکا بھی ساماں ہو گیا

جب کوئی آنسو مژہ پر آکے چمکا شامِ غم
میں یہ سمجھا صبح کا تارا نمایاں ہو گیا

شکر شانے کا کروں یا صبر کو ڈھونڈوں کہیں
زلف تو سمٹی مگر ہاں دل پریشاں ہو گیا

کم سے کم پر آج راضی ہیں شہیدوں کے مزار
آپ ہنس دینگے تو سمجھیں گے چراغاں ہو گیا

جس میں لاکھوں پھول تھے ثاقب وہ گلشن ہائے ہائے
ایک ہی گردش میں گردوں کی بیاباں ہو گیا

علما کی صحبت

تقریر جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے، ناظم محکمۂ آثار قدیمہ حیدرآباد دکن اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسہ کے موقعہ پر مورخہ ۷ نومبر ۱۹۲۶ء میں فرمائی۔

سید جمیل حسن، ایم۔ اے،

جناب صدر انجمن صاحب و معزز حاضرین اور عزیز طالب علمو! آپ کے لائق صدر نے چند روز ہوئے جب وہ بلدے تشریف لے گئے تھے۔ مجھ سے ازراہ کرم فرمایا تھا کہ یورپ کے علمار کی صحبت سے جو اثر میرے دل پر ہوا۔ اس کا ذکر اس جلسے میں آپ کے سامنے کروں، اُن علمار کی سادہ اور بے لوث زندگی، علمی تبحر، مطالعے میں انہماک اور تحقیق کا شوق ایسی خصوصیات ہیں جو ہندوستان کے طالب علم کو خواہ اس نے مغربی طرز کے مدارس میں تعلیم پائی ہو۔ یا ایشیائی مکتبوں اور آشرموں میں پروان چڑھا ہو، ضرور عجیب نظر آتی ہیں۔ جب کسی قوم میں انحطاط آتا ہے۔ تو اس کا معیار علم بھی پست ہو جاتا ہے۔ ناداری اور افلاس کی بلا اخلاق کو خراب کر دیتی ہے۔ معلموں کی اور عام پیشہ دروں کی زندگی میں مطلق فرق نہیں رہتا۔ ذاتی مفاد، تحصیل و تدریس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ اور علمی، تلاش کا حقیقی ذوق بالکل مفقود ہو جاتا ہے۔ ہمارے بدنصیب ملک کی آجکل یہی حالت ہے۔ مغربی تعلیم حاصل کرنے کی غرض محض کسب معاش ہے۔ اور مشرقی مدارس کی غایت ثواب اُخروی۔ علم کی جستجو محض علم کے شوق کی وجہ سے اس سرزمین میں آجکل عنقا ہے۔ اس تنزل کے اسباب خواہ سیاسی ہوں خواہ معاشی، لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ صحیح معنوں میں علمی [illegible] چیزوں سے ہم ناآشنا ہو گئے ہیں۔ اور تہی دستی اور بدذوقی یہاں تک پہنچ گئی ہے۔ .. اگر ہم کسی میں بھولے بسرے یہ شوق دیکھتے بھی ہیں۔ تو ہم کو تعجب ہوتا ہے اور اسکی

غایت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

طالب علم کے دل و دماغ پر استاد کی زندگی اور طرز معاش کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے اور حقیقی طور سے پوچھئے تو وہ تربیت جو طالب علم کو خود بخود اس اثر سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ قومی فلاح اور کامیاب زندگی کے لئے ایسی تعلیم سے جو امتحانات کے پاس کرنے یا دستار فضیلت حاصل کرنے کی غرض سے کتابوں کے درس کے ذریعہ سے دی جاتی ہے، بدرجہا ضروری اور لازم ہے۔ ہندوستان والوں کو کیمبرج اور آکسفورڈ یا یورپ کی بعض اور قدیم درسگاہوں میں ایک اور بات جو غیر معمولی نظر آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ پروفیسر طالبعلموں کو اس طور سے سبق نہیں دیتے جیسا کہ ہماری تعلیم گاہوں میں رواج ہے کہ استاد نے طالبعلموں کو ایسی یادداشتیں لکھادیں جو امتحان میں کارآمد ہوسکتی ہیں اور جن کو حفظ کرکے طالب علم، کامیاب ہوگئے وہاں کے پروفیسروں کا وقت زیادہ تر خود اپنی علمی تحقیقات میں گزرتا ہے، طالب علموں کو بھی مناسب ہدایات دی جاتی ہیں لیکن یہ ہدایات تیار لقمے کی صورت میں نہیں ہوتیں بلکہ اُن کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ کن ذرائع سے اور کن کتابوں سے اپنے معلومات میں اضافہ کرسکتے ہیں فرق یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کالجوں میں استاد بجائے بچوں کے دودھ پینے کی عادت کے چھڑانے کے جو ایک خاص وقت تک ضروری ہے اس عادت کو آخری وقت تک جاری رکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا طالبعلم ایم۔ اے۔ کے امتحان کے واسطے بھی اُسی طرح اُستاد کی یادداشتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ جیساکہ وہ مدرسے کی ابتدائی جماعات میں تھا۔

میں نے آپ سے ابھی عرض کیا کہ استاد کی زندگی کا طالب علم کے اوپر بڑا اثر ہوتا ہے یورپ کی اعلیٰ درسگاہوں میں علمی ترقی کا راز در اصل استادوں کی زندگی اُن کا علمی انہماک اور شغف گرید ایک رباتی ہے جس میں طالب علم خود بخود رنگ جاتا ہے اور حقیقی شوق جو علم کی جستجو کے لئے لازمی ہے اُس میں پیدا ہوجاتا ہے۔ میں اب آپ کو چند اساتذہ سے اپنی ملاقات

کا ذکر سناؤں گا جس سے میرے خیالات اور واضح ہو جائیں گے۔

پروفیسر براؤن کا نام آپ نے سنا ہو گا یہ کیمبرج میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ ساری عمر عربی لغت کی تحقیق میں صرف ہوئی ہے۔ اور اب اس فن میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بدن پتلا دبلا ہے اور مزاج میں زیادہ شگفتگی نہیں۔ اس لئے طالب علم ان کے پاس آنے جانے سے گھبراتے ہیں باہر کم نکلتے ہیں اور زیادہ وقت مطالعے میں اپنی اقامت گاہ میں جو کالج کے اندر ہے گذرتا ہے۔ جان مارشل نے جو کیمبرج کے پرانے طالب علم ہیں میرے آنے کے متعلق پروفیسر صاحب موصوف کو لکھ دیا تھا چنانچہ جب میں اُن کی اقامت گاہ پر پہنچا اور دستک دی تو بہت دیر تک کچھ جواب نہ آیا معلوم ہوتا ہے مطالعے میں مستغرق تھے جب دروازہ کھلا تو میں نے اپنا کارڈ شناسائی کی غرض سے دیا اُسے ہاتھ میں لے لیا اور بیٹھ گئے۔ میں بھی بیٹھ گیا لیکن اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اُن کا خیال ابھی مطالعے ہی کی طرف تھا یہ کیفیت کوئی پانچ منٹ تک رہی مجھے اُن کے سکوت کو دیکھکر افسوس ہوا کہ میں نے اُن کو ناحق تکلیف دی۔ آخر میں اُٹھنے لگا یکایک کچھ چونک سے پڑے کہنے لگے۔ بیٹھو بیٹھو، کچھ سناؤ کیا کیا کرتا ہے کہاں کہاں جانا ہے؟ میں نے اجمالی طور سے اپنے سفر کی غایت بیان کی اور اسلامی فن تعمیر کی ضمن میں کہیں مسجد کی ابتدا کا ذکر آگیا۔ فرمانے لگے۔ مسجد کا لفظ عبرانی کتابوں میں بھی آیا ہے۔ اور سریانی زبان میں لفظ مسجد کے معنی تقریباً وہی موجود ہیں، اسلام کی اشاعت کے بعد اس لفظ کے عربی زبان میں پیدا ہو گئے۔ پھر اس رائے کی تائید میں اتنے حوالے دیئے اور اتنی دقیق بحث کی کہ میرے فہم سے باہر تھی۔ میں چپکا بیٹھا سنتا رہا۔ لیکن اُن کے شوق اور انہماک کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور دل میں یہ خیال آیا کہ اے کاش یہ شوق ہمارے ملک کے ہونہاروں میں بھی پیدا ہو جائے۔

اب میں آپ کو پروفیسر براؤن مرحوم کا حال سناتا ہوں اُن کی عجب شخصیت تھی، دیکھنے میں تو ذرا سے آدمی تھے اور کوزپشتی کا عیب بھی موجود تھا، لیکن جب بات کرتے

تھے تو چہرے سے کمال ذہانت ٹپکتی تھی۔ اور بذلہ سنجی کا یہ حال تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ طبیعت میں انتہا کا انکسار اور حلم تھا۔ اسی وجہ سے طالب علم اور آنے جانے والے اُن کا بہت وقت ضائع کرتے تھے۔ ایشیائیوں کے لئے مہمانی کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ میرے آنے کا جب حال معلوم ہوا تو ڈاکٹر بذل الرحمٰن سے جو اس وقت کیمبرج میں تھے کہا کہ اُن کو سیدھا اسٹیشن سے میرے پاس لے آنا۔ دو دن تک مہمانی رہی، پُر لطف باتیں کرتے تھے۔ اِن دونوں بیوی کی علالت کی وجہ سے ذرا طبیعت میں انتشار تھا۔ اور اپنی صحت کی خرابی کو بھی محسوس کر رہے تھے۔ مسودوں کے بستے دکھائے کہ خدا اس ذمہ داری کو پورا کرے۔ آنکھ میں چونکہ بے حد لحاظ تھا، اس لئے بعض اوقات چھپ چھپ کر کام کرتے تھے۔

ایران اور اہل ایران کے ساتھ حقیقی عشق تھا۔ اپنے ملک کی نگاہ جب کبھی بدلی ہوئی دیکھتے تھے، فوراً ایران کی بھلائی کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے، اُس پر خلوص محبت اور شیفتگی کی وجہ سے سیاسی عہدہ دار بھی اُن کا ادب کرتے تھے۔ سر دولزے ہیگ ایک قصہ سناتے تھے۔ وہ جب مشہد میں قونصل جنرل تھے ایک شاعر کو ایرانی سلطنت نے غداری اور بغاوت کے جرم میں قید کر دیا۔ شاعر نے پروفیسر براؤن کو عرضی لکھی اور دیباچاہی اُن کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ فوراً سر دولزے کو خط لکھا کہ جس طرح ممکن ہو، شاعر کو چھوڑا دو، یہ سمجھو کہ براؤن کا بیٹا قید ہو گیا ہے اور دستگیری کا وقت ہے۔ سر دولزے کہتے ہیں کہ شاعر کے جرم میں مطلق شبہ نہ تھا، لیکن براؤن کی محبت کو دیکھ کر مجھے شاعر کو بغیر رہا کرائے بن نہ پڑی۔

یہ محبت ہی تھی کہ اس فاضل نے ایران کی ادبیات کو اس خوبی سے سمجھا ہے، لیکن باوجود تبحر کے کبھی کسی قسم کی لن ترانی اُن کی زبان سے نہیں سُنی گئی۔ شبلی کی تالیف "شعر العجم" کے متعلق فرمانے لگے کہ "یہ ایسے وقت لکھی گئی، جب میں اپنی کتاب بہت کچھ لکھ چکا تھا۔

اور چونکہ یہ اُردو میں لکھی گئی۔ اس لئے اس کے مطالعے میں مجھے بیحد وقت پیش آئی۔" جب پروفیسر براؤن کے انکسار اور فضیلت کا مقابلہ ہندوستان کے علمار کے مبلغ معلومات اور تعلی سے کیا جاتا ہے تو ان حضرات کے حال پر تاسف ہوتا ہے، اور اُن کے تنگ مایگی پر غیر قوم والوں کے سامنے شرم آنے لگتی ہے۔

کیمبرج کے ایک پروفیسر کا ذکر میں اور کروں گا۔ اُن کا اسم گرامی "سر ولیم رجوے" ہے۔ یہ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ میں نے اُن کی بعض تنقیدیں پڑہی ہیں۔ خلاف واقعہ باتوں اور غلط بیانی کے دشمن ہیں۔ اور اس قسم کی کمزوریوں پر مصنفین اور مؤلفین کی دہجیاں اڑانے میں مطلق نہیں چوکتے۔ علم الآثار کے پروفیسر ہیں اور سر جان مارشل کے استاد ہیں۔ پروفیسر "براؤن" نے جب یہ سُنا کہ مجھے "سر ولیم رجوے" سے بھی ملنا ہے، تو پہلے تو بہت تعجب کیا لیکن پھر مسکرا کر چپ ہو رہے۔ کیمبرج میں اس زمانے میں موسم گرما کی تعطیل ہو گئی تھی۔ اور "سر ولیم" اپنے ذاتی مکان میں چلے گئے تھے، یہ لب دریا کیمبرج سے کوئی چار میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں کشتی میں سوار ہو کر اُن سے ملنے گیا۔ یہ بھی عجیب سیر تھی۔ لیکن اس وقت اس کا ذکر موجودہ مضمون سے متعلق نہیں۔ "پروفیسر رجوے" کا سن ستر سال سے زیادہ ہوگا۔ نہایت بلند قامت ہیں اور ہاتھ پیر خوب مضبوط ہیں لیکن بینائی نے بالکل جواب دے دیا ہے، میرے آنے کی خبر ملی، تو فوراً نکل آئے اور میری پشت پر ہاتھ رکھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور کہنے لگے: "مجھے تمہارے آنے سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ تم میں تیسری پیڑی نظر آتی ہے۔ "سر جان مارشل" میرے شاگرد ہیں اور تم اُن کے" پھر اُن کی بیوی آگئیں، اُن سے بھی اسی طرح تعارف کرایا۔ اور ایسی محبت سے باتیں کرتے رہے، جیسے کوئی اپنے بچوں سے کرتا ہے، پھر اپنے گھر کی ایک ایک چیز دکھائی۔ بصارت کی کمی کی وجہ سے چلنا پھرنا دشوار تھا، لیکن میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر صحن میں گئے اور ایک دہوپ گھڑی دکھائی، جس کی کچھ تاریخی اہمیت تھی، اس کا سارا حال سُنایا۔

شام کو کھانے کے بعد کہنے لگے کہ مجھ کو ہندوستان کے آثار کے متعلق کچھ معلوم نہیں، سنتا ہوں وہاں کے فنون لطیفہ میں یونانی اثر غالب ہے۔ تم ہندوستان کے رہنے والے ہو۔ کچھ تم بیان کرو۔ جو کچھ میں کہتا تھا نہایت غور سے سنتے تھے اور کبھی کبھی سوال بھی کرتے تھے۔ لیکن اس تمام بات چیت میں شفقت کا رنگ غالب تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ محبت کا دریا اُمڈا چلا آرہا ہے۔ دو روز اس صحبت میں عجیب لطف سے گذرے اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اہل علم کے نزدیک شاگرد اور اولاد میں مطلق فرق نہیں، اور یہی گہرا قلبی تعلق ہے، جو علمی ترقی کا راز ہے۔

کیمبرج کے تین پروفیسروں کی شان آپ نے سن لی، اب تھوڑی دیر کے لئے میں آپ کو یورپ سے شام میں لیجاتا ہوں۔ بیروت میں عیسائی پاپاؤں کا جو دارالعلوم قائم ہے اس سے تو آپ شاید واقف ہوں گے۔ یہاں ایک استاد "پاپا شیخو" نامی ہیں۔ اسلامی علوم میں فرد ہیں۔ یورپ کے تمام مستشرقین اُن کا بہت احترام کرتے ہیں۔ عرب کی قدیم تاریخ انہیں خوب معلوم ہے۔ اور چند سال ہوئے فرانسیسی زبان میں مکہ معظمہ کے حالات پر ایک ضخیم کتاب بھی تالیف کی ہے "موسیو پروسٹ" جو خود ایک زبردست "اثری" ہیں، مجھے پاپا شیخو کے پاس لے کر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ خانقاہ میں جہاں پاپا شیخو، اور اور پاپا رہتے ہیں اُسے قلعہ سمجھنا چاہئے۔ ایک برآمدے میں پاپا ٹہل رہے تھے "موسیو پروسٹ" کو آتا ہوا دیکھ کر جلد آگے بڑھے اور فرمایا "دوہرا شکرانہ اور دوگنی مسرت کہ خود بھی آئے اور اپنے ساتھ ایک اور عنایت فرما کو بھی لائے" پاپا شیخو، چھریرے بدن کے ہیں۔ قد میانہ ہے۔ ہونٹ پتلے پتلے اور آنکھیں نہایت روشن بات کرنے میں اکثر مسکراتے رہتے ہیں اور تعجب ہوتا ہے کہ زہد نے ان میں کسی قسم کی خشکی یا انقباض پیدا نہیں کیا۔ ہم کو اپنے حجرے میں لے گئے، اس میں سوائے پلنگ اور ایک میز اور دو تین کرسیوں کے اور کوئی سامان نہ تھا۔ کرسیاں بھی نہایت چھوٹی چھوٹی

اور ہاتھ رکھنے کے لئے ان میں ڈنڈے وغیرہ نہ تھے، زندگی نہایت سادہ بسر کرتے ہیں اور تمام وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گذرتا ہے۔ اُن کا حجرہ خانقاہ کی اُسی منزل میں ہے، جہاں کتب خانہ ہے۔ مجھ سے مکۂ معظمہ، طائف، مدینۂ منورہ، وغیرہ کے حالات پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کہ ہم خیالی گھوڑے دوڑاتے ہیں۔ اس لئے اکثر لغزش ہوتی ہے۔ مورخ کے واسطے سیاحت اور قدیم مقامات کا دیکھنا ضروری ہے۔ پاپا سے صحبت تو کوئی دو گھنٹے تک ہی رہی۔ لیکن اُن میں میں نے ایک عجب مقناطیسی اثر پایا۔ خبر نہیں وہ اُن کے زہد یا استغنا کی وجہ سے ہے، یا علمی شوق کی وجہ سے، یا طبیعت کی قدرتی شگفتگی اور سحر بیانی کی وجہ سے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ طالب علم، جن کو ایسے استاد کی شاگردی کا فخر حاصل ہوگا۔

عزیز طالب علمو! آپ کے صدر صاحب نے مجھ سے فقط یورپ اور بیرونی ممالک کے اساتذہ کے حالات بیان کرنے کے متعلق فرمایا تھا۔ لیکن میں اس موقع پر ایک اور عالم کا بھی ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں، جن کے اخلاق میں گو ہمارے ملک میں رہنے کی وجہ سے وہ کشش نہیں رہی، جو میں اور اساتذہ کی نسبت بیان کر چکا ہوں۔ لیکن وقت کی قدر، عمل میں احتیاط، اور تحقیق کا شوق، اس درجہ ہے کہ اُن کی بدولت وہ دنیا کے مشہور و معروف آدمیوں میں سے ہو گئے ہیں۔ ان عالم کا نام ڈاکٹر آریل ستاین، ہے۔ نسل کے یہودی ہیں، ہنگری کے رہنے والے ہیں، آکسفورڈ میں تعلیم پائی، ہندوستان میں آکر پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے، اور پھر صوبۂ سرحدی کے ناظم تعلیمات ہو گئے۔ تحقیق کا شوق آکسفورڈ سے ساتھ لائے، وہاں پالی اور سنسکرت کا درس لیتے تھے اور وسط ایشیا کے ریگستانوں کی چھان بین کے خواب دیکھتے تھے۔ ہندوستان آنے کے بعد، گو ملازمت کرتے رہے، لیکن دل بدھ مت کے کھنڈروں کی تلاش کے شوق میں لگا رہا اور تیاری کرتے رہے۔ آخر جب

موقع ملا تو تین دفعہ وسط ایشیا کا سفر کیا۔ پہاڑ اور ریگ چپہ چپہ زمین کی مساحت کی اور علم و فضل، فن و کمال کے وہ خزانے ڈھونڈے کہ دنیا حیران ہوگئی۔ سر آریل سٹائن نہ غیر معمولی طور سے ذہین ہیں، اور نہ بہت بڑے فاضل۔ اُن کی ترقی کا راز وہی صفات ہیں جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔ وسط ایشیا کی بے آب ریگ سیاحوں کو آگے نہ بڑھنے دیتی تھی۔ اُنہوں نے پہلے سے اندازہ کر لیا کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے میں کتنے پانی کی ضرورت ہوگی۔ رستے کی دقتوں کے لحاظ سے روزانہ کسقدر مسافت طے کرنی چاہیئے، آخر ڈیڑھ سو اونٹ برف سے لدے ہوئے ساتھ لے کر کشمیر کے پہاڑوں سے روانہ ہوئے۔ جو رفتار مقرر کر لی تھی۔ اُس میں مطلق فرق نہ آنے دیا۔ بیمار ہوئے، پیر کا انگوٹھا سردی کی شدت کی وجہ سے گل گیا، لیکن ہیرے ارادے کا پکا، آگے بڑھے گیا۔ اور آخر ٹھیک اتنی مدت میں جتنا کہ اندازہ کیا تھا اپنی سیاحت کو کامیابی کے ساتھ ختم کیا۔ خود فرماتے تھے کہ چونکہ وقت کم رہ گیا تھا، اس لئے بھائی رام سنگھ کو جو پیمائش کیواسطے ساتھ گئے تھے ایک جانب بھیجا اور خود دوسری جانب روانہ ہوا: تاکہ کام جلد ختم ہو جائے۔ چلتے وقت بھائی رام کو ہدایت کر دی کہ جو نظام العمل مقرر کیا ہے، اگر اُس کی پابندی نہ کی گئی تو ہم دونوں ریگستان میں ہلاک ہو جائیں گے۔ کہتے تھے جس روز ہم دونوں ٹھیک اسی موقع پر اور اسی وقت ملے ہیں جہاں کہ ہم نے اندازہ کیا تھا، تو ہماری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

۱۹۱۹ء میں یہ ممالک محروسہ میں تشریف لائے تھے ایک ہفتہ تک مجھکو اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، وقت کی قدر اور احتیاط کا حال آپ سُنینگے تو حیران ہونگے وقت پر سوتے تھے، وقت پر اُٹھتے تھے، اور وقت پر کل کام کرتے تھے۔ اور اتفاق سے اگر نظام العمل میں فرق آجاتا تھا تو وقت کو ضائع نہونے دیتے تھے۔ صبح کو چائے پلانے اور ڈاڑھی بنانے کے لئے گرم پانی دینے کا وقت بندھا ہوا تھا۔ ایک روز گرم پانی لانے میں دیر ہوئی۔ یہ فوراً قلمدان کھول، خط لکھنے میں مشغول ہو گئے جل گاڑی کے اسٹیشن

پر پہنچے تو اطلاع ملی کہ پنجاب میل دو گھنٹے تاخیر سے آئیگا۔ مجھ سے کہنے لگے: معاف فرمانا میں اپنی یادداشتوں کو صاف کرلوں۔ ورنہ پھر یہ وقت ضائع جائیگا۔ ہر چیز قفل و کنجی میں رکھتے تھے۔ اور جو کام کرتے تھے، اس کو فوراً اس کی حد تک مکمل کردیتے تھے۔ اجنتا میں مولوی سید احمد صاحب بھی ساتھ تھے، ہم دونوں بعض وقت ہنستے تھے، کیونکہ انھوں نے ایک ہی غار میں کئی کئی فوٹو لئے لیکن جہاں ایک فوٹو لے لیا، فوراً صندوق میں کیمرے کو بند کرکے قفل لگا دیتے تھے اور پھر جب تھوڑی دیر بعد دوسرا فوٹو لینا ہوتا تھا تو پھر کیمرے کو نصب کرتے تھے اور پھر قفل لگاتے تھے۔ نوٹ بک کا بھی یہی حال تھا کہ وہ بار بار تھیلے سے نکالتے تھے اور پھر مقفل ہوجاتی تھی۔ میرے عزیز دوستو! وقت کی قدر اور احتیاط یہی سر آریل اسٹائن کی نمایاں کامیابی کے راز ہیں اور یہ ایسی صفات ہیں کہ ہمارے ملک میں کم نظر آتی ہیں۔

حضرات! علمار کی جو صفات میں نے آپ کے سامنے بیان کیں، یہ طالب علم کی زندگی میں کایا پلٹ کردیتی ہیں، لیکن ایسی نہیں کہ ہمارے امکان سے باہر ہوں۔ فضل و کمال کسی خاص قوم کا ورثہ نہیں، کبھی آپ کی بھی یہ حالت تھی کہ آپ شمالی یورپ کی اقوام کو جو آج دنیا میں ممتاز ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کے میدان میں بلید الذہن، کم فہم اور جاہل سمجھتے تھے۔ اگر آپ کو میرے بیان میں شبہ ہو تو ابن حزم کی کتاب "الفصل فی الملل والاہوا والنحل" کو دیکھئے کہ کیا لکھتے ہیں۔ یا ابن سعید کی تصنیف "طبقات الامم" کو ملاحظہ فرمائیے کہ شمالی یورپ کے باشندوں کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ عروج و زوال ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہیں، مایوس نہ ہونا چاہیئے، عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کی غایت یہی ہے کہ ہمارے ملک کے ہونہاروں میں علم کا سچا شوق پیدا ہو۔ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ہم کو ایسا بادشاہ دیا جو علم و فضل کا حقیقی سرپرست اور حامی ہے۔ نصاب کا تقرر اور طریق تعلیم کی اصلاح ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ ترقی کے لئے کوئی امر مانع نہیں

اساتذہ کو چاہئے کہ اپنے نصب العین بدل دیں۔ اور وہ شوق وانہماک دکھائیں جو علم کی شمع برداری کے لئے لازم ہے۔ مستقبل بہت خوش آیند ہے۔ ملک میں سر جگدیش بوس اور رابندر ناتھ ٹگور پیدا ہو چکے ہیں، طلبا، اورنگ آباد! تم سے بڑی بڑی امیدیں ہیں، تم ایسے خطے میں رہتے ہو جہاں تمہارے بزرگوں کے کارنامے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ تغلق کی اولوالعزمی، بہمنیوں کی شوکت، مغلوں کی تہذیب اور لطیف ذوق سے اپنے کمہلائے ہوئے دلوں میں روح پھونکو! سالباہن کے قصے اور راجہ کرشنا کی حکایات تمہاری گھٹی میں ہیں۔ اجنٹا کی تصاویر اور ایلورہ کے معابد تمہارے ہی اسلاف کے بنائے ہوئے ہیں، ٹوٹی ہوئی ہمتوں اور مٹے ہوئے ولولوں کو پھر پیدا کرو! تمہیں ایک اور بڑی خصوصیت بھی حاصل ہے، وہ تمہارے صدر کی پاک اور بے لوث ہستی ہے۔ اس کی بے نظیر زندگی کی تقلید کرو۔ علم کی لو جو اس کے دل کو لگی ہوئی ہے اگر تم نے بھی پیدا کر لی تو بیڑا پار ہے۔

کامیابی کا راز

اپنی اصلاح

از

(جناب حسن عابد صاحب جعفری۔ اکسن بیرسٹرایٹ لا۔ ایڈیٹر شمع)

یہ سلسلہ مضامین شمع میں مستقلاً شائع ہوتا رہے گا۔ یقین ہے کہ پوری توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ خیالات اور جذبات کو اکسانے اور اپنی حالت کا اندازہ لگاکر بہتر بننے کا ولولہ ایک مبارک جذبہ ہے، جس کو قایم رکھنا اور ترقی دینا تعلیم کا اصلی مقصد ہے، افسوس کہ ایسی ہی ضروری باتوں سے ہمارے نوجوان بے خبر ہیں، اور فارغ التحصیل ہوکر بھی اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اس سلسلہ مضامین کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

مدیران شمع

اگر دو تین آدمیوں سے آپ کی نہیں بنتی تو ممکن ہے اُن کا قصور ہو۔ لیکن اگر دس بارہ آدمیوں سے آپ کی نہیں بنتی ہے تو یقینی طور پر آپ خطاوار ہیں۔

یہ الفاظ امریکہ کے ایک مشہور عالم نفسیات کی زبان سے نکلے ہیں جس کا مقولہ ہے

کہ دنیا رہنے کے قابل ہے، اور یہاں کی خوشیاں اس لایق ہیں کہ انسان جی بھر کر اُن سے لطف حاصل کرے۔

اگر تین سال کے عرصہ میں آپ دو تین کام یا ملازمتیں یکے بادیگرے کریں، تو ممکن ہے کہ آپ ترقی کر رہے ہوں، لیکن اگر ایک سال کے اندر آپ نے متعدد کام اُٹھائے یا ملازمتیں اختیار کیں اور اُن کو چھوڑ دیا تو واقعی آپ نے غلطی کی،

یہ الفاظ بھی اسی زبردست عالم کے ہیں، اور آپ کے ذاتی جانچ کے لئے دو اہم سوالات ہیں، ظاہر ہے کہ آپ یا تو اپنے ملنے والوں کو بُرا کہیں گے، یا اپنی ملازمتوں اور اپنے کاموں میں نقائص ہونا ظاہر کریں گے۔ لیکن یہ ذرا مشکل ہے کہ کبھی تنہائی میں بیٹھ کر آپ سوچیں کہ آپ کی ذات والاصفات کتنی برائیوں کی مرکز ہے، اور اسی کی بدولت آپ نے دُنیا میں کتنی ناکامیاں اٹھائی ہیں! کچھ تو آپ کی عادتیں بچپن میں بگڑیں، اور کچھ اسوقت بگڑیں جبکہ آپ مطلق العنان ہو گئے تھے ہمیشہ آپ نے دوسروں کا دکھڑا رو دیا، اور ہر کام میں نقص نکالا۔ لیکن آپ کبھی اپنی اصلاح پر بھی متوجہ ہوئے؟ آئیے! آج ہم اس موضوع پر آپ سے صاف صاف باتیں کرتے ہیں۔ اور دکھاتے ہیں کہ معمولی توجہ اور کوشش سے اس دنیا میں آپ کے کتنے ہمدرد، اور مددگار پیدا ہو سکتے ہیں کہ معمولی اور ملازمتیں آج آپ کو وبالِ جان معلوم ہو رہی ہیں، کسقدر خوشگوار بن سکتی ہیں؟ ہر دلعزیز ہونا یا دوسرے الفاظ میں، اوروں کے ساتھ اچھے اور خوشگوار تعلقات قائم رکھنا ایک فن ہے، اور چونکہ اس کا گہرا تعلق عملی نفسیات سے ہے، اس لئے جواب تک اس مسئلہ پر تحقیقات ہو چکی ہے اس کو ہم عام فہم زبان میں پیش کریں گے تاکہ قارئین شمع جن میں طلبا بھی شامل ہیں۔ ہمارے مفہوم کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔

تعلقات کو خوشگوار بنا کر قایم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا پہلا اصول اچھی طرح سمجھ لیا جائے،

(۱) فعل انسانی کے متعلق پیشین گوئی کیجا سکتی ہے، یعنی آپ پہلے سے رائے قایم کر سکتے ہیں کہ خاص حالتوں میں فلاں شخص سے کس قسم کے افعال ظہور میں آئیں گے! اور یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ فلاں شخص جو کچھ کرے گا اُس کا تعلق آپ سے ہے کہ پہلے آپ کیا کر چکے ہیں؟ مثلاً میں کہوں کہ آپ جھوٹے ہیں، اس کا آپ ایک طرح پر جواب دیں گے، اسی طرح، اگر آپ کی تعریف کروں، تو آپ دوسری طرح پر جواب دیں گے،

حضرت سلیمان نے فرمایا ہے کہ" عاجزی کا جواب غصہ کے سوال کو سوخت کر دیتا ہے، باہمی تعلقات کے قیام کا بہت کچھ انحصار اس امر پر ہے کہ ہم اکثر مواقع پر یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہماری پیش قدمی کا جواب دوسری ذات سے کیا ملے گا۔ ابھی چند دنوں کا واقعہ ہے کہ میں رسالے کے لئے مضامین چھانٹ رہا تھا، برآمدے میں میرے ایک ملاقاتی ملازم سے ضد کر رہے تھے کہ اُن کی اطلاع کر دی جائے، آواز سن کر میں نے انہیں بلا لیا۔ اور سمجھایا کہ اس میں ملازم کا قصور بالکل نہ تھا، ایڈیٹری کے فرائض بہت اہم ہیں، اور ملاقاتیوں کو متعلق احساس نہیں ہوتا کہ کچہری کے بعد بھی دوسرے لوگ دماغی کام کرنے کے عادی ہیں، وہ معذرت خواہ ہو کر فرمانے لگے "بیرسٹر صاحب! میں تو کام سے آیا تھا! کاروبار کی حالت ابتر ہے، اور گھر کا یہ حال ہے کہ جرمنی کی جنگ میرے ہی گھر میں ہوئی تھی، ہر چیز بے قاعدے ہے۔ نہ گھر میں چین ہے نہ باہر آرام!" یہ کہہ کر اُنھوں نے اپنی جیب سے لفافہ نکالا اور فرمانے لگے کہ اس کو رجسٹری کر کے بھیجتا ہوں، اس پر بھی اگر بیوی میکے سے تشریف نہ لائیں تو آپ نالش کر کے دلاپانے زوجہ کی ڈگری کرا دیجئے گا، خط میری طرف بڑھا دیا۔ مضمون پڑھ کر میں نے پوچھا "کیا آپ واقعی اس خط کو بھیج رہے ہیں" اُنھوں نے جواب میں کسی قدر جوش کے ساتھ فرمایا "بیشک!"

وہ خط میں نے اُن کی طرف بڑھا دیا اور کہا "ذرا اس جملہ کو تو بلند آواز سے پڑھیے" اُنھوں نے پڑھا "بس اپنی حماقتوں سے باز آؤ۔ غصہ کو بھاڑ چولہے میں ڈالو، اور سوچو کہ میں تمہارا

شوہر، تمہارا سرتاج، تمہارا مجازی خدا، تم سے کہتا ہوں کہ بس اب چلی آؤ، تم نے جو کچھ کیا بہت بُرا کیا، اور میں تمام عمر تمہاری اس سیہ قلبی، ڈھٹائی، اور حکم عدولی کو کبھی فراموش نہ کرونگا، مگر طول دینے سے کیا فائدہ! میں اب بھی تم کو اپنے گھر میں مثل اپنی بیوی کے رکھنے پر آمادہ ہوں، اور ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد میں تمہاری خطا کو بھی معاف کردوں"

میں نے دریافت کیا "کیا جب آپ کی بیوی آپ کے ساتھ رہتی تھیں تو آپ اُن سے اسی قسم کی باتیں کرتے تھے؟" جواب ملا "ہاں" اگر میں ضرورت سمجھتا تھا تو اسی قسم کی یاد اور قسم کی نصیحت ضرور کرتا تھا، جس کا وہ بہت بُرا مانتی تھیں، اور کئی کئی دن منہ پھولا رہتا تھا، لیکن یہ خط تو بہت ملایم ہے، میں نے تو اس میں کچھ بھی نہیں لکھا ہے، سوائے اس کے کہ وہ اس بات کو سمجھ لیں کہ میں ان کا شوہر ہوں اور اُن پر قرآن، حدیث، تاریخ، اور روایات کی رو سے فرض ہے کہ وہ میرے احکام کو۔ میں نے اُن کو یہیں روک کر کہا کہ "میں نے آپ کی سب مشیخت پناہی سن لی، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے اور اُن کے تعلقات اور خراب ہوں تو بسم اللہ اس خط کو ضرور روانہ کر دیجئے" دنیا میں ایسے ہزاروں شوہر ہیں جو اپنی بیبیوں سے اچھے تعلقات رکھنا چاہتے ہیں مگر نہیں رکھ سکتے، وہ ایمانداری سے کوشش کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ منجملہ اُنکے ایک آپ ہیں جو محض اپنی غلطی کے آپ شکار بنے ہوئے ہیں یہ میں نہیں کہتا کہ آپ کی بیوی فرشتہ خصلت ہیں مگر دنیا میں بہت سے ایسے کام ہیں جو انسان کو ملتوی کرنے پڑتے ہیں، اس خط کو بھیجکر آپ اُن کی طبیعت میں اشتعال پیدا کریں اور کیا نتیجہ ہے؟ آپ کو دیکھنا چاہئے کہ موجودہ حالات کیا ہیں؟ آپ چاہتے ہیں کہ گھر میں خوشی نظر آئے، میاں بیوی میں ہمدردی اور باہمی محبت ہو، لیکن آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ بعض الفاظ کے استعمال سے آپ کی بیوی کا مزاج مشتعل ہو جاتا ہے، لیکن آپ اُن کو ترک نہیں کرتے۔ ایک شخص بھینسے کو لال جھنڈی

دکھاتا ہے، اور جب بھینسہ حملہ آور ہوتا ہے تو وہ اُسکے اُس فعل کو احمقانہ سمجھتا ہے، حالانکہ وہ خوب جانتا ہے کہ لال جھنڈی کو دیکھ کر بھینسا ضرور حملہ کرے گا، اور وہ اسی وقت جھنڈی دکھاتا ہے جب کہ وہ بھینسہ کو غصہ میں لانا چاہتا ہے، آپ کی بھی بجنسہ یہی حالت ہے"

میں نے دوران تقریر میں اُن کو بات کرنے کا موقع نہ دیا۔ جب میں تقریر ختم کر چکا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیکار نہیں گئی، اور انھوں نے دریافت فرمایا "تو پھر کیا کروں"؟

میں نے کہا کہ فرض کیجئے کہ اسی انداز کا ایک خط آپ کی بیوی کا آپ کے پاس آتا تو آپ کے غصہ کی کیا کیفیت ہوتی اور اگر کوئی شخص ہنس کر اور اخلاق کے ساتھ پیش آتا ہو تو آپ کی کیا حالت ہوتی ہے؟"

حضرت کی سمجھ میں یہ باتیں آگئیں اور جب دوسری مرتبہ ملنے آئے تو چہرہ پر بشاشت تھی اور جیب سے ایک خط نکالکر دیدیا جو اُن کی بیوی کا جواب تھا اور جس میں اُن لانے کے واسطے بلایا تھا، شکر ہے کہ اب بھی دونوں میاں بیوی ہنسی خوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں،

تعلقات زن و شو میں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ "ہم دونوں نے غلطی کی"، یہاں تک تو ٹھیک ہے، تعلقات خراب نہ ہونگے، لیکن جب یہ کہا جائیگا "یہ غلطی تمہاری تھی"، تو ہزار عمل اور انصاف برتا جائے، میاں بیوی میں کبھی صفائی نہ ہوگی:۔

انسان کا دماغ مشین کی طرح کام کرتا ہے، اور اگر اس کی قابلیت اور اس کی عادت کا علم ہو جائے تو ہم اس کے بارے میں پیشین گوئی بھی کر سکتے ہیں۔ اصول نمبر ۲ یہ ہے۔

"غور سے دیکھتے رہو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اُس کے جواب میں دوسرا کیا کرتا ہے بالفاظ دیگر مطالعہ کرو کہ تمہارے طرز عمل کا جواب دوسرے کی جانب سے کیا ظہور میں آتا ہے"،

اس طفلانہ خیال کو اپنے پاس کبھی نہ آنے دیجئے کہ دوسرے کو کیا کرنا چاہئے، بلکہ صرف اس امر پر آپ توجہ کریں کہ دوسرا آدمی کیا کرتا ہے، آپ کو حیرت ہوگی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کہہ سکا کریں گے فلاں موقع پر اُس شخص کا کیا طریق عمل ہوگا، اور پھر آپ

اُس کی بہترین صفات سے فائدہ اُٹھا سکا کریں گے۔ اسی اصول کے تحت میں یہ مثال بے موقع نہ ہو گی۔

ایک شخص تھا، اُس خدا کے بندے نے دنیا میں انجن چلانے کے کام سے شروع کر کے معنف تک کا فرائض کو انجام دینے کی کوشش کی تھی، اور چار یا پانچ برس کے عرصہ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ چلا جانا اُس کے لئے معمولی بات رہی تھی۔ ہر جگہ چند دن تو وہ اچھی طرح کام کرتا تھا۔ اور پھر کوئی نہ کوئی ایسی افتاد ہوتی تھی کہ اُسے علیحدہ ہونا پڑتا تھا اُس کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جہاں میں جاتا ہوں میری ہوشیاری اور قابلیت سے وہاں کا منیجر جلتا ہو جاتا ہے، میں نے جب اُس کے حالات پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص اپنی زبان کا شکار تھا اور یہ نہ جانتا تھا کہ اُس کے الفاظ سے اُس کے منیجر یا آقا پر کیا اثر پیدا ہو گا۔ جس معاملہ میں اختلاف ہوتا وہ صاف کہدیتا کہ تم غلطی کر رہے ہو، حالانکہ اُس کو جاننا چاہئیے تھا کہ اس قسم کی گفتگو سے دوسرے کے دل پر کوئی خوش آئند اثر نہیں ہوتا ہے، ایک مرتبہ وہ ایسی ہی مصیبت میں مبتلا تھا اور عنقریب اپنی خدمت سے علیحدہ ہونے والا تھا۔ میرے پاس آیا میں نے کہا کہ تم جاؤ اور جو کچھ تمہارے اور منیجر کے درمیان گفت و شنید ہوئی ہو وہ لفظ بہ لفظ لکھ کر لاؤ۔ میں نے اسی طرح اُسکی دوسری ملازمتوں کے بارے میں بھی سوال و جواب لکھوائے۔ اُن کو دیکھ کر وہ خود قائل ہو گیا کہ حقیقت میں ہمیشہ اسُ کی جانب سے غلطیاں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اسُ کا علاج یہ تجویز کیا کہ وہ دوسروں کی رائے کی عزت کیا کرے اور اسُ کو اپنی رائے پر ترجیح دیا کرے، تین مہینہ کی مشق میں وہ شخص تمام بلاؤں سے نجات پا گیا، اور آج بہت اچھی حالت میں ہے، میری صلاح ہے کہ قارئین شمع بھی ایک ہفتہ یہ مشق کریں اور دیکھیں کہ اس عرصہ میں اُن کو کیسی کامیابی ہوتی ہے۔ اور کتنے دوست پیدا ہوتے ہیں۔

ایک اور مثال لیجئے، ان حضرات کو خود بینی کا مرض تھا، ہر موقع اور محل پر اپنی بزرگی، اپنی بڑائی اور کامیابی کی خواہش رہتی تھی۔ اسی خیال سے اُنہوں نے

مذہب کی آڑلی تھی، ممبر پہ بیٹھ کر وعظ فرماتے تھے، بڑے بڑے مجمعے آپ کی تقریر کو سنتے تھے اور آپ ہر جگہ مذہب کے بھیس میں محض ذاتی کامیابی کا کھیل کھیلا کرتے تھے، امر واقعہ یہ ہے کہ کم بخت کو مذہب سے اتنا بھی شغف نہ تھا جتنا کہ مجھ کو آپ کو ہے، مجھ سے مل کر بھی انہوں نے اپنا وہی رنگ اختیار کیا اور مجھے بھی اپنے پاک خیالات سے مرعوب فرمانا چاہا۔

اُن کو شکایت یہ تھی کہ لوگ اُن کی باتوں پر توجہ نہیں کرتے ہیں، اور بالفاظ دیگر اُن کی خود بینی کو ٹھوکریں لگتی ہیں، اس شخص کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ وہ بے ایمان تھا، وہ مذہبی آدمی محض اپنے مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے بنا ہوا تھا، اُس کا دل مخلص نہ تھا۔ چنانچہ دوسروں کی جانب سے بھی اُس کو غیر مخلصانہ جواب ملتا تھا، اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اخلاص پیدا کیجئے۔ اخلاص کا جواب آپ کو اخلاص سے ملے گا، یعنی جس طرح برتاؤ آپ دوسروں کے ساتھ کریں گے ویسا ہی برتاؤ وہ آپ کے ساتھ کرینگے۔

جو لوگ اپنے حلقہ میں کامیاب نہیں ہیں، اور لوگ اُن سے خوش نہیں ہیں اُن کو چاہئے کہ تنہائی میں سوچیں کہ "کیا میں ویسا ہی اچھا ہوں جیسا کہ ظاہر کیا کرتا ہوں؟ کیا مجھ میں ظاہرداری نہیں ہے؟ کیا باتیں کرتے وقت مجھ میں تھوڑی سی مشیخت اور خود داری نہیں آجاتی ہے اور میں دوسروں کو مرعوب نہیں کرنا چاہتا ہوں؟" اگر آپ میں یہ عیوب موجود ہیں تو کامیابی کا خواب ترک فرمائیے۔ دنیا میں ایسے لوگ بہ کثرت ہیں جو طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہیں، لیکن چونکہ وہ اپنی جانچ خود نہیں کر سکتے ہیں اور اس فن سے واقف نہیں ہیں روزمرہ انواع و اقسام کی پریشانیاں اُٹھاتے ہیں، اور دنیا اور اہل دنیا کو مطعون کرتے پھرتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی اس قسم کی شکایتوں میں سب سے زیادہ مبتلا ہے۔ اس کی تنگ نظری، اور دل کی کثافت ضرب المثل کی حد تک پہونچی ہوئی ہے، بہر کیف اسوقت ہمارے سامنے تین اصول ہیں۔

(۱) انسان کے افعال کے متعلق پیشین ہو سکتی ہے (۲) آپ کو چاہئے کہ دوسروں کے

خیالات کو معلوم کریں۔

(۳) آپ ہمیشہ مخلص رہیں اور ظاہر داری کو اپنے پاس نہ آنے دیں۔ نیز ہم کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ زیادہ تر پریشانیوں کا باعث یہ ہے کہ لوگ اپنی جانچ خود نہیں کرتے ہیں۔

"نقشہ امتحان عادات کی بابت"

	علی احمد	علی محمد	محمد اختر	محمد بشیر	عبدالستار	یونس رضا	ادیم حسین	علی سیف اللہ	مشہدی	ضامن رضا
جدت	+	=	+	−	+	+	+	=	+	+
رضاجوئی	=	=	·	+	=	−	−	=	=	−
ایمانداری	+	=	=	=	−	+	+	+	=	+
اعتبار	+	−	−	=	−	=	+	=	=	=
قوت ارادی	−	=	−	=	−	−	−	+	−	−
حکومت	+	+	=	+	=	=	=	+	+	=
انہماک	=	−	+	−	−	+	=	=	−	=
ذہانت	−	=	=	−	=	+	=	+	=	+
استقلال	+	−	=	=	+	+	=	=	+	−
سوجھ بوجھ	=	=	+	=	=	+	+	−	=	+
خواہش ترقی	·	+	+	+	=	−	−	+	=	=
ضبط	·	−	−	+	=	=	+	=	−	=

یہ نقشہ ایک شخص نے میری ہدایت سے بنا کر اپنی جانچ کی تھی۔ دس دوستوں کے بارہ صفات کو اس نے اپنی رائے سے معلوم کر کے لکھا تھا اور پھر ان سے اپنا مقابلہ کیا تھا، آپ بھی ایک ایسا ہی نقشہ بنائیں اور اپنے احباب کے نام لکھ کر دیکھیں کہ وہ کن صفات میں آپ سے بہتر، برابر، اور کم ہیں۔ تین نشانات -، =، + کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے دوست آپ سے بہتر، برابر، اور کم ہیں، اس نقشہ میں ۱۲۰ فیصلے ہیں جو آپ کو اپنے احباب کے بارے میں قائم کر کے نشان لگانے ہوں گے، جس شخص نے اس نقشہ کی خانہ پوری کی تھی وہ ۴۲ میں بہتر، ۴۹ میں برابر، اور ۲۹ میں کم تر ثابت ہوا، اگر آپ کے نقشہ میں + کے نشان زیادہ ہوں تو یا تو آپ خود بین ہیں اور اپنے آپ کو "بڑا آدمی" سمجھتے ہیں، یا آپ کے دوست آپ کے احباب آپ کی قابلیت کے مقابلہ میں کم قابل ہیں، اگر آپ کے نقشہ میں — کے نشان زیادہ ہوں تو آپ ایسے لوگوں سے مل رہے ہیں جو آپ سے زیادہ قابل ہیں یا آپ میں یہ عیب ہے کہ آپ اپنی خوبیوں کو گھٹا کر دیکھنے کے عادی ہیں، بہرکیف ان دونوں میں سے ہر حالت میں آپ کو نہایت سنجیدگی اور سمجھداری کے ساتھ متوجہ ہونا چاہئے۔ اور میں یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ ایمانداری کے ساتھ اپنے نقشہ کو پُر کریں گے اور سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں گے تو آپ اپنی زندگی کو قطعی طور پر درست کر لیں گے، اور یہ درستی آپ کی کامیابی اور راحت کا باعث ہوگی۔ لہذا آپ کا فرض ہے کہ جن صفات میں آپ کو کمی محسوس ہو ان صفات کو اپنے آپ میں پیدا کریں، اور جن صفات کو آپ اپنے آپ میں پائیں تو پہلے یہ دیکھیں کہ آپ میں واقعی وہ صفات موجود ہیں یا نہیں، اگر موجود ہیں تو انکی حفاظت کریں اور ان کو ضائع نہ ہونے دیں۔

اب میں ایک نوعمر دوست کی مثال پیش کر کے بتانا چاہتا ہوں کہ آپ اپنی جانچ کس طرح کر سکتے ہیں۔ ان کا فرضی نام نواب ہے، ہونہار، ہوشیار، اور ذہین آدمی ہیں۔ مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ وہ نہایت پریشان تھے، ان کی پہلی شکایت تو یہ تھی کہ ان کا افسر اعلیٰ خفا

رہتا تھا، دوسری شکایت یہ تھی کہ محکمہ کے کسی شخص سے ان کی موافقت نہ تھی! اور انھیں وجوہ سے وہ اپنی لیاقت کا اظہار نہ کر سکتے تھے، تین سال کے عرصہ میں نواب نے مختلف قسم کے کام شروع کئے۔ کہیں سے تو وہ برخاست ہوئے اور کوئی کام وہ خود چھوڑ آئے۔ اور ہر مرتبہ کسی نہ کسی آدمی سے ناراض رہے، یعنی استعفیٰ یا برخاستگی کا باعث یہ ہوتا تھا کہ یا تو محکمہ کے کسی کام ملازم سے ٹکر ہو جاتی تھی یا وہ خود افسر اعلیٰ سے الجھ پڑتے تھے، نواب نے جوں توں کر کے تعلیم تو ختم کر لی تھی۔ مگر انکا خیال تھا کہ دنیا بہت بُری جگہ ہے، اور اس میں سخت نقص ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا بہت اچھی جگہ ہے صرف ہمارے دوست کی اندرونی دنیا میں نقص تھا، میں نے ان کی اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا وہ حسب ذیل تھا۔

(۱) پہلے تو میں نے ان کی ذہنی لیاقت کا اندازہ کیا، کہ وہ کس قسم کی تھی اور کتنے بار کے اٹھانے کی متحمل ہو سکتی تھی! میری غرض یہ تھی کہ مجھے معلوم ہو سکے کہ وہ جن کاموں میں ہاتھ ڈال رہا تھا وہ اس کی استعداد سے باہر تھے، یا کم تھے، میں نے مختلف قسم کے سوالات کر کے یہ رائے قائم کی کہ جن کاموں کو وہ کر رہا تھا یا کر چکا تھا ان سے اس کی لیاقت دس گنا زیادہ تھی! یعنی اس کا کارہائے منصبی میں اس کے دماغ کا صرف دسواں حصہ صرف ہوتا ہے اور بقیہ نوے حصے شکایتوں اور جنگ و جدال کی نذر ہوتے تھے، چنانچہ اس نے ایسی خفیف خفیف باتیں سنائیں جن پر وہ لڑ کر یا تو برخواست ہوا تھا یا مستعفی! یہاں یہ نکتہ یاد رکھنے کے لایق ہے کہ اگر آپ کو کسی پر غصہ آئے۔ اور آپ تنہائی میں اس کا تصور کر کے دانت پیسنے لگیں کہ بغیر بدلہ لئے ہرگز نہ چھوڑونگا، تو آپ کو چاہئے کہ آپ اپنی حالت پر ہنسیں، کیونکہ برائی کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے، اور آپ اپنا دستور العمل یہ بنالیں:-

(۲) "میں دنیا میں اگر اور لوگوں کے ساتھ رہکر بسر کرنا چاہتا ہوں تو چاہئے کہ پرانے قضیوں کو اور شکایتوں کو فراموش کر دوں"!

(۳) نواب میں مجھے ایک اور بات نظر آئی جس کی طرف والدین کو ابتدا سے توجہ

کرنی چاہئے - وہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور تیز تھا، اور جب دوسرے بچے اُس کی بات نہ سمجھتے تھے تو وہ خفا ہوا کرتا تھا، بچپن سے یہ عادت ترقی پاتی رہی اور شباب میں بھی رنگ لائی - یعنی اپنی ذہانت سے وہ معاملہ کی تہہ پر فوراً پہونچ جاتا تھا، اور اس بات پر خفا ہوتا تھا کہ دوسروں کی سمجھ میں وہ بات کیوں نہیں آئی - یہی وجہ محکمہ کے ملازمین اور بعض اوقات افسروں سے بگاڑ کا باعث ہوئی - اس مثال سے بھی ہم ایک اور اصول قایم کرتے ہیں -

" ذہین آدمیوں کو چاہئے کہ وہ سست آدمیوں کے ساتھ صبر اور نیکی کا برتاؤ کریں "

سست ذہن آدمیوں کو اپنی تیزی کے ساتھ کھینچنے میں اُن کا دل دُکھتا ہے، غصہ پیدا ہے، اور اکثر رنجش پیدا ہو جاتی ہیں - سست ذہن آدمی فطرتاً مجبور ہے، وہ ذہین آدمی کیساتھ کیونکر سوچ سمجھ سکتا ہے، اُس پر خفا ہونا، فطرت سے لڑنا ہے اور سخت حماقت ہے، آپ کبھی دوسروں پر حکومت نہ کر سکیں گے جب تک کہ آپ دوسروں کے دماغی معلم کے ساتھ ساتھ چلنا نہ سیکھیں گے -

اب اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نواب کی زندگی سے آپ کو تین سبق حاصل ہوئے -

(۱) جو کام آپ کریں وہ آپ کی لیاقت سے نہ تو بہت گرا ہوا ہو، اور نہ بہت بلند ہو،

(۲) اپنے دل میں بغض کو جگہ نہ دینی چاہئے -

(۳) سست ذہن آدمیوں کے ساتھ تیزی نہ کرنی چاہئے بلکہ اُن کو ساتھ ساتھ رکھنے کے لئے اپنی رفتار کم کرنی چاہئے، اب اگر علاج کی طرف توجہ کیجائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو سب سے پہلے اپنے آپ کو دوبارہ تعلیم کرنی چاہئے، دوبارہ تعلیم کرنے کا طریقہ یہ ہے -

(۱) آپ ایمانداری، صفائی، اور انصاف کے ساتھ اپنا مقابلہ دوسروں کے ساتھ

کرناسیکھیں۔

نقشہ جو اس مضمون کے ساتھ شامل ہے، آپ کے کام آئے گا، اس کی طرف توجہ کیجئے اور خود بھی ویسا ہی نقشہ بنا کر اپنی قابلیتوں کا موازنہ دوسروں کی قابلیتوں سے کیجئے۔ اور یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے، میری گفتگو نواب سے ہوئی تھی وہ حسب ذیل تھی۔ اس گفتگو سے آپ کو اندازہ ہو جائیگا کہ آپ اپنی جانچ اور دوسروں سے موازنہ کس طرح کرسکیں گے۔

میں - تم احمد علی سے واقف ہو؟

نواب - ہاں، اچھی طرح واقف ہوں۔

م - جو کام وہ کر سکتے ہیں، تم بھی کر سکتے ہو۔

ن - ہاں بہت سے کام کر سکتا ہوں۔

م - وہ کون سے کام ہیں جن کو تم اُن سے بہتر انجام دے سکتے ہو۔

ن - مجھے لوگوں کے نام اور لوگوں کی صورتیں خوب یاد رہتی ہیں، اُن کو نام یاد ہی نہیں رہتے،

م - ٹھیک ہے۔ اب بتاؤ کہ اگر کوئی مسئلہ تمہارے سامنے آئے تو تم بہ نسبت اُنکے زیادہ انہماک اور توجہ کے ساتھ اس میں معروف ہو سکتے ہو؟

ن - نہیں میری رائے میں اُن کو فضیلت ہے۔

م - خیر۔ مگر یہ بتاؤ کہ علی محمد، اختر، اور بشیر کے مقابلہ میں تمہاری قوت انہماک اور توجہ کا کیا حال ہے؟

ن - میں ان سے بہتر ہوں۔

م - مگر عبدالستار بھی تو ہیں! آپ کہتے ہیں کہ وہ احمق ہیں؟ لیکن آپ اپنا موازنہ اُن سے بھی کیجئے کہ قوت ارادی میں ان کی کیا حالت ہے؟

ن - قوت ارادی میں تو وہ مجھ سے کچھ بڑھے ہوئے ہیں۔ اپنی رائے ذرا مشکل سے

بدلتے ہیں۔

م - اب آپ یہ بتائیے کہ صفائی، سچائی، اور ایمانداری میں کہ اپنے ان احباب سے موازنہ میں آپ کا کیا مرتبہ ہے؟ ایک ایک کو لیکر رائے قائم کیجئے۔ اچھا پہلے دوستداری کو لیجئے۔ ان لوگوں کے مقابلہ میں دوستوں کے ساتھ آپ کی کیا حالت ہے؟ کیا عبدالستار دوستی کو اچھی طرح بناہتے ہیں؟ اور کیا وہ آپ سے بہتر دوست ثابت ہوتے ہیں!

غرض کہ اس طریق استدلال سے نواب صاحب پندرہ میں دوستوں کا موازنہ ہو گیا، اور جو نتیجہ مرتب ہوا، اس کو دیکھ کر ان کی ہمت بڑھی، اور خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا، یہی حال ہر شخص کا ہے، اس قسم کی ذاتی جانچ پرتال سے خود اعتمادی کو ترقی ہوتی ہے، آپ بھی آزمائش کیجئے اور دیکھئے کہ آپ کی حالت میں عظیم الشان فرق نظر آئے گا۔

میری اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک اور اصول اخذ کرتے ہیں یعنی :-

"دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اپنی قابلیتوں کا صحیح اندازہ ہو اور نیز اپنی کمزوریوں کا"

تعلیم کا اصلی مقصد یہ نہیں ہے کہ آپ میں ردانی پیدا کر دے، اس کی اصلی غرض یہ ہے کہ آپ اپنی حالت کا صحیح اندازہ کر سکیں، ہمارے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم کو اس بات کا علم ہو کہ ہم فلاں کام نہیں کر سکتے ہیں، اور فلاں کام کر سکتے ہیں، اور جب ہم کو صحیح علم ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں، اور کیا نہیں کر سکتے ہیں، اسی وقت ہم دوسروں سے اپنا موازنہ کر سکتے ہیں، انسان کی زندگی میں اس سے زیادہ ضروری اور کوئی کام نہیں ہے، آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ نواب کے پیش نظر اس کی دو تصویریں ہیں۔ ایک وہ جس میں اس کو اپنی دماغی قابلیتیں نظر آتی ہیں، ہم اس کو تصویر ذکاوت کہیں گے۔ اور دوسری وہ تصویر ہے جسمیں اس کی خصلتیں نظر آتی ہیں، یعنی اس کی قوت ارادی۔ قوت فیصلہ، قوت اعتبار، قوت ایمان،

وغیرہ وغیرہ جلوہ گر ہیں۔ اس کو ہم تصویرِ خصوصیات کہیں گے، ہم نے نواب کو یہ بھی بتا دیا کہ اُس کی تصویرِ خصوصیات، دوسروں کی تصاویرِ خصوصیات کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے بعد، یعنی یہاں تک پہونچکر ہم کو تصویرِ آرزو و جذبہ ترقی کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے یہ وہ تصویر ہے جس میں اُس کو آج پانچ یا دس برس آیندہ کی اپنی تصویر نظر آتی ہے انتہائی حیرت کی بات ہے کہ لوگ اپنی پانچ یا دس برس آیندہ کی تصویر قائم نہیں کرتے ہیں اور ذرا تصور سے کام لیکر یہ نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مہینہ، ایک سال، یا دس برس کے بعد کیا ہوں گے اور کیا کرتے ہوں گے۔ اس تصویر کے بنانے کے لئے ضروری ہے کہ انسان یہ بتا سکے کہ وہ اپنے شوق اور ذوق کے ساتھ کس کام کو کرنا چاہتا ہے، اور اس انتخابِ کام کی وجہ کیا ہے، ان دونوں سوالات کا صحیح جواب لیکر میں بتا سکتا ہوں کہ انسان کو کون کام شروع کرنا چاہیئے جس میں وہ یقینی طور پر کامیاب ہو سکتا ہے، اس موقع پر صحیح مشورہ دینا ذرا دشوار ہے۔ کیونکہ "میں سمجھتا ہوں میں فلاں کام کر سکوں گا" اور "میں واقعی فلاں کام کر سکوں گا" کے درمیان میں بہت فرق ہے، آپ کا خیال ہے کہ آپ یقینی طور پر فلاں کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ کر سکیں گے، لیکن جب کام کرنے کا وقت آتا ہے تو آپ کو اپنی غلطی محسوس ہوتی ہے، اگر آپ پہلے سے سوچ کر اور اپنی جانچ کر کے نتیجہ نکال لیتے تو غالباً آپ کبھی ایسے کام کے پاس بھی نہ پھٹکتے جس میں ناکامی ہی ناکامی تھی۔

سنجیدہ اور سمجھ دار آدمی اگر کافی غور کرے تو معلوم ہو جائے کہ وہ اُسی کام کو اچھی طرح کر سکتا ہے جس میں اُس کا دل لگتا ہے اور جس کی طرف اُس کو رغبت ہوتی ہے یہ "رغبت" اور "دل لگنے" کا سوال خاصا پیچیدہ ہے، عام طور پر اگر سوال کیا جائے تو نوجوانوں کی کثیر تعداد "سیر و سیاحت" اور "کھیل و تفریح" کی طرف رغبت ظاہر کرے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ سیر و تفریح کے ذریعہ سے کتنے نوجوان معاش کی مستقل صورت پیدا کر سکتے ہیں، نوجوان

کا فرض ہے کہ وہ سنجیدگی سے سوچیں اور طے کریں کہ واقعی کس طرف ان کی طبیعتوں کا میلان ہے۔ دُنیا کے شور و شعب، محنت، سختیوں اور کام کی پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے اور اپنی طبیعت اور قابلیت کا اندازہ کرتے ہوئے صرف اُسی کام کی طرف راغب ہونا چاہیئے جس کو انسان انجام دے سکتا ہے۔

دوسروں کے ساتھ تعلقات قایم رکھنے میں ہم کو اُن کی معمولی معمولی عادتوں اور خصلتوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ بادی النظر میں وہ محض معمولی اور ناقابل لحاظ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں گے تو وہ دوسروں کی فطرت ثانی بن چکی ہیں اور اس قدر پرانی ہو چکی ہیں کہ اب اُن سے چھیڑ چھاڑ، پوری جنگ کا پیش خیمہ بن سکتی ہے، اسی طرح مجھے ایک اور معاملہ پر بھی چند باتیں لکھنی ضروری ہیں میرا خیال ہے کہ عام طور پر لوگوں کی دماغی حالت اچھی ہوتی ہی لیکن بعض لوگ اپنی ملازمتوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُن کو بتاتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ طریقہ غلط ہے جو کام انسان قوت بازو سے اور اپنے دماغ سے انجام دیتا ہے محنت کرکے روپیہ کماتا ہے وہ قابل عزت ہے اور اگر وہ ذرا توجہ سے سوچے تو اُس کو خود بخود معلوم ہو جائیگا کہ اس عالم اسباب میں جسکی زنجیر کا سلسلہ بہت بڑا ہے، وہ ایک کڑی ہونیکا شرف رکھتا ہے پھر کیا وجہ ہے کہ انسان اپنے کاموں کو یا اپنی ملازمتوں کو حقیر اور ذلیل سمجھے؟

آخر میں مجھے صرف یہ بتانا ہے کہ

"اگر آپ دوسروں کی زندگی اور اُن کے کام میں دلچسپی لینا شروع کر دیں تو آپ کے ہمدرد احباب کی تعداد میں بہت اضافہ ہو جائے گا، مگر آپ اس خیال کو دل سے نکالدیں کہ دوسرے لوگ ہی آپ سے دلچسپی پیدا کریں"، جب تک آپ اس وہم میں گرفتار رہیں گے کہ دوسرے لوگ آپ کی ذات سے دلچسپی پیدا کریں آپ کے احباب کبھی پیدا نہ ہونگے، لیکن جس وقت آپ اس غلطی سے مُنہ موڑکر دوسروں کی طرف متوجہ ہو جایں گے دنیا آپ کے پیچھے پیچھے پھرے گی۔

بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے یہ کہنا کہ آپ اُس کو پسند کرتے ہیں شرمناک نہیں ہے اور یہ وہ الفاظ ہیں جن کو بادشاہ سے لیکر فقیر تک سُننا پسند کرتا ہے۔

دلچسپی کے معنی یہ ہیں کہ آپ جن لوگوں سے واسطہ رکھیں اُنکی کامیابیوں، اُن کی زندگیوں اور اُن کی ناکامیابیوں میں خلوص اور صداقت کے ساتھ دلچسپی لیں اور اُن سے ہمدردی اور محبت کا برتاؤ رکھیں۔ اور کبھی اس غلطی میں نہ پڑیں کہ جس طرح آپکو اپنے احباب کی فکر رہتی ہے دوسرے آپ کی فکر کیوں نہیں رکھتے ہیں۔ وہ خود بخود آپ کی طرف متوجہ ہو جائینگے، اور بہت جلد آپ محسوس کرنے لگیں گے کہ صداقت اور سچائی کے ساتھ ہمدردی کرنیکا صلہ دنیا بہت جلد دے دیتی ہے، جو لوگ ان اصول پر کاربند ہو کر دنیا میں رہیں گے وہ دیکھیں گے کہ احباب کی دنیا میں کمی نہیں ہے اور قدم قدم پر ایسے لوگ موجود ہیں جو اُن کی زندگی کو خوشگوار، اُن کے کاموں کو دلچسپ اور اُن کی مشکلوں کو آسان کر سکتے ہیں۔ اور یہی طریقہ ہے دنیا میں کامیابی کا!

(مختار)

غزل

(لسان الملک حضرت محشر لکھنوی)

ہجر میں نیرنگ ہستی صبر سے دیکھا کریں
چار آنسو رو کے آنکھوں کو عبث رسوا کریں

وقت نظارہ نظر کے سامنے ہیں سو حجاب
آنیوالے جلوہ گاہِ ناز میں آیا کریں

زندگی عشق میں ہنسنا ہے قسمت سی بعید
دل یہ کہتا ہے جہانتک ہو سکے رو دیا کریں

کوچۂ جاناں سے ہم نکلے تو پھر کیا رہ گیا
اب خدائی بھر کے فتنے سیکڑوں اٹھا کریں

زندگی اور حسرت ایفائے وعدہ روگ ہے
آنیوالے کا کہانتک راستہ دیکھا کریں

مدتوں سے سن رہی ہیں چارہ سازی آپکی
ہم تو جب جانیں مریض عشق کو اچھا کریں

لائیں محشر جلوہ گاہِ حسن میں وہ قدرتیں
سامنے آئے خدائی بھر تو اب دیکھا کریں

اب فرمائیے حضرات!

(ترجمہ روسی زبان سے)

از جناب محمد مجیب صاحب (آکسن)

خوب! اب میں شراب پینا بالکل چھوڑ دونگا .... کچھ .... کچھ بھی ہو! اب سمجھ سے کام لینے کا وقت آگیا ہے۔ محنت کرنا چاہئے، محنت، تنخواہ وصول کرنا پسند کرتے ہو تو ایمانداری سے کام کرو، دل لگا کر، خدا کا خیال کرکے، چاہے نہ آرام ملے نہ نیند۔ ہنسی مذاق چھوڑو .... تمہاری مفت میں تنخواہ لینے کی عادت پڑگئی ہے، اور یہ اچھا نہیں۔ اچھا نہیں ....

اسی طرح اور چند اخلاقی سبق اپنے آپ کو دیکر ٹکٹ کلکٹر پوُدچیاگن نے محنت اور مشقت کرنے کی ایک عجیب خواہش محسوس کی۔ رات کے دو بجے تھے، لیکن اس پر بھی اس نے اور چند ساتھیوں کو جگایا اور انہیں ساتھ لے کر ٹکٹ چک کرنے کے لئے گاڑی کا گشت لگانا شروع کیا۔

"آپ ...... کے ٹکٹ ......" وہ چلاتا ہے اور ٹکٹ چک کرنے کے اوزار کو خوشی سے ہلاتا جا رہا ہے۔

اونگھتے، گاڑی کے اندھیرے میں لیٹے ہوئے لوگ، کانپتے ہیں سر ہلاتے ہیں اور اپنے ٹکٹ پیش کرتے ہیں۔

"آپ ..... کے ٹکٹ" پوُدچیاگن نے سکنڈ کلاس کے ایک مسافر کی طرف مڑ کر

کہا۔ یہ شخص بہت دبلا ہے، بدن پر سوا ہڈیوں کے کچھ نہیں، کمبل میں لپٹا ہوا ہے اور چاروں طرف تکیہ لگے ہیں۔

"آپ کے.... ٹکٹ...."

"مسافر کچھ جواب نہیں دیتا۔ وہ نیند میں غرق ہے۔ ٹکٹ کلکٹر اوس کا کندھا ہلاتا ہے اور بے صبری سے کہتا ہے!"

"آپ.... کے..... ٹکٹ!"

مسافر کانپ جاتا ہے، اور آنکھیں کھول کر پوڈچیاگن پر ایک خوف زدہ نظر ڈالتا ہے۔

"۔کیا؟ کون؟ ہائیں؟"

"۔آپ سے آدمیوں کی طرح کہتے ہیں: آپ کے.... ٹکٹ! ذرا تکلیف کیجئے!"

"اے خدا" مسافر روندھا سا چہرہ بنا لیتا ہے۔" اے خدا! مجھے گٹھیا کی بیماری ہے........ تین رات سویا نہیں، جان بوجھ کر ( ) مورفیہ پھانکا، کہ نیند آجائے.... اور آپ.... ٹکٹ لینے پہونچے! یہ تو ظلم ہے، انسانیت کے خلاف ہے! اگر آپ کو اس کا کچھ اندازہ ہوتا کہ مجھے نیند کتنی مشکل سے آتی ہے تو آپ اس ذرا سی چیز کے لئے مجھے نہ جگاتے..... بے رحمی، بے تکا پن ہے! اور آپ کو میرے ٹکٹ کی کیا پڑی ہے؟ محض حماقت ہے! اور کچھ نہیں!"

پوڈچیاگن سوچتا ہے کہ اس پر خفا ہونا چاہئے یا نہیں۔ اور یہ ارادہ کرتا ہے کہ خفا ہونا لازم ہے۔

"۔آپ یہاں مت چلائیے! یہ چنڈو خانہ نہیں!"

مسافر کھانس کر جواب دیتا ہے:۔

"آپ سے تو چنڈو خانہ میں بھی زیادہ بھلے لوگ ملتے ہیں....... اب بتاؤ کہ مجھے نیند پھر کیسے آئے گی! عجیب بات ہے، میں یورپ کے تمام ملکوں میں سفر کر چکا ہوں، وہاں

مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہیں مانگا، لیکن یہاں پہونچتے ہی بس یہ لوگ پیچھے پڑ جاتے ہیں، جیسے کوئی بھوت پریت ان پر سوار ہے، اور اس کے سوا ان کو کچھ نہیں کرنے دیتا!

"جی ہاں، اگر یورپ آپ کو پسند ہو تو وہیں چلے جائیے"

"حماقت ہے جناب، بس اور کیا کہوں! دھوئیں کے مارے سانس نہیں لیجاتی، ہر طرف سے سرد ہوا آرہی ہے، کیا مسافروں کو یہ تکلیف کافی نہیں؟ اس کے علاوہ کمپنی یہ تمام قاعدوں پر بھی عمل کرائے گی، خدا اس کو غارت کرے، ان حضرت کو ٹکٹ چاہیے، دیکھیے تو کس دھوم سے ٹکٹ مانگتے ہیں! اور اگر یہ اتنی سختی نہ کرتے تو تو کون اس ملک میں ایسا ایماندار ہے کہ ٹکٹ لے کر چلتا!"

"سنئے جناب، اگر آپ شور مچانے اور دوسرے مسافروں کو دق کرنے سے باز نہ آئیں گے تو میں آپ کو اگلے اسٹیشن پر اوتار دونگا اور آپ پر عدالت پر دعویٰ کرا دونگا!"

"یہ تو عذاب ہے!" چند لوگوں سے نہ رہا گیا، بول اٹھے "بیمار آدمی سے کیوں ٹر رہا ہے! بات سمجھ جی اور جھگڑا ختم کردو!"

"مگر دیکھئے تو وہ خود بُرا بھلا کہہ رہے ہیں" پودچیاکن ذرا ڈر کر کہتا ہے۔ بہت اچھا، میں ٹکٹ نہیں لوں گا......جیسا آپ چاہیں......لیکن دیکھئے تو آپ کو خود معلوم ہوگا کہ میں اسی کام کے لئے نوکر ہوں اگر میرا فرض نہ ہوتا تو......آپکا جی چاہے تو اسٹیشن ماسٹر سے پوچھ لیجئے......جس سے جی چاہے پوچھ لیجئے۔

پودچیاکن کندھے ہلا کر بیمار کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ پہلے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے اور اس کی بے عزتی ہوئی ہے، لیکن اس کے بعد جب وہ دو تین ڈبوں سے گذر چکتا ہے تو اس کے ٹکٹ کلکٹری سینہ میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے اور اپنی حرکت پر پشیمانی۔

"واقعی اس مریض کے جگانے کی کوئی ضرورت نہ تھی" وہ اپنے جی میں سوچتا ہے۔ لیکن اس میں میری کوئی خاص غلطی نہ تھی۔ وہ سب سمجھتے ہیں کہ موٹا ہو رہا ہوں اور بیکاری کے سلسلہ میں سب سے ٹکٹ مانگتا پھر رہا ہوں، لیکن اونھیں یہ نہیں معلوم کہ میرا کام یہی ہے...... اگر ان کو اس کا یقین نہیں تو میں اسٹیشن ماسٹر کو اون کے سامنے پیش کر سکتا ہوں"

اسٹیشن، گاڑی پانچ منٹ ٹھرتی ہے۔ تیسری گھنٹی سے پہلے پودچیاگن اسی درجہ میں جس کا ذکر ہو چکا ہے پہنچتا ہے۔ اس کے پیچھے اسٹیشن ماسٹر لال ٹوپی پہنے ہوئے۔

"یہ دیکھئے، یہ صاحب ہیں" پودچیاگن کہنا شروع کرتا ہے" جو فرماتے ہیں کہ مجھے اون سے ٹکٹ مانگنے کا کوئی حق نہیں اور..... اور مجھ پر خفا ہوتے ہیں۔ میں آپ سے اسٹیشن ماسٹر صاحب، درخواست کرتا ہوں کہ ان کو سمجھا دیجئے۔ آیا ٹکٹ چیک کرنا میرا فرض ہے یا میں یوں ہی لوگوں کو دق کر رہا ہوں۔ جناب۔ جناب" دبلے پتلے مسافر کی طرف رجوع ہو کر کہتا ہے" لیجئے، اسٹیشن ماسٹر صاحب سے پوچھ لیجئے اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں"

بیمار مسافر کانپ جاتا ہے، جیسے اوس کے کسی بھڑ نے ڈنک مار دیا، آنکھیں کھول دیتا ہے اور روندھا چہرہ بنا کر گدی پر پیٹھ کے بل لیٹ جاتا ہے۔

"اے خدا! دوسری پڑیا پھانکی تھی اور اونگھا ہی تھا کہ وہ پھر آگیا...... پھر آگیا۔ آپ کے ہاتھ جوڑتا ہوں، مجھ پر رحم کیجئے!"

"لیجئے آپ اسٹیشن ماسٹر صاحب خود سے پوچھ سکتے ہیں کہ مجھے ٹکٹ چیک کرنے کا حق ہے یا نہیں!"

"بھئی یہ تو مجھ سے نہیں سہا جاتا! آپ آخر ٹکٹ لیکر کیا کریں گے...... کیا کرینگے! میں پانچ ٹکٹ خریدنے کے لئے تیار ہوں، مگر مجھے آرام سے مرنے دیجئے! کیا آپ خود کبھی بیمار نہیں ہوئے! بڑی بے حس قوم ہے!"

"یہ تو صاف ہنسی اُڑا رہا ہے" ایک مسافر جو فوجی وردی پہنے ہے خفگی سے کہتا ہے "اور نہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں اس بات پر اڑا ہوا ہے!"

"جانے دو، اسٹیشن ماسٹر تیوری چڑھا کر کہتا ہے اور پوچیاگن کی آستین پکڑ اُسے باہر کی طرف کھینچ لیتا ہے۔

پوچیاگن کندھے ہلاتا ہے اور اسٹیشن ماسٹر کے پیچھے دھیرے دھیرے چلا جاتا ہے۔

"بھلا ان لوگوں کو کوئی خوش تو کرے،" وہ ناراض ہو کر اپنے آپ سے کہتا ہے میں اُسی کی خاطر اسٹیشن ماسٹر کو بھی بلا لایا تھا کہ میری بات سمجھ لے اور اُسے تسکین ہو جائے، اور وہ .... اُلٹا مجھے بُرا بھلا کہتا ہے!"

دوسرا اسٹیشن۔ گاڑی یہاں پر دس منٹ ٹھرتی ہے۔ دوسری گھنٹی سے پہلے، جب پوچیاگن ریفرشمنٹ روم میں کھڑا سوڈا واٹر پی رہا ہے تو اس کے پاس دو صاحب آتے ہیں، ایک انجنیر کی وردی میں، دوسرا فوجی اوورکوٹ میں۔

"سنئے ٹکٹ کلکٹر صاحب!" انجنیر پوچیاگن سے کہتا ہے "بیمار مسافر کے ساتھ جو آپ نے حرکت کی ہے اس سے ان تمام لوگوں کو جو وہاں بیٹھے تھے بڑی سخت تکلیف ہوئی۔ میں انجنیر پوزنیٹسکی ہوں اور یہ..... کرنیل صاحب ہیں۔ اگر آپ اُن مسافر سے معافی نہ مانگیں گے تو ہم کمپنی کے ڈائرکٹر سے، جس سے ہم دونوں کی جان پہچان ہے، آپکی شکایت کریں گے۔"

پوچیاگن جلدی سے کہتا ہے:

"مگر میں تو..... مگر آپ تو..... "

"ہم آپ سے بحث کرنے نہیں آئے ہیں۔ لیکن ہم آپ کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ نے معافی نہ مانگی تو ہم مسافر کی طرف سے بدلے لیں گے۔"

— بہت اچھا ہیں..... ہیں، جیسا آپ چاہیں، معافی مانگ لوں گا..... لیجئے......

آدھے گھنٹے کے اندر پوچیاگن، معافی مانگنے کا ایک فقرہ، جس سے مسافر خوش ہو جاتا اور اس کی اپنی ہتک بھی نہ ہوتی سوچ کر اسی درجہ میں پہنچا۔

"جناب! —" وہ بیمار کی طرف مخاطب ہوتا ہے۔

"سنئے جناب!"

بیمار کانپ جاتا ہے اور گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"کیا ہے؟"

"میں اس کو..... کیا کہوں؟..... آپ خفا نہ ہوجئے......

"ارے پانی دو، پانی — بیمار ہانپ کر دل پہ ہاتھ رکھ لیتا ہے — تیسری ٹرپا پھانکی تھی اور...... پھر! اے خدا یہ عذاب آخر کب دور ہوگا؟

"میں اوسے..... آپ معاف کریں گے......

"سنئے..... آپ مجھے اگلے اسٹیشن پر اُتار دیجئے گا....... مجھ سے اور نہیں برداشت ہو سکتا..... میں مر رہا ہوں......

"کیا ذلیل، کمینی حرکت ہے" حاضرین میں ست چند نے کہا۔ "چلئے، دُور ہوجئے! اگر پھر ایسا مسخرہ پن کیا تو اس کی سزا ملے گی! چلئے!"

پوچیاگن ٹھنڈی سانس بھر کر درجہ سے باہر نکل آتا ہے۔ ریلوے کے ملازموں کا جو درجہ ہے اس میں آکر بیٹھ جاتا ہے، اور شکایت شروع کرتا ہے۔

"اب فرمائیے، حضرات پبلک! آپ کو بھی خوش کرنے کی کوشش کا کیا نتیجہ ہوتا ہے! اور کیا خدمت محنت کی جائے! جی بھی نہ چاہتا ہو تب بھی سوا اس سب جھگڑے کے لات مارنے اور مست ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہیں........ کچھ نہ کرو — خفا ہوتے ہیں، کچھ کام شروع کرو، تب بھی خفا ہوتے ہیں............ بس پیو،

اور کیا!"

پودچیاگن ایک سانس میں آدھی بوتل پی جاتا ہے اور محنت، فرایض اور ایمانداری کے پھندے میں نہیں پڑتا۔

(چیخوف)

کتب مجوزہ بغرض ریویو

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو ہمارے پاس آئی ہیں جن کی رسید شکریہ کے ساتھ پیش کیجاتی ہے عنقریب ان سب کتابوں پر ریویو کیا جائے گا۔

باقیات فانی - دیوان جناب فانی علیگ۔ وکیل اٹاوہ ے ر

ہندو تیوہاروں کی اصلیت منشی رام پرشاد صاحب بی۔ اے ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول گونڈہ ۹۰ ر

دور ایام - تاریخ ریاست ٹونک کا دوسرا حصہ۔ امیر الانشا دبیر الملک مولوی سید علی اصغر صاحب ناظم نیاہیرہ ٹونک ۸ ر

درر التبیان - سید محمد حمید صاحب۔ اسٹیشن روڈ نامپلی۔ حیدرآباد دکن ۸۰ ر

التبیذیر حقیقۃ الرسوم - مولوی محمد عبدالشکور صاحب کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۸ ر

شمیم حصہ اول و حصہ دوم (افسانہ) مولوی فیاض علی صاحب بی۔ اے علیگ وکیل فیض آباد ۲ ر

مرآۃ الاسرار - مسئلہ استرداد برار پر تنقید و تبصرہ سید مبین الرحمن صاحب بی۔ اے ال۔ ال بی وکیل اکولہ۔ برار۔ ۱۲ ر

مخزن توفیق - ابتدائی تعلیم کے لئے۔ محمد حمید اللہ صاحب کنل منڈی حیدرآباد دکن ۳ ر

تنقید بر قواعد اردو - از مولوی محمد عبدالغنی صاحب ایم۔ اے۔ پتہ:- پروفیسر عبدالقوی صاحب ایم اے فانی۔ لکھنؤ یونیورسٹی ۱۲ ر

تذکرہ رحمۃ للعالمین (یعنی زمانہ میلاد حصہ اول و دوم) مولینا حبیب حسین ساکن ردولی شریف۔ پتہ:- سجاد حسین عبدالرزاق تاجران نواب بازار ڈاکخانہ و مقام قصبہ ردولی ضلع بارہ بنکی ۶۰ ر

ہملیٹ - (شیکسپیر کا ناٹک) مترجمہ مولوی امتیاز علی صاحب بی اے وکیل فیض آباد پتہ:- منشی اصغر علی مکان جناب مترجم محلہ مغل پورہ شہر فیض آباد۔ مجلد ۱۲ ر غیر مجلد ۸ ر

منیجر شمع

کفایت شعاری

از

(جناب سید امیر حیدر صاحب نجت اکبر آبادی)

مداوائے تذلیل و درمانِ خواری — کفایت شعاری کفایت شعاری

بکار آیدت داشتہ اے برادر — چو وامے نداری تو جامہ بیاری

"جو پیسہ بچایا وہ ہی پیسہ پایا" — یہ اک قول[۵] ہے لاکھ تولونہ بھاری

لئے منہ میں ننھے سے ریزے کو چیونٹی — وہ دیکھو چلی جارہی ہے بچاری

اگر تم پس انداز کچھ کرسکو گے — سنور جائے گی زندگانی تمہاری

کفایت کو تم بخل ہرگز نہ سمجھو — نہیں آجکل دولت و تاجداری

اگر خرچ آمد سے زائد کرو گے — تو سوکھے گا دریا جو ہے آج جاری

سکھاتا ہے انسان کو صرف بیجا — جوا۔ رہزنی، جعل، چوری، چکاری

کُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا پر — عمل کیجئے۔ ہے یہ فرمان باری

بشر کو مناسب نہیں صرف بیجا — ہے شایانِ شان خاک کو خاکساری

نکالو گے پاؤں جو چادر سے باہر — تو بے چادری تم کو کر دیگی عاری

زمانہ ہے بیزار اگر زر نہیں ہے — ہے بے سود بے زر کا زور اور زاری

اگر تم نے پہنا ہے دھاری کا کرتہ — تو راجہ نہ بنجاؤ تم راجدھاری

یہ دنیائے عالم فریب آشنا ہے — جو آدھی کو چھوڑو تو جاتی ہے ساری

---

۵ انگریزی مثل ہے ۱۲

ہی جز بے ایمانی کی اسراف بیجا، کفایت شعاری ہے ایمانداری
شمار آمد و خرچ کا گر نہ رکھا عجب کیا جو ہو نوبت دم شماری
مناسب ہے پابندِ اوقات رہنا کہ ہے وقت کھونہیں تذلیل و خواری
تباہی نہ لو سر پہ عیاش ہو کر کہ بے سود ہے ایسی یارو نکی یاری
تم اندھے رہو گے دم واپسیں تک جو تیر نظر کا لگا زخم کاری
بھروسہ رہے زور بازو پہ اپنے نہ کام آئیں گے یہ سلاری مداری
کفایت ہو عادت مشقت ہو شیوہ اگر دل میں ہے عزم مقصد براری
کرو کام اپنا یہ دن کام کے ہیں جوانی میں کیوں خواب غفلت ہو طاری
جو پیدل چلو گے تو طاقت بڑھیگی نہ تم نہ پابندِ شوق سواری
ضعیفی میں پھر آپ پچھتائیے گا اگر کھیل میں نوجوانی گزاری
جوانی میں تم خواب غفلت سے چونکو ضعیفی میں بے سود ہو آہ و زاری
جو آپ اپنا یارو مددگار ہوگا کریگا خدا اوس کی بے شبہ یاری
فقط عرض احوال ہے اہل دل سے نہ یہ شاعری ہے نہ مضمون نگاری

اثر صحبت ناداں کی باتوں میں کیا ہو
نہ عالم، نہ مفتی، نہ واعظ، نہ قاری

(مسلسل)

مرزا جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر

از

(حسن عابد جعفری صاحب (آکسن) بیرسٹرایٹ لا۔ اڈیٹر شمع)

تاریخ پیدائش

ز دولت خانۂ نواب منصور

۱۱۴۴ھ

برآمد آفتاب از مطلع نور

۱۱۴۴ھ

۱۷۵۴ء میں چوبیس سال کی عمر میں بمقام فیض آباد تخت نشین ہوئے۔ وہ زمانہ نواب کے لئے پرآشوب تھا۔ اسمٰعیل بیگ خاں کابلی کا دور دورہ تھا۔ افواج اس کے قابو میں تھیں اور محمد قلی خاں، برہان الملک مرحوم کے بھتیجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتی تھی، کابلی چاہتا تھا کہ نواب کو برائے نام اختیارات دیے جاویں اور وہ خود سلطنت پر حاوی رہے، اسی زمانہ میں ہمت بہادر گوشائیں نے ایک کھتری عورت محل میں پہنچا دی۔ کھتریوں میں واویلا مچ گئی اور افواج کو موقع مل گیا۔ بادشاہ دہلی بھی نواب سے منحرف تھے، اس لئے افواج نے فوراً محمد قلی خاں کو طلب کرلیا۔ اس فتنہ کا دفیعہ نواب کے قابو کا نہ تھا، مگر اُن کی والدہ نواب بیگم نے کمال

دانشمندی سے برافروختہ اور بدظن سرداروں کو راضی کرلیا۔ محمد قلی خاں طلبی کی خبر پاتے ہی چل کھڑا ہوا، آدھے رستہ میں اُس کو اطلاع ملی کہ سرداروں کی کشیدگی رفع ہوگئی ہے اور اُس کو الہ آباد واپس جانا چاہئے۔ چونکہ وہ نصف راہ طے کرچکا تھا اور احتمال تھا کہ واپسی کی اطلاع جب نواب کو پہونچے گی تو وہ مشکوک ہونگے اس لئے ارادہ فسخ نہ کیا بلکہ اشتیاق قدمبوسی کا عذر پیش کرکے نواب کی خدمت میں چلا آیا۔ اسمٰعیل بیگ کا انتقال ہوگیا اور بادشاہ دہلی نواب عمادالملک کے ہاتھوں تنگ آکر لکھنؤ چلے آئے۔ نواب نے ساتھ لاکھ نقد اور ہاتھی اور گھوڑے نذر کئے۔ کج اندیشوں کے مشورہ سے متاثر ہوکر بادشاہ نے محمد قلی خاں کو وزارت اودھ کا جائز امیدوار تسلیم کرلیا اور اُس کو اپنے ہمراہ لیکر تسخیر بنگالہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ محمد قلی خاں کو بادشاہ کی کمزوریوں کا اور اُن کی بدرعبی کا جب علم ہوا تو گھبرایا اور اُن سے رخصت ہوکر لکھنؤ چلا آیا۔ اُس کو خوف تھا کہ نواب ناراض ہوکر اُس کی جاگیر کو ضبط اور اُس کے بیوی بچوں کو قید کرلیں گے۔ نواب ان معاملات سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ محمد قلی خاں گرفتار کرلیا گیا اور جلال آباد کے قلعہ میں بند کردیا گیا۔ ایک دن نواب، احمد شاہ ابدالی کے لشکر میں گئے ہوئے تھے، ہواخواہوں کو موقع مل گیا، اور محمد قلی خاں کو ہلاک کرکے کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہیں اُس کی قبر بنی جو بعد کو اُس کے ورثا کی زیارت گاہ ہوگئی۔ اس واقعہ کے بعد نواب کی زندگی میں بعض مشہور معرکہ آرائیاں ہوئیں۔

(۱) ۱۱۷۴ھ میں نواب نے نجیب الدولہ نواب خاں کے ساتھ شریک ہوکر مرہٹوں کو شکست دی۔

(۲) احمد شاہ ابدالی کے ساتھ شریک ہوکر پانی پت کا میدان مرہٹوں کے مقابلہ میں سر کیا۔ اس جنگ میں اسّی ہزار مرہٹے کام آئے۔ اور احمد شاہ ابدالی ہندوستان کا چند روزہ بادشاہ بن گیا۔ ۱۱۷۵ھ میں اُس نے نواب کو خلعت وزارت سے سرفراز کیا۔

(۳) ۱۱۸۵ھ میں نواب نے بُندیلوں کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر بل بعدر تعلقہ دار کی بغاوت کا حال معلوم کرکے بغیر جنگ کئے ہوئے، ہوبہ سے واپس چلے آئے۔

(۴) امیر الامرا احمد خاں بہادر عالی جنگ بنگش رئیس فرخ آباد کے خلاف ۱۱۸۷ھ میں فوج کشی کی۔

(۵) ۱۱۸۸ھ کے آخر اور ۱۱۸۹ھ کے آغاز میں انگریزوں سے نواب نے مقابلہ کیا۔ اور میجر ایچ منرو کی زیر کمان ۲۳ مئی ۱۷۶۴ء کو بکسر میں شکست کھائی۔ نواب لکھنؤ اور فیض آباد ہوتے ہوئے بریلی پہونچے، اور پٹھانوں، افغانوں اور مرہٹوں کو جمع کر کے ایک مرتبہ پھر انگریزوں کے مقابلہ میں آئے۔ لیکن بریگیڈیر جنرل کارنک کے زیر کمان انگریزی افواج کے ہاتھوں پھر شکست فاش کھائی۔ اور فرخ آباد میں جا کر پناہ لینی پڑی۔ نواب کی زندگی میں یہ وقت سب سے زیادہ سخت گذرا۔ اور اُن کی خودداری کا خون ہوگیا۔ کیونکہ انکو جنرل کارنک کے پاس جانا پڑا اور الہ آباد کے صلح نامہ پر دستخط کرنے پڑے جس کی رُو سے (۱) کڑا اور الہ آباد نواب سے چھین کر شاہ عالم ثانی کے اخراجات کی مد میں دیدیئے گئے (۲) نواب کو اپنی سلطنت میں انگریزی گماشتوں اور سوداگروں کو بغیر روک ٹوک اور بلا مزاحمت تجارت کی اجازت دینی پڑی، اور (۳) پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنے کا اقرار کرنا پڑا، نواب کے پاس بمشکل تمام دس لاکھ کی مالیت تھی۔ اعیان حکومت اور احباب سے امداد کا طالب ہونا پڑا، مگر کسی نے دل کھول کر نواب کا ساتھ نہ دیا۔ البتہ اس موقع پر اُن کی ناموس اور رفیق زندگی بہو بیگم نے وہ کام کیا جو بہ لحاظ شرافت اور بہ لحاظ رفاقت مشرق کے لئے مایۂ ناز ثابت ہوا۔ انہوں نے اپنی کُل جائداد۔ اور اپنا کل نقد و زیور فروخت کرکے نواب کو دے ڈالا۔ صلاح کاروں نے منع بھی کیا مگر انہوں نے جواب دیا وہ اگر نواب زندہ سلامت رہے تو یہ سب انہیں کا ہے، اور اگر خدانخواستہ وہ نہ رہے تو یہ چیزیں میرے کس کام کی؟

کہا جاتا ہے کہ بہو بیگم نے اپنی ناک کی کیل تک بیچ ڈالی تھی۔ غرضکہ اس طرح پر چالیس لاکھ روپیہ کی کمی پوری ہو گئی۔ لارڈ کلایو نے بورڈ کے نام اپنے خط مورخہ ۱۱ر جون ۱۷۶۶ء میں نواب کی صادق الاقراری کی تعریف لکھی ہے، اور لکھا ہے کہ نواب کی دوستی کا اُس کو کامل یقین ہے اور یہ دوستی انگریزوں کے لئے از بس مفید اور قابل اعتبار ہے۔

انگریزی گماشتوں اور سوداگروں نے نواب کے سلطنت میں طرح طرح کے مظالم کئے جن کی وجہ سے تنگ آکر نواب کو گورنر جنرل سے شکایت کرنی پڑی اور وہ لوگ سلطنت سے خارج کر دیئے گئے۔ لیکن ایک ہی سال کے بعد کمپنی کو سخت نقصان کا احساس ہوا، اور وارن ہیسٹنگز نے نواب سے مل کر زبانی گفتگو کے ذریعہ سے دوبارہ انگریز گماشتوں اور سوداگروں کے لئے اجازت حاصل کرنی چاہی۔ مگر نواب نے صاف انکار کر دیا اور کھلے ہوئے لفظوں میں بتا دیا کہ اگر وہ لوگ آئے تو ان کے اور کمپنی کے درمیان میں مصالحت قائم نہ رہ سکے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وارن ہیسٹنگز کو سخت مایوسی ہوئی۔

بنارس میں ۸ ستمبر ۱۷۷۳ء کو نواب نے ایک اور صلح نامہ پر دستخط کر دیئے اور ایک بریگیڈ کے اخراجات یعنی مبلغ اکیس ہزار کی ادائگی منظور کر لی۔ اور کڑہ اور الہ آباد کے واپسی کے لئے پچاس لاکھ روپیہ دینا قبول کر لیا۔ بیس لاکھ اسی وقت انگریزوں کو ادا کر دیئے اور پندرہ لاکھ ایک سال اور بقیہ پندرہ لاکھ دو سال کے بعد ادا کرنے کا اقرار کر لیا۔ نواب نے روہیلوں کی امداد مرہٹوں کے خلاف کی تھی اور روہیلوں نے چالیس لاکھ روپیہ نواب کو دینا طے کیا تھا مگر مرہٹوں کی شکست کے بعد وہ انکاری ہو گئے تھے۔ نواب نے کمپنی سے امداد چاہی اور چالیس لاکھ روپیہ کا وعدہ کر کے انگریزوں کی فوج لے کر روہیلوں پر حملہ کر دیا ۲۷ اپریل ۱۷۷۴ء کو نواب رحمت خاں روہیلوں کا سردار توپ کے گولہ سے قتل ہو گیا اور اسی روز نواب کی فوج کے ہاتھ میدان آگیا۔ اور روہیلہ مقبوضات کے بڑے حصہ پر نواب قابض ہو گئے۔

چند ماہ کے بعد نواب کی طبیعت خراب ہوگئی اور ۲۴ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۷۵ء کو فیض آباد میں بعمر پینتالیس سال انتقال ہوگیا۔ ان کی ہڈیاں دہلی بھجوا دی گئیں اور وہیں حضرت شاہ مردان میں جہاں ان کے اور عزیز بھی دفن تھے، سپرد خاک کردی گئیں۔

نواب نہایت وجیہ، قوی اور دلیر آدمی تھے۔ نواب بہو بیگم سے تمام عمر خوش رہے، آئندہ ماہ میں نواب بہو بیگم پر مفصل مضمون شمع میں شائع ہوگا۔ نواب روزانہ علی الصباح اپنی افواج کی قواعد کا معائنہ کرتے تھے، اور صبح اور دوپہر کو سلطنت کے امور کو انجام دیتے تھے۔

نواب شجاع الدولہ کا عہد حکومت کئی وجہ سے قابل لحاظ ہے۔ بالخصوص انگریزی پالیسی کے مدارج اور انکی کیفیتوں کا انکشاف نہایت واضح طور پر ہوتا ہے۔ ادھر یہیں سے سلطنت اودھ کی بربادی کا آغاز ہوتا ہے۔

چونکہ شمع کے صفحات بسیط اور مشرح حالات کے متحمل نہ ہوتے اس لئے واقعات کے اظہار کرنے میں حتی الوسع اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ فقط

اقبالی کیلنڈر بابتہ ۱۹۲۷ء

علامہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی تصویر سے مزین ہے، تصویر کے نیچے کیلنڈر کے اوراق ہیں۔ ہر ورق پر علامہ موصوف کا ایک شعر ہے جو مہینہ یا موسم کی رعایت سے دیا گیا ہے، کیلنڈر خوبصورت اور خوش وضع ہے، قیمت غالباً ۲ر ہو

مصطفائی بک ڈپو، رنگ محل لاہور

سے طلب فرمائیے

تبصرے

فرہنگ اصطلاحات علمیہ

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن کی توجہ اور جناب مولوی محمد عبدالحق صاحب بی - اے علیگ سکریٹری انجمن مذکور کی علمی کوششوں اور اُن کی دماغی کاوشوں کی داد نہ دینا حقیقت میں اردو زبان پر ظلم ہے - جو گرانمایہ علمی خدمت مولوی صاحب سے ظہور میں آرہی ہے اس کا جواب نہیں وہ اردو کے مسیحا ہیں - انہیں کی توجہ کی برکت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات علمیہ چھپ کر تیار ہوگئی - پوری کتاب پانچ سو صفحات سے زیادہ حجم کی ہے - اور کم و بیش بائیس مضامین کی علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ ہے - علم ہیئت، علم نباتات، اقتصادیات، حکومت ہند، آئینی حکومت، تاریخ انگلستان - تاریخ یونان - منطق - جبر و مقابلہ - ہندسی مخروطات، ہندسہ مجسمات، علم مثلث، تفرقی مساواتیں، علم سکون - مابعد الطبیعات - نفسیات - طبیعات - سیاسیات، آثار قدیمہ، وغیرہ کی اصطلاحات کے ترجمے ہمارے یہاں نہ تھے، اور اگر کہیں پر کچھ ترجمے ہوئے تھے تو وہ شخصی کوششوں کا نتیجہ تھے اور چونکہ ہر شخص نے اپنی طبیعت کے مطابق ترجمے کئے تھے اس لئے ایک ہی لفظ کے مختلف ترجمے ہوگئے تھے جو اصطلاحات کے اعتبار سے سخت مضر تھے اور پڑھنے والوں کو چکر میں ڈال دیتے تھے - ضرورت ہے کہ فرہنگ اصطلاحات کو عام طور پر رواج دیا جائے اور مترجمین کا فرض ہے کہ اصطلاحوں کے ترجموں کو قبول کریں، یا اگر وہ بعض اصطلاحات کے خود ترجمے کریں تو جب تک انجمن ترقی اردو اُن کو قبول نہ کرلے، استعمال نہ کریں - فرہنگ اصطلاحات علمیہ مکمل نہیں ہیں - جن مضامین کی طرف توجہ کی گئی ہے خود انکی بعض اصطلاحات ترجمہ ہونے سے رہ گئی ہیں - اسی طرح ابھی دیگر متعدد مضامین سے ہاتھ نہیں لگایا ہے لیکن اچھا ہوا کہ جو کچھ مسالہ تیار رہا شائع کردیا - بقیہ ترجموں کی خاطر موجودہ مواد کو روک

رکھنا مناسب نہ تھا، بلکہ ترجمہ کرنے والوں کے حق میں مضر ہوتا۔ دیگر مضامین اور اصطلاحات کا ترجمہ ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ جغرافیہ۔ فلسفہ، سائنس وغیرہ وغیرہ کی اصطلاحات جلد شائع کیجائیں گی۔ اور اس عرصہ میں نقد و تبصرہ و دیگر ذرائع سے جو معلومات بہم پہونچی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھاکر فرہنگ کا ایک ضمیمہ بھی شائع کر دیا جائے گا۔ کیونکہ بعض اصطلاحات کے ترجمے دقیق اور ثقیل ہیں۔ جہاں کہیں عربی کے ثقیل اور سخت الفاظ آئیں اُن کو ترک کرنا بہتر ہے اور اُن کے بجائے چھوٹے الفاظ، یا اصل اصطلاحات کو حتی الوسع مہند کرنا ضروری ہے۔ تاکہ مغربی علوم کو اصل زبان میں پڑھنا آسان ہو اور طبیعت پر زیادہ بار نہ پڑے، البتہ عربی اور فارسی یا سنسکرت کی اصطلاحات جو ثقیل نہیں ہیں اُن کے اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ وضع اصطلاحات کا کام کرتے وقت یہ اصول ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اصطلاحات اُن لوگوں کے لئے بنائی جارہی ہیں جن کی مادری زبان اُردو ہے، سنسکرت یا عربی نہیں ہے۔ یقین ہے کہ اس تنقید کو نیک نیتی پر محمول کیا جائیگا۔ ہم جانتے ہیں کہ اعتراض کر دینا بہت آسان ہوا کرتا ہے۔ لیکن اصطلاحوں کا ترجمہ کرتے وقت دانتوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ اور اس کام کے کرنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں کہ "کوہ کندن و کاہ برآوردن" کے کیا معنی ہیں۔

بہرکیف فرہنگ اصطلاحات کی اشاعت ایک ہتم بالشان کام تھا جو مستعدی اور عرق ریزی کے ساتھ انجام دیا گیا ہے۔ مولوی صاحب اور کارکنان انجمن دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ انگریزی اصطلاحات بائیں جانب اور اُنکا ترجمہ داہنی جانب چھپا ہے۔ قیمت صرف ۱؎ ہے، ہم اس کی خریداری کے لئے پُرزور سفارش کرتے ہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کے لئے تو یہ کتاب ازبس ضروری ہے۔

مذاکرات (سال اوّل)

ہمارے دوست سید ہاشمی صاحب فریدآبادی جوان ہیں، اُنکا دل جوان ہے اور

اور قلم بھی جوان ہے، جہاں اتنی جوانیاں جمع ہوں، وہاں جو کام ہوگا اُس پر شباب کی کیفیت ہوگی اور اس میں قوت و توانائی کی دلکشی ہوگی۔

' مذاکرات ' حیدر آباد کی ایک جدید انجمن یک سالہ محنت کا نتیجہ ہے، اور زیر جلد کے اندر وہ مضامین ہیں جو انجمن میں پڑھے گئے تھے، کاغذ نفیس لکھائی چھپائی پاکیزہ۔ جلد بندی قیمتی اور خوش وضع مضامین بہت اچھے، لکھنے والے مستند، غرض مذاکرات کی ظاہری نمایش سے طبیعت شگفتہ، اور اس کی باطنی خوبیوں سے روح مسرور ہوگئی۔ یہ انجمن قائم رہے گی؟ اس کا جواب تو وہی دے سکیں گے جو حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ مگر رسالہ کی خوبیوں مضمون نگاروں کی لیاقت اور خود جناب ہاشمی کی توجہ کو دیکھتے ہوئے تو امید پڑتی ہے کہ وہ بڑا کام کرے گی اور اس میں ہر سال بہتر سے بہتر مضامین پڑھے جائیں گے،

مذاکرات سات مضامین کا مجموعہ ہے تاج الماثر پر سید ہاشمی صاحب نے اور تحفہ سامی، اور جاویدان خرد پر، نواب صدر یار جنگ بہادر شروانی نے تبصرے تحریر فرما کر انجمن میں پڑھے تھے۔ اُن کی ایک غزل بھی ہے جو بہت خوب ہے، جاپان پر ہمارے محترم دوست نواب مسعود جنگ بہادر کی انگریزی نثر کا ترجمہ ہے۔ شمع میں ہم کئی بار جاپان کے متعلق آپ کے خیالات قارئین کرام تک پہونچا چکے ہیں۔ یہ مضمون بہت لطیف ہے۔ نظریہ اضافیت پر ڈاکٹر مظفر الدین صاحب کا مضمون ہے جو دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ اُستاذی جناب مولوی محمد عنایت اللہ صاحب ناظم دارالترجمہ کا مضمون جغرافیہ اندلس بہت دلکش، دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ آپ نے جغرافیہ اندلس کے متعلق جو تحقیقات کی ہے وہ قابل تعریف ہے اور ہم اُن کی بے مثل کتاب جغرافیہ اندلس کی اشاعت کے منتظر ہیں۔ مذاکرات کی جلدیں عام طور پر قیمتاً فروخت نہیں ہوتی ہیں، لیکن قدردانوں تک پہونچانے کے لئے عہ قیمت ہے۔

پتہ :- جناب معتمد صاحب مجلس مذاکرہ - دارالترجمہ حیدر آباد دکن

جلال الدین خوارزم شاہ

ترجمہ جناب مولوی سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے

اردو زبان پر سید صاحب موصوف کا احسان ہے کہ انھوں نے اس میں ترکی لٹریچر کے بیش بہا نمونے پیش کئے، اور غالباً سید صاحب ہی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اہل ہند کو ترکی لٹریچر سے روشناس کرایا۔ جودت طبع، اور جدت طراز تحریر کے لئے وہ کسی مزید تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ اُن کے مضامین اور ترجمے برسوں سے خراج تحسین حاصل کر رہے ہیں، اور مدت تک ہماری زبان میں موجود رہیں گے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ آپ نے ترکی زبان کے سب سے زیادہ مشہور ادیب نامق کمال بے مرحوم کے ایک عدیم المثال تاریخی، ڈرامے کا اردو میں ترجمہ فرمایا تھا۔ اور ہمارے پاس ریویو کے لئے بھیج گیا تھا لیکن افسوس ہے کہ طویل علالت کے باعث ہم ابتک اس مسرت بخش فرض کو ادا نہ کر سکے۔

ہمنے دوران علالت میں ترجمہ کو کئی بار پڑھا۔ اور اب بھی پیش نظر ہے، ہر مرتبہ اس کے مطالعہ سے طبیعت کو نیا لطف آیا۔ اور ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں یہ ترجمہ ایک نعمت ہے، اطبائع انسانی، اور نفسیاتی کیفیات کی جیتی جاگتی تصویروں کو اردو میں ہو بہو اُتار لینا، ادبی کارنامہ ہے جس کے لئے لائق مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں، چنگیز خاں کے خونیں دور میں جلال الدین بادشاہ، حمیت اسلام، اور غیرت وطن سے متاثر ہوکر وہ تمام باتیں کرتا ہے جو سر فروش مسلمان، جانباز سپاہی، اور غیور بادشاہ کے شایان شان ہوتی ہیں، عہد قدیم میں شخصی وقار اور فاتحانہ بے باک حملوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہونا معمولی کام نہ تھا۔ سپاہ کی فراہمی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں اس کے جوش کو قائم رکھنا، بیوی بچوں اور ذاتی آرام کی مفارقت، طرح طرح کی مصیبتیں اور سب سے زیادہ یہ کہ نفسانی اغراض کے لئے نہیں بلکہ محض مذہب وطن اور ملت کی خاطر، ان سب کو برداشت کرنا، نہایت سبق آموز باتیں ہیں،

واقعات کی تفصیل، اور مختلف جذبات، اور مواقع کی ترجمانی اور مصوری کے لطیف نمونے اسی ڈرامہ میں نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب نوجوانوں کے مطالعہ میں رہنی چاہیئے اور نصاب میں داخل ہونی چاہیئے۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے حجم ۴۸۰ صفحے قیمت عہ
پتہ:- سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے۔ رجسٹرار مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

غذائے روح، بالتصویر

شری مد بھگوت گیتا یعنی کرم یوگ شاستر کا منظوم ترجمہ پنڈت پربھو دیال صاحب مصر عاشق لکھنوی نے کیا ہے حجم ۱۲۰ صفحے۔ قیمت عہ
قابل مترجم نے ایک بسیط دیباچہ کے ذریعہ سے بتایا ہے کہ بھگوت گیتا کی تعلیم تارک الجزا ہے اسی رعایت سے ترجمہ کا نام غذائے روح، ہے۔ انھوں نے یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ بھگوت گیتا تارک الدنیا ہونا سکھاتی ہے بلکہ اس کا مقصد ہے کہ دُنیا میں رہو، لیکن اس کی (دنیا کی) محبت میں گرفتار ہو کر اپنی حقیقت اور دُنیا میں آنے کی غرض غایت، کو نہ بھولو۔ اور سچی محبت سے اپنا قلب پروردگار عالم کو نذر کر دو۔ لایق مترجم نے کوشش کی ہے کہ سنسکرت کے ایک شعر کا ترجمہ اردو کے ایک شعر میں کیا جائے جا بجا حواشی دیکر اور اخیر میں مشکل الفاظ کے معنی لکھہ کر شاعر نے تصنیف کو مفید بنا دیا ہے۔ شروع میں بھگوت گیتا کا خلاصہ سلیس عبارت میں ہے تاکہ ناواقف بھی ترجمہ کو بخوبی سمجھہ سکیں۔ البتہ شاعر نے ایک شعر کا ترجمہ ایک ہی شعر میں کرنے کی قید عائد کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے بعض مقامات تو بالکل تشنہ معلوم ہوتے ہیں اور ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ وہ چاہتے تو ترجمہ کو زیادہ شگفتہ بنا سکتے تھے۔ مگر خود عاید کردہ قیود توڑنی پڑتیں۔ اسی قسم کی اور قابل قدر سنسکرت تصانیف کو اردو میں ترجمہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ادبی اور علمی خدمت ہو اخیر میں مترجم کا عکس ہے۔ جا بجا بلاک کی تصویریں ہیں جن کا تعلق نفس کتاب سے ہے۔

پتہ:- پنڈت پربھو دیال صاحب مصر، عاشق لکھنوی - عرائض نویس - عدالت دیوانی - لکھنؤ،

دشینت وشکنتلا المعروف بہ مثنوی سحر

(از اقبال ورما صاحب سحر ہنگامی)

چھوٹی تقطیع پر ۷۶ صفحے کی نظم ہے - جناب سحر نے ہندوستان کے سحر نگار شاعر کالی داس کے مشہور قصہ موسومہ شکنتلا کو اردو مثنوی کا جامہ پہنایا ہے، ابتدا میں منشی دیا نرائن صاحب نگم اڈیٹر زمانہ کانپور کا لکھا ہوا مقدمہ ہے جس کے بعض حصے بہت پاکیزہ ہیں - مثلاً "شکنتلا کا نام زبان پر آیا اور پردہ تصور پر ایک تصویر کھنچ گئی - کیسی شگفتہ - کیسی درد انگیز، حسن اور شباب کا ایک لبھانے والا خواب، پھول کی طرح نازک اور پتی کی طرح کمزور -

ہرا بھرا جنگل، ندی کا شاداب کنارا، کنول کے پھولوں کا کنج - ہرنوں کی کلیلیں، چڑیوں کی خوشنوائیاں، شہد کی مکھیوں کے نغمے اور ہوائے معطر کے جھونکے، ان دلفریبیوں کے بیچ میں شکنتلا اپنی دو سہیلیوں کے ساتھ کنول کے بھورے پتے پر، راجہ کو خط لکھتی ہے - کتنا دلفریب تخیل ہے .... شکنتلا ایک عورت ہی سفر کی - درد کی - میٹھے الاپ کی - اس میں سیتا کی روحانیت نہیں - ساوتری کا استقلال نہیں - دمن کا صبر نہیں - وہ ایک کمزور ہستی ہے - تناور درخت نہیں جس پر ہوائیں اثر نہیں کرتیں - وہ ایک شاخ ہے جو ہواؤں سے ہلتی ہے اور ٹوٹ جاتی ہے - یہی اس کا جوہر ہے اسی نے اُسے دلکش بنا دیا ہے "

پہلے بھی شکنتلا کا ترجمہ اردو میں ہوا تھا، لیکن مترجم کی ہندو معاشرت کی ناواقفیت نے اصلی رنگ کو قائم رکھنے سے معذور کر دیا تھا - لیکن جناب سحر نے قصہ کی وطنیت کو بدرجہ اتم قائم رکھا ہے -

منشی صاحب کا خیال ہے کہ "بلاغت اور روانی بیان اور حسن ترکیب کے

اعتبار سے مثنوی سحر گلزار نسیم سے لگا کھاتی ہے "ہمارا خیال ہے کہ منشی صاحب کا یہ جملہ حسن مروت اور اخلاق پر مبنی ہے۔ روانی اور حسن بندش کے لحاظ سے گلزار نسیم بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

یعنی اک طفل تھا نمودار　　جیسے کہ صدف سے دُر شہوار
تھا حسن میں اک کمال خوبی　　تھا جسم میں اک مثال خوبی
شکیں جو ہوئی سکنتلا کی　　ممنون تھی بخشش خدا کی

سختی غم فراق سہتی　　محبوس تشددات رہتی
سکھیوں کو بھی رو کے گہہ رُلاتی　　گہہ یاہ کا ماجرا سُناتی

مثنوی دلکش ہے۔ اور شاعر کی فکر کا دلپذیر ثبوت ہے۔ بعض اشعار نہایت آبدار ہیں۔ اور کئی موقعے ایسے ہیں جہاں تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے یقین ہے کہ مثنوی مقبول ہوگی۔ قیمت غالباً ۸ رہے۔

ملنے کا پتہ:۔ زمانہ بک ایجنسی کانپور

مُصباح القوافی

مصنفہ سید محمد نقوی الکرسوی صاحب متخلص بہ سید۔ حجم ۱۶ صفحہ قیمت ۲ر

پتہ:۔ مولوی سید زین العباد صاحب نقوی محاسب محکمہ عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی حیدرآباد دکن

چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں تمام القاب حروف وحرکات قافیہ اور ان کے تعریفات مستند اہل فن کی تصانیف سے ماخوذ کر کے نظم کئے ہیں۔ طرز قدیم ہے مگر لایق مصنف اور شاعر کی محنت قابل داد ہے کہ ۶۸ اشعار میں کل مسائل بیان کر دئیے۔ معمولی توجہ سے

ان پر عبور ہو سکتا ہے اور مطالعہ شاعروں کے لئے ضروری ہے۔ اگر حواشی اور ضروری نوٹ دیدیئے جاتے تو رسالہ زیادہ مفید اور دلچسپ بھی ہو جاتا۔

ساربان حجم ۲۵ صفحے قیمت ۴ر۔ نورِ ہدایت حجم ۳۱ صفحے قیمت ۴۔ ارمغانِ عرب حجم ۳۰ صفحے قیمت ۴ر۔ پیمانِ وفا۔ حجم ۳۶ صفحے قیمت ۵ر۔ امانت حجم ۲۲ صفحے قیمت ۳ر۔ خطا تقدیر حجم ۵۵ صفحے قیمت ۶ر

یہ چھ رسالے ایم اسلم صاحب کی تصنیف ہیں اور نسیم بک ڈپو بارود خانہ بازار۔ لاہور۔ سے مل سکتے ہیں۔

ساربان :- حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت کا ایک دلچسپ اور مؤثر قصہ ہے۔ اور حقیقت میں مصنف نے خوب لکھا ہے۔

نورِ ہدایت :- میں حضرت سرورِ کائنات کا ایک صحابی جلیبیب شہید کا پاکیزہ کریکٹر دکھایا ہے۔

ارمغانِ عرب :- میں حضرت عمرؓ کے سوانحی حالات لکھ کر ایک بدو عرب کی دلچسپ حکایت ہے اور اسلام کے بعض ضروری اصول بیان کیے ہیں۔

پیمانِ وفا :- ایک رقت انگیز تاریخی قصہ ہے جسمیں عہد و پیمان پر قائم رہنے کی خوبیاں دکھائی ہیں۔

امانت :- خلیفہ ہارون رشید کے عہد کا واقعہ ہے جس میں ایک لڑکے کے عاقلانہ فیصلہ کا ذکر ہے۔

خطا تقدیر :- گذشتہ جنگ یورپ کی ایک دلچسپ، پُر درد اور سبق آموز داستان ہے جسکا تعلق حبِ وطن، ایثار، اور انسانی ہمدردی سے ہے۔

افسوس ہے کہ ہم ان رسائل پر جلد ریویو نہ کر سکے۔ ہم نے ان سب کو پڑھا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے ایک مفید خدمت انجام دی ہے۔ طرزِ بیان صاف اور سلجھا ہوا

ہے۔عبارت سلیس اور مؤثر ہے۔طرز تصنیف سبق آموز ہے۔ناصحانہ اور استادانہ نہیں ہر
جو بسا غنیمت ہے۔لڑکوں اور لڑکیوں کے واسطے یہ سب رسالے کارآمد ہیں۔اور اس
لایق ہیں کہ والدین خرید کر اولاد کو، اور استاد طالب علموں کو انعام کے طور پر تقسیم کریں،
توقع ہے کہ آیندہ اڈیشن میں نظرثانی سے عبارت کی بعض خامیاں دور ہو جائیں گی۔
مثلاً ساربان میں صفحہ ۸ پر ہے "طیور........ درختوں پر بیٹھے بیٹھے کر ٹکڑ مچا رہے تھے"
صفحہ ۱۹ پر ہے "ایک استعمال شدہ کرتا زیب بدن تھا" "چہرہ انوار ایمانی سے نورانی نظر آتا
تھا" "پھٹی ہوئی جوتیوں کا جوڑا پڑا تھا" وغیرہ وغیرہ۔لیکن یہ غلطیاں اس قسم کی نہیں ہیں
کہ رسالوں کی قدر و قیمت کو گھٹا دیں۔

بہشتی جھومر یا اسباق النسواں

(مصنفہ محمد مرزا خاں صاحب دہلوی۔حیدرآباد دکن)

لایق مصنف کا خیال ہے کہ ہندوستانی خواتین نے اس قدر ترقی کرلی ہے کہ اب بجائے
قصہ کہانیوں کے پیرایہ میں سبق دینے کے ان کی اخلاقی کمزوریوں سنجیدگی سے بحث کیجائے،
اور ان کے نقائص ان کو دکھائے جائیں تاکہ وہ اپنے معائب سے واقف ہو کر چپکے ہی چپکے
اپنی اصلاح کرتی رہیں۔یہ رسالہ اس مضمون کی پہلی قسط ہے جس میں لڑکی کے سسرال
جانے کے بعد اس سے جن جن کمزوریوں کا ظہور ہوتا ہے ان میں سے چند کی تشریح کردی
گئی ہے۔رسالہ میں چار سبق ہیں، اگر مقبول ہوا تو مصنف صاحب دوسرا حصہ بھی جلد شائع
کریں گے۔

مصنف نے اپنے خیالات کو صفائی کے ساتھ ظاہر کیا ہے۔البتہ عبارت ذرا دقیق
ہے جو معمولی لکھی پڑھی لڑکیوں کو مشکل معلوم ہوگی۔مگر ہمارا خیال ہے کہ اس کا مطالعہ

بہت کچھ فائدہ بخش ثابت ہوگا۔ سسرال جانے سے قبل اور سسرال پہونچ کر ہر تعلیمیافتہ لڑکی کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ کچھ انگریزی داں شوہر یا بیبیاں مصنف کے بعض خیالات سے اتفاق نہ کریں تاہم بہت سی باتیں سیکھنے کے قابل ملیں گی۔ جن پر عمل کر کے راحت مل سکے گی۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ہیں حجم ۲۰۰ صفحے۔ قیمت صرف ۱۰ار
چند جلدیں دفتر شمع میں موجود ہیں اور منیجر صاحب سے مل سکتی ہیں۔

صنف نازک

(مصنفہ جناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب سنبھل)

لایق مولف کا بیان ہے "دیوں دیکھنے کو آپ اس کو ایک مختصر سا مجموعہ کہدیں گے لیکن اس کے فراہم کرنے میں اور ترتیب دینے میں اپنی عمر کا بہترین حصہ اس کی تذر کرنا پڑا۔ دنیا کی ہر زبان کے شاعرانہ خیالات سے خوشہ چینی کرنی پڑی۔ کہیں سے پتی لی تو کہیں سے پھول، کہیں سے تنکا لیا تو کہیں سے رنگ و بو، تب کہیں یہ گلدستہ سدا بہار تیار ہوا"

مولف کے یہ الفاظ تعلی پر نہیں حقیقت پر مبنی ہیں۔ اور خدا معلوم انہوں نے ان جواہر ریزوں کو جمع کرنے اور بہترین اصلوب کے ساتھ پیش کرنے میں کیا کیا زحمتیں اٹھائی ہونگی۔

صنف نازک، بجائے خود ایسا نازک موضوع ہے اور اسکی دلپذیری ایسی عالمگیر ہے کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہونا ظلم ہے، چونکہ جذبات کی تخلیق اور صنف نازک کی مداحی فطری باتیں ہیں۔ اسلئے صنف نازک کی خوبیوں سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے، انکی تعریف کرنا شاعر کا کام ہے، ان سے قلب کو منور کرنا عارف کا کام ہے، اور انکی کمزوریوں کو الم نشرح کرنا مذہبی اور فلسفی دل و دماغ کو مبارک رہے یہ روگ طبائع انسانی کے بس کا نہیں، عورت پھول سے زیادہ نازک، تصویر سے زیادہ دلکش، موسیقی سے زیادہ مترنم، فلسفہ سے زیادہ سکون بخش،

دولت سے زیادہ راحت رساں، اور عزت سے زیادہ قابل قبول نعمت ہے، آپ اُس کی کمزوریوں کو دیکھنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں۔ اور اُس کی قوت انتقام یا زبان کی درشتی کو کیوں آمادہ عمل کرتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ اُس کی کمزوریوں، کو آمادۂ انتقام بنا لینا اور نقصان اُٹھانا مرد کے لئے واجبی سزا ہے کیونکہ عورت محبت کی دیوی ہے، اور یہ صفت اُس سے کسی عمر میں جدا نہیں ہوتی۔ اُس کا وجود شیریں ہے بھائیوں سے پیار، باپ سے الفت، شوہر سے محبت، اولاد سے شفقت، ہمسایہ سے مروت، اُس کے فطری خوبیاں ہیں، وہ بہترین مونس اور غمخوار ہے حقیقی رازدار ہے، اور حاضر و غائب یکساں جاں نثار ہے۔ مرد کے لئے زیبا ہے کہ اُس کی صفات سے روحانی مسرت اور سکون حاصل کرے، نہ کہ اُس کی دل آزاری اور تخریب کے درپے ہو،

مولوی سید علی اصغر صاحب بلگرامی نے تقریظ، اور مولوی محمد عظمت اللہ خاں صاحب بی اے نے دیباچہ پر لطف انداز میں لکھے ہیں۔ لائق مؤلف نے جہاں صنف نازک کی خوبیاں بتائی ہیں وہاں اُن کی کمزوریاں بھی گنوادی ہیں تاکہ مرد اُن کی صفات پر فریفتہ ہو، اور اُن کی کمزوریوں کی زد سے بچا رہے۔

حجم تقریباً ۸۰ صفحے، لکھائی چھپائی دلکش، اور جلد خوبصورت ہے، صنف نازک کا ایک فوٹو بھی ہے، قیمت ۸؍

پتہ:۔ مصنف بیرون۔ دبیر پورہ۔ حیدر آباد۔ دکن

سرورِ عالم

(مصنفہ مولوی عبد المجید صاحب۔ دار التصنیف کپورتھلہ)

مولوی عبد المجید صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے جناب سرور کائنات کی مقدس سوانحعمری ایسی خوش اسلوبی کے ساتھ لکھی ہے، تصنیف بذاتہ مختصر ہے لیکن سرورِ عالم کی حیات کے تمام ضروری پہلو موجود ہیں، اسوۂ حسنہ کو پیش کر کے دوسروں کے

لئے ایک بیش قیمت نمونہ پیش کیا ہے۔ اور کوشش کی ہے کہ نبی اور بشر ہونے کی حیثیتوں
سے سوانح دکھائی جائیں۔ بلاد عرب کا نقشہ ہے اور کوہ حرا کی عکسی تصویر بھی دی گئی ہے
کوہ حرا کے متعلق مولوی صاحب نے لکھا ہے "جس کے دیکھتے ہی دیار حبیب کی ایک نمایاں
خصوصیت سامنے آجاتی ہے اور انسان عالم تصور میں اس سرزمین میں جا پہونچتا ہے جہاں
کوہ حرا کی چوٹیاں اور اس کے گوشہ ہائے عزلت، ایسی خاموش و ساکن زبان کے ساتھ
جس سے زیادہ کوئی زبان بلند آہنگ نہیں ہوسکتی، دنیا کو بتاتے رہیں گے کہ یہی وہ گھاٹیاں
ہیں، یہیں وہ غار ہے، جہاں سے سادہ مگر چونکا دینے والا پیغام آیا۔
"یا محمد انت رسول اللہ" اور جس نے زمانہ کی ظلمت کو عالم افروز نور سے بدل دیا
ان مقامات کے تصور سے ہی انسان، روح نواز کیفیتوں اور کیفوں میں ڈوب جاتا ہے اور
دل روحانی طمانیت کے بار سے تھرتھرانے لگتا ہے" کتاب میں سنہ ہجری کے ساتھ سنہ
عیسوی بھی دیا گیا ہے۔ کتاب قابل قدر ہے۔ قیمت صرف بارہ آنہ۔

موصوف نے چھوٹا رسالہ "انا بشر" بھی تصنیف کیا ہے۔ اور کیا خوب لکھا ہے کہ "رسول
عربی کے اسوۂ حسنہ جو دنیا کے لئے بمنزلہ متاع عمومی کے ہیں، بنی نوع انسان کے لئے روحانی اور
دنیوی زندگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ جب یہ بات ہے تو یہ نمونہ اس قابل ہے کہ ہر وقت ہمارے
سامنے رہے" اس خیال سے لائق مصنف نے رسول کی حیات کے مختلف شعبوں پر چھوٹے
چھوٹے رسالے لکھنے ارادہ کیا ہے۔ اور یہ رسالہ اس زنجیر کی پہلی کڑی ہے جو بچوں کے لئے
نہایت مفید ہے یقین ہے کہ صاحبان مقدرت اس کو خرید کر مکتب کے لڑکوں، اور عزیز رشتہ
داروں اور دوستوں کے بچوں کو مفت تقسیم کرینگے۔ حجم ۳۲ صفحے قیمت صرف ار جو کچھ بھی نہیں
ہے۔ مصنف سے مذکورۂ بالا پتہ پر مل سکتا ہے۔

ندی سہاگ تیل



جون کی تلاش اور جستجو اور بہت رقم خرچ کرنیکے
رہنے اس خوشبودار روغن سندری سہاگ
نسخہ حاصل کیا ہے جسکی سچی تعریف آپکے سامنے
ش کرتے ہین :-
سندری سہاگ دماغ کو تروتازہ کرتا ہے۔ اڈ
ے ہوے بالونکی جگہ نئے بال پیدا کرتا ہے :-
ندری سہاگ کے استعمال سے بالونکی جڑین مضبوط
ماتی ہین جسکی وجہ سے بال نہ تو وقت سے پہلے گرتے
اور نہ تو سفید ہوتے ہین :-
ندری سہاگ :- بالونکو گھونگروالا۔ اور چمکدار
ینا بنا دیتا ہے۔
ری سہاگ کی خوشبو بہت دلپسند ہے اور ان ہی وجہون
سے عورت و مرد دونوں اسکو پسند کرتے ہین۔
قیمت فی شیشی ایک روپیہ اد
ن کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے۔ محصول علاوہ

چہرہ پہ ملاحت اور خوبصورتی پیدا کرنی ہو تو سندری اسنو



استعمال کیجیے

اسمین خوبی یہ ہے کہ چہرہ مین لگاکر آہستہ آہستہ
ایک منٹ ملنے سے چہرہ مین جذب ہوجاتی ہے -
چہرہ پر لگتے ہی برف جیسی ٹھنڈک پیدا کردیتی ہے
اور بھینی بھینی خوشبو سے کمھلایا ہوا چہرہ تروتازہ
ہوجاتا ہے۔ چہرے کی جھائیان، داغ - اور مہاسے
کو دور کردیتا ہے - قیمت فی شیشی بارہ آنے ۱۲

موسم سرما مین سندری اسنو کا استعمال موزون ہے

محترمہ خورشید سلطانہ بیگم صاحبہ

تحریر فرماتی ہین مجکو تسلیم! سندری اسنو پہونچی مین
اسکی مشکور ہون اور آپکو اس ایجاد پر مبارکباد دیتی ہون
سندری اسنو مجھے بہت پسند ہے آئندہ بجائے ہزلین اسنو
کے سندری اسنو استعمال کرونگی اور میری کئی سہیلیون
کو بھی پسند ہے سر دست تین شیشی سندری اسنو بذریعہ ویلیو
میرے نام بھیجدیجیے ۔۔۔۔

کا پتہ :- ایس اے - بی - بخشی - اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴ کلکتہ

رجسٹرڈ نمبر اے (۱۴۱۲)

اردو زبان کا ماہوار رسالہ

شمع

مدیران

محمد حبیب آکسن

بیرسٹر ایٹ لا، ایم، آر، اے، ایس پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ و ممبر لیجسلیٹو کونسل

حسن عابد جعفری

بیرسٹر ایٹ لا، آگرہ

دار الاشاعت

حسن منزل شاہ گنج آگرہ

قواعد و ضوابط

۱۔ رسالہ "شمع" ہر ماہ انگریزی کے اخیر ہفتہ میں شائع ہوتا ہے۔
۲۔ دوسرے ماہ کی ۵ تاریخ تک اگر رسالہ نہ پہنچے تو دوبارہ طلب فرمائیے ورنہ رسالہ قیمتاً روانہ ہوگا۔
۳۔ قیمت سالانہ چھ روپیہ اور ششماہی تین روپیہ آٹھ آنہ۔ ممالک غیر سے سالانہ دس روپیہ ششماہی چھ روپیہ ہے جو ہر حال میں پیشگی لی جائے گی۔
۴۔ ایک پرچہ کی قیمت مع محصول ڈاک دس آنہ ہے۔ ممالک غیر سے ۱۲ ، نمونہ کا پرچہ مفت نہ روانہ ہوگا۔ چھ ماہ سے کم کے واسطے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا۔
۵۔ تین ماہ سے کم کے واسطے پتہ تبدیل نہیں ہو سکتا ہے۔ خریداران اپنے مقامی ڈاکخانہ سے خود انتظام فرمالیں۔
۶۔ رسالہ کے متعلق ہر قسم کی خط و کتابت و ترسیل زر چندہ و اجرت اشتہارات براہ راست منیجر رسالہ ذیل کے پتہ پر فرمائیے۔
۷۔ مضامین و خطوط متعلق مضامین اڈیٹر شمع کے پاس بمقام آگرہ روانہ فرمائیے۔

نوٹ۔ چونکہ رسالہ شمع کسی ذاتی مقصد یا ذاتی فائدہ کی غرض سے جاری نہیں کیا گیا ہے اسلئے زر چندہ بذریعہ منی آرڈر پیشگی مرحمت فرما کر کارکنان شمع کو ممنون فرمائیے۔ اور وی۔ پی منگوا کر واپس فرمائیے جواب کے لئے ار کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا لازمی ہے۔ (شرح اجرت حسب ذیل ہے)

مدت	۱/۴ صفحہ	نصف صفحہ	ایک صفحہ
تین ماہ	عـہ/	للعـہ/	عـــہ/
چھ ماہ	للعـہ/	عـــہ/	ہمـعـہ/
ایک سال	عـــہ/	للعـہ/	ہم للعـہ/



[illegible] محمد سلیمان [illegible]

جلد ۵ | فہرست مضامین رسالہ شمع بابت ماہ مئی و جون سنہ ۱۹۲۶ء | نمبر ۵ و ۶

شبیہ { آنریبل جسٹس ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم۔اے۔ال ال۔ڈی
بیرسٹرایٹ لا۔ جج ہائی کورٹ۔الہ آباد۔

علمی دعوت

اگر آپ کثیر الاحباب ہیں تو

شمع کو چھ خریدار ایک سال کیلئے عنایت فرمایئے۔ شمع سال بھر تک مفت حاضر خدمت ہوگا۔ دس خریدار مرحمت فرمائیں گے تو شمع ایک سال تک مفت حاضر خدمت ہوگا اور نیز پانچ روپیہ کی کتب پیش کیجائینگی۔

اگر آپ کو فسانہ نگاری کا شوق ہے تو

جون ۱۹۲۷ء تک جو افسانہ وصول ہوگا اسکے معاوضہ میں شمع چھ ماہ تک مفت ارسال خدمت ہوگا۔ اور اگر کوئی ناول تحریر فرمایا ہے تو جبتک وہ شمع میں چھپتا رہیگا رسالہ مفت حاضر ہوگا اور کتابی صورت میں اسکی بیس جلدیں بھی نذر ہونگی۔

اگر آپ کو فن مصوری کا شوق ہے تو

فن مصوری کا کوئی پاکیزہ نمونہ یا کوئی تاریخی دلچسپی کی عمدہ تصویر مرحمت فرمایئے بعد اشاعت اسکی بیس کاپیاں مفت حاضر کیجائینگی۔

اگر آپ شاعر ہیں

اور آپکی نظمیں یا غزلیات سال بھر میں سب سے زیادہ تعداد میں شمع میں شائع ہوئیں تو رسالہ سال بھر تک مفت نذر ہوگا۔

ان کے علاوہ

شمع میں ہر مضمون پر جو اپنے موضوع کے اعتبار سے سال بھر میں بہترین ہوگا اسپر حسب تجویز کمیٹی انعام پیش کیا جائیگا

واضح رہے

جو مضمون، فسانہ، ناول، نظم یا غزل، ناپسند ہوگی وہ ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر واپس کردیجائیگی۔ البتہ تصاویر کو ہم اپنے خرچ سے باحتیاط واپس کرنے کے ذمہ دار ہیں، شمع کے جس نمبر میں آپ کا مضمون یا آپکا کلام شایع ہوگا، بلالحاظ اسکے کہ آپ انعام کے مستحق ہیں یا نہیں، وہ نمبر آپ کی خدمت میں مفت روانہ کیا جائیگا

مطبوعات جدید

جو ۱۹۲۷ء میں بغرض ریویو وصول ہونگی، اُن پر دو انعامات ہیں۔

(۱) حسب تجویز کمیٹی ایک انعام اُن کو دیا جائے گا جو بہترین کتاب بھیجیں گے۔

(۲) انعام حسب تجویز کمیٹی اُنکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ تعداد میں کتب ارسال فرمائینگے۔

خادم منیجر شمع

شمع

مئی و جون سنہ ۱۹۲۶ء

تاریخ کا ایک بوسیدہ ورق جونپور

از

جناب سید علی ضامن صاحب ترمذی بی۔اے

شہر جون پور گومتی ندی کے کنارے اب ایک اجڑا ہوا مقام ہے دو سو برس پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا علمی مرکز اور مغلیہ بادشاہوں کا سرمایۂ ناز "دو شیراز ہند" تھا۔ وہی آج آبادی اور زندہ دلی کے لحاظ سے ایسی بستی جہالت اور گمنامی میں پڑا ہوا

کہ تاریخ نہ جاننے والے کے لئے ایک ادنیٰ سی بستی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا مگر اس عالم میں بھی اسکی عالیشان عمارتیں جنھیں پتھروں کا پہاڑ کہنا نا زیبا نہ ہوگا سیاحوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں جن کے در و دیوار کا جلالت خیز سکوت اگوشۂ عظمت کی داستانیں دوہراتا ہے ان مٹی ہوئی عمارتوں کے سوا اب کوئی شے ایسی نہیں رہگئی جس سے یہاں کے پچھلے عروج کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مگر اس شہر کی بڑی حق تلفی ہوگی اگر کھوتے ہوئے زمانے کو یہاں کی عبرت خیز حالت یاد نہ دلائی جائے یہ شہر نہ صرف مسلمانوں کے زمانہ میں بلکہ ہندوؤں کے دور میں بھی نمودار مقام تھا جس کی جھلک تاریخی صفحوں کے گوشوں میں کہیں کہیں ملجاتی ہے۔

عام تیاریوں میں یہ غلطی جمی ہوئی ہے کہ جونپور فیروز شاہ تغلق کا بسایا ہوا شہر ہے لیکن تاریخ کی چھان بین کرنے والوں کی نظر پچھلے دوروں میں دور تک جاتی ہے۔ فیروز شاہ کے وقت میں یہاں آبادی موجود تھی اور ہندوؤں کے زمانے کی کچھ کچھ ٹوٹی پھوٹی عمارتیں بھی رہگئی تھیں۔ شہر کا پرانا نام یوناپور یا جوناپور بھی غالباً زبانوں پر چلا جاتا تھا۔ یہ بستی کاشی اور اجودھیا کی پرانی شاہراہ پر ہونے سے آنے جانے جاتریوں کے لئے پڑاؤ کی جگہ تھی جو کہ مکت گھاٹ (متصل محلہ سپاہ) پر اشنان کرکے پوتر ہوتے تھے۔ یہ راہ شمالی ہند میں بہت پرانی سڑک تھی۔ یہ پتہ تو نہیں چلتا کہ یہ شہر پہلے پہل کب بسایا گیا لیکن اتنا کھوج ملتا ہے کہ فیروز تغلق کے ہاتھوں اسکی آبادی کی تیسری بہارتھی (مقالات خضریہ قلمی) تاریخ ابھی تک اسے تحقیق نہ کرسکی کہ پچھلے دو بار کب اور کس کے ذریعہ سے اس کو رونق ملی۔ مگر اس میں شبہہ نہیں کہ اسکی ابتدائی کہنا افسانوی عہد میں پڑتی جو اب سے تین ہزار برس پہلے ہے۔

حال کے فلسفی تاریخ دانوں نے ہندوستان کی تاریخ کو دو مختلف حصوں پر تقسیم کیا ہے۔ پہلا وہ زمانہ کہ جب تک یونانی حکیموں کی طرح ہندوستان میں بھی علم و حکمت کی تعلیم کا سلسلہ زبانی اور دل و دماغ تک محدود تھا۔ کتاب اور لکھائی کی محتاجی کو سبک نگاہ

سے دیکھتے تھے ۔ انسانی سینہ کتب خانہ اور دل کے صفحے کتاب تھے جن پر سُننے کی قوت قلم کشی کرتی تھی (اسے اصطلاح میں طرز املا کہتے ہیں) ہندوستان میں بھی اسوقت تک لکھنے کا رواج نہ تھا اور نہ واقعات کو تاریخ اور سنہ کے قید سے منضبط رکھا جاتا تھا ۔ علمی مضامین ہوں یا واقعات زیادہ تر نظم کی صورت میں ہوتے تھے (تاکہ یاد رکھنے میں آسانی ہو) اور دانش والے طبقوں کی زبانوں پر سلسلہ وار چلے آتے تھے اسلیئے اس زمانہ کو افسانوی عہد (اپیکل پیریڈ) کہتے ہیں ۔ چنانچہ رامائن اور مہابھارت نظم کی صورت میں اُسی عہد کی یادگاریں ہیں جن کے اشلوک کو زبانی یاد کرنے کا رواج آج تک پنڈتوں میں باقی ہے ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان بہت سادہ مگر پاکیزہ زندگی بسر کرتا تھا ۔ جو نہایت عاقلانہ اصول پر قائم تھی ۔ ضروریات زندگی کے پھیلاؤ سے محتاجیوں کا بڑھانا بہت بُرا سمجھا جاتا تھا ۔ اسکے بعد جب ملک نے تمدنی ترقی کی طرف قدم بڑھائے یا دوسرے لفظوں میں آزاد فطرت انسان محتاجی کے جنجالوں میں اُلجھا تو اور بکھیڑوں کے ساتھ پوتھیوں کی تھیاں بھی بندھنے لگیں اور قلم کاغذ کے صفحوں پر دوڑنے لگا ۔ علم دل کے صفحوں سے کاغذی سطح پر اُترا اور اشرف المخلوقات انسان درختوں کے پتوں (بھوج پتر) چھالوں یا سڑے ہوئے مسالوں (کاغذ) کا دست نگر بنا ۔ واقعات بھی سنہ اور تاریخ کی جکڑ بند میں آنے لگے اور یہیں سے تاریخی عہد (ہسٹاریکل پیریڈ) شروع ہوا ۔ یہ طرز اصطلاح میں طرز انشا کہلاتا ہے ۔

افسانوی عہد کے جو حالات ملتے ہیں وہ بہت اجمالی ہیں اسلیئے اُسوقت کی کوئی بات پوری پوری نہیں معلوم ہوتی محض کچھ معاشرتی (سوشل) اور تمدنی کیفیت یا کسی بات کے ہونے نہونے کا اندازہ ملتا ہے زبانی روایات سے جو نیور کا تعلق رامائن (کرار کوٹ کی لڑائی کا افسانہ جہاں اب قلعہ ہے اور کرار بیر کا رام چندر جی کے ہاتھ سے مارا جانا) اور مہابھارت دونوں سے معلوم ہوتا ہے ۔ جو واقعات

بیان کیئے جاتے ہیں خواہ وہ اصلی ہوں یا استعاری (ایلیگاریکل) لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ اُس وقت جونپور کا وجود تھا خواہ وہ کیسی ہی ابتدائی حالت میں ہو۔ افسانوی عہد پر اگنگی کا دھندھلکا چھایا ہوا ہے اسلیے مدت کا صحیح اندازہ ہونا ممکن نہیں۔ ہاں صرف اس قدر کہ تین ہزار برس سے پہلے کے واقعات ہیں۔ ہری ونسا میں جو مہابھارت کا ضمیمہ ہے یونندرپور نامی بستی کا ذکر ہے جس کے بابت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جونپور کا قدیم نام ہے جو آگے بڑھکر کسی صورت سے یونا پور ہوا اور یہ نام ہندوؤں کے اخیر زمانہ تک قائم رہا۔ بلکہ غالبًا اسلامی عہد کے ابتدائی دو سو برس تک بھی جاری رہا۔ جب کہ یہ مقام گمنامی کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔

دوسری آبادی اس شہر کی کب ظہور میں آئی تاریخیں کچھ نہیں بتاتیں لیکن اگلے پچھلے حالات کو سوچنے کے بعد میرا ذاتی قیاس ہے کہ غالبًا کشن بنسی راجاؤں کے زمانے میں جب کہ بودھ پنتھ کا اثر سارے ہندوستان پر چھایا ہوا تھا اس مرجھائے باغ میں دوسری بہار آئی۔

کشن بنسی ساکا یا تورانی قوم کے باہر سے آنے والے اجنبی تھے جنکا دور دورہ ہندوستان میں پہلی اور دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ پروشش پور (پیشاور) اُنکی راجدھانی تھی اور اوترکھنڈ (شمالی ہند) میں اُنکی عملداری بہار (مگدہ دیس) تک تھی۔ راجہ کنشک گھرانے کا نامور مکٹ دھاری (تاجدار) تھا جو نہ فقط ہندوستان کا سوامی (مالک) تھا بلکہ اُسکی ملکی سیواے ایران توران اور چین سے ملے ہوئے تھے یہ سب کے سب بودھ پنتھی تھے اور اُنھوں نے اپنا پنتھ ہندوستان سے باہر بہت پھیلایا ایسے باہر سے آنے والوں اجنبیوں کو سنسکرت میں یونا کے نام سے پکارا گیا ہے اسی زمانہ میں سنگی تعمیرات کا مذاق ہندوستان میں پھیلا اور سنگ تراشی کا فن کمال کو پہونچا بودھ پنتھ اور جین پنتھ کے درمیان (جو ہندو دھرم کو دباتے ہوئے ساتھ ساتھ

بڑھ رہے تھے) مذہبی بستیاں بسانے اور عمدہ عمارتیں بنانے کی لاگ ڈانٹ چلی جس نے ہندوستان کے فن تعمیر کو چار چاند لگا دیے۔ جونپور کی پرانی عمارتوں میں بودھ پنتھ کی تعمیری نشانیاں کھلی موجود ہیں اور اس عہد کے خاص نقش و نگار اور کندہ کاری عمارتوں کے پتھروں میں نمودار ہیں حال میں موضع پچپلیا کے قریب کچھ عمدہ مورتیاں جینی پنتھ کی بھی ایک کھیت سے برآمد ہوئی ہیں کہ آٹھویں یا نویں صدی عیسوی کی تھیں جو بنارس گئیں۔ اس لیے جونپور کی دوسری بنا بودھ پنتھی دور سے متعلق ہونے کا خیال بیجا نہیں ممکن ہے کہ اسی سلسلہ میں کشن بنسیوں کے اثر سے اسکا نام یونا پور رہا ہو۔

آٹھویں صدی عیسوی سے راجپوت ابھرنے لگے جنھوں نے بودھ پنتھ کا ہندوستان میں ستھراؤ کر دیا۔ اور ان کے سنگرموں (عبادت خانوں) اور وہاروں (خانقاہوں) کو مندر اور شیوالا بنا ڈالا۔ جونپور میں اٹل دیوی کا مندر پہلے بودھ پنتھ کا وہارا تھا جسے راجہ بجے چند رگھوار قنوج والے نے مندر بنایا۔ اس عمارت کے نقش و نگار بودھ پنتھ کے طرز تعمیر کی دلیل ہیں جیسا نمودار ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر فہرا نے (شرقی آرکی ٹکچر آف جونپور۔ تعمیرات شرقیہ جونپور) میں لکھا ہے۔ یہی عمارتیں کہنگی اور موسم کے جھٹکے اٹھا کر اور خود بخود مٹ مٹا کر اسلامی زمانے میں چولا بدلنے پر مسجدیں بن گئیں۔ اور موجودہ زمانے کے مصلحت نگار مورخوں نے کہنگی۔ فرسودگی۔ موسمی تصرفات۔ بارش کی چیرہ دستیاں۔ بے مرمتی اور بے توجہی کے نقصانات زمانہ کے تغیرات سب کا الزام صرف مسلمانوں کے سر ڈالدیا ہے سلطان فیروز تغلق نے بنگال کی مہم پر جاتے ہوئے یہاں کی خوش سوادی پر فریفتہ ہو کر جب نیا شہر بسانا چاہا تو پرانی آبادی بیمراج پور (دریا کنارے جنوبی حد سے خاص حوض تک موجود تھی۔ قدیم آبادی کا اندازہ پرانی عمارتوں کے موقع اور محل سے ہو سکتا ہے (جنکا تاریخوں سے پتہ ملتا ہے) غور کرنے سے اچھی طرح ہو سکتا ہے۔

چاچک پور (محلہ سیاہ) میں مکت گھاٹ پر راجہ بجے چندر کا مندر تھا جہاں جھنجھری مسجد ہے۔ اس سے آگے تقریباً میل بھر پچھم کو دریا کنارے کرار کوٹ تھی جسے اب قلعہ کہتے ہیں۔ لیکن محلہ اب بھی کرار کوٹ ہی کہلاتا ہے۔ پھر کچھ اور آگے تقریباً ڈیڑھ میل پر جس جگہ ندی کا بہاؤ مڑ گیا ہے (پورب پچھم سے اتر دکھن ہو گیا ہے) اونچی ٹیکری پر راجہ بجے چندر کا راج بھون (شاہی محل) جو ہندوؤں کے وقت میں بجے منڈل اور مسلمانوں کے زمانے میں بدیع منزل کہلایا گیا۔ یہ بلند اور دلکشا ویرانہ بیراج پور میں دریا کے گھماؤ سے بنے ہوئے گوشہ پر واقع ہے اور اتنا اونچا ہے کہ وہاں سے تمام شہر زیر نظر رہتا ہے۔ اب ایک بزرگ کی قبر ہونے سے پیر ڈلی پکارا جاتا ہے۔ آس پاس دور تک زمین بہت اونچی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ میں کبھی عالیشان عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ عمارتوں کا اب کوئی نشان نہیں۔ ہاں کہیں کہیں سیڑھیاں یا بلندی پر ایک فٹ موٹی گچ یا بدر رؤں کے سنگی چوڑے دہانے مٹے ہوئے محلوں کا سراغ دیتے ہیں۔ یہاں سے پورب آدھ میل پر خالص پور ہے یہاں راجہ بجے چندر کا دوسرا دیول تھا۔ جہاں اب چار انگل کی بوسیدہ مگر وسیع مسجد (مسجد خالص) ہے۔ اس جگہ سے اتر اور پورب (دو فرلانگ پر) پرانی بازار کے قریب اس سڑک سے اوتر جو بارہ دو دریا کے پہلو سے گذرتی ہے کبھی کو ٹھیا بیر کا استھان یا شیوالہ تھا۔ جسکا پیالہ نما حوض ایک ڈال پتھر کا کھیت میں پڑا ہوا تھا اور حال ہی میں بجلی کے صدمے سے چور ہو گیا۔ یہاں سے اوتر آدھ میل پر مشہور تلاؤ راجہ ساگر (خاص حوض) اور اسی سے ملا ہوا محلہ شاہ گنج کی سڑک کے دوسرے کنارے پر رانی ساگر تھا۔ خاص حوض کا پرانا نام راجہ ساگر سنا گیا ہے۔ یہ بڑے پھیلاؤ کی بلند سنگی عمارت تصویر کے قابل تھی چاروں طرف چوکور حدوں میں اونچی عمارتیں تھیں۔ جسکے بیچ ایک میل کے رقبہ میں لہریں لیتا ہوا پانی درمیانی جزیرہ نما محل کے دامنوں سے اٹھکیلیاں کرتا تھا ٹیلوں سے

پرانی شان کے آثار اب تک نمایاں ہیں اور قدیم عمارت کا مٹا سا خاکہ باقی ہے۔ سلطان محمود شرقی نے بدیع منزل چھوڑ کر اس کے پوربی حصے پر اپنا محل سجایا تھا۔ تالاب کی وسعتی ہو کر اس کا پانی شاہی مصرف اور عام سیرابی کے لیے مخصوص ہوا اور پہرے بیٹھے کہ کوئی نہانے دھونے سے گندہ نہ کرے۔ جب ہی سے یہ خاص حوض کہلایا۔ (مقالات خضریہ) سکندر لودی میں بربادی کی تمام مشرقی عمارات کے ساتھ یہ بھی تباہی کے لپیٹ میں آ گیا۔ اس کے طرز تعمیر کا خاکہ بندیل کھنڈ کے راجاؤں کی تعمیرات سے میل کھاتا ہے کیونکہ یا راجپوتوں کا تسلط کچھ دنوں ان پوربی حصوں میں کافی پر قبضہ کی لالچ سے ہوا تھا اور یہ سب وسط ہند سے پھیلے تھے۔

عمارتوں کا یہ وسیع سلسلہ بند عہد کے شہر کی وسعت کا پتہ دیتا ہے ان کے موقع کا لحاظ کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر مسلمانوں کے تسلط سے پہلے کوئی چھوٹا مقام نہ تھا بد قسمتی سے ہندوؤں کے زمانہ میں تاریخی مذاق ایسا بجھا ہوا تھا کہ اسوقت کی معدوم حالت پر تاریخیں آجتک سوگوار ہیں تاہم تعمیری طرز کے شاہد سے اور کچھ اسلامی تاریخوں کی مدد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ہندوؤں کے مختلف عہد کی عمارتیں پچھلے زمانہ میں موجود تھیں۔ اسمیں نہ صرف ہندوؤں کے قدیم عہد کے آثار تھے بلکہ بدھ مت دور اور اسکے پیچھے آنیوالے ہندوؤں کا تازہ دور یعنی گپت بنسی راجاؤں کا زمانہ تھا۔ (جن کی راجدھانی پہلے پٹنہ پھر اجودھیا اور اجین میں ہوئی۔ اس گھرانے کا دوسرا چندر گپت بعض مورخوں کے نزدیک بکرماجیت یا وکرماوت کے عرف سے مشہور ہے) چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی میں اور سب سے آخر راجپوتی دور سب کچھ نہ کچھ اپنی نشانیاں یہاں پر چھوڑ گئے۔

سلطان معز الدین غوری (جو عام طور پر شہاب الدین غوری مشہور ہے) کے دوسرے حملہ میں راجہ جے چند گھڑوار والی قنوج پہلی شکست چندوار (ضلع آگرہ) کے میدان میں اٹھا کر پیچھے ہٹا اور اپنی پوربی راجدھانی منیچھ یا ظفرآباد (مضافات جونپور) میں ٹھہر کر مغربی سیلاب کو روکنے کیلئے تیار ہو گیا۔ دوسری لڑائی قطب الدین ایبک سلطانی ہراول سے اسنی کوٹ کے سامنے منیچھ کے میدان میں ہوئی اور یہ خطہ مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔

...تاریخ فرشتہ ذکر قطب الدین ایبک۔ چراغ نور تاریخ ظفرآباد قلمی۔ مناقب درشیدیہ۔

لیکن قطب الدین نے یہاں کی حکومت پھر گھرواروں کو دیدی۔ اور جیت سنگھ گھروار کہ
جے چند کا منتری (وزیر) اور سمبندھی (رشتہ دار تھا) یہاں کا راجہ خراج گذاری کے
اقرار پر مقرر ہوا۔ اُس زمانے سے تغلقوں کے عہد تک (تقریباً دو سو برس) انہیں لوگوں
کا راج رہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اتنے دنوں تک اس حصہ کی تاریخ پر گہری خموشی چھائی
ہوئی ملتی ہے۔ خلجیوں کا چراغ گل ہونے پر خسرو خاں کی آفت گردی میں ظفرآباد کا راجہ
سکیت سنگھ سرکشی کی ہوا میں اُڑنے لگا۔ یہاں تک غنیمت تھا۔ لیکن اُس نے
ستم یہ کیا کہ اس جوار سے مسلمانوں کے صاف کرنے پر تل گیا اور ہزاروں کو تلوار کے
گھاٹ اُتار دیا۔ اس واقعہ سے ہلچل پڑ گئی۔ حضرت مخدوم آفتاب ہند سید اسدالدین بیدی
(مدفون ظفرآباد) اور مخدوم چراغ ہند[1] شیخ صدرالدین قریشی جو مشرقی حصوں میں عوت
اسلام کی خدمت میں مصروف تھے اس فتنہ کی خبر سنکر ادھر دوڑ پڑے اور سلطان غیاث الدین
تغلق کو اطلاع دیکر دہلی سے بھی مدد منگائی۔ شہزادہ ظفر خاں تغلق کا چھوٹا بیٹا (چھ ہزار
تجرار سوار لیکر دوہری منزلیں مارتا آ پہونچا۔ انتقام آسان تھا۔ لیکن مخدوم آفتاب جب
اسلامی مشنری اور خانوادہ سیادت کے ستارے تھے انھوں نے تلوار کھینچنے سے پہلے
تصفیہ پر توجہ کی۔ یکہ تازی دنگل کمبٹیٹ کے میداں میں جسمانی قوت کے مقابلے اور
مناظرے کی بساط پر علمی اور روحانی قوت کے مقابلے پر فیصلہ ٹھہرا۔ مخدوم نے یہ
پیچیدہ معرکہ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر جیت لیا۔ انگریزی مورخ اس پُر امن
فتح کے ذکر میں انگاروں پر لوٹتے نظر آتے ہیں اور تفرقہ انداز حکمت عملی کے اصول پر
بیجا ذہانت صرف کرکے انوکھے قیاسات سے طرح طرح کی موشگافیاں کی ہیں اور
واقعات کو بُرے[2] رنگ میں اچھی طرح رنگا ہے۔ لیکن آفتاب پر کوئی بھی خاک ڈال سکا ہے

[1] چراغ ہند کا بھی ظفرآباد میں مزار موجود ہے ۱۲ [2] تاریخ جونپور جو زیر قلم ہے اسمیں ضلع جونپور
کے گزٹیر نویس کی طباعی پر پوری تنقید کرکے غلط بیانیاں اچھی طرح واضح کی گئی ہیں ۱۲

سکیٹ سنگھ کو باوجود ایسی خونی بغاوت کے ضلع مرزاپور میں جاگیر دیکر ہٹا دیا گیا جہاں اسکی نسل کے خانزادے ابھی تک موجود ہیں۔ اور یہ خطہ براہ راست مسلمانوں کے ہاتھ میں آیا۔ کیا ۱۸۵۷ء کے بعد بھی کوئی ایسی مثال ڈھونڈھے سے مل سکتی ہے۔ اسکے بعد تقریباً پچاس برس تک مشرقی صوبہ کا پائیگاہ حکومت ظفرآباد رہا جو شہزادہ ظفرخاں کے نام پر موسوم ہوا۔

جب ۷۶۰ھ میں سلطان فیروز تغلق بنگالہ کی دوسری مہم پر جاتے ہوئے ظفرآباد میں برسات گذارنے کو ٹھہرا (تاریخ فیروزشاہی از شمس سراج عفیف) تو سرزمین جونپور کے نصیب سوتے سوتے جاگ پڑے۔ بلکہ انگڑائی لیکر اُٹھ بیٹھے۔ غالباً اس وقت کرار کوٹ ویران اور آس پاس کی زمین اُجاڑ پڑی ہوئی تھی جہاں نیا شہر بسانے کی تجویز ہوئی اور پرانی بستی ملا کر ایک کر دیگئی۔ اس شہر کا نیا نام پڑنے کی وجہ کے متعلق بعض مورخ فیروز تغلق کا ایک خواب بیان کرتے ہیں، اور جوناخاں عرف سلطان محمد تغلق کا رویا میں نئے شہر کو اپنے نام پر موسوم کرنے کی ہدایت کرنا نقل کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن لطیفہ یہ ہے کہ صاحب تاریخ فیروزشاہی جو ہم عصر مورخ ہیں وہ جونپور کی بنا میں خواب کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ کھلی ہوئی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ پرانا نام یونا پور یا جونا پور (جو سنسکرت کے اصول ہجی کی رو سے دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔ جیسے جوگی اور جوگی ایودھیا اور اجودھیا) اتفاق سے محمد تغلق کے اصلی نام (جونا خاں) سے میل کھاتا تھا اس لیئے اُس طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس میں خواب و خیال کی باتوں سے زیادہ شاعرانہ طبیعت کی جودت نظر آتی ہے۔

فیروز تغلق کو سلاطین ہند میں رفاہ عام کے کاموں سے بڑی دلچسپی تھی۔ بہت سے مدرسے۔ کارواں سرائیں۔ شفاخانے۔ پل۔ کنوئیں۔ نہریں۔ شکارگاہیں۔ باغات عمارتیں۔ مسجدیں۔ حمام۔ کئی شہر اور اکثر قلعے اُس کے بنائے اور بسائے ہوئے ہندوستان

میں جابجا موجود ہیں اور اس نقارۂ فخر کی آواز کسی طرح نہیں دب سکتی کہ محکمۂ آثار قدیمہ (آرکیالوجی) کی بنیاد ڈالنے والا یہی نیک نیت سلطان تھا۔ (فیروز شاہی از سراج عفیف)
دہلی واپس پہونچکر بھی سلطان کو اس نئے شہر کا خیال رہا اور اسکی آبادی کے لئے برابر توجہ رہی۔ علم و ہنر والے۔ کمال و فن کے واقف کار صنعت و حرفت کے پیشہ ور۔ ہر قسم کے دستکار ملک کے حصوں سے چن چن کر نئی آبادی کی رونق بڑھانے کو بھیجے گئے۔ اور انھیں انعام اور وظیفوں سے پوری مدد دیگئی۔ اس طرح بارہ برس کی کوششوں میں یہ شہر کچھ سے کچھ ہوگیا۔ شاہی عمارتیں تیار اور شہر آباد ہونے پر دربار کے خوش فکروں نے تکمیل آبادی کی تاریخ شہر جون پور (۷۷۲ھ) سے نکالی۔ اکثر مورخوں نے اسے غلطی سے بناء شہر کی تاریخ سمجھا ہے۔ لیکن جب فیروز کے مہم بنگالہ کے سال پر نظر کی ہے تو گرہ بڑ اٹے ہیں۔ بڑی عمارتوں کی تیاری اور شہر کے بسنے میں برسوں لگتے ہیں اور بناء و تکمیل کے زمانے میں بہت تفاوت ہوتا ہے۔ اس لئے ۷۷۲ھ عمارات و شہر کی تکمیل کی تاریخ ہے جس میں بارہ برس صرف ہوگئے۔

تغلقیہ خاندان کے زوال پر جونپور کی قسمت جگمگا اٹھی۔ شرقی سلاطین کے عہد میں اس شہر کا عروج دوپہر کے سورج کی طرح چمکا۔ اور جس رنگ سے ہر طرح کے کاملوں اور فاضلوں کا ہجوم اس مشرقی فلک رفعت پر ستاروں کی سی جلوہ گری دکھا گیا وہ عالم دہلی کے سواد دوسرے شہر کو ہند میں نصیب نہوا۔ اس دور سے یہاں کے حالات گو مجمل سہی مگر تاریخوں میں جابجا نظر آتے ہیں جن کے بعض رخوں کو آئندہ تحریر میں نمایاں کیا جائیگا اور پراگندہ واقعات کو سمیٹ کر دبے ہوئے پہلو ابھار دیے جائیں گے۔

غزل

جناب میرزا ثاقب صاحب لکھنوی جانشین میرزا غالب

قہقہے ہم نے سُنے دنیا میں اور فریاد بھی ہے
ایک ہی رستے سے گذرے شاد بھی ناشاد بھی

زندگی ہے گو مٹانے ظلم بھی بیداد بھی ہے
کیونکہ باقی ہیں ابھی آنسو بھی اور فریاد بھی

نام کو عشرت نہیں اور کاروانِ غم ہزار
اک یہی دل ہے جو ہے آباد بھی برباد بھی

جوششِ گریہ سے پھندے پڑ رہے ہیں حلق میں
میں اسیرِ دام ہوں تو قید ہے فریاد بھی

صبحِ محشر کا سماں ہے ہو گئے اپنے بھی غیر
اُف ری بیہوشی کہ میں بھولا ہوں دل کی یاد بھی

ایک میری گردنِ لاغر کے دشمن سیکڑوں
تیغِ آتشبار بھی ہے خنجرِ فولاد بھی

رنگ تصویروں میں کیا ٹھہرے کہ دنیا ہی سراب
شگفتگیٔ عالم سے شکل مانی و بہزاد بھی

آہنی قیدیں تو کٹ جانے کے قابل تھیں مگر
عشق کی بیڑی سے شل ہیں بازوے جلاد بھی

غم بھی تھا گوشہ نشیں فرقت کی شب تھی وہ عجیب
لاکھ چاہا پر نہ نکلی دل سے اک فریاد بھی

گھٹ رہی ہے عمرِ دنیا بڑھ رہا ہے شوقِ حشر
سب کے آگے آئیگی اک دن مری روداد بھی

کیوں لگا دی آگ میرے دل میں او کافر نژاد
اک تمنا کیا اسی میں تھی خدا کی یاد بھی

آشیاں جس شاخ پر تھا ڈھونڈھتے ہیں اسکو لوگ
ہو گیا پرسش کے قابل خانۂ برباد بھی

یہ حیاداری ہے یا کیا سب تو آئے تھے مگر
حشر کے مجمع میں آیا وہ ستم ایجاد بھی

تنگیٔ دل کے سبب یہ بزم افروزِ جمال
ایک میری یاد کیا بھولی خدا کی یاد بھی

آج مقتل کی زمیں میں حالِ مقتولوں کا دیکھ
کل تو بولے گی زبانِ خنجرِ فولاد بھی

سب نے جانا حالِ دل وہ پاس ہیں ان سے دور رہوں
اسکا شاہد میں ہی ہوں ثاقبؔ ہی فریاد بھی

آنریبل جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب ایل ایل ڈی

از

حسن عابد جعفری صاحب آکسن، بیرسٹر ایٹ لا مدیر شمع

ہندوستان کو، اور بالخصوص ہمارے صوبہ کو، آنریبل مسٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان صاحب ایم۔اے (کیمبرج) ال، ال، ڈی، بیرسٹر ایٹ لا، جج ہائی کورٹ الہ آباد کی ذات والا صفات پر جس قدر ناز ہے بجا ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے مشہور اور ہر دلعزیز ہیں۔ اور اگرچہ شرافت اور نجابت کے اعتبار سے اس صوبہ کے نہایت ممتاز خاندان کے رکن ہیں، لیکن اُنکی حیرت انگیز ترقی، اور کامیابی محض اُن کی ذاتی صفات اور قوت بازو کی مرہون منت ہیں۔ اُن کی زندگی ہمارے نوجوانوں کے لئے روشن مثال، اور بوڑھوں کے لئے دلچسپ اور مسرت بخش داستان ہے۔ والدین اپنے بچوں کو، اور اُستاد اپنے شاگردوں کو، اُنکی طالب علمی کے کارنامے ذوق اور شوق سے سُناتے ہیں۔ اور گذشتہ بیس بائیس برس سے اُنکا نام نامی ہمارے صوبے میں ہر لکھے پڑھے آدمی کی نوک زباں ہے۔

ممدوح کے والد مولوی عثمان صاحب جون پور کے مشہور وکیل اور رئیس تھے۔ اُن کی ذہانت، اور قانون دانی دور دور تک مشہور تھی۔ نانا مولوی حافظ عابد حسین صاحب جون پور کے نہایت وضعدار رئیس اور وکیل تھے، اور حسن اخلاق، وضعداری اور مہمان نوازی کے اعتبار سے زمانہ قدیم کی یادگار تھے۔ اخیر عمر تک اُنھوں نے قدیم روش کو نبھایا۔

راقم الحروف کو وہ اور مولوی محمد عثمان صاحب اچھی طرح یاد ہیں۔ اور اب اُس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو وہ مُرقع آنکھوں میں پھر جاتا ہے جو اسلامی معاشرت، اور انسانی شرافت کا بہترین نمونہ تھا۔

خان بہادر مولوی محمد محسن صاحب فدا القدر۔ مولوی حافظ عابد حسین صاحب وکیل، مولوی باسط علی صاحب وکیل، خان بہادر محمد کاظم صاحب، مولوی محمد عثمان صاحب۔ مولوی محمد یحییٰ صاحب رئیس منڈیاہون، مفتی زین العابدین صاحب، حکیم مولوی مبارک حسین صاحب، مولوی عبد العلیم صاحب، آسیؔ، و نیز دیگر بزرگوں کے وجود سے جونپور سرسبز اور شاداب بنا ہوا تھا۔ نواب عبد المجید صاحب بیرسٹر الہ آباد میں رہتے تھے مگر جونپور میں بھی انکا قیام رہتا تھا، افسوس کہ ہمارے تمدن کی آخری جھلک ان بزرگوں کے ساتھ جونپور سے رخصت ہو گئی۔ اور اب ان میں سے ایک ہستی بھی دنیا میں موجود نہیں۔

جون پور صدیوں سے مرکز مشاہیر رہا، لیکن زمانے نے اس ورق کو بھی الٹ دیا۔ یعنی

برسوں میں جنکو جمع کیا تھا وہ مر گئے
گویا کبھی جہاں میں نہ تھے، یوں گذر گئے

ڈاکٹر صاحب کی نشو و نما اس زمانے میں ہوئی جب یہ بزرگ موجود تھے، اور جونپور کے مخصوص گھرانوں میں قدیم تہذیب اور تمدن کا چرچا تھا، چونکہ مولوی حافظ عابد حسین صاحب کے اولاد ذکور میں سے کوئی نہ تھی اس لیے انھوں نے ڈاکٹر صاحب کی تعلیم و تربیت میں بہت زیادہ دلچسپی لی۔ مرحوم کا خیال تھا کہ ان کو انگریزی سے بقدر ضرورت واقفیت کرا دیجائے اور مذہبی تعلیم دیکر عالم بنایا جائے۔ چنانچہ عربی، فارسی اور دینیات پر بہت زور دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب چھوٹی سی عمر میں حافظ قرآن

ہو گئے اور علوم قدیمہ میں بہت جلد خاطر خواہ ترقی کر لی۔ اسی زمانے میں آپکی ذہانت کی تعریفیں ہوتی تھیں، لیکن تقدیر میں وہ مرتبے لکھے ہوئے تھے جن پر آج ڈاکٹر صاحب پہونچکر آسمان شہرت کا درخشندہ ستارہ بنے ہوئے ہیں۔ اس لیئے موصوف نے اپنی مرضی سے علوم انگریزی کی طرف زیادہ توجہ کی۔ اور مخالفتوں نے ہمت شکنی کی بجائے ترغیب دی۔ شوق، محنت اور فطری ذہانت نے مساعدت کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موصوف انٹرنس کے امتحان میں نہ صرف اول درجے میں کامیاب ہوئے بلکہ الہ آباد یونیورسٹی میں شاید چوتھا یا پانچواں نمبر رہا۔ اب ان کو روکنا بیکار تھا۔ اور وہ میور سنٹرل کالج الہ آباد میں فرسٹ ایر ایف۔ اے میں داخل ہوئے۔ اور عربی آنکی سکینڈ لینگویج رہی ایف۔ اے میں بھی اُنھوں نے اول درجے میں کامیابی حاصل کی اور تمام یونیورسٹی میں دوسرا نمبر رہا۔ پہلا نمبر اُس طالبعلم کا تھا جس نے سائنس لی تھی دوسرے نمبر پر رہ جانا موصوف کی ذہین طبیعت پر شوق کا تازیانہ ثابت ہوا، اور اُن کے ہاتھوں سے وہ کار نمایاں ہوا جس کی مثال اس سے قبل یا بعد ہندوستان کی کوئی یونیورسٹی پیش نہ کر سکی۔ یعنی آپ نے اُستادوں کے مشورے کے خلاف بی۔ اے میں ریاضی لے لی۔ اس موقع پر بھی مخالفت اپنا کرشمہ دکھا رہی اور ڈاکٹر صاحب بی۔ اے کے امتحان میں تمام یونیورسٹی میں اول آئے۔ ریاضی میں ممتاز ہوئے۔ کاکس میڈل حاصل کیا۔ اور سرکاری وظیفہ سے انگلستان تشریف لے گئے، خیال تھا کہ سول سروس کا امتحان دین گے اور اعزا اور احباب کا بھی یہی تقاضہ تھا۔ مگر انگلستان پہونچکر موصوف نے سول سروس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔ کیمبرج سے بی۔ اے کیا اور لندن سے بیرسٹری کی اور ڈبلن سے ال۔ ال۔ ڈی کی سندیں حاصل کیں۔ اپنا وقت اُن علوم اور فنون کی تحصیل میں صرف کیا۔ جو بعد کو اُن کے پیشے یعنی بیرسٹری میں مفید ثابت ہوئے، چنانچہ معاملہ فہمی، خوش بیانی، قانونی لیاقت، نظایر پر عبور، فطری

ذہانت، اور سخت محنت، وہ مخصوص صفات تھیں جو اُن کو بہت جلد پبلک کے سامنے لائیں اور اُنکی وسعت اخلاق، اور ذاتی شرافت اور رواداری نے نہایت قلیل عرصہ میں اُنکو پیشہ میں کامیاب بنا دیا۔ اور وہ بہت جلد الہ آباد ہائی کورٹ کی ججی پر فائز ہو گئے۔ اِس کم عمری میں اَب تک کوئی ہندوستانی ہائی کورٹ کا جج نہیں ہوا۔ اور اِس وقت بھی وہ ہندوستان میں سب سے کم عمر ہائیکورٹ کے جج ہیں۔

بیرسٹری کا زمانہ موصوف کے انتہائی انہماک کا زمانہ رہا ہے۔ اور اب بھی اِن کو سخت دماغی محنت کرنی پڑتی ہے، لیکن ذوقِ علمی، اور کتب بینی نے کبھی اُن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جو لوگ ڈاکٹر صاحب کے طالبعلمی کے کارناموں سے واقف ہیں یا جنھوں نے الہ آباد میں وکالت کی منہمک زندگی میں اُن کو بدل و جان منہمک دیکھا ہے اور جو اُنکو ہائی کورٹ کی ججی کی کرسی پر متمکن دیکھتے ہیں۔ یا اُن کے عالمانہ قانونی فیصلہ جات کو پڑھتے ہیں وہ یہ معلوم کر کے حیرت میں رہ جائینگے کہ موصوف اُردو کے زبردست حامی اور ادیب ہیں، اُن کو ادبِ اُردو پر حیرت انگیز دسترس ہے، وہ اُردو شاعری کے سچے دلدادہ ہیں، اور صحیح معنیوں میں بے مثل نقاد ہیں، اُن کے کتب خانہ میں پندرہ سو شعرا کے دیوان موجود ہیں۔ اور اُنھوں نے حال میں خاقانی ہند ذوق مرحوم دہلوی کے قصائد، اور اُنکی غزلیات کو دو جلدوں میں ترتیب دیکر خوش ذوقی، وسعتِ نظر کثرتِ مطالعہ ادبی نقادی، اور جوہر شناسی کا ایسا دل آویز اور مسرت بخش ثبوت دیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنی پڑتی ہے۔ دونوں جلدیں نظامی پریس بدایوں میں نہایت سلیقہ سے چھپ کر شائع ہو چکی ہیں اور ہمارے پیش نظر ہیں۔ دورِ جدید کی ادبی کرامات نے خاقانی ہند کو مردود بنا دیا تھا۔ اور نئی اُمت کے بعض نقاد اُن کو شاعر تک نہ مانتے تھے۔ غالب مرحوم کی کورانہ پرستاری، اور ادب اُردو کی ناشناسی کی اِس سے زیادہ حسرتناک مثال نہ ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اخلاقی جرأت، اور نقادانہ

ہمت کو بر سر کار لاکر ذوق مرحوم کی حمایت میں ادب اُردو کی قابل قدر خدمت کی - اور مرحوم کو اس گمنامی سے بچا لیا - جو تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس کی بدولت اس یگانۂ روزگار شاعر کے نصیب میں آچلی تھی - ذوق مرحوم کے متعلق جو غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی اُسکو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختصر اور مؤثر دیباچوں کے ذریعہ سے نہایت صفائی اور خوبصورتی سے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اچھی طرح کامیاب ہوئے ہیں -

ہم نہ غالب کے وکیل ہیں اور نہ ذوق کے طرفدار، لیکن انصاف پسندی، اور حق بینی تنقید کی روح، اور ادب کی جان ہیں - ان سے منھ پھیرنا، اور کسی صاحب کمال کو مردود بنا دینا، فنِ تنقید میں گناہ عظیم ہے -

ڈاکٹر صاحب نے اساتذہ کے سلسلۂ کلام کی اشاعت کا تہیہ فرما لیا ہے - قصائد ذوق اور انتخاب غزلیات ذوق اسی سلسلہ کی دو کڑیاں ہیں - قصائد ذوق میں دس صفحوں کا دیباچہ ہے جس میں اُستاد ذوق کے سوانحی حالات، انتخاب کلام - ترتیب کلام وغیرہ پر مجمل بحث ہے - مختصر تنقید بھی ہے، قصائد کے ساتھ نامکمل مثنوی، اور قطعات و رباعیات بھی شامل ہیں - اخیر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ ہے - تمہید میں قابل مؤلف نے وجہ تالیف بیان فرمائی ہے کہ ”نوجوانانِ قوم کو جو اکثر ادب اُردو سے ناآشنا ہوتے ہیں یہ موقع ہاتھ آئے کہ اُردو شاعری کے ایک مستند اُستاد کے کلام کو نئے لباس میں ملبوس دیکھکر اس کے مطالعہ کی طرف مائل ہوں اور اُسکی نازک خیالی، فصاحت اور بلاغت سے لطف اُٹھائیں اور معلوم کریں کہ ہماری فراموش کردہ زبان میں بھی کیا کیا جوہر موجود ہیں“ یہ خیال بجائے خود قابل توصیف ہے، اور ہم خوش ہیں کہ موصوف نے ایک رقم علیحدہ کر دی ہے جس میں وہ حسب ضرورت اضافہ کرتے رہینگے اور اُسی سرمایہ سے اساتذہ کے کلام کی اشاعت ہوتی رہے گی -

ذوق کے قصائد کو پڑھکر بعض انگریزی خواں نوجوان چیں بہ جبیں ہوں گے انکو

چاہیے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے ذیل کے الفاظ کو غور سے پڑھیں، اور قصائد اُردو کی خوبیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ "صحیح یہ ہے کہ قصائد میں مبالغہ کثیر ہے، اکثر اشعار نیچرل شاعری کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں، لیکن مبالغہ اُردو شاعری کی جان ہے۔ یہ طرز مشرقی شاعری کی خصوصیات میں سے ہے۔ بلا اِس کے نظم بے نمک ہے۔ ہر سخن فہم مبالغہ کو خوب سمجھتا ہے اور مبالغہ سے قطع نظر کر کے صرف بلندی خیال کو دیکھتا ہے۔ مبالغہ کو تشبیہ اور تمثیل کے متوازی خیال کرتا ہے، مبالغہ صرف ایک جامہ زریں ہے کہ جس میں اصل خیال آراستہ کیا جاتا ہے غرض صرف اعلیٰ مشابہت سے ہے مبالغہ خوبی کلام ہے نہ کہ نقص۔"

انتخاب غزلیات ذوق میں ڈاکٹر صاحب نے صرف اُن اشعار کو لیا ہے جو اُن کو مرغوب ہیں لیکن ہم جناب مؤلف کے ذوق شاعری کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے بہترین انتخاب کلام فرمایا ہے۔ ذوق کے کلام کا بڑا حصہ ضایع ہو چکا ہے اور جو کچھ آزاد مرحوم کی کوشش سے محفوظ ہو گیا تھا وہ بلالحاظ اسکے کہ کس پایہ کا تھا شایع کر دیا گیا تھا اسکو کلام غالب کی طرح حُسن انتخاب نصیب نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا انتخاب شایع شدہ کلام کا عطر ہے۔ اور باوجود زمانہ کی دستبرد کے ذوق غزلیات میں بھی مسلم الثبوت اُستاد نظر آتے ہیں۔ اُن کا کلام مشاعروں میں پڑھا گیا، اور مقبول ہوا لیکن غالب کا کلام عام فہم نہ تھا اور جب تک اُن کا منتخب کلام شایع نہ ہوا مشہور نہ ہوا۔ لائق مولف نے موازنہ ذوق و غالب کے عنوان سے نہایت مفید اور دلچسپ بحث کی ہے جو تنقید کا کا پاکیزہ نمونہ ہے۔ قصائد میں لائق مؤلف نے ذوق کو غالب پر ترجیح دی ہے۔ اور اگرچہ ذوق کے بہت سے قصائد ناپید ہو گئے پھر بھی دو قصائد موجود ہیں جو غالب کے قصائد کے ہم ردیف و قافیہ ہیں اور غالب کا ایک قطعہ ذوق کے ایک قصیدہ سے ملتا ہے لیکن یہ تینوں قصائد ذوق کے بہترین قصائد میں سے نہیں ہیں۔ تاہم عام موازنہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوق کا مرتبہ بلند ہے۔ مثنوی غالب مرحوم کے یہاں

بھرے سے غائب ہے۔ سہرا، غالب مرحوم نے خوب لکھا تھا مگر انھیں قافیوں کو باندھنا اور بڑھا دینا ذوق کا کمال تھا۔ قطعات میں کہیں غالب بڑھے ہوئے ہیں تو کہیں ذوق کو فضیلت ہے۔ رباعیات میں دونوں کا درجہ مساوی ہے۔ اب رہا غزل کا میدان اس میں لائق مؤلف تسلیم کرتے ہیں کہ "مجموعی طور پر بلا شبہ غالب کی غزلیات ذوق کی غزلیات کے مقابلے میں اعلیٰ ہیں۔ لیکن اسقدر تفاوت ہرگز نہیں ہے جتنا کہ خیال کیا جاتا ہے۔ غالب کے کلام میں ترکیب فارسی، منتخب مضامین اور پیچیدہ خیالات بھرے ہوئے ہیں۔ فلسفہ غالب کا حصہ ہے۔ لیکن مشکل ترکیبوں کی وجہ سے عام فہم نہیں ہیں۔ دیر تک غور کیئے بغیر اکثر اشعار سمجھ میں نہیں آتے، لیکن جب سمجھ میں آگئے تو بلند پروازی ظاہر کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ مشاعروں میں غالب کی غزلوں کو وہ مقبولیت حاصل نہ ہوسکی جو ذوق کو تھی یا مومن خاں کو ملی .... برخلاف اسکے ذوق کی زبان روزمرہ کے محاوروں سے مملو ہے۔ الفاظ فارسی و عربی کا استعمال کثیر ہے لیکن ترکیب فارسی مقابلتہً کم ہے۔ زیادہ تر اشعار بذات خود مکمل ہیں کوئی لفظ محذوف نہیں ہے جو الفاظ شعر میں ہیں وہ اس شعر کے پورے مضمون ادا کرنے کے لیئے کافی ہیں۔ ذوق کی غزل کو نثر میں تبدیل کرنا نہایت آسان ہے۔ زیادہ الفاظ بڑھانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ لیکن غالب کے اشعار میں تصور کو زیادہ دخل ہے۔ الفاظ خیالات کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ جب خیالات ذہن میں پیدا ہوگئے تو پڑھنے والا کمی الفاظ کو بھول جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اُن خیالات کو ادا کرنے کے لیئے کافی الفاظ اشعار میں موجود نہیں ہیں۔ صرف بلند خیالی کا لطف اُس کمی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسکا پتہ اُسوقت چلتا ہے جب یہ کوشش کیجاوے کہ غالب کی ایک غزل کو نثر میں تبدیل کریں اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ مزید الفاظ بڑھانے کی کس قدر ضرورت ہے۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ علاوہ برتریٔ کلام ایک سبب زیادہ مقبولیت کا یہ بھی تھا کہ غالب کا منتخب کلام شایع ہوا، جو اشعار دیوان میں شایع کیے گئے وہ چیدہ تھے۔ ایک یہ وجہ بھی ہوئی کہ غالب نے بحر و قافیہ و ردیف کے انتخاب میں بہت کچھ احتیاط کی زیادہ تر بحریں ایسی رکھیں جو پڑھنے میں بھلی معلوم ہوں اور گانے میں اچھی سخت زمین یا غیر معمولی ردیف و قافیہ سے غالب نے حتی الامکان پرہیز کیا۔ مثلاً خ۔ ذ۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ق کی ردیفوں میں غالب کی کسی غزل کا پتہ نہیں چلتا۔ مگر ذوق نے سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیفوں میں ہمیشہ طبع آزمائی کی اور اپنی قادر الکلامی دکھائی۔ بحر و قافیہ کے انتخاب میں احتیاط نہ کرنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ بہ لحاظ فن شاعری غزلیات غالب کی نازک خیالی و مضموں بندی کو نہ پہونچ سکیں۔ غالب نے سخت زمین میں اپنے اعلےٰ پیمانے کی غزل کہنے کی دشواری کو ضرور محسوس کیا ہوگا اور اسی وجہ سے معمولی اشعار کہنے کے بجاے دیوان میں اکثر ردیفوں کو متروک کرنا پسند کیا .... بہتر طریقہ موازنہ کا یہ ہے کہ ایک ہی طرح کی غزلیں ساتھ پڑھی جائیں۔ اور پھر ذوق کی پختگی کلام صحت زبان، سلاست بیان اور فصاحت کا مقابلہ غالب کی مضمون بندی فارسی تراکیب، نازک خیالی اور بلاغت سے کیا جاے۔ ہر طرح کی غزلوں کا مقابلہ کرنا ایک طویل امر ہوگا۔ صرف ایک طرح کے اشعار ایک دوسرے کے مقابل تحریر کیے جاتے ہیں۔ اور ترجیح صرف پڑھنے والے کی راے پر چھوڑی جاتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے موازنہ کا یہ نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ طوالت کے خوف سے ہم صرف چند اشعار نقل کرتے ہیں:-

ذوق۔ جل اٹھا شمع نمط تار رگ جاں میرا　　　آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا
دھیان میں آئینۂ رخ کے گئی جاں نکل　　　رہ گیا ہاے کھلا دیدۂ حیراں میرا

———•———

غالب۔ سرمۂ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے	کہ رہے چشم خریدار پہ احساں میرا
رخصت نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم	تیرے چہرے سے ہو ظاہر غم پنہاں میرا

ذوق۔ لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کی مژگاں کا	نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے نہ پیکاں کا
غالب۔ خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں	چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

ذوق۔ بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج	کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج
غالب۔ لو ہم مریض عشق کے تیماردار ہیں	اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ذوق۔ ہم اپنے جذبۂ دل کا اثر کو دیکھتے ہیں	وہ پہلے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں
ہوئی انکی چشم کی گردش پہ گردش عالم	جدھر ہوا انکی نظر سب ادھر کو دیکھتے ہیں
عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اس رخ پر	ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں
جہاں کے آئنہ سے دل کا آئنہ ہے جدا	اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں
غالب۔ یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے	کبھی ہم انکو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو	یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں	ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ذوق۔ یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں	واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھکر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں	کیا جانے لکھدیا انھیں کیا اضطراب میں

غالب ۔ قاصد کے آتے آتے خط ایک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

غالب چھٹی شراب پہ اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

ڈاکٹر صاحب نے قابل دید موازنہ کیا ہے اور آخر میں ایک پُر لطف سوال قائم کیا ہے "اِن اشعار کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں پڑھکر آپ کس اُستاد کے کلام کو ترجیح دیتے ہیں؟" ہم بھی ڈاکٹر صاحب کے ہمزبان ہوکر قارئین شمع سے اس سوال کا جواب مانگتے ہیں۔ اور اگر وہ اس قلیل اقتباس کو رائے زنی کے لیے کافی نہیں سمجھتے تو ہم سفارش کرتے ہیں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی دونوں تالیفات کا بغور مطالعہ فرمائیں ۔ اور ذوق کے کلام میں خود اپنی طبیعت کی افتاد کے مطابق اس سوال کا جواب تلاش کریں ، ہم نہیں کہہ سکتے کہ قارئین کرام کس اُستاد کو ترجیح دینگے ، لیکن اس بات کے ہم ضامن ہوتے ہیں کہ ذوق مرحوم کی طرف سے جو بدعقیدگی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے وہ ضرور دور ہوجائیگی ۔ اور ماننا پڑیگا کہ ذوق مرحوم ہی وہ بزرگ تھے جن کو زمانے نے اُستاد تسلیم کیا ، اور جن کے جیتے جی غالب مرحوم کا کلام مقبول عوام نہ ہوسکا ۔ قصائدِ ذوق کی قیمت عہ ہے اور یہی قیمت انتخاب غزلیات ذوق کی ہے ۔ دونوں کتب منیجر نظامی پریس بدایوں سے مل سکتی ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور اُن کے کارناموں کے لیے شمع کے مختصر صفحات قطعی ناکافی ہیں ۔ موصوف کے متعلق ان سطور کے لکھنے کی صرف یہ غرض تھی کہ قارئین کرام کو معلوم ہوجائے کہ موصوف مغربی علوم و فنون ہی میں ماہر نہیں ہیں بلکہ اردو سے بھی اُن کو خاص شغف ہے ، اور وہ اس کے سچے قدردان ہیں ۔ مضمون کی ضرورت سے موصوف کی تحریر کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں جن سے بخوبی اور باسانی اندازہ ہوسکتا ہے

کہ موصوف اُردو کے بہت اچھے ادیب، اور اعلےٰ درجے کے نقاد ہیں۔ اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ ملک کی ایسی ہونہار اور قابل رشک ہستی اسکی آبیاری کی طرف متوجہ ہے۔ موصوف کو مسئلہ تعلیم سے بھی خاص اُنس ہے اور وہ اپنے عزیز اوقات کا معقول حصہ اسطرف بھی صرف کرتے ہیں۔ اور متعدد یونیورسٹیاں، اور علمی انجمنیں اُنکی مرہون منت ہیں۔ دعا ہے کہ خدا برتر اُن کی عمر میں برکت، اور ان کے ارادوں کو کامیابی عطا فرمائے اور وہ عرصہ دراز تک زندہ رہکر ملک اور ادب کی خدمت کرسکیں۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

غزل

جناب لسان الملک محشر لکھنوی

دل سے ممنون ہوں صیاد کی بیداد کا / قید ہونا مرا اک خواب ہے آزادی کا

آئی ہر قطرۂ خونِ شہدا سے یہ صدا / نام زندہ ہے تری ذات سے جلّادی کا

شرح آفاتِ محبت کی سناؤں تم کو / حشر کی چیز ہے عالم مری بربادی کا

شکوۂ جورِ فلک سنکے بہت شاد ہوا / جاؤ اب نام نہ لینا ستم ایجادی کا

نزع میں کیوں نہ اسیرانِ ستم کو ہو خوشی / دم نکلنا نہیں پیغام ہے آزادی کا

جسقدر عمر گھٹی بڑھ گئی منہ کی رونق / کیا کلیجہ ہے غمِ عشق کی فریادی کا

روئے دیتا ہوں نشیمن کی طرف کرکے نظر / تنکے تنکے میں نہاں راز ہے بربادی کا

غمِ فرقت سے سوا بے اثری کا غم ہے / ہو گیا خون کلیجہ کسی فریادی کا

کس میں یہ دم جو کہے کچھ تو بتا کیا گذری / جو ہے منہ دیکھ رہا ہے ترے فریادی کا

محشر اس دور میں اپنی یہ ہے تحقیق جدید
مذہب ایجاد کیا عشق نے جلادی کا

بے بصری

(ڈاکٹر ربیندرو ناتھ ٹیگور کے افسانہ کا ترجمہ)

از

جناب محمد سلیم خاں صاحب

میرے بیاہ کو زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ ایک مردہ بچہ پیدا ہوا، اور میری جان کے لالے پڑ گئے۔ صحت تو رفتہ رفتہ درست ہوگئی، لیکن آنکھیں دن بہ دن کمزور ہوتی چلی گئیں۔

جس زمانے میں مجھ پر یہ بلا نازل ہوئی۔ میرے شوہر ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، اُنھوں نے بلا تامل میرا علاج شروع کر دیا، اور اپنی طبی لیاقت صرف کر دی، میرے بھائی جو وکالت کی امتحان کی تیاری کر رہے تھے عیادت کو آئے، وہ میری آنکھوں کی حالت دیکھکر حیران رہگئے، اور میرے شوہر سے کہنے لگے "تم کیا کر رہے ہو۔ کمو کی آنکھیں بگاڑے ڈالتے ہو، کسی ہوشیار ڈاکٹر کو دکھاؤ"۔ وہ بگڑ کر بولے "کیوں؟ مجھ سے بہتر کون علاج کر سکتا ہے، معمولی مرض ہے۔ اس کا تو ہر شخص علاج کر لے گا" بھائی نے کہا "پھر تو آپ کے نزدیک آپکی اور پروفیسروں کی قابلیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے" اس جملہ پر وہ جھنجھلا گئے اور کہنے لگے "آپ کی اگر شادی ہوگئی ہوتی اور بیوی کی جائداد کے متعلق مقدمہ ہوتا تو آپ میری قانونی راے پر ہرگز عمل کرتے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ علاج کے معاملہ میں دخل دیتے ہیں؟"

باتوں ہی باتوں میں دونوں میں نوک جھونک ہوگئی، لیکن اسکا خمیازہ

مجھے اٹھانا پڑا۔

والدین کو چاہیئے کہ شادی کے بعد اولاد کے معاملات میں دخل نہ دیں۔ کیونکہ شادی کے بعد لڑکی کا ہر رنج و غم شوہر کی ذات کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ لیکن میں اپنی بدنصیب آنکھوں کو کیا کہوں جنکی بدولت میرے بھائی اور شوہر کے درمیان شکر رنجی پیدا ہو گئی۔

اُنکی غیر موجودگی میں ایک دن، دادا نے ہوشیار ڈاکٹر کو بلا کر میری آنکھوں کا معائنہ کرا دیا، ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور تاکید کی کہ آنکھوں کی طرف سے آیندہ غفلت نہ کیجائے۔ دادا نے دوا فروش کے یہاں نسخہ بھیجکر دوا منگا دی۔ مگر میں نے بہت منت و سماجت سے کہا کہ وہ آیندہ علاج میں نہ بولیں کیونکہ اندیشہ تھا کہ ڈاکٹر کو چھپکر بلانے سے مزید رنجشیں پیدا ہو جائیں گی۔ مجھے اپنی جسارت پر خود حیرت ہوئی۔ کیونکہ میں دادا کا بہت ادب کرتی تھی، میری ہمت پر دادا کو بھی ضرور تعجب ہوا ہوگا۔ وہ میری گفتگو سنکر تھوڑی دیر کیلئے بالکل چپ ہو گئے، اور کہنے لگے آیندہ احتیاط کروں گا۔ لیکن جب دوا آجائے تو تم اُس کا استعمال ضرور کرنا۔" یہ کہکر دادا تو چلے گئے، لیکن جب دوائیں آگئیں تو میں نے اُن کو کنویں میں پھنکوا دیا، بھائی کی مداخلت پر میرے شوہر بہت خفا ہوئے اور میرے علاج میں اور زیادہ توجہ کرنے لگے۔ طرح طرح سے علاج کیا، اور میں نے بھی اُن کے حکم مطابق پٹی باندھ لی، رنگ برنگ کے چشمے لگائے، قسم قسم کے سفوف استعمال کیئے، اور مچھلی کا تیل اتنا پیا کہ گلے میں خراش ہو گئی۔ اُن کا قاعدہ تھا کہ شفاخانے سے واپس آکر سیدھے میرے پاس چلے آتے، اور پوچھتے "کہو کمو۔ کیسی رہیں؟" میں جواب دیتی "اچھی طرح رہی" مگر واقعہ یہ ہے کہ اس طرح ضمیر کے خلاف باتیں کرکے مجھے جھوٹ بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ آنکھوں میں جب زیادہ پانی ہوتا تو میں اس خیال سے دل کو تسلی دیا کرتی کہ نقصان رساں پانی کا نکلجانا ہی اچھا، اور جب ریزش میں کمی ہوتی تو اُن کی لیاقت پر پھولی نہ سماتی۔ لیکن

چند دنوں میں تکلیف ناقابل برداشت ہوگئی، اور میری آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، دن رات
سر میں درد رہنے لگا، وہ بھی بہت فکرمند ہوگئے، اور قرائن سے معلوم ہوا کہ وہ کسی ہوشیار
ڈاکٹر کو بلانے کا بہانہ ڈھونڈھتے تھے۔ میں نے اُنکی رائے کی تائید کی جس سے اُن کو
گونہ اطمینان ہوگیا اور وہ ایک انگریز ڈاکٹر کو بلا لائے، میں نہیں کہہ سکتی کہ دونوں میں
کیا باتیں ہوئیں۔ لیکن اُس نے میرے شوہر سے کُرید کُرید کر کرخت سوالات کیے، اور
اُس کے چلے جانے کے بعد وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ اُن کی فکر دور کرنے کو میں نے
کہا "یہ فرنگی تو بالکل اناڑی معلوم ہوتا ہے، تم کو بلانا تھا تو ہندوستانی ڈاکٹر کو بلاتے
جس کا اخلاق ٹھیک ہوتا، کیا تمھارا خیال ہے کہ وہ میرے مرض کو تم سے بہتر سمجھ سکتا ہے"
وہ چپ چاپ سُنا کیے اور کچھ دیر سکوت کے بعد شکستہ آواز میں کہنے لگے "دیکھو! تمھاری آنکھ
نشتر دیا جائے گا" میں نے تسلّی دینے کے لہجے میں جواب دیا "خواہ مخواہ اتنی دیر بات
چھپائی، اگر تم جانتے تھے تو مجھ سے کہنے میں کیا ہرج تھا، میں کوئی ناسمجھ بچہ نہ تھی جو نشتر
کے نام سے ڈر جاتی؟" یہ سنکر اُن کی صورت بحال ہوگئی، اور کہنے لگے "نشتر کے نام
سے لوگ عام طور پر خوف کھاتے ہیں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "بجا ہے! مرد صرف
عورتوں کے سامنے بہادر ہوتے ہیں" وہ سنجیدگی سے میری طرف دیکھکر کہنے لگے "تم
سچ کہتی ہو، ہم لوگوں میں ظاہری نمائش بہت ہے" مجھے اس سنجیدگی پر ہنسی آگئی،
اور اُن کو چھیڑنے کے لیے کہا "غور طلب یہ امر ہے کہ کیا آپ لوگوں کو ہماری ظاہری
نمائش پر زد و کوب کرنیکا کیا کوئی حق حاصل ہے؟"

جب دادا آئے تو میں اُن کو الگ لیگئی، اور چُپکے سے باتیں بنا کر بہلا دیا، کہ
"وہ بھائی تمھارے ڈاکٹر صاحب کے علاج سے ضرور اچھی ہوگئی ہوتی، مگر افسوس مجھے زخم کے
مرہم کا خیال بالکل نہ رہا، اور نہ اب تک اُسکا استعمال کرسکی۔ میری آنکھیں خراب ہوگئیں

اور اب نشتر لگانے کی ضرورت ہوگی۔"

دادا نے کہا "تم اپنے شوہر کا علاج نہیں چھوڑتی تھیں، اس لیے میں نے تمہارے پاس کا آنا چھوڑ دیا تھا۔"

میں نے جواب دیا "نہیں، تمہارا خیال غلط ہے۔ میں پوشیدہ طور پر تمہارے ہی ڈاکٹر کا علاج کرتی رہی ہوں۔"

افسوس! ہم عورتیں جھوٹ بولنے میں کیسی مشاق ہوتی ہیں! شادی ہوتے ہی جھوٹ بولنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور شوہروں کی تسلی، یا اگر بچے ہو گئے تو ان کو بہلانے کے لیے جھوٹ بولنا پڑتا ہے، اور تمام عمر ایسی بدعت کی پابندی رہتی ہے۔! بہرکیف میرا دماغ ایسا خوش تدبیر تھا کہ دادا اور شوہر کے درمیان صفائی ہو گئی۔ دادا کو ندامت تھی کہ انھوں نے ڈاکٹر کا معاملہ چھپانے کی مجھے تاکید کی تھی۔ اور شوہر کو یہ خفت تھی کہ اگر وہ شروع میں انکا کہنا مان لیتے تو آج یہ دن کیوں نصیب ہوتا؟" غرض دونوں میں صفائی ہو گئی۔ اور دونوں نے مشورہ کرکے ایک انگریز ڈاکٹر کو بلایا، بائیں آنکھ پر نشتر لگا، یہی آنکھ کمزور تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رہی سہی بصارت بھی جاتی رہی، اور دوسری آنکھ پر خود بخود تاریکی چھا گئی۔

ایک دن میرے شوہر سرہانے آکر کھڑے ہو گئے، اور کہنے لگے "میں کس منہ سے تمہاری ہمدردی کروں! میری ہی سہل انکاری سے تمہاری بصارت چلی گئی۔" آنسوؤں کی وجہ سے انکی آواز گلوگیر ہو رہی تھی، میں نے انکا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر جواب دیا "تم نے تو حتی الوسع بھلائی کی کوشش کی تھی، اگر خدا نخواستہ تم خود اس بلا میں گرفتار ہو جاتے تو یہی کرتے جو میرے ساتھ کیا ہے۔ کسی غیر ڈاکٹر کے ہاتھوں سے میری آنکھیں خراب ہو جاتیں تو میں اپنے دل کو کس طرح تسکین دیتی؟

جو کچھ ہوا اچھا ہوا، میری تشفی اور دلجمعی کیلئے یہی خیال کافی ہے کہ میری آنکھیں تمہارے پیارے ہاتھوں سے رخصت ہوئیں، آخر وہ بھی تو ایثار تھا کہ سری رام چندر جی کو جب صرف ایک گل نیلوفر ملا اور اسکو انھوں نے پرمیشور کے نام پر چڑھانے کے لیے کافی نہ سمجھا، تو اپنی دونوں آنکھیں نکال کر چڑھادیں، اسی طرح میں نے بھی خدا کی راہ میں اپنی آنکھیں دے ڈالیں، اب اگر کوئی ایسی چیز نظر آئے کہ جس کو دیکھکر تمھارا دل خوش ہو تو مجھ سے اسکا ذکر کیا کرنا، میں وہی مسرت حاصل کرونگی، جو تمکو ہوا کریگی ؟

مگر ان باتوں سے مجھے اطمینان نہ ہوا، کیونکہ مجھے اٹکل نہ تھی کہ اس قسم کی گفتگو سے اُن کے قلب پر کیا اثر ہوتا تھا، مجھے اس طرح کی باتوں کی عادت ہوگئی، اور اُن کو روز دوہرانے لگی۔ جب میرے قلب پر رنج و غم کا ہجوم ہوتا یا میرے قدم صبر و شکر کی راہ میں ڈگمگاتے یا جی گھبراتا، تو میں بے اختیار ہو کر رونے لگتی، مگر فوراً ہی ان باتوں سے اپنے دل کو اس طرح سمجھاتی۔ جیسے کوئی بچہ کہی ہوئی کہانی کو دوہراتا ہے اُسوقت صبر آجاتا، طبیعت راضی بہ رضا ہوتی، اور مایوس کن خیالات سے پناہ مل جاتی ؟

جس وقت ہم دونوں باتیں کر رہے تھے، میں نے اپنے خیالات کو اُن پر اچھی طرح ظاہر کر دیا وہ کہنے لگے "دکمّو، مجھ سے جو غلطی ہوگئی۔ اسکی تمام عمر تلافی نہیں ہوسکتی، البتہ میں ایک کام کرسکتا ہوں، یعنی ہمیشہ تمھارے پاس رہوں، اور حتی المقدور تمھاری معذوری کو دور کرنے کی کوشش کروں" میں نے کہا یہ کیونکر ممکن ہے! میں تمھارے گھر کو اندھی عورت کا شفاخانہ نہیں بنا سکتی۔ بہتر ہے کہ تم دوسری شادی کرلو"

میں نے یہ الفاظ کہہ تو دیے مگر حلق خشک ہوگیا، کھانسنے کے بہانے سے میں نے طبیعت کو روکنا چاہا، لیکن" بات کاٹ کر بولے "دکمّو، میں جانتا ہوں کہ میں

سخت نالائق ہوں، بلکہ اس سے بھی زیادہ بُرا ہوں، لیکن میری طبیعت کمینی نہیں ہے تمہاری قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں شادی کروں تو مجھ پر اپنے ماں اور باپ کی جان لینے کا پاپ لگے،،! مجھے ایسی سخت قسم کی اجازت نہ دینی چاہیے تھی، لیکن آنسوؤں کے بہاؤ کی وجہ سے میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ مگر ان الفاظ کو سن کر میں آپے میں نہ رہی، اور اپنی اندھی صورت کو تکیہ میں چھپا کر دیر تک روتی رہی، جب کسی قدر سکون ہوا، تو میں نے اُن کا سر اپنے سینے سے لگا کر پوچھا ''تم نے ایسی بڑی قسم کیوں کھائی؟ کیا میں نے نفسانی اغراض کے لیئے شادی کرنے کو کہا تھا؟ نہیں میرا یہ مطلب نہ تھا بلکہ یہ خیال تھا کہ جس طرح میں تم کو آرام دیا کرتی تھی، اب وہ دیا کرے گی،، کہنے لگے وہ آرام تو خدمتگاروں سے بھی مل سکتا ہے، میں ایسا پاگل نہیں ہوں کہ ایک لونڈی کو لا کر اپنی دیبی کے تخت کا شریک بنا دوں''۔

زبان سے ''دیبی،، کا لفظ نکلتے ہی اُنھوں نے میرے چہرے کو ہاتھوں میں لے لیا۔ میری پیشانی کو چومنے لگے، اُسی وقت مجھے الہام ہوا کہ میری عقل کی تیسری آنکھ بینا ہو گئی ہے۔ اور میں دل میں کہنے لگی ''بہت اچھا ہوا۔ گھر کے معمولی کام کاج نہ کر سکوں گی نہ سہی۔ لیکن نئی دنیا کی سیر کیا کرونگی، خدا کی عبادت کرونگی۔ اور دنیا کے پیچ و فریب سے پناہ میں رہونگی، شاید اسی بہانے سے میرے گناہ معاف ہو جائیں،، اُس روز تمام دن میرے دل میں کشمکش رہی، اور اس خیال سے بہت خوشی ہوئی کہ اتنی بڑی قسم کھا کر، اب وہ دوسری شادی نہ کر سکیں گے لیکن نئی روح جو مجھ میں حلول کر گئی تھی اور نسائیت سے معمور تھی بولی، ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ تمہارے شوہر کو قسم کا توڑ دینا آسان ہو جائے، اور وہ دوسری شادی کر لیں، اصلی روح نے کہا وہ ممکن ہے! لیکن اتنی بڑی قسم کو توڑ ڈالنا آسان نہیں'' دل نے میری اصلی روح کی ہمنوائی کر کے اس طرح تشفی کر دی اسمیں کیا شک ہے؟

اُنھوں نے واقعی بہت بڑی قسم کھائی ہے"

غرض میرے دماغ میں اسی طرح کے خیالات آتے رہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نئی روح جس نے ابھی حلول کیا تھا، مجھ سے خفا ہو گئی، کیونکہ خوف و ہراس کی مہیب شکل میرے سامنے آ گئی اور میں خوف زدہ ہو کر کانپنے لگی۔



میرے پشیمان شوہر، میرے کاموں کو اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے اور نوکروں کو پاس تک نہ آنے دیتے۔ اُن کے ہاتھوں ضروریات کے رفع ہونے پر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی۔ اور اُن کی صحبت میں میرا وقت ہنستے بولتے گذرنے لگا، نابینا ہو جانے کی وجہ سے میں چاہتی تھی کہ وہ ہر وقت میرے ہی پاس رہیں کیونکہ جلوت کا وہ لطف جو کبھی آنکھوں کے ذریعہ میسر تھا، مجھکو اب عالم نابینائی میں ملتا تھا، پہلے جب کبھی وہ کہیں چلے جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ مجھے باندھکر ہوا میں لٹکا گئے ہیں، اور میں بجیس ہوں، اُن کو اگر شفاخانہ سے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں کھڑکی کھول دیتی اور سڑک کی طرف ٹکٹکی باندھکر دیکھا کرتی گویا سڑک اُن کے اور میرے قلب کے درمیان ایک رشتہ تھی، لیکن اب چونکہ بصارت چلی گئی تھی اور سڑک نظر نہ آتی تھی، اسلیئے میں اُن کے تصور میں ہمہ تن انتظار رہتی تھی۔ وہ رشتہ جو بینائی کے وجود سے قائم تھا، شکست ہو گیا تھا، اور ایک ناقابل عبور دریا مائل تھا، اُنکی جدائی سے اس دریا کے کنارے چوڑے ہو جاتے، اور اُنکی آمد پر ساحل نزدیک ہو جاتا۔ لیکن یہ بیتاب تمنائیں، اور ناقابل اعتبار خیالات بے کار تھے۔ مرد کے لیئے عورت کیلیے خود بوجھ ہوتی ہے اور نابینائی کا اضافہ اس بوجھ کو قطعی ناقابل برداشت بنا دیتا ہے اس لیئے میں نے عہد کر لیا کہ میں ہر دکھ اور مصیبت کو تنہا برداشت کرونگی اور اس بلا میں اُنکو شریک نہ کرونگی۔

تھوڑے ہی عرصہ میں، میں نے چھونے، سننے، اور آواز پہچاننے کی مشق سے گھر کے کل کام کاج کرنے کی صلاحیت پیدا کرلی، اور میں نابینائی کی حالت میں، بینائی کی بہ نسبت ہر کام کو جلد سیکھ لیتی تھی، کیونکہ بینائی بجائے ترغیب دینے کے اکثر ہمت شکن ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ میری قوتیں جو خوابیدہ تھیں جاگ اٹھیں، اور فرائض کو مستعدی اور اطمینان کے ساتھ انجام دینے لگیں۔ متواتر مشق کا یہ نتیجہ ہوا کہ میں کسی کام کو اپنے شوہر پر نہ چھوڑتی۔ ابتدا میں انھوں نے اعتراض کیا کہ میں ان کے منفعل قلب کو فرائض کی انجام دہی سے محروم رکھتی ہوں۔ لیکن میری ہمت اور استقلال میں فرق نہ آیا۔ میں ان کے الفاظ کی وجہ سے نہیں کہتی ہوں۔ بلکہ خود میں نے محسوس کیا۔ گھر کے مشاغل میں وقت صرف کرکے انکو خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ نابینا بی بی کی روزانہ خدمت کا پابند ہو جانا دنیا میں کسی شوہر کے لئے موجب مسرت نہیں ہو سکتا۔

(۲)

وہ دن بھی آگیا کہ میرے شوہر کی تعلیم ختم ہوئی۔ اور وہ ڈاکٹر ہو گئے۔ کلکتہ کے ایک چھوٹے قصبے میں انھوں نے ڈاکٹری شروع کی، میں یہاں آکر بہت خوش ہوئی، گویا مادر وطن کے گود میں پہونچ گئی۔ آٹھ برس کی عمر میں مجھے کلکتہ جانا پڑا تھا وہاں دس برس رہکر وطن کی یاد دل سے محو ہو گئی تھی۔ جبتک آنکھیں تھیں کلکتہ کی منہمک طرز زندگی نے بچپن کی یاد نہ آنے دی، حالانکہ میں جانتی تھی کہ کلکتہ کے نظارے صرف آنکھوں کو لبھاتے ہیں، ان سے قلب کو تسکین نہیں ہوتی، مگر نابینا ہوتے ہی بچپن کی باتیں اس طرح تازہ ہوگئیں جس طرح غروب آفتاب کے بعد ایک ایک کرکے ستارے نکل آتے ہیں۔

شروع نومبر میں ہم لوگ ہرسنگھ پور پہونچ گئے۔ یہ جگہ بالکل نئی تھی لیکن دیہات کی زندگی مجھے بیحد پسند تھی۔ تازہ جتے ہوئے کھیتوں میں ہوکر پھولوں کی مہک آتی تھی

دور سے چروا ہے لڑکوں کے گانے کی آوازیں اور گاڑی کے پہیوں کی گنگناہٹ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں، ہرطرف خوشبو ہی خوشبو تھی، اور بہتے ہوئے چشمے الگ کھینچتے تھے کہ میں اُن کے کنارے پر بیٹھکر روح کو تازہ کروں۔

یہاں بچپن کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں، خود بخود محسوس ہوا کہ میں بچپن کی زندگی کا لطف اُٹھا رہی ہوں، البتہ ماں کی غیر موجودگی سے کلیجہ پر چوٹ سی لگتی تھی، تصور میں بچپن کی ایک ایک چیز سامنے آجاتی۔ کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ میں گھر میں بیٹھی ہوں، پیپل کے پُرانے درخت کھڑے ہیں، اور ہمارے گاؤں کے چشمے اُبل رہے ہیں، کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ بوڑھی دادی دھوپ میں بیٹھکر بال سکھا رہی ہیں اور کمزور آواز میں گاتی جاتی ہیں، شام کو مویشیوں کی جگالی کی آواز سنتی تو ماں کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی، اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ابھی چراغ لیکر مویشیوں کے حلقہ میں گئی ہیں، وطن کی تازہ اور ہری گھاس کی بھینی بھینی خوشبو دماغ میں بس جاتی، اور دور کے مندروں سے گھنٹیوں کی آواز کانوں میں گونجنے لگتی۔

لمبے چوڑے کلکتہ میں ایک کشش ہے۔ جو دلوں کو بے اختیار کھینچتی ہے، مگر وہاں میری زندگی کی تازگی، اور معصومیت قطعی مفقود ہوگئی تھی، وہاں ایسی باتیں پیدا ہوجاتی تھیں جن سے دل کو تکلیف ہوتی تھی، ایک دن کا ذکر ہے کہ میری ایک ملنے والی کہنے لگی، "دیکھو! توبہ ہے!! تم بھی کیسی بے حس ہو! اگر میرا شوہر ایسا سلوک کرتا تو میں تمام عمر اسکی صورت نہ دیکھتی"، یہ جب کی بات ہے کہ میرے شوہر دوسرے ڈاکٹر سے میرا علاج کرا رہے تھے، اُسکا کہنا مجھے بہت ناگوار گذرا اور میں نے صاف کہدیا، بہت رنج ہوا۔ میں نے، وہ میرا اندھاپن کچھ کم بُرا ہے جو خواہ مخواہ شوہر کی بُرائیاں کروں۔ اس جواب پر وہ خفیف سی ہوگئی۔ مجھ سی کم عمر عورت سے اس جواب کی اُسکو مطلق اُمید نہ تھی مگر وہ سر کو جنبش دے کر، اور تنک کر میری بات کو سنی اَن سنی کرگئی۔

بہر کیف میری طبیعت پریشان ہو گئی اور اُس کے الفاظ میرے دل سے کبھی نہ مٹے کلکتہ میں نئے سے نئے فصول کی بھرمار دلوں کو سخت بنا دیتی ہے، اگر یہاں پھر مجھ میری بھولی ہوئی تمنائیں اور بے ریا محبت کی باتیں پھر عود کر آئیں گویا خدائے کریم نے اپنی رحمت مجھپر نازل فرمائی جس نے میرے دل اور میری روح کو منور کر دیا میں اپنے معبود حقیقی کی ذرہ نوازی پر قربان جاتی اور بار بار شکر کرتی کہ مر تو نے اپنی دی ہوئی نعمت مجھ سے چھین لی، لیکن ہزار شکر ہے کہ تو میرے ساتھ ہے، مجھے یوں نہ کہنا چاہیئے، یہ الفاظ گستاخی پر محمول ہو سکتے ہیں، کیونکہ بندہ تو صرف دعا مانگ سکتا ہے مجھکو یوں نہ کہنا چاہیے کہ تو میرے ساتھ ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیئے میں دعا کرتی ہوں کہ خدایا! میرے دل سے تیری یاد کبھی محو نہ ہو! اور جب زندگی میں کوئی شئے باقی نہ رہے اُسوقت بھی تیری یاد میرے دل میں قائم رہے!!۔

(۳)

قصبہ میں رہتے کئی مہینہ ہو گئے تھے، یہ زمانہ ہنسی خوشی میں گذرا۔ میرے شوہر نے ڈاکٹری کے پیشہ میں تھوڑی بہت شہرت حاصل کر لی اور اُنکے ہاتھوں میں روپیہ آنے لگا لیکن اس آمدنی میں کچھ حصہ حرام کا بھی تھا۔ میں اپنے خیال کی تائید میں کوئی خاص واقعہ بیان نہیں کر سکتی ہوں، لیکن اندھوں کا ضمیر آنکھ والوں کی بہ نسبت صاف ہوتا ہے اسلیئے دولت میں ترقی کے ساتھ میرے شوہر میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں، اُن کا مجھکو اچھی طرح علم تھا، اوائل عمری میں اُن کو حق اور انصاف کا بہت خیال رہتا تھا۔ اور اکثر کہا کرتے کہ جب میں ڈاکٹر ہو جاؤنگا، غریبوں کی مدد کرونگا، اور بلا فیس اُنکی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھونگا، وہ اُن شریف طبع ڈاکٹروں کی توصیف کیا کرتے۔ جو بلا فیس غریبوں کا علاج کرتے تھے۔ لیکن افسوس اب اُن کے وہ خیالات نہ تھے۔ مزاج بہت سخت ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک غریب عورت اپنے بچہ کو لائی اور تنگی

فیاضی اور سخاوت کا واسطہ دیکر امداد کی طالب ہوئی، مگر اُنھوں نے بُری طرح جھڑک دیا اور جب میں نے سفارش کی، تو نہایت لاپرواہی سے ٹال کر اپنے کاموں میں مصروف ہوگئے جب ہم غریب تھے ہمکو حصول دولت کی زیادہ آرزو نہ تھی، اور ہمارا ایمان سلامت تھا۔ مگر جب سے بنک میں روپیہ جمع ہونا شروع ہوا، تو اکثر مہاجنوں کے دلالوں کا اور شہر کے بداعمالوں سے اُنکی گھنٹوں صحبتیں رہنے لگیں، اس کا جو کچھ مطلب ہوسکتا ہے اُسکے اظہار کی ضرورت نہیں!۔

آہ! یہ کیسا انقلاب تھا! یہ وہی میرے شوہر تھے جنکو میں نابینائی کے قبل اپنی آنکھوں سے دیکھا کرتی تھی! یہ وہی تھے جنھوں نے میری پیشانی کو چوم کر مجھے ایک مقدس ہستی کہا تھا، اور دیبی کے تخت پر بیٹھنے کی عزت دی تھی! افسوس انکی حالت میں کیسا انقلاب ہوگیا تھا۔!

جو لوگ فوری جذبہ سے متاثر ہوکر گمراہ ہوجاتے ہیں وہ پھر اثر پذیر ہوکر اپنی اصلی حالت پر آسکتے ہیں! لیکن وہ لوگ جو رفتہ رفتہ اپنے اخلاقی مادہ کو تحلیل کرتے ہیں، یا بیرونی اثرات سے متاثر ہوکر روح کو بیچس اور برباد کردیتے ہیں۔ اُن کے جذبات قطعی سوخت ہوجاتے ہیں۔ ان کی اصلاح کی دنیا میں کوئی صورت نہیں۔

نابینائی کی وجہ سے آنکھوں سے نظر نہ آنا، محض فرضی علٰحدگی ہوتی ہے۔ لیکن آہ یہ خیال کیسا روح فرسا تھا کہ اب وہ (میرے شوہر) مجھ سے واقعی جدا تھے، اور میرے نہ تھے! حالانکہ اگر ہم دونوں، ہم خیال ہوتے تو زندگی کے لمحات پُرمسرت ہوجاتے! اصل جُدائی آنکھوں سے نہیں دلوں کے فرق سے ہوتی ہے! میں اپنے دل کو محبت اور وفا کا زیراثر رکھکر تسلیاں دے لیتی تھی۔ لیکن وہ صبر اور شکر کی راہ سے قطعی جُدا ہوگئے تھے، اُن کو فانی، اور بے ثبات چیزوں کی تلاش رہتی اور دولت جمع کرنے کا جنون ہوگیا تھا۔ اُن کی یہ حالت دیکھکر بعض اوقات مجھکو شک ہوتا کہ شاید نابینائی کے

باعث محض غلطی پر ہوں، اور نمائشی چیزیں اتنی بُری نہیں ہیں جتنی کہ معلوم ہوتی ہیں۔ ممکن ہے اگر میری بینائی ہوتی تو میں دنیا کو اس کے اصلی رنگ میں قبول کر لیتی اور نمائشی اور غیر نمائشی فانی اور غیر فانی، اصلی اور مصنوعی، چیزوں کے جھگڑے میں نہ پڑتی، بہرکیف میرے شوہر کا اور میرا، نقطۂ نظر جداگانہ تھے، میں ہر چیز کی حقیقت کو دیکھتی، اور وہ اُسکی سطح کو،

ایک دن ایک بوڑھا مسلمان اُن کے پاس آیا، گود میں اُسکی پوتی تھی جس سے وہ بہت مانوس معلوم ہوتا تھا، بچی بہت بیمار تھی، اُسنے بہت منت وسماجت کی، حضور مَیں ایک غریب بیکس آدمی ہوں، آپ میری مدد کریں، خدا آپ کا بھلا کرے گا"، مگر وہ بہت بُری طرح پیش آئے "زیادہ مت بکو، بتاؤ کیا فیس دے سکتے ہو!" میں ان باتوں کو سُن رہی تھی، سخت صدمہ ہوا، خدا نے مجھے اندھا کیا تھا، بہرا اور بہا دیتا۔ غریب بُڈھے نے لمبا سانس کھینچا، اور اُٹھکر چلا گیا، میں نے ماما بھیجکر بڈھے کو بلا لیا اور دروازے پر اُس کے ہاتھ میں کچھ روپیہ دیکر کہا "یہ روپیہ بچی کے علاج کے واسطے ہے، مہربانی کرکے اس کو قبول کرو، کسی ہوشیار اور ایماندار ڈاکٹر سے اس کا علاج کرانا، اور میرے شوہر کے ایمان کی سلامتی کے لیے دعا کرنا"

اُس صدمہ کی وجہ سے میں نے تمام دن کچھ نہ کھایا اور جب دوپہر کو وہ سو کر اُٹھے تو متعجب ہو کر دریافت کیا "کیا بات ہے اسقدر رنجیدہ کیوں ہو" میں حسب معمول جھوٹ بولنا چاہتی تھی، مگر مکر اور فریب کے دن گذر چکے تھے، اس لیے میں نے صاف صاف کہدیا، میں تم سے کئی دن سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ لیکن اس وقت خود میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کہنا ہے، اور نہ جو کچھ میرے دل و دماغ میں ہے وہ زبان پر آسکتا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں تم کو خود معلوم ہے کہ اس زمانہ میں تم میں کیا تبدیلیاں ہوگئی ہیں! اور تمھاری اور میری زندگی میں کیسا انقلاب ہوگیا ہے؟

اُن سے کچھ نہ بن پڑا کہنے لگے انقلاب تو قدرت کا قانون ہے میں نے جواب دیا

یہ تو میں بھی جانتی ہوں، لیکن دنیا میں بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جن میں انقلاب نہیں اور وہ قطعی غیر فانی ہیں۔ وہ چیں بر جبیں ہو گئے، اور بگڑ کر بولے "بہت سی عورتیں اس لئے رنج و مصیبت میں مبتلا ہیں کہ اُن کے شوہر ایک پیسہ نہیں کماتے، اور بہت سی ایسی بدنصیب ہیں جنکو شوہر پیار نہیں کرتے۔ لیکن تم سخت ناشکری ہو"

اُس روز سے مجھ پر یہ حقیقت اور واضح ہو گئی کہ نابینائی نے مجھکو اُن چیزوں کے دیکھنے کی قوت دیدی ہے، جو لافانی ہیں، اور جن کو تغیر نہیں ہے، میں دوسری عورتوں کی طرح ناشکری نہیں کرتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے شوہر میرے خیالات کو سمجھنے سے بالکل معذور رہتے۔

(۴)

ہم میاں بیوی، کی زندگی ایک حالت پر گذر رہی تھی جس میں کوئی بات قابل ذکر نہیں تھی، اور یہ طرز جاری رہتا۔ لیکن میرے شوہر کی چچی کے یکایک آجانے سے ہماری معاشرتی استواری درہم برہم ہو گئی۔ اُنھوں نے آتے ہی زہریلا اثر پیدا کر دیا۔ اور واری اور قربان ہو کر فرمانے لگیں "کمو، مجھے تم پر بڑا ترس آتا ہے، لیکن اس مصیبت میں اپنے شوہر کو کیوں شامل کرتی ہو، تم کو چاہیے کہ اُنکو شادی کی اجازت دیدو"

اگر میرے شوہر اس گفتگو کو مذاق میں اُڑا دیتے تو یقین ہے کہ وہ جھینپ جاتیں، یا اگر ہنس دیتے تو اُن کو اطمینان ہو جاتا، مگر اُنھوں نے اس موقع پر جو گفتگو کی وہ اٹک اٹک کر، اور دبی آواز میں بادلِ ناخواستہ کہنے لگے "چچی کیا آپ کا ایسا خیال ہے؟ آپ کو تو اس قسم کی باتیں نہ کرنی چاہیئیں۔

ذرا سہارا ملتے ہی اب وہ مجھ سے مخاطب ہوئیں "کمو، کیا میں نے جھوٹ کہا تھا؟"

میں نے ہنسکر ٹال دیا "اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتا ہے جو معاملات کو ہم سے

بہتر سمجھتا ہو، گرہ کٹ، کیونکہ کسی کی جیب نہیں کاٹا کرتے۔"

فرمایا "ٹھیک کہتی ہو" اور بھتیجے سے بولیں "بیٹا ابنیاش آؤ، ہم تم الگ چلکر باتیں کریں۔"

کچھ روز کے بعد انھوں نے میری موجودگی میں چچی سے پوچھا کہ وہ کسی ایسی شریف خاندان لڑکی سے واقف ہیں جو ہمارے گھر میں رہکر کام کاج کر دیا کرے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے خانگی کاموں میں کسی کی امداد کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن میں سُنکر خاموش ہو رہی۔

چچی نے جواب دیا "ایسی ہزاروں موجود ہیں، خود میرے چچا زاد بھائی کی بیٹی ہر جو بیاہ کے قابل ہے اور بہت خوبصورت ہے، وہ لوگ خوشی سے تمھارے ساتھ بیاہ کر دیں گے۔

اُنھوں نے کہا "مگر میں شادی کے لیے کہتا کب ہوں۔"

چچی نے جواب دیا "تو پھر ایسی کونسی شریف زادی ہوگی، جو بن بیاہی تمھارے گھر میں رہے"، جواب کی معقولیت پر وہ خاموش ہوگئے اور اُٹھکر چلے گئے، اُن کے جانے کے بعد میں تنہا رہ گئی اور بیٹھے دعا مانگی "یا اللہ! تو میرے شوہر کو بچا۔"

ابھی چند ہی دن گذرے تھے، میں پوجا کے کمرے سے برآمد ہو رہی تھی کہ چچی نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، اور کہنے لگیں "کمو! جس لڑکی کا اُس دن ذکر ہوا تھا، میرے ساتھ آئی ہے۔ تم ملکر بہت خوش ہوگی، آؤ پیاری بیٹی، ادھر آؤ، اپنی بہن سے ملو،

اس کا نام ہمنجنی ہے۔ عین اسی وقت وہ بھی آ نکلے۔ اور گھر میں ایک بن بیاہی لڑکی کو دیکھکر بظاہر متعجب ہو گئے۔ اُلٹے پاؤں لوٹنے کو تھے مگر چچی نے روک لیا "پیارے ابنیاش! پردہ نہیں ہے۔ میرے چچا زاد بھائی کی بیٹی جو تم سے ملنے آئی ہے بیٹی! اسلام کرو۔"

وہ سٹ پٹائے ہوئے تھے، مگر باتیں بنانے لگے اور اس ٹوہ میں رہے کہ کنواری لڑکی کے آنے کا سبب کیا تھا، میں تمام باتوں کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی، لیکن ہم منجنی کا ہاتھ پکڑ کر کمرہ میں لیگئی، اور محبت سے اُسکے چہرے کو ٹٹولنے لگی۔

حقیقت میں وہ بہت خوبصورت لڑکی تھی، چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور کہنے لگی "کیا تم مجھے خواب میں لارہی ہو؟" اُسکی بے ریا اور بے تکلف ہنسی نے غیریت کا پردہ ہٹادیا، اور میں نے اُس کے گلے میں داہنا ہاتھ ڈال کر کہا "پیاری بہن میں تم کو دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوں" اور اپنا بایاں ہاتھ اُس کے چہرے کی طرف بڑھایا، وہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی "کیا تم سچ مچ مجھے دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو، میں کوئی گل بوٹا ہوں جس کے رنگ اور بو کو معلوم کرنا چاہتی ہو؟

میں سمجھ گئی کہ اس کو میری بدنصیبی کا علم نہ تھا، میں نے بتادیا "بہن میں نابینا ہوں" میں نے محسوس کیا کہ اُسکی خوبصورت، نرگسی آنکھیں میرے چہرے کو بغور دیکھ رہی ہیں۔ اور وہ مجھکو قابل رحم سمجھتی ہے، وہ اپنے استعجاب کو چھپا نہ سکی:- "اِس لیے تمھارے شوہر نے اپنی چچی کو رہنے کے لیئے بلایا ہے"

میں نے جواب دیا "نہیں! بالکل غلط ہے، اُنھوں نے ہرگز نہیں بلایا، چچی اپنی مرضی سے آئی ہیں"

وہ بولی "تو پھر دوسروں کو تو زیبا نہیں کہ بن بلائے چلی آئیں؟ میں بتائے دیتی ہوں کہ وہ یہاں کچھ دن رہکر جائینگی" اور اس خیال سے وہ خود مغموم ہوگئی اور مجھ سے پوچھنے لگی "مجھے بتا، چچی نے یہاں کیوں بھیجا ہے؟ پیاری بہن تمھیں کچھ خبر ہے؟"

ہم دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ چچی آگئیں، لڑکی نے پوچھا، چچی، کب تک واپس چلوگی؟ چچی گھبرا گئی اور بات ٹالنے کے لیئے کہنے لگی "اس سوال کا کونسا موقع ہے؟ میں نے تم سی لڑکی دنیا جہان میں نہیں دیکھی، ابھی آئی ہو اور ابھی چلنے کا تقاضہ شروع ہوگیا"

لڑکی نے کہا "چچی، بُرا ماننے کی کیا بات ہے، تم اپنے بھتیجہ کے گھر آئیں، ٹھیک کیا۔ مگر میں کون ہوں جو یہاں رہوں، میں تو صاف کہتی ہوں کہ میں یہاں نہیں رہوں گی" اور میرا ہاتھ پکڑ کر پوچھنے لگی "کیوں بہن! میں غلط کہتی ہوں؟"

میں نے اُسکو سینہ سے لگا لیا اور کچھ جواب نہ دیا۔ چچی پریشان تھی۔ ڈری کہ موا ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اس لیے بات کا شکر کہنے لگی "بیٹی، چلو ندی پر اشنان کر آئیں" مگر لڑکی مجھ سے چمٹ گئی اور کہنے لگی "نہیں میں تو ان (یعنی مجھ سے مطلب تھا) کے ساتھ اشنان کو جاؤنگی، اس مخالفت سے چچی کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے"

راستہ میں ننھی نے پوچھا "بہن! تمھارے کوئی اولاد نہیں ہوئی؟" مجھے اس سوال پر بہت تعجب ہوا، مگر میں نے بتا دیا "نہیں، مجھے خدا نے کوئی اولاد نہیں دی، یہی سبب ہے........"

اُس نے قطع کلام کر کے شوخی سے کہا "نہیں، یہ بات نہیں ہے، ایسا کبھی نہوگا اطمینان رکھو، لیکن تم نے کوئی بُرا پاپ کیا ہے۔ دیکھو چچی بھی لا ولد ہے۔ اُسکو تو اُسکے گناہوں کا ثمرہ ملا ہے، تم نے کیا پاپ کیا تھا؟"

مجھے اس گفتگو سے بہت تکلیف ہوئی۔ اُسکا وہم دور کرنے کے لیے میرے پاس جواب ہی کیا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر دل میں کہا "اللہ، تو ہی واقف ہے کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے"۔ مجھے غمگین دیکھکر وہ چلا کر کہنے لگی، "نیک بخت، پاگل راجن رانی، تم نے ٹھنڈا سانس کیوں بھرا؟" میری باتوں کا خیال نہ کرو، اور اُس کے ہلکے قہقہے، ندی کی لہروں میں مل گئے۔

(۵)

میرے شوہر کے پیشہ میں روز بروز رکاوٹیں پیدا ہوتی جاتی تھیں۔ اُن کا دل کام سے اُچاٹ ہوگیا تھا۔ باہر کے مریضوں کی طرف بالکل توجہ نہ کرتے تھے، اور مقامی

مریضوں سے بھی بہت جلد پیچھا چھڑا لیتے تھے۔

پہلے تو وہ صرف دوپہر اور رات کو مکان کے اندرونی حصہ میں چچی سے باتوں کا وقت معین تھا۔ مگر اب یہ حالت تھی کہ دن میں کئی کئی بار جانے لگے۔ چچی لڑکی سے گلاس میں پانی منگوایا کرتی تھیں۔ مگر میں سمجھ جاتی تھی! چند روز تک تو لڑکی حکم کی تعمیل کرتی رہی، لیکن اس کو تامل ہونے لگا، تو چچی بہت پیار سے پکارنے لگیں "ہیمو! ہیمو!! بیٹی ہنجنی"، مگر وہ مجھ سے چمٹ جاتی اور اداس ہو جاتی۔

اس زمانہ میں میرے بھائی بھی کلکتہ سے آگئے۔ ان میں دلدہی اور محبت کا مادہ بہت تھا مگر وہ سخت اور انصاف پسند آدمی تھے، اس لیے میں ڈری کہ دونوں میں پھر کہیں جھگڑا نہ ہو جائے۔ میں ان کے سامنے ہر وقت خوش رہتی، اور میں نے اپنی تکالیف کا بالکل اظہار نہ ہونے دیا، لیکن ان کے قیام سے میرے شوہر کو بہت اذیت تھی وہ مجھ سے بار بار پوچھتے "تمھارے بھائی کب تک چلے جائیں گے؟" بھائی نے بھی ان کے طرز عمل کو محسوس کر لیا اور بہت جلد رخصت ہو گئے۔ چلتے وقت وہ دیر تک اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھے رہے۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رو رہے ہیں اور زیر لب دعائیں دے رہے ہیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ گاؤں کی ہاٹ ختم ہو گئی تھی، کاروباری لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہوائیں تیز تھیں، طوفان کے آثار تھے۔ اور بھیگی ہوئی زمین اور ابر کی وجہ سے حبس ہو رہا تھا۔ چونکہ احتیاط کے خیال سے میں اپنے کمرے میں چراغ نہ رکھتی تھی اس لیے میرے کمرے میں تاریکی تھی۔ میں فرش پر بیٹھی ہوئی عبادت میں مصروف تھی "اے دونوں جہان کے مالک! مجھے تیرے درشن کس طرح نصیب ہونگے، میں تو اندھی ہوں اور دلشکستہ ہوں۔ میرا قلب زخمی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے زخم کو دبائے ہوئے بیٹھی ہوں، طوفان حوادث مجھے بہائے لیے جاتے ہیں!

تو ہی مجھ پر اپنا فضل و کرم فرما۔ آخر کب تک .... کب تک .... میرا امتحان جاری رہیگا!"
اسی حالت میں میری گردن تکیہ پر جھک گئی اور میں زار و قطار رونے لگی۔ مجھے کسی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی، ہمنجنی آکر گلے سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کو پونچھنے لگی۔ میں کمرے میں اتنی دیر تک اپنے قیام کی کوئی وجہ نہیں بتا سکتی ہوں۔ اُس نے بھی کوئی بات نہ پوچھی اور نہ کچھ منھ سے بولی، البتہ نرم و نازک ہاتھوں سے میری کنپٹی سہلاتی رہی اور میری پیشانی کو چوم کر کمرے سے باہر چلی گئی۔
اُس نے صبح کو میرے سامنے چچی سے کہا "تم چاہو تو قیام کرو، مگر میں تو نوکر کے ساتھ گھر جاتی ہوں"
چچی نے جواب دیا "تنہا جانے کی کیا ضرورت ہے، میں بھی چلونگی" اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر ایک انگوٹھی نکالی جس میں موتی جڑے ہوئے تھے اور بہت پیار سے کہنے لگی "پیاری بیٹی، میرا ابنیاش تمھارے لئے کیسی خوبصورت اور بیش قیمت انگوٹھی لایا ہے!"
"چچی، دیکھو میں کیسا اچھا نشانہ لگاتی ہوں" یہ کہکر ہمنجنی نے کھڑکی سے باہر تالاب میں انگوٹھی پھینک دی۔ بوڑھیا کے ہوش غائب ہو گئے۔ بالکل بوکھلا گئی، میرا ہاتھ پکڑ کر بار بار کہتی "دیکھو، ابنیاش کو خبر نہو، اُسکو بہت غم ہوگا" میں نے کہا۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے! تم اطمینان رکھو، میں اپنی زبان سے ایک حرف نکالونگی"
دوسرے دن رخصت ہونے سے پہلے لڑکی میرے پاس آئی، اور گلے میں باہیں ڈال کر کہنے لگی "بہن، دل میں رکھنا، مجھے بھول نہ جانا۔ میں نے کئی بار اُسکے چہرے کو ہاتھوں میں لیا، اور یقین دلایا، "بہن، اندھوں کی یاد بہت دیر پا ہوتی ہے۔ اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا، اور اُس کے بالوں کو چومتی رہی۔ اُس کے جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے دل کی دنیا ویران ہو گئی۔ اُسکی خوبصورتی، شوخی

اور جوانی سے ہر وقت میں لطف اُٹھایا کرتی تھی ۔ اب میں ہیک وقت اُن سے محروم ہو گئی ۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی آ گئے ، مہمانوں کے چلے جانے پر اطمینان او رپشیمانی نقصان کا اظہار محض اُنکی بناوٹی بات تھی ۔ ابتک تو صرف میرا اندھاپن اُن کے اور میرے درمیان صرف ایک رُکاوٹ تھا ، لیکن اب ہمجنی کے فراق کا اور اضافہ ہو گیا ۔ لہٰذا ہر وہ لاپرواہی ظاہر کرتے تھے ، مگر مجھے یقین تھا کہ خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا ۔

شروع مئی میں ایک دن خادمہ نے پوچھا " ندی کے کنارے جلوس کی تیاریاں ہو رہی ہیں ۔ مالک ، کہاں جا رہے ہیں ؟ آنے والی مصیبت کو میں سمجھ گئی ، مگر میں نے یہ کہکر ٹال دیا ، مجھے کیا معلوم ، کیسا جلوس ہے اور کہاں جا رہے ہیں ۔ اُس دن کے بعد خادمہ کو پھر جرأت نہ ہوئی کہ وہ مجھ سے اس بارہ میں سوال کرتی ۔ ایک ٹھنڈا سانس لیئے باہر چلی گئی ، اور اُسی شب کو تھوڑی دیر بعد وہ خود میرے پاس آکر کہنے لگے ، باہر گاؤں میں ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے ، دو تین دن میں واپس آؤنگا "

میں اُٹھ بیٹھی اور بلند آواز سے کہا " تم جھوٹ بولتے ہو " وہ اٹک اٹک کر کہنے لگے ۔ اس میں جھوٹ کیا ہے ؟ "

میں نے کہا " تم شادی کرنے جا رہے ہو "

یہ سنکر وہ دم بخود ہو گئے ، اور مکان میں سناٹا پڑ گیا ، مگر میں خود ہی بولی ۔

" چپ کیوں ہو ؟ مردوں کی طرح کیوں نہیں کہتے ، ہاں ! عورت لینے جا رہا ہوں "

دھیمی آواز میں اقرار کیا " ہاں "

میں نے تیز ہو کر کہا " ہرگز نہ جانے دونگی ، میں تم کو قسم توڑنے کے عذاب سے بچاؤں گی ۔ تمہاری بیوی ہوں اپنا فرض ضرور پورا کروں گی ، کیا میں نے اسی دن کے لیئے عبادت کی تھی ؟ "

کمرے میں بالکل خاموشی تھی ، میں فرش پر گر پڑی اور اُن کے پیروں سے لپٹ کر

کہنے لگی "میں نے کیا گناہ کیا ہے ؟ کونسی تقصیر کی ہے ، دوسری شادی کی وجہ کیا ہے ؟"

اب اُن کو دبی آواز میں کہنا پڑا "اگر تم کو ایسا ہی اصرار ہے تو میں سچ کہتا ہوں ، مجھے صرف تمہارا ڈر لگتا ہے ۔ مگر میں مجبور ہوں ، تم نابینائی کی چار دیواری میں مقید ہو میرا جی اس اندھیرے میں گھبراتا ہے ، میرے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ، تم میرے لیے ایک اجنبی عورت ہو گئی ہو ، میں تمہارے ساتھ روزمرہ کی زندگی کیسے گذار سکتا ہوں مجھے خدا کی بنائی ہوئی معمولی عورت چاہیے ۔ جس کے ساتھ زندگی کے دن آرام سے گذار سکوں ۔"

میں نے دل میں کہا "میرے دل کو چیر کر دیکھو ! میں وہی ہوں ، جو ایک دن دلہن بنکر تمہارے گھر آئی تھی ...... اور میں نے تم پر سب کچھ قربان کر ڈالا" ، یاد نہیں کہ میں نے اس وقت کیا کیا کہا ، مگر اتنا کہنے کا ضرور خیال ہے "میں تمہاری حقیقی محرم راز ہوں ، ہرگز وہ کام نہ کرنے دونگی جس سے تم سخت عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے ، مجھے یقین ہے یا تو میں بیوہ ہو جاؤ نگی ، یا وہ لڑکی مر جائے گی" ، جب مجھے ہوش آیا تو ہر طرف تاریکی اور بے بسیاں خاموشی تھی ...... میرے شوہر روانہ ہو چکے تھے ، میں تمام دن عبادت کرتی رہی اور اپنے کمرے سے باہر نہ آئی ۔

شام کو تیز ہوائیں چلنے لگیں ، اور طوفان کے آثار نمایاں ہو گئے ، بادل کی گرج ، اور بجلی کی کڑک سے در و دیوار تھرا اُٹھے ۔ مگر میں بدستور عبادت میں مصروف رہی مجھے یقین تھا کہ طوفان خیز ہواؤں میں کشتی جھکولے لے رہی ہو گی ، لیکن میری زبان سے اُن کے لیئے دعا کا ایک حرف نہ نکلا ، مجھے بس ایک دھن تھی ! کسی طرح وہ اپنی قسم کو توڑنے سے بچ جائیں ، اور چاہے ہم دونوں کا کچھ ہی حشر کیوں نہ ہو جائے ، یہ رات بھی گذر گئی ، اور دوسرا دن بھی پرمیشر کی یاد میں گذر گیا ، شام کو کسی نے دروازے پر دستک دی ، اور شور و غل کی آوازیں آنے لگیں ، دروازہ کھلنے پر

مجھے بیہوش پاکر دوسرے کمرے میں لٹا دیا گیا، نہ معلوم میں کتنی دیر غافل رہی جس وقت مجھے ہوش آرہا تھا اسکا مجھے کچھ کچھ خیال ہے، میرے کانوں میں کوئی کہہ رہا تھا "بہن! بہن!!" یہ آواز مانوس تھی! میں نے آنکھیں کھول دیں، "ممنجھی کی گود میں میرا سر تھا اور وہی مجھے پکار رہی تھی، میں نے کروٹ بدلی تو عطر عروس کی خوشبو دماغ میں بھر گئی

ہائے افسوس میری دعا ربیکار گئی اور تقدیر کا لکھا آخر کار پورا ہوکر رہا!!

خوبصورت لڑکی نے گردن جھکا کر آہستہ سے کہا "بہن! میں اپنے بیاہ پر مبارکباد لینے آئی ہوں" میرا لہو خشک ہوگیا، میری حالت اس درخت کی سی تھی جس پر یکایک بجلی گری ہو، کلیجہ مسوس کر بیٹھ گئی، اور بمشکل طبیعت کو قابو میں لاکر بولی "میں تم کو کیوں نہ مبارکباد دوں گی۔ اس میں تمھارا قصور ہی کیا ہے؟" وہ ہنس پڑی، اور کہنے لگی "قصور کیسا؟ اور کس کی خطا؟ تمھاری شادی کے وقت تو سب کچھ جائز تھا، لیکن میرا بیاہ ہوتے ہی خطا، اور قصور نکل آئے؟"

میں نے جواب میں مسکرانے کی کوشش کی، مگر مجھ سے ہنسا نہ گیا۔

البتہ دل میں کہنے لگی "میری آخری تدبیر میری دعائیں تھیں! لیکن خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہوسکتا ہے!

خیر! جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب میرے سر پر آرے ہی کیوں نہ چلیں، مگر میں ایمان اور عقیدہ میں خلل نہ آنے دوں گی "اس نے بڑھکر میرے قدم چھولئے، اور میں نے دعا دی "تمھیں تمھارا شوہر مبارک ہو! اور اللہ تم کو شاد و آباد رکھے، تمھاری عمر دراز ہو، اور تم سہاگن بنی رہو"

سنگدل کو اس پر بھی اطمینان نہوا، کہنے لگی "مجھ اکیلی کو مبارکباد دینے سے کیا حاصل! ہم دونوں کو مبارکباد دو، اور ہاتھ اٹھا کر ہمارے حق میں دعا کرو، میرے شوہر کو اپنا مہمان بناؤ، اور اگر اجازت دو تو ان کو تمھارے سامنے لے آؤں؟"

میں نے کہا "اجازت ہے! اُن کو ضرور میرے سامنے لاؤ" مجھے کسی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی، میں اس آہٹ کو پہچانتی تھی، ساتھ ہی آواز آئی "کہو اکیسا مزاج ہے؟"

میں چونک پڑی، اور گھبرا کر کہا "دادا ؟"

دُلھن پھر ہنسنے لگی، معلوم ہوتا تھا اُس کے منھ سے پھول جھڑ رہے تھے، کہنے لگی، تم ابھی تک اِن کو بڑا بھائی کہتی ہو! کیسی بیوقوفی کی بات ہے، اب اِن کو چھوٹا بھائی کہا کرو، ذرا اِن کو کان پکڑ کر ٹہلاؤ! انھوں نے تمھاری چھوٹی بہن سے شادی کر لی ہے"

اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے شوہر کی قسم قائم رہی، اور اُن کو خدا نے اپنے فضل و کرم سے بچا لیا، میں سمجھتی تھی کہ والدہ کے انتقال کے بعد دادا نے تمام عمر مجرد رہنے کا پختہ عہد کر لیا تھا، اور ایسا کوئی نہ تھا جو اُن کے خیالات کو بدل دیتا، لیکن اُنھوں نے محض میری خاطر سے اپنی شادی کر لی، میرا دل بے قابو ہو گیا، اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بہت چاہتی تھی کہ آنسوؤں کو روکوں مگر وہ اُمڈ اُمڈ کر آتے تھے، اور جس قدر ضبط کرتی تھی بے قابو ہوتی جاتی تھی، انتہائی مایوسی اور رنج کی حالت میں واقعات کے خوشگوار اختتام نے دل کی عجب حالت کر دی تھی۔ دادا، نے میرے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور دُلھن میرے گلے سے لپٹ گئی، اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی "

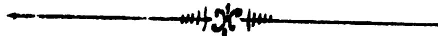
بستر پر لیٹ کر مجھے نیند نہ آئی، کیونکہ وہ اب تک نہیں سوئے تھے! میں جانتی تھی کہ اُن کو اپنی ناکامیابی پر نہایت سخت صدمہ ہوگا، نصف شب کے بعد مکان کا دروازہ کھلا اور میں اُٹھ بیٹھی، جوں جوں اُن کے پیروں کی آہٹ قریب ہوتی تھی۔ میرے دل کی دھڑکن بڑھتی تھی، وہ میرے بستر کے قریب آ گئے، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "تمھارا دادا نے مجھے زندہ کر دیا، ورنہ میں فوری جوش سے مغلوب ہو کر اپنی زندگی برباد کر چکا تھا، واقعات نے مجھے اندھا کر دیا تھا، خدا ہی علیم ہے کہ میں دل پر کتنا

درنی تیھر رکھکر کشتی میں سوار ہوا تھا! راستہ میں طوفان آگیا، آسمان کالا پڑ گیا اور اُس وقت جب کہ کشتی جگر کھا رہی تھی، میں نے سچے دل سے دعا مانگی، کہ اللہ مجھکو غرق کردے! متھرا گنج تک میرے دل کی یہی حالت رہی۔ مگر وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ تمھارے دادا نے اُس لڑکی سے شادی کرلی! میں نے وہیں شکر کا سجدہ کیا، اور کشتی میں سوار ہوکر سیدھا واپس چلا آیا۔ راستہ میں یاد آیا کہ میں نے قسم کھاکر تم سے وعدہ کیا تھا! اب میں اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ دنیا میں تمھاری ذات کے سوا میرے لئے کوئی اور ہستی عیش اور راحت کا باعث نہیں ہوسکتی ہے! اور کیوں نہ ہو! تم میری دیبی ہو“

میں ہنسنے لگی، اور ذرا سخت ہوکر بولی، نہیں! ہرگز نہیں!! ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، میں دیبی نہیں ہوں، تمھاری وہی پرانی لونڈی ہوں، اور یہی عزت میرے لئے فخر کا باعث ہے“

”میری پیاری، میری عزت اور آبرو! میں بھی تم سے ایک اقرار لیتا ہوں، اب آیندہ تم مجھکو اپنا بھگوان کہکر شرمندہ نہ کرنا“

صبح ہوتے ہی تمام قصبہ میں جھیل تھی، لیکن اس خطرناک طوفان کا راز کسی کو نہ معلوم ہوا جب کہ دریا کی ہر لہر موت کا ایک پیغام تھی“!



حقیقتِ شمع

از

جناب مولوی عبدالرزاق صاحب بسملؔ وکیل حیدرآباد دکن

تخلیق کا جب میری قدرت کو خیال آیا
شبنم سے لیے آنسو، بلبل سے لیا نالہ

پھر برق کی بیتابی رکھدی مرے سینے میں
کچھ رنگ شفق کا بھی طینت میں مری ڈالا

تاروں سے ضیا لیکر غنچوں کے تبسم میں
یوں کالبدِ نوری سانچے میں مرا ڈھالا

پھر میری سرِ محفل روشن ہوئی جب ہستی
ظلمت کدۂ دل میں باقی نہ رہی تاریکی

خلوت ہو کہ جلوت ہو، میں مونس و ہمدم ہوں
تسکینِ دلِ عاشق اک ذات ہی میری تھی

گذری تھیں بہت راتیں ایسی ہی مگر سر پر
تا صبح میں کاہش سے روتی رہی جل جل کر

تھی کس کو پڑی میری، کرتا کوئی غمخواری
بیتاب رہا شب بھر آخر یہ دلِ مضطر

آ، کان ادھر لانا اک بات حقیقت کی
کہتی ہوں تجھی سے میں کہنا نہ کسی سے بھی

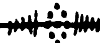
ہو جائے گا گر افشا یہ راز محبت کا
عالم میں تلاطم ہو، بہہ جائے نہ یہ کشتی

قدرت کا یہ منشا ہے ہو سوز بھرے دلمیں
اوروں کو جلا کر پھر خود آپ ہی جل جانا

"حافظہ کو ترقی دینے کے سات طریقے"

از

حسن عابد جعفری صاحب آکسن، بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر رسالہ شمع



ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا حافظہ اچھا ہو، اس لیے ہم آپکو سات گر بتانا چاہتے ہیں لیکن اُن کو بتانے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ حافظہ اپنا فعل کس طرح کرتا ہے، چونکہ اس مسئلہ کا تعلق سائنس سے ہے، اور وہ خاصہ پیچیدہ ہے، اس لیے سائنس کی بحث کو تو اس موقع پر نظرانداز کرتے ہیں، البتہ دو موٹے اور ابتدائی اصول بتلائے دیتے ہیں تاکہ کُل مضمون کو سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ رہے۔

اوّل یہ کہ دنیا میں ہر قسم کا تجربہ حواس خمسہ کے ذریعہ سے اپنا اثر قائم کرتا ہے خواہ وہ اثر دماغ کے خلیہ (cells) پر ہو خواہ عمود نخاعی (spinal column) پر ہو، خواہ پٹھوں کے کسی مرکز پر ہو، ان میں سے بعض اثرات تمام عمر قائم رہتے ہیں، بعض کچھ عرصہ کے بعد مٹ جاتے ہیں، اور بہت سے ایسے اثرات بھی ہیں جو پیدا ہوتے ہی محو ہو جاتے ہیں۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جو باتیں ایک مرتبہ ہمارے تجربہ میں آ جاتی ہیں ہمارے دماغ نیم شعوری میں اس طرح محفوظ رہتی ہیں کہ حسب ضرورت اُن کو حافظہ کام میں لا سکے، لیکن ایسے ہزاروں گہرے اثرات بھی ہیں جو قائم رہ جاتے ہیں، اور حافظہ کی ترقی اسی طرح ممکن ہے کہ ان اثرات پر زیادہ زور ڈالا جائے اور اُن کو ایسے قاعدے سے ترتیب دیا جائے کہ ضرورت کے وقت اُنکی بڑی تعداد فوراً کام میں آ سکے، اگرچہ اصول سائنس

کی رو سے مندرجہ ذیل مثال درست نہ ہوگی۔ مگر ہماری اغراض کے لیے کافی ہے، ان اثرات کو جو ہمارے تجربات دنیوی کا نتیجہ ہیں۔ ہمارے پٹھوں کے سیلز اسی طرح قبول کرتی ہیں جس طرح کہ ایک کیمرے کی پلیٹ عکس کو قبول کرتی ہے، پلیٹ کے اوپر بعض عکس ہلکے آتے ہیں اور بعض گہرے، ہلکے عکس کی تصویر چند دنوں میں غائب ہو جاتی ہے، لیکن گہرے عکس کی تصویر قائم رہتی ہے۔ یہی حال حافظہ کا ہے۔ جس قدر صاف اثر پیدا ہوگا اور جس قدر آپ کا دماغی مرکز درست ہوگا۔ اسی قدر آسانی سے آپ کا حافظہ کام کریگا۔

بعض آدمیوں کا حافظہ کیمرہ صفت ہوتا ہے، ایک مرتبہ کا دیکھ لینا، سن لینا، یا محسوس کر لینا اُن کے حافظ کے لیے کافی ہوتا ہے، چنانچہ لکھنؤ میں ایک صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ میر انیس مرحوم کی مجلس میں بیٹھکر دو دو سو اور ڈھائی ڈھائی سو بندوں کے مرثیے صرف ایک مرتبہ سن کر یاد کر لیتے تھے، اور گھر واپس آکر پورا مرثیہ زبانی سُنا دیتے تھے، اسی طرح بعض آدمیوں کو ہندسے اور رقمیں یاد رکھنے مہارت ہوتی ہے، غالباً انھیں وجوہ کی بنا پر کہا گیا ہے کہ حافظہ کئی قسم کا ہوتا ہے، لیکن یہ بحث بھی سائنس سے تعلق رکھتی ہے، اور ہمارے لیے چنداں مفید نہیں ہے، ہمارا تعلق صرف معمولی حافظہ سے ہے جس میں کچھ نقص ہونا ضروری ہے؛ اور ایسی حافظہ پر انسان کو بھروسہ نہ کرنا پڑتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حافظہ ایک فطری صفت ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ اسکو ترقی دینا یا ناقص بنا لینا ہمارا ذاتی فعل ہے اور بہرکیف یہ بحث بھی ہمارے لیے بیکار ہے لیکن ہم اس قدر ضرور بتا دیں گے کہ ماہرین نفسیات نے اس قسم کی تقسیم کو کوئی جگہ نہیں دی ہے، بلکہ اس موضوع پر علاقلانہ اور عام فہم انداز سے روشنی ڈالی ہے، اُن کے نزدیک حافظہ میں ترقی کی گنجائش ہے، اور ہر شخص جو معمولی دماغ رکھتا ہے اپنے حافظہ کو بہت زیادہ وسعت دے سکتا ہے کیونکہ حافظہ کی ترقی کا انحصار چند قواعد

پر ہے جو قطعی قرین قیاس ہیںا اور بآسانی تجربہ میں آسکتے ہیں، یہی ہمارے مضمون کا موضوع ہے اور اس اصول کی تحت میں ہم اپنا مضمون پیش کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو ہم ابتدائی اور غالباً نہایت غیر دلچسپ طریقہ کو بیان کرینگے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس کی مدد سے آپ نے اپنے بچپن میں الفاظ کہنے شروع کیے، اور مدرسہ میں جاکر ہجے کرنا اور ریاضی میں ضرب کرنا سیکھا۔ اس طریقہ کو ورد کرنا یا دوہرانا کہتے ہیں،

بچہ شروع میں "اماں" "اور" "بابا" کہنا سیکھتا ہے، یہ الفاظ اسکی زبان سے کیوں ادا ہوتے ہیں؟ اس لیے کہ وہ بارہا انھیں الفاظ کو سنتا ہے، چنانچہ سیکڑوں مرتبہ کے ورد کے بعد یہ الفاظ اس کے دماغ میں ایسا گہرا اثر پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ خود بھی انکا اعادہ کرنے لگتا ہے۔

اس طرح محض اتفاق سے وہ یہ بھی سیکھ لیتا ہے کہ وہ حرکت سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچ سکتا ہے، چنانچہ وہ بارہا اسکی مشق کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مشق ہوتی ہے اس قدر دماغ پر زیادہ گہرا اثر پیدا ہوتا ہے، یہاں تک کہ ایسا وقت آتا ہے کہ وہ بآسانی چلتا پھرتا ہے اور معمولی اشاروں میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہونچ جاتا ہے۔ یعنی نقل و حرکت اسکی نظرت میں داخل ہو جاتی ہیں، وردکر کے کسی چیز کو یاد کرنا پرانا قاعدہ ہے، اور غالباً حافظہ کی مشق کا قدیم تریں طریقہ ہے چنانچہ اسلامی ممالک میں قرآن شریف کا حفظ کرنا معمولی بات ہے۔ لیکن چونکہ یہ نتیجہ ہے بار بار دوہرانے کا، اس لیئے حافظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ محنت اور کاوش کے لحاظ سے قابل وقعت ہے، اگر انسان صبر اور استقلال سے کام لے تو محض رٹ کر بہت سی باتیں یاد کرسکتا ہے۔

دوسرا طریقہ جس سے حافظہ کو ترقی ہوسکتی ہے، یہ ہے کہ جس چیز کو حفظ کرنا منظور ہو اسکی طرف اپنے حواس کو پوری طرح متوجہ کر دیا جاے، پیدائش کے وقت

انسان میں جبلّی رجحانات ہوا کرتے ہیں، مثلاً رونا، اکڑنا، مسکرانا، وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد جو علم حاصل ہوتا ہے اُنکا ذریعہ محض حواس ہوتے ہیں۔ یعنی دیکھنا، سننا، چھونا، سونگھنا، چکھنا وغیرہ وغیرہ وہ قوتیں ہیں جو بچہ کو دنیا میں نئی باتیں سکھاتی ہیں آپ کو حیرت ہوگی، مگر واقعہ ہے کہ اندھیرے میں جو قوت آپ کو زینہ پر بآسانی چڑھا دیتی ہے، وہ محض اعصابی تحریک پر منحصر ہے، اور اُسکا تعلق بھی حافظہ کی قوت سے ہے،

ممکن ہے کہ آپ کو یہ سمجھنے میں دشواری ہو کہ حواس کو کس طرح متوجہ کیا جاتا ہے اسکی مثال یوں ہے کہ آپ ایسے شخص کو سیب دکھائیں جس نے پہلے کبھی سیب نہیں دیکھا ہے، وہ اُسکو دیکھکر اپنے ساتھ چند اثرات لیجائیگا، لیکن اگر وہ سیب کو ہاتھ میں لیکر دیکھے گا تو اُسکے وزن کو محسوس کرے گا، اسی طرح اگر اُسکو سونگھے گا، چکھے گا، اور دانتوں سے چبائے گا تو اُس پر اور بھی زیادہ صاف اثر پیدا ہوگا جو کبھی ضایع نہ ہوسکے گا۔

اس واقعہ کی سائنس کے ذریعہ سے اس طرح معقول توجیہ ہوسکتی ہے کہ عصبی قوت کو پیدا اور ہمارے خیالات کو جمع کرنے کے لیئے نظام عصبی میں کروروں سیلز (خلئے) ہوتے ہیں جب آپ کسی بات کو یاد کرنا چاہتے ہیں تو کسی قدر عصبی قوت کا اخراج ہوتا ہے اور وہ قوت کروروں چھوٹے چھوٹے ریشوں کی مدد سے سیلز کے مختلف مجموعوں میں ہوکر پورے نظام عصبی میں بجلی کی طرح تیر جاتی ہے، نگاہ کے ذریعہ سے جو اثر پیدا ہوتا ہے اُسکو قبول کرنے والے سیلز اُن سے مختلف ہوتے ہیں جو سماعت کے اثرات کو قبول کرتے ہیں، اسی طرح دیگر حواس کے ذریعہ سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں اُنکے سیلز بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اِن کُل سیلز میں باہمی تعلقات بھی ہیں، چنانچہ اثرات کی تعداد جس قدر زیادہ ہوگی اُسی قدر مضبوطی کے ساتھ وہ آپ کے دماغ نیم شعوری میں وہ مجموعۂ اثرات جاگزیں ہوجائیگا۔"

نام اور صورت یاد رکھنے کے لئے یہ اصول خاص طور پر قابل توجہ ہے میں ایک مل کے منیجر سے واقف ہوں جنکا حافظہ معمولی تھا لیکن ملازمت کے بعد کارخانہ کے آدمیوں کے نام اور صورتیں یاد رکھنے کی انکو سخت ضرورت محسوس ہوئی - اور اس مشکل کو انھوں نے اس طرح حل کیا کہ کارخانہ کا جب کوئی ملازم اُن کے پاس کسی کام سے آیا تو انھوں نے پہلے اُس کے نام کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا، پھر اُسکو اپنے قلم سے لکھا اور بغور دیکھ لیا اِسطرح اُن کے عصبی اور بصری حواس پر ایک خاص اثر پیدا ہوا گفتگو کے دوران میں وہ اُس شخص کا نام بار بار دوہراتے تھے اور اُسکی صورت اور چہرے کی ساخت کا مطالعہ کرتے جاتے تھے، گفتگو ختم ہونے پر اُن کے ذہن میں اُس آدمی کا صاف عکس اُتر آتا تھا اور اُسکا نام بھی دماغ میں محفوظ ہو جاتا تھا - اور اب اُنکی یہ حالت ہے کہ کم از کم دس ہزار آدمیوں کے نام اور اُنکی صورت سے اچھی طرح واقف ہیں، اور مہینوں بلکہ برسوں کے بعد بھی غلطی نہیں کرتے ہیں -

جن لوگوں کو نام یاد نہیں رہتے اُسکی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ نام کو صاف طور پر سُنتے نہیں ہیں یا اُسکی طرف توجہ نہیں کرتے ہیں - غالباً اُنکی توجہ اُس آدمی کی اور باتوں کی طرف منعطف ہو جاتی ہے -

اگر آپ کو صورت یاد رہتی ہے لیکن نام یاد نہیں رہتا تو پہلا کام یہ کرنا چاہیئے کہ آپ اُس کے نام کو صاف طور پر سُنیں، پھر اُسکے نام کے ہجے کریں، اُسکے بعد دوران گفتگو میں اُسکا نام کئی بار لیں اور جب موقع ملجائے اُسکو قلمبند کر لیں، پھر اُسکو غور سے پڑھیں اور اُسکی صورت کو پیش نظر رکھیں، صورت اور نام یاد رکھنے کا یہ ایک طریقہ ہے لیکن بعد کو اور طریقے بھی بیان ہونگے ؎

اگر آپ صرف ایک اثر قبول کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کی قوت بصری طاقتور ہے بعض ماہرین نفسیات کا تو خیال ہے کہ انسان کے دماغ میں آنکھوں کے ذریعہ سے پچھتر فیصدی اثرات پیدا ہوتے ہیں "

حافظہ کو تقویت پہونچانے کا ایک اور مؤثر اور کامیاب ذریعہ توجہ ہے، بے توجہی حافظہ کو بدنام کرنے والی بدعت ہے، لوگ ایک وقت میں ایک چیز کو صاف طریقہ سے ماسکہ ([illegible]) پر نہیں لاتے، اور باتیں کرتے وقت اسکا خیال نہیں کرتے کہ کہنے والا کیا کہہ رہا ہے، بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ وہ آیندہ کیا کہے گا، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خیالات اُلجھ جاتے ہیں اور کسی ایک بات پر قائم نہیں رہتے۔ کسی خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار تعریف کرنے لگتے ہیں لیکن اُسکی تفصیل پر نگاہ نہیں رکھتے۔ کتاب پڑھتے وقت جلد جلد ورق گردانی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسکو فوراً ختم کرلیں لیکن اس کا ذرا خیال نہیں رکھتے کہ کتاب میں کیا کیا باتیں لکھی ہیں، ایسے لوگوں کی زندگی ایسے ہی غلط انداز و خیالات سے معمور نظر آتی ہے، اور جب اُن کے حافظہ کو ٹٹولا جاتا ہے تو اسمیں بہت کمی معلوم ہوتی ہے۔

مجھے صحیح دماغ اور اعلیٰ درجہ کے حافظہ کا ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جس کی قوت مشاہدہ اور قوت توجہ عمدہ نہ رہی ہو اگر آپ کا حافظہ کمزور ہے تو توجہ کی قوت کو بڑھائیے، توجہ کے معنی یہ ہیں کہ نفس معاملہ پر دماغ لڑا دیا جائے اور فروعات میں نہ پھنسنے پائے۔

صاف اور واضح تصویر لینے کے لئے کیمرے کے شٹر (Shutter) کو تنگ کر دیا جاتا ہے، حافظہ کے لیے بھی انسان کو اپنے دماغ کے شٹر کو تنگ بنانے کی ضرورت ہے، یعنی اُسکو توجہ کے استعمال کی طرف رجوع ہونا لازم ہے۔ اگر آپ کسی کی گفتگو یاد رکھنا چاہتے ہیں تو اسکے ساتھ ساتھ اپنے خیالات کو نہ دوڑائیے اور اس سے دریافت کرنے کے لئے اپنے دل میں سوالات نہ پیدا کرتے جائیے، بلکہ پوری گفتگو ختم کر لینے دیجئے۔

تمام گفتگو کو سنکر آپ جو سوال کرینگے معقول ہوگا۔ جس بات کو یاد رکھنا منظور ہو

اُس کی تفصیل اور تشریح پر نگاہ رکھیے،

ایک بنک کے خزانچی سے میری واقفیت ہے، اُن کو آدمیوں کی صورت یاد نہ رہنے کی شکایت تھی، اس لیئے انھوں نے نئے آدمیوں کی صورتوں کا تصور اپنے دماغ میں قائم کرنا چاہا، مگر وہ تصویریں دماغ سے بہت جلد مٹ گئیں، پھر انھوں نے چہروں کے خط و خال پر توجہ کرنی شروع کردی، یعنی فلاں شخص کی ناک کس قسم کی ہے، ٹیڑھی ہے یا سیدھی، چھوٹی ہے یا موٹی، پتلی ہے یا اونچی، آنکھیں نیلی ہیں یا سیاہ، چھوٹی ہیں یا بڑی، چمکدار ہیں یا بے رونق، کان بڑے ہیں یا چھوٹے، غرض کہ اس طرح چہرے کے ایک ایک حصہ پر توجہ کرنے لگے، اور اُن کو فوراً محسوس ہونے لگا، کہ جب سے انھوں نے چہرے کے خط و خال پر توجہ شروع کی اُن کے ذہن میں اُن کے واقفکاروں کی صورتیں بھی محفوظ رہنے لگیں۔

فرانس کے مشہور مصنف ہودین نے اپنے حافظہ کو ترقی دینے کی بہت آسان ترکیب نکالی تھی، وہ کھلونوں کی دوکان کے سامنے گذرتے وقت تین کھلونوں کو اپنے ذہن میں رکھ لیتے، دوسری مرتبہ چار کھلونوں کو، تیسری مرتبہ پانچ کھلونوں کو، غرضکہ اسی طرح وہ دوکان کے تمام کھلونوں کو اپنے ذہن میں محفوظ کرلینے کے عادی ہوگئے اور پھر تو اُنکی یہ کیفیت ہوگئی کہ کسی دوکان کو صرف ایک مرتبہ دیکھنا کافی تھا، اور وہ اُسکی تمام چیزوں کو یاد کرلیتے تھے۔

جو چیزیں مشاہدے میں روزمرہ آتی رہتی ہیں، ہم اُن کو بھی یاد نہیں رکھتے ہیں ہم تاش کھیلتے ہیں، لیکن ہم کتنے کھلاڑی ایسے ہیں جو یہ بتا سکیں گے کہ چاروں رنگ کے بادشاہوں میں کس کی تصویر پورے چہرے کی ہے، اور کس کی نصف چہرے کی ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ درخت سے بلی اپنے جسم کے اگلے حصے سے اُترتی ہے یا پچھلے حصہ سے؟ گائے اگلی ٹانگوں کے بل اُٹھتی ہے یا پچھلی ٹانگوں کے، یہ سوالات

بذاتہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے لیکن ان سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو ہم اکثر دیکھتے رہتے ہیں وہ بھی یاد نہیں رہتی ہیں۔

حافظہ کے لیے چوتھی ضروری چیز ایتلاف ہے جس کو ہم سب کم و بیش استعمال کرتے ہیں اور اس پر ترقی حافظہ کے کئی مروج طریقوں کا دارومدار ہے، ہم کو ایک شخص کا نام اس لیے فوراً یاد ہو جاتا ہے کہ وہ ہمارے ایک گہرے دوست کا ہمنام ہے، یا اسکا نام کسی افسانہ کے کریکٹر سے ملتا جلتا ہے، یا اسکا تعلق کسی ایسی واقعہ سے ہے جو ہمارے دل میں موجود ہے، اگر بلا وجہ بار نہ ڈالا جاے تو ایتلاف ہی حافظہ کا زبردست معاون ہے، جو غالباً آسان ترین طریقہ ہے، اور قطعی فطری بھی ہے۔

علی الصباح آنکھ کھلتے ہی ایتلاف کی زنجیر بننی شروع ہو جاتی ہے، گرم گرم بستر کا خیال آتے ہی جلد اٹھکر دفتر جانے کا ناگوار خیال آجاتا ہے۔ اور اسی کے ساتھ کئی کام یاد آجاتے ہیں جن کو انجام دینا ضروری ہے، میز پر تھیٹر کا اشتہار دیکھتے ہی اپنا تھیٹر جانا یاد آجاتا ہے، اور یہ بھی یاد آتا ہے کہ اس تماشہ میں کون سی اچھی نقل ہوئی تھی اور ہمارے دوستوں نے کیا مذاق کیا تھا! غرضکہ اسی طرح ایتلاف در ایتلاف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، اور بیحد و حساب خیالات دماغ میں آجاتے ہیں اور انکی زنجیریں بنتی چلی جاتی ہیں تا آنکہ کسی بیرونی وجہ سے وہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے، اس طریق کی لاجواب مثال الف لیلیٰ یا داستان امیر حمزہ ہے۔

ہر شخص کے دماغ میں بہت سے واقعات مضبوطی کے ساتھ جاگزیں ہوتے ہیں ایتلاف کے ذریعہ سے اسی ذیل کے بہت سے واقعات کو ہم پیدا کر سکتے ہیں، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر آسان ایتلاف ہوگا اسی قدر کم بوجھ ہمارے حافظہ پر پڑے گا۔

حافظہ میں پنجمی ضروری چیز دلچسپی ہے، اگر آپ کو حقیقی اور گہری دلچسپی ہے تو

اس طرف توجہ کا منعطف ہو جانا لازمی امر ہے۔ جن لوگوں کو نام یاد رکھنے میں دشواری ہوتی ہے وہ اُن کے نام خوب یاد رکھتے ہیں جن سے اُنکو دلچسپی ہے یا محبت ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ نے سر مہاراجہ صاحب بہادر والی محمود آباد کی خدمت میں عرضداشت پیش کی۔ اور اُنھوں نے اُسکو ملاحظہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ آپ کی درخواست پر ضرور توجہ کی جائے گی، اور دو ایک دن کے بعد اطلاع دیجائیگی، تو آپ کو ممدوح کے ایک ایک لفظ کے یاد رکھنے میں مطلق زحمت نہ ہوگی اور نہ ممدوح کا حلیہ آپ کے ذہن سے اُتر سکے گا۔

بعض لوگوں کو گیند بلّے کے کھیل سے دلچسپی ہوتی ہے اور اُن کو تمام مشہور کھلاڑیوں کے نام اور اُن کے کارنامے ازبر ہوتے ہیں مگر دو چار گھنٹے کے بعد اپنے اور ملاقاتیوں کی صورت بھول جاتے ہیں۔

ایک صاحب کے پاس عکسی تصاویر کا بڑا ذخیرہ ہے، اُن کو نہ تو صورتیں یاد رہتی ہیں، اور نہ کسی کا نام، لیکن اُن کو ایک ایک تصویر یاد ہے اور ہر صاحب تصویر کے مفصل حالات نوک زباں ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اُنکو عکسی تصاویر جمع کرنے کا شوق ہی نہیں ہے بلکہ جنون ہے۔ نپولین کو اپنے ہزاروں سپاہیوں کے نام یاد رہتے، امریکہ کے مشہور سراغرساں فرینک وِلکنسن کو کم و بیش بیس ہزار جرائم پیشہ اشخاص کے نام اور اُنکی صورتیں یاد ہیں، اس شخص کو امن پسند اشخاص سے کوئی سروکار نہیں ہے، سراغرسانی اُسکا فن ہے اور وہ اُس میں منہمک رہتا ہے، اسی وجہ سے مجرم کی ایک بار صورت دیکھ لینا اُسکے لیے کافی ہوتا ہے۔

دوکانداروں کو صورت شناسی اور نام یاد رکھنے میں اکثر ملکہ ہوتا ہے کیونکہ مال کی بکری گاہکوں پر منحصر ہوتی ہے، اور دوکاندار کو اپنا مال فروخت کرنے کے شوق میں گاہکوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

میری اس تحریر کا عملی لب لباب یہ ہے کہ جس بات کو آپ یاد کرنا چاہیں اس سے پوری دلچسپی پیدا کر لیجیے، اُسکی دلاویز خوبیوں کو تلاش کر کے نکالیئے، اور اپنے دماغ میں اسکا اثر پیدا کیجیئے، اور سوچیئے کہ اس کو حاصل کر کے یا اس سے متمتع ہو کر آپ کو کس قدر راحت اور مسرت حاصل ہوگی، ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ اسکو عمر بھر فراموش نہ کر سکیں گے۔

حافظہ کے لیئے چھٹی ضرورت سمجھنے کی ہے، اگر کسی چیز یا کسی معاملہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں تو اُسکو یاد رکھنے کی آپ سے توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔ لہذا جو بات حافظہ کو سپرد کرنی منظور ہو اُسکو پہلے اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے،

حافظہ کی ترقی کا آخری اصول انتخاب ہے، ہر بات کا یاد رکھنا انسانی قوت سے باہر ہے، اور اگر ہر بات کو یاد رکھنے کی کوشش کیجائیگی تو کچھ بھی یاد نہ رہے گا۔ لہذا آپکو چاہیے کہ احتیاط اور غور کے ساتھ صرف اُن باتوں کا انتخاب کریں جنکا یاد رکھنا ضروری ہو اور پھر اُن پر اپنے دماغ کی شعاعیں ڈالیئے۔

عام طور پر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ایک ہزار روپیہ کی قیمت کے اوزار سے آیک آنہ کا کام لینا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہم اپنے احباب کے لمبے چوڑے پتے اور اُنکے ٹیلیفون نمبروں کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ چاہیے یہ کہ کسی مناسب مقام پر اُن کو نوٹ کر لیں اور حافظہ کو زیادہ اہم اور ضروری کاموں کے واسطے محفوظ رکھیں، دنیا میں سیکڑوں ایسی باتیں ہیں جنکو بجائے حافظہ کے آپ کی یادداشت کی کتاب میں جگہ ملنی چاہیے۔ آپ کو اپنی منزل مقصود معلوم کرنی چاہیے اور یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ وہاں پہونچنے کا ذریعہ کیا ہے۔ اس کے بعد پھر صرف انھیں واقعات کو ذہن میں محفوظ کیجیئے، جن کی آپ کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے، چونکہ ہر شخص کے واقعات جداگانہ ہوا کرتے ہیں، اس لیئے اُن کے ضروری اور غیر ضروری ہونے کے بارے میں کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن آپ اگر اپنے ماحول پر نظر ڈال کر ایمانداری اور سچائی کے ساتھ ضروری باتوں کو

چھانٹنا چاہیں گے تو آپ اُن کو ضرور چھانٹ سکیں گے، اور ذہنی ترقی کی طرف آپ ایک قدم آگے بڑھ سکیں گے۔

ہوشیاری کے ساتھ اپنے حافظہ اور توجہ کو ماسکہ (دیکھو صفحہ) پر لائیے محال کے لئے ابتدا میں آرزو نہ کرنی چاہیے، اگر نام اور صورتیں یاد نہیں رہتی ہیں تو اِن کو یاد رکھنے کی اس طرح ابتدا نہونی چاہیے کہ ہر شخص کا نام اور اُسکی صورت کو یاد رکھنے کی کوشش کی جائے، اِن میں بہت سی ایسی صورتیں ہونگی جن سے آپ کو عمر بھر واسطہ نہ پڑے گا، اور شاید ہی کوئی ایسا موقع آسکے کہ وہ آپ کے کام آسکیں یا آپ اُن کی مدد کر سکیں، لہذا آپ صرف دو تین صورتوں کا انتخاب کر لیجئے اور اُنکو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش کیجئے اُن کے نام اور اُنکی خصوصیتوں کو لکھ لیجئے، دوسرے دن اُنپر نگاہ ڈالیئے) اور اپنے حافظہ میں اُنکو تازہ کیجئے اس مشق کو جاری رکھیے اور ناغہ نہونے دیجئے، چند دنوں میں اسکے نتائج پر خود آپکو حیرت ہوگی۔

اگر آپ کو شکایت ہے کہ جو کچھ آپ پڑھتے ہیں وہ یاد نہیں رہتا، تو بیکار خواندگی کو یکلخت ترک کر دیجئے اور اشد ضروری مقامات کو انتخاب کر کے نہایت توجہ کے ساتھ روزانہ پڑھیے، ہر جملہ کو پڑھکر توقف کیجئے اور دیکھیے کہ جو آپ نے پڑھا ہے وہ یاد ہے؟ اگر صاف طور پر یاد نہیں ہے تو پھر پڑھیئے، بظاہر یہ طریقہ دشوار معلوم ہوتا ہے لیکن ممکن ہے کہ آپ کے دماغ کی منتشر اور پراگندہ مشین کو درست کرنے کے لیے اس سے زیادہ اور کوئی مفید ترکیب نہو۔

بعض آدمی بہت زیادہ اور ہر وقت پڑھتے ہیں، روزانہ اخبار پڑھنے والے جو اخبار کو الف سے لیکر ے تک پڑھتے ہیں، اور علاوہ خبروں اور مضامین کے اشتہارات تک کو ایک نگاہ میں ہڑپ کر جانے کے عادی ہیں وہ اس اصول کے لحاظ سے بُرانے مجرم ہیں۔ کیونکہ اس قسم کی اخبار بینی سے حافظہ کو مدد نہیں ملتی ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو حافظہ کے مسئلہ سے دلچسپی ہے، ورنہ آپ

اس مضمون کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہ کرتے اور غالباً اس کے مطالعہ کے وقت آپ کا شوق اور آپ کی توجہ اس طرف رہی ہیں۔ پس اگر آپ صحیح طور پر اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ بہترین حالات میں آپ کا حافظہ کس طرح کام کرتا ہے تو براہ کرم مندرجہ ذیل آٹھ سوالات کے جوابات دینے کی زحمت گوارا فرمائیے۔

(۱) حافظہ کو ترقی دینے کے سات طریقوں کے کیا نام ہیں؟

(۲) اس مضمون میں نام اور صورت کو یاد رکھنے کے بارے میں جتنی ہدایات کی گئی ہیں ان کو بتائیے۔

(۳) کون سے حاسّوں کا ذکر کیا ہے جو اثرات کو نظام عصبی کے سیلز تک پہونچاتے ہیں؟ ان کے نام بتائیے۔

(۴) فرانس کے مصنف ہودن کے طریقہ کا ذکر کیا گیا ہے، وہ طریقہ کیا تھا؟

(۵) بنک کے خزانچی نے اپنے حافظہ کو ترقی دینے کے لیے کیا تدابیر اختیار کی تھیں؟

(۶) بصارت کے ذریعہ سے جو اثرات پیدا ہوتے ہیں ان کا اوسط کیا ہے؟

(۷) سُراغ رساں ولکنسن کتنے مجرموں کو فوراً شناخت کر سکتا ہے؟

(۸) اس مضمون کو پڑھتے وقت آپ نے اپنے حافظہ کو ترقی دینے کے لیے جن تدابیر پر عامل ہونے کا ارادہ کیا تھا ان کو بتائیے؟

غزل

از
مولوی سید غلام مصطفٰے صاحب ذہین حیدرآبادی

خوشدلی میں رنج بھی راحت کا ساماں کیوں نہو
لیتے ہیں لطف گلستاں ہم بیاباں کیوں نہو

کون ناظر کون ہے منظور کچھ کھلتا نہیں
آئنہ کو دیکھکر آئینہ حیراں کیوں نہو

اُسکے شمع رخ کا پروانہ ہے یہ سارا جہاں
حسن عالم سوز پر اپنے وہ نازاں کیوں نہو

ہے تصور ہی سے لطف دید و وصل دلربا
جب خیال آئے مری دنیا میں وہ مہماں کیوں نہو

اِن گناہوں پر بھی ہے یارب تیرا ہی کرم
تیری اِس احسان سے بندہ پشیماں کیوں نہو

تو ہی خالق تو ہی رازق تو ہی رب تو ہی رحیم
ساری دنیا اے خدا تیری ثناخواں کیوں نہو

رحمۃ للعالمیں کی حق نے خود کی ہے ثنا
جو خلیق ایسا ہو وہ محبوب یزداں کیوں نہو

جور ہو یا مہر دونوں کا اُسی سے ہے لگاؤ
وہ کرے ظلم و ستم بھی تو یہ احساں کیوں نہو

غم مرا مونس ہے میں غمخوار ہوں غم کا ذہین
نام کو سنکر مرے راحت گریزاں کیوں نہو

پادشاہ مر گیا، پادشاہ زندہ باد

(مترجمہ جناب حاجی محمد خاں صادق اُبوی صاحب)

جس کمرے میں بادشاہ بستر مرگ پر پڑا دم توڑ رہا تھا، وہاں کچھ بہت خاموشی نہ تھی لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا، اور وہ دبے پاؤں مضطربانہ انداز میں کانوں کان کچھ کہہ بھی رہے تھے۔

خفیف آہٹ بھی بعض اوقات گھبراہٹ پیدا کر دیتی ہے جس کی تاب بیمار آدمی مشکل سے لا سکتا ہے۔ لیکن اس اندیشہ سے کیا حاصل تھا؛ جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ اُسے اب کچھ سنائی نہیں دیتا اور نہ ہی اُس نے اپنی قوت سماعت کا کوئی ثبوت دیا تھا، ورنہ اپنی حسین و جمیل بیوی کو جو اس کے قریب گھٹنوں کے بل بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس حالت میں دیکھ سکتا تھا؛

چند دنوں تک اس بات کا بہت خیال کیا گیا کہ کمرے میں روشنی نہ آنے پائے، لیکن آخر آخری میں یہ التزام نہ رہ سکا اور پردے کھچے رہے۔

لیکن یہ اندیشہ بھی فضول تھا! جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ "وہ اب اندھا ہے" کچھ دنوں تک وہاں صرف تیمار دار ہی تیمار دار جا سکتے تھے۔ لیکن آج ہر شخص کیواسطے دروازہ کھلا تھا۔ جو در آئے۔ اب کیا مضائقہ تھا؟

جب ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ "وہ کسی کو پہچان بھی نہیں سکتا" وہ بہت دیر تک پلنگ پوش پر اپنا ہاتھ پھیلائے اس طرح پڑا رہا ہے کہ گویا وہ کسی چیز کی تلاش میں ہے، ملکہ نے جوش محبت سے بےخود ہو کر اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر دبایا۔ لیکن جواب میں گرمجوشی نہ تھی، اور یا آخر اُس کی آنکھیں،

منھ اور دل کی حرکت بند ہو گئیں۔ جو لوگ پاس کھڑے تھے آپس میں کہنے لگے "بادشاہ کا چہرہ کس قدر حسین معلوم ہوتا ہے!"

جب بادشاہ آپے میں آیا تو کمرے میں سناٹا تھا۔ اس نے دل میں کہا کہ "یہ سکوت اور یہ تاریکی کتنی مسرت آفریں ہے۔ وہ اس نئی کیفیت سے بیحد متاثر ہوا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہشت میں ہے۔

کمرہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا، رات کی ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا کے جھونکے کھلی ہوئی کھڑکی سے آرہے تھے۔ پائنتے موم بتیوں کی قطار تھی۔ اور ہلکی ہلکی روشنی کے ساتھ جل رہی تھیں۔ بادشاہ سیاہ مخمل کی چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ صرف اسکا چہرہ اور سر کھلا ہوا تھا۔ چار پانچ آدمی اس کی حفاظت کے لیے متعین تھے۔ لیکن اب وہ بھی سو گئے تھے۔

اطمینان کی یہ نامتناہی کیفیت جس کا اس کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا اس قدر گہری اور عمیق تھی کہ اس نے جنبش تک نہ کی، اور خاموش پڑا رہا۔ لیکن جب محل کے بڑے گھڑیال نے گیارہ بجائے تو اس نے کروٹ لی اور خفیف تبسم کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا وہ آپ بیتی یاد رکھتا تو کس نوع سے، جب کہ اسکا دل ہی اسکا ساتھ چھوڑ چکا تھا، اور ہوش و حواس پامال ہو گئے تھے۔ آخر اس نے عصباتی ہیجان پر قابو پا کر اس غیر منصفانہ فیصلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جو اسے ایسی حالت میں دنیا سے علیحدہ کر رہا تھا۔ جب کہ دنیا والوں کو اسکی شدید ترین ضرورت تھی۔ معاً اسے ایک آواز سنائی دی "موت کے بعد تجھے گھنٹہ بھر کی مہلت ہوگی! تجھکو اگر اس عرصہ میں تین شخص بھی ایسے مل جائیں کہ جو تیری دوبارہ زندگی چاہتے ہوں، تو اس دنیا میں پھر زندہ رہ سکتا ہے۔"

موت نے اُسے ایک گھنٹہ کی قلیل مہلت دی تھی۔ لیکن وہ اس تھوڑی میعاد سے خوف نہ ہوا۔ کیونکہ وہ ایک نیکدل حکمراں تھا، اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کے واسطے شب و روز سرگرم عمل رہ چکا تھا۔ اُسکا قلب مطمئن تھا۔ لیکن اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ زندگی نہایت شیریں ہے۔

اس سے قبل وہ اس عشرت کا اندازہ نہ کرسکا تھا۔ کیونکہ وہ خود غرض سمجھتا تھا اُس نے اپنے ایک غیر تکمیل یافتہ کام کے خلاف نیا قانون نافذ پاکر بہت رنج ہوا، وہ کمرے سے نکل کر وہاں پہونچا۔ جہاں محافظین گہری نیند سو رہے تھے گئے بعض چیزوں میں کچھ تغیر تبدل بھی نظر آیا۔ وہ صحیح طور پر خیال کرنے لگا کہ میری کاوشیں کچھ زیادہ وقیع نہیں ہیں، مجھ سے بہتر آدمی اس وسیع و عریض دنیا میں موجود تھے، جو مجھ سے کہیں زیادہ خوش اسلوبی کے ہاتھ کام سرانجام دے سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اب دنیا و مافیہا اُسے وسیع و عریض بھی نظر آنے لگتی تھی، اُسے اپنے گھر اور محل سے بیحد محبت تھی، رات ہی سے اُسے یہ سُونے دکھائی دینے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد اُسے معلوم ہوا کہ اُسکا ملک اور گھر اپنی حالت پر بدستور قائم ہیں۔

وہ دروازہ سے نکلکر ایک لمحہ کے لیئے ہچکچایا کہ پہلے ملکہ کے پاس نہ جانا چاہیے۔ پھر وہ ملکہ کے غم و اندوہ کے خیال سے کانپ گیا، وہ اس سے ملنا بھی نہ چاہتا تھا جب تک وہ خود اُس سے ہم آغوش ہوکر خوشی کے آنسو نہ بہائے۔

اب اُس نے اندازہ کیا کہ مہلت کی میعاد صرف ایک گھنٹہ ہے اور بارہ بجنے پر ہیں دوبارہ جامۂ زندگی پہن لونگا۔ موت اور موت کی کارفرمائیاں خواب و خیال ہوجائیں گی ....

بادشاہ پھر اپنے بستر مرگ کے پاس آیا، جس سے وہ علیحدہ ہوچکا تھا۔ اور

کہا کہ "میں خوف کے باعث ابھی کچھ نہیں کرسکا"

یہ کہکر وہ معاہدہ کی شرط پر ہنسنے لگا - سامنے چاندنی میں اس کا شہر جگمگا رہا تھا
اُس نے اطمینان کے لہجہ میں کہا "نہیں نہیں میں تین ہزار آدمی ایسے اسے تلاش کرونگا،
جو دوبارہ میری زندگی چاہتے ہونگے - تمام ملک میرا پرستار اور دلدادہ ہے" جونہی
وہ دروازہ سے گذرا، زینہ پر ایک بچی نظر آئی جو رو رو کر چلا رہی تھی -

ایک محافظ نے رک کر کہا "ننھی کیا بات ہے، روتی کیوں ہو؟"

بچی نے سسکی لے کر کہا "اماں اور ابا محل میں گئے ہیں - ہمارا نیک دل بادشاہ
مرگیا ہے اور میری گڑیا بھی ٹوٹ گئی ہے، اور وہ ابھی واپس نہیں آئے - میں تھک گئی
ہوں -

کاش! کہ ہمارا بادشاہ دوبارہ زندہ ہوجائے" یہ کہکر وہ پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی - لیکن بادشاہ اس گفتار سے کچھ زیادہ مسرور نہ ہوا - اُس نے کہا کہ
میری رعیت میں یہ پہلی بچی ہے جو مجھے دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتی ہے"

بادشاہ لاولد تھا - وہ ٹھہرتا اور اس بچی کو چمکار کر بہلاتا - لیکن کئی کام ضروری
تھے - اور وقت کم تھا -

وہ اپنے ایک دوست کے گھر کی طرف روانہ ہوا جو اُسے بہت عزیز تھا اور
اُسکی انتہائی ناامیدی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے لاکر کہنے لگا "غریب ایاز
مجھ پر جو گذرتی ہے، کچھ نہ پوچھ! میں مسرور ہوں کہ تو اس دنیا میں موجود ہے
ورنہ میں اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لاسکتا"

جب وہ اپنے دوست کے گھر کے صحن میں آیا تو لوگ شمعیں ہاتھوں میں لیئے
آجا رہے تھے، اور گھوڑے سازو سامان سے آراستہ و پیراستہ کیے جا رہے تھے
جن کی وجہ سے کچھ گھبراہٹ پھیل گئی تھی، مگر اُسے اپنا دوست نظر نہ آیا جسے وہ

ایک بار نہیں ہزار بار دیکھ چکا تھا۔ تلاش یار میں وہ ایک ایک کمرے میں گیا۔ یکایک وہ اس خیال کے آتے ہی تھرا گیا "کہیں ایاز میرے غم میں جان تو نہیں دے چکا" آخر کو وہ اُس خاص کمرے میں آیا جہاں وہ کئی بار مل کر معروفیت کے لمحے مسرت و انبساط کے ساتھ کاٹ چکے تھے۔ لیکن اُسکا دوست یہاں بھی موجود نہ تھا۔ قیاس اور قرینہ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے۔ کتابیں اور کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ فرش پر ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ اور ایک چھوٹی سی تصویر بھی پڑی ہوئی تھی۔ جس کا چوکھٹا گرنے سے ٹوٹ گیا تھا۔ بادشاہ نے اُسے اُٹھا کر دیکھا تو وہ خود اسی کی تصویر تھی! اُس نے تصویر کو اُٹھا کر پھینک دیا، آگ روشن تھی۔ کاغذ کے ٹکڑے کچھ جل چکے تھے اور کچھ ابھی جلنے سے بچ رہے تھے، اُنھیں اُٹھا کر دیکھا تو یہ اُس کے اپنے آخری خط کے پُرزے تھے۔ اس خط میں اُسنے اپنی ایک خاص تجویز پیش کی تھی۔ افسوس کہ موت نے مہلت نہ دی اور تجویز دل کی دل میں رہگئی۔

اُس نے اپنے خط کے پُرزوں کو آگ کے سپرد کیا ہی تھا کہ دو آدمی باتیں کرتے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک عورت تھی اور ایک مرد تھا۔ جو بوٹ اور مہمیز لگائے ہوئے تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی دور و دراز سفر سے واپس آیا ہے۔

اُس نے پوچھا "ایاز کہاں ہے؟"

عورت نے جواب دیا "وہ نئے بادشاہ کی خدمت میں باریاب ہونے کیلئے گیا ہے۔ آپ کے خیال کے مطابق ہم بیحد پریشان ہیں۔ یہ نیا بادشاہ اُس قطع و قماش کا انسان نہیں ہے جیسا کہ وہ مرنے والا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمیں اُس سے تنفر بھی تھا۔ ایاز کو پچھلے رسوخ کے باعث سے دربار میں بہت سی

دقتوں کا سامنا ہو رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ جلد یہ کانٹے صاف کرے گا۔ اس نے یہ تو ابھی سے اعلان کر دیا ہے کہ مجھے اِن فضول اصلاحات کے نفاذ میں مرحوم بادشاہ سے ایک حد تک خصوصیت تھی۔ لیکن خیالات کا معاملہ جدا چیز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ لوگوں کے جذبات و حسیات کا خیال تک نہیں کرتے۔ لیکن ہم لوگوں کو جمہوری آزادی کا ہمیشہ احترام رہا ہے۔ اس لیے بادشاہ کی موت کے بعد ایاز یہاں سے فوراً چلا گیا۔ اب میں اُسکی سواری کا انتظام کر رہی ہوں۔ مرد کو بادشاہ نے پہچان لیا تھا وہ اُس کا سفیر تھا۔ مرد نے کہا، "بالکل بجا ہے میں بھی اس کی تقلید کرونگا۔ آپ اور ہم لوگ ہی تو ملک کے سچے بہی خواہ ہیں۔ یہ نوخیز بچہ تو سیاست کے نام سے بھی آشنا نہیں۔ ہاں مرنے والے نے جنگ کے خاتمہ کے واسطے ایسے وقت میں مجھے مجبور کیا تھا کہ جس کا نتیجہ ملکی مفاد کے لیے کسی طرح سے بھی اچھا نہ تھا۔ میں مسرور ہوں کہ اب جنگ جاری رہے گی۔ اگر وہ ہم میں موجود ہوتا تو فوج کی ترقی کا سوال تک نہ اُٹھتا۔"

بادشاہ یہاں کچھ زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکا، اور کہنے لگا "میں اپنی رعایا کے پاس جاؤنگا، جنھیں میرے جانشین سے کچھ زیادہ سروکار نہیں بلکہ اُسکے تخت نشین ہوتے ہی میرے دیئے ہوئے حقوق و مراعات بھی اُن سے چھین لیے جائیں گے۔"

وہ آگے بڑھا تو گھڑیال نے سوا گیارہ بجائے۔

وہ ایک شریف النفس اور نیک دل حکمراں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی مملکت کے غریب طبقہ سے بھی واقف تھا۔ وہ ایک بار نہیں کئی بار بھیس بدلکر اُس طرف جا چکا تھا، اُنکی مفلسی سے متاثر ہو کر اُسنے وہ رعایتیں کر دی تھیں جو اس سے قبل کبھی عالم وجود میں نہ آئی تھیں۔

اُس معدی بخار کے چھٹنے کی جگہ سے، جو اُسے قبر میں لے گیا تھا کوئی بھی واقف نہ تھا۔ لیکن بخار کے متعلق خود اس کا اپنا شبہہ نہایت قوی تھا۔ یعنی انھیں افلاس زدہ لوگوں میں جانے سے وہ اس مرض کا شکار ہوا تھا۔ چنانچہ اُب بھی اُس نے سیدھا اُسی طرف کا رُخ کیا اور مسکرا کر کہا "اب مجھے کسی قسم کا بخار نہیں ہو سکتا ہے۔ ان کے گھر اُسی طرح خستہ و خراب حالت میں تھے اور لوگ ویسے ہی بیمار اور میلے کچیلے تھے۔ اگرچہ وقت زیادہ گزر چکا تھا۔ لیکن لوگ ابھی بازار میں جوق در جوق اسی کے متعلق باتیں کر رہے تھے اور اُسی کا نام برابر لیا جا رہا تھا سب سے زیادہ لطف انگیز باتیں اسکی بیماری کا تذکرہ اور اُس کے جنازے کے کوائف تھے۔

ایک معمولی سے شراب خانہ میں پانچ سات آدمی گول میز کے گرد بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بادشاہ ان کی باتیں سننے کے لیے رُکا۔ ایک آدمی کو جسے وہ بخوبی جانتا تھا کہنے لگا "لو خوب چھٹکارا ہوا ایسے بادشاہ سے کیا فائدہ جس نے فراخدلی اور کشادہ پیشانی کے ساتھ کبھی ایک اٹھنی بھی خرچ نہ کی۔ اس قسم کے مصارف سے تجارت کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔ یہ نوخیز بچہ اس قطع و قماش کا نہیں ہے۔ اب تو خوب روپیہ اچھالینگے۔

دوسرے نے بات کاٹ کر کہا "وہ تنگ دل انسان تھا اور خواہ مخواہ دخل در معقولات دیا کرتا تھا۔ اُسے کیا حق حاصل تھا کہ ہمارے معاملات میں اُلجھا کرے۔

ہمیشہ اُسکی بارگاہ سے گھروں اور مکانوں کی صفائی کے احکام جاری ہوتے تھے۔ اوّل تو بادشاہ و بادشاہ کی کوئی ضرورت نہیں اور اگر ہو بھی تو ایک ایسا نوجوان ہونا چاہیے جو اپنی جورو سے دب کر نہ رہے اور کم سے کم شراب،

مگر اصفہانی شراب کا دلدادہ ضرور رہو۔"

چوتھے نے چلّا کر کہا "اب تو پھانسی وانسی کی سزا بھی موقوف ہونے لگی تھی۔ جس کا مدعا محض یہ تھا کہ قیدی مدت العمر جیل خانوں میں پڑے سڑا کریں اور ان سے سخت کام لیئے جائیں۔"

اس وقت بادشاہ کا سب سے بڑا دشمن بھی گالیاں دیتا تو شاید وہ اتنا اذیت کوش نہ ہوتا۔ لیکن بادشاہ اِن الفاظ کی تاب نہ لا سکا۔

جب وہ یہاں سے رخصت ہوا تو گھڑیال ساڑھے گیارہ بجا چکا تھا! وہ سیدھا اُس قیدخانہ میں پہونچا، جہاں پھانسی پانے والے محبوس تھے، وہ خوش ہوا کہ ابھی پھانسی کی سزا موقوف ہوئی تھی۔ اِس کلبۂ احزاں میں صرف ایک بستہ قد انسان موجود تھا۔ جو اپنے گھٹنے پر کاغذ رکھ کر کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ بادشاہ اُسے ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ لیکن اَب خصوصیت سے دیکھنا شروع کیا۔ اسی اثنا میں داروغہ جیل اور مجلس وزرا کے صدر اول آ گئے۔ جن کے ساتھ بادشاہ کو بعید اُنس تھا قیدی نے گردن اُٹھا کر کہا "میرے لیئے تو کل کا دن مقرر تھا" ساتھ ہی قیدی نے محسوس کیا کہ یہ کہنا کہیں بُزدلی پر محمول نہ کیا جاے۔ اسلیئے کہنے لگا "بہر کیف میں ہر لمحہ تیار ہوں، کیا آپ یہ خط میری بیوی تک پہونچا دینگے۔"

مجلس وزرا کے صدر اول نے متانت کے ساتھ جواب دیا "بادشاہ مر چکا ہے، تمھاری سزا بھی معاف کر دیجائے گی۔ کیونکہ نئے بادشاہ کے خیالات کچھ اور ہیں۔"

قیدی نے متحیر ہو کر پوچھا "بادشاہ مر چکا ہے .... ؟"

"جی ہاں بادشاہ مر چکا ہے۔"

قیدی نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر کہا "میرے دل میں اسکا قدر اور احترام ہے، کچھ بھی ہو وہ ایک بادشاہ تھا۔ میرے ساتھ اسکا برتاؤ شریفانہ رہا۔ میری طرح اسکی بیوی بھی نوجوان ہے

کاش کہ وہ ایک بار پھر زندہ ہو جائے "

یہ کہکر الماس کے نگینے توڑنے لگا۔

جب بادشاہ زندان سے نکلا تو گھڑیال نے پونے بارہ بجائے۔ اُس نے دشمن کا رحم ایک دوست کے تنفر سے کہیں زیادہ ناقابل برداشت پایا۔ وہ اس ذلت اور رسوائی کے خیال سے زمین میں گڑ گیا، حقیقتاً ایک ایسے شخص کی وساطت سے زندگی کا دوبارہ حصول اسکے لیۓ باعث ننگ تھا۔ بہرکیف وہ ایک عجیب تھا۔ اسلیے شریفانہ خیالات سے مسرور رہوا۔ اسنے اپنے حالات پر تبصرہ کیا اور کہا "میری کاوشوں کا اچھا صلہ ملا محبت اور وفاداری کا اعتماد محض ایک خواب تھا وہ بھی پریشان جن لوگوں کے واسطے میں آمادہ کار تھا، افسوس! کہ انمیں اتنی بھی صلاحیت نہ آئی کہ وہ اصلاح ہے سکیں۔ میرا حلقۂ احباب ایک فیاض دشمن اور ایک بیوقوف ننھی بچی تک محدود ہے۔ ایسے عالم میں زندگی کی تمنا بیسود ہے۔ میرے لیے بہتر ہوگا کہ میں صبر و سکون کے ساتھ موت کے خلاف تگ و دو چھوڑ دوں۔ مجھے سبق مل گیا ہے میں اب اطمینان کی گہری نیند سوؤنگا۔ تقدیر کا فیصلہ برحق اور درست ہے۔ کیا ہوا اگر میری رعیت بے وفا اور جھوٹی ہے ؟"

اب وہ ٹھنڈے دل سے غور و خوض کر رہا تھا!

چاند بادلوں میں چھپ گیا اور سردی شدت کے ساتھ تیز ہو گئی، اُسے اپنی بیکسی اور تنہائی کا احساس ہونے لگا اور دل خود بخود بیٹھنے لگا۔

"در حقیقتاً میری کسی کو پرواہ نہیں ہے!"

اب وہ تلطف آمیز کرم کے ساتھ دنیا کی ہر چیز قربان کرنے کو تیار تھا۔ اور اعتراف محبت کا بیحد متمنی تھا۔

وقت مہلت میں ابھی کچھ لمحے باقی تھے اور یہ انتظار اسے بیحد شاق تھا۔ لیکن وہ مطمئن تھا کہ ابھی حقیقی مسرت اسکے لیۓ دنیا میں موجود تھی ..... مگر آہ یہ محض فریب خیال تھا!

موجودہ تلخ تجربہ کی بنا پر وہ اپنی بیوی کے دروازہ پر رکا اور کشمکش میں پڑ گیا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں؟ ممکن ہے کہ یہاں بھی امید کو پیام مرگ مایوسی ملے۔ میرے لیے بہتر ہوگا بغیر اسکو اطلاع کیے رخصت ہو جاؤں۔ مگر اسکو یہ خیال پسند نہ آیا کیونکہ وہ دنیا میں کبھی خوف زدہ نہ ہوا تھا۔ وہ کمرے میں گھس گیا سامنے آگ کے قریب منہ چھپائے اسکی ملکہ بیٹھی تھی اور اسکے لمبے لمبے بال پریشان تھے۔ پہلی نظر میں اسنے صحیح طور پر محسوس کیا "میرا خوف فضول ہے!"

اسکی انگلی میں بادشاہ کی دی ہوئی انگوٹھی ابتک موجود تھی وہ اسکو کبھی جدا نہ کرتی تھی اس انگوٹھی کا نگینہ چمک رہا تھا۔ اور کمرہ میں صرف اسی نگینہ کی روشنی تھی!

بادشاہ کی دلی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنی بیوی کی تسلی کر سکے۔ ساتھ ہی وہ متحیر تھا کہ اس کی سہیلیوں نے اُسے کیوں تنہا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ یہ ماتم کی پہلی رات ہے۔

ملکہ خاموش بیٹھی خیالات کے جال بن رہی تھی۔ بادشاہ نے دل میں کہا "کیوں نہ اسکا نام پکار کر اسکی دنیائے الم برباد کر دی جائے؟" لیکن ایک اجنبی آواز نے بادشاہ کو چونکا کر دیا۔ دیوار میں ایک خفیہ دروازہ تھا جسکا علم ملکہ اور بادشاہ کے سوا کسی اور کو نہ تھا۔ وہ خفیہ دروازہ کھلا اور ایک شخص ملکہ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

ملکہ نے اپنی انگلی لبوں پر رکھی جسکا مقصد تھا کہ نو وارد بالکل خاموش رہے۔

پھر اس نے اپنی باہیں پھیلا کر اسکو سینہ سے لگا لیا ....

ملکہ نے کہا "میں خوش ہوں کہ تم آ گئے۔ مرتے وقت مجھے اسکا ہاتھ تھامنا پڑا۔ اب میں تب تنہا بیٹھی ہوئی اس خوف سے کانپ رہی تھی کہ کہیں اسکی روح بھوت بنکر مجھ پر سوار نہ ہو جائے۔ شکر ہے وہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ اب ہمارے دن خوشی سے کٹیں گے" یہ کہکر اسنے اپنی انگوٹھی اتار کر اس آدمی کو پہنا دی۔ ....

جس وقت گھڑیال نے بارہ بجائے محافظین چونک کر اٹھ بیٹھے۔ مگر بادشاہ کی لاش اسی طرح سے رکھی تھی البتہ اسکے چہرہ کی حالت مسخ ہو گئی تھی۔ محافظین آپس میں کہنے لگے "اب ملکہ کو اسکا چہرہ نہ دکھانا چاہیے"

(میری کالرج)

غزل

جناب صدق صاحب جائسی

کیا تیر تھے چھپے ہوئے چشمِ سیاہ میں — تڑپا دیا کسی نے مجھے اِک نگاہ میں

بھر دی ہے کوٹ کوٹ کے شوخی نگاہ میں — اِک برق کوندتی ہے تری جلوہ گاہ میں

کیونکر نسیم کوچۂ جاناں کو دوں خبر — مثلِ غبار کب سے پریشاں ہوں راہ میں

ظالم یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہوئی — اُف اُف میں رات کٹتی ہے دل کی آہ آہ میں

کہتے ہیں آکے دل میں تصور بھی شرط ہے — ہم بھی کمی کرینگے نہ اس رسم و راہ میں

انجان بنکے دوست سے اک دن نشانِ دوست — جی چاہتا ہے چھیڑ کے پوچھوں میں راہ میں

کیا بد نصیب دل ہے کہ اس با وفا کی قدر — میری نگاہ میں نہ تمھاری نگاہ میں

سننے لگے ہیں صدق کے اشعار بزم میں
آنے لگا ہے لطف انھیں آہ آہ میں



یمن کے قدیم آثار اور علمائے یورپ

ایک اطالوی مستشرق کے لیکچر کا خلاصہ

از

جناب مولوی محمد حسین صاحب حسّان

یمن کی سرزمین کا چپہ چپہ قدیم کھنڈرات کتبات و آثار سے لبریز ہے جو وہاں کی قدیم تاریخ تہذیب و تمدن کی نمایاں دلیل ہے۔ اہل یورپ نے ان کتبات و آثار اور ان کے ذریعہ یمن کی قدیم تاریخ کو برافگندہ نقاب کرنے کیلئے جو کوششیں صرف کی ہیں تلاش و جستجو میں جس طرح چند در چند مصائب و تکالیف برداشت کی ہیں اور تمام مشکلات موانع پر قابو حاصل کرکے جسطرح کامیابی حاصل کی ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ترقی یافتہ قومیں علمی تحقیقات میں کسقدر شغف رکھتی ہیں آج کی صحبت میں ہم ان زندہ دل اہل یورپ کی سعی و کاوش اور جد و جہد کا تذکرہ کریں گے جو گوناگوں مشکلات کا سامنا کرکے یمن میں پہونچے ہیں اور وہاں زبردست اور اہم تاریخی انکشافات کئے۔

بلاد یمن اور حضر موت بحر احمر کے ساحل اور خلیج عدن پر واقع ہیں اور اس موقع پر ہونیکی وجہ سے ان کو بہت بڑی تجارتی اہمیت حاصل تھی اکثر ہندوستان اور دیگر ممالک کے درمیان آنے جانے والی جہازات اور کشتیاں یمن سے ہو کر گذرتی تھیں، سولھویں صدی عیسوی میں یورپ کے جہازات بھی اکثر اسی طرف سے ہو کر گذرتے تھے۔

لودریکو قارملتیا اہل یورپ میں پہلا شخص جو بلاد یمن میں داخل ہوا وہ لودریکو قارملتیا ہے جسوقت وہ عدن میں آیا وہاں کے ایک رئیس نے گرفتار کرلیا اور مہینے تک قید رکھکر چھوڑ دیا اس قید سے رہائی پانے کے بعد اس نے صنعا کا

سفر اختیار کیا پھر وہاں سے وہ جنوب کی طرف لوٹا ظفار ، اور تعز کی سیاحت کی پھر زبید اور بحر احمر ہوتا ہوا اٹلی کی طرف واپس گیا وہاں جاکر اس نے مشرق کے حالات میں ایک زبردست کتاب (سفرنامہ) لکھی اور یمن کے حالات کے لئے ایک جز مخصوص کردیا۔

ڈی لاغریلو دیبیر

یہ دوسرا سیاح ہے جو ۱۷۱۲ء میں بلاد یمن میں داخل ہوا لیکن اس نے یمن کے بہت تھوڑے حصہ کی سیاحت کی وہ ایک فرانسیسی جہاز پر ہندوستان سے آرہا تھا جو مخا کے بندرگاہ میں لنگر انداز ہوگیا۔ امام یمن ان دنوں بیمار تھا۔ اسے جب خبر ہوئی تو اس نے فوراً جہاز کے طبیب ڈاکٹر کو بلا بھیجا سیاح نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ڈاکٹر کی معیت اختیار کری، اور شہر مواہیب[1] تک جہاں اسوقت امام یمن قیام پذیر تھا اسکے ساتھ رہا۔ اس نے اس مختصر سی سیاحت کا چھوٹا سا سفرنامہ بھی لکھا۔

میخائلس کی مہم

میخائلس ایک جرمنی عالم عبرانیوں کے آثار اور توراۃ کے نسخوں اس کی اصلی اور شروح کے متعلق بحث و تحیص میں مشغول تھا کہ اس کے دل میں مشرق سیاحت اور وہاں کے عادات و اخلاق رسم و رواج تاریخی و جغرافی حالات حیوانات و نباتات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا خصوصاً توارۃ میں یمن ملوک یمن اور وہاں کے تمدن و تہذیب اکثر مقامات پر تذکرہ دیکھکر اس کے خیال کو اور تقویت ہوئی اور یمن جانے کے لئے ایک مہم ترتیب دینے کی تجویز اس کے ذہن میں آئی اور اس تجویز کو اس نے شاہ ڈنمارک کے سامنے پیش کیا جس نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ اور اسے اس مہم کی ترتیب کا حکم دیا۔ اس نے جرمن۔ سوید اور ڈنمارک سے پانچ علما کو منتخب کیا جن میں کارسین نیبر

[1] ذمار کے قریب ایک شہر تھا یمن کا امام اس وقت امام مہدی محمد بن احمد بن الحسن تھا ۱۰۴۸ھ (۱۶۳۸ء) میں پیدا ہوا اور رمضان ۱۱۳۰ھ ( ) میں وفات پائی مواہیب کے قلعہ میں دفن کیا گیا (ترجمہ)

ڈنمارک کا فوجی افسر اور فورسکل ([illegible]) سویڈی ماہر نباتات بھی تھے۔
۱۷۶۱ء میں یہ مہم قسطنطنیہ اور وہاں سے قاہرہ گئی اور قاہرہ میں اتنی مدت تک قیام کیا کہ سویڈی ماہر نباتات نے مصر کی نباتات کے متعلق ایک کتاب لکھی، ۱۷۶۳ء میں یہ لوگ گئے اور یمن میں داخل ہو کر صنعا تک چلے گئے، اور مہم کے دو ارکان مر جانے کے بعد وہاں سے مخا چلے آئے۔ پھر ہندوستان کی طرف سفر کرتے وقت دو رکن اور مر گئے اور صرف نیبہر باقی رہ گیا۔ اس نے وطن واپس ہونے کے بعد دو اہم کتابیں لکھیں ایک جزیرۃ العرب کے حالات میں اس کتاب میں اس نے تمام معلومات کو ترتیب دیا جنھیں سواحل بلاد میں بیٹھکر جمع کیا تھا، دوسری کتاب صرف بلاد یمن کے حالات میں لکھی تھی اپنی سیاحت کے دوران میں حمیری کتبوں سے مطلع نہ ہوا البتہ لوگوں نے بتایا کہ اس قسم کے کتبے ظفار میں پائے جاتے ہیں جو یریم سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔

سٹزن Seetzen

نیبہر کی کتاب نے ایک جرمنی عالم سٹزن کو جس نے اپنی زندگی کا کافی حصہ قیصر روس کی خدمت میں بسر کیا تھا مشرق اور یمن کی آثار کی تفتیش پر آمادہ کیا اس نے شام اور فلسطین کا سفر کیا اور ان دونوں کا ایک سفر نامہ لکھا پھر یمن کا قصد کیا اور ۱۸۱۰ء میں حدیدہ گیا اور مسلمان ہو گیا حدیدہ سے صنعا گیا وہاں سے جنوبی سمت کا رخ کیا اور وہی راستہ اختیار کیا جو نیبہر نے اپنی کتاب میں بیان کیا تھا یہاں تک کہ ذمار پہونچگیا اور موضع حذافہ کا پتہ دریافت کیا لیکن اس اطراف کے لوگ کچھ نہ بتلا سکے کیونکہ اس گاؤں کا صحیح نام نساف تھا، وہ برابر جنوبی سمت بڑھتا چلا گیا اور ظفار پہونچ گیا وہاں اس نے تین کتبے پائے جن میں ایک خرید لیا دوسرا بلند مقام پر تھا جہاں اس کی رسائی نہ ہو سکی اور تیسرے کو وہاں سے جلد منتقل ہو جانیکی وجہ سے نقل نہ کر سکا پھر ایک گاؤں کی مسجد میں جو ظفار سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر تھا، پانچ کتبے پائے جن میں سے تین پر بلندی کی وجہ سے اس کی رسائی نہ

ہو سکی دو کتبوں کی نقل لیلی اور انھیں یورپ بھیجدیا۔ یہ اولین حمیری کتبے تھے جو یورپ میں داخل ہوئے نیبھر نے دوسرے مقامات کی بھی سیاحت بھی کی مگر بعد میں وہ مفقود الخبر ہو گیا اور نہیں معلوم کہ کہاں مرگیا۔

حکومت بمبئی کا جہاز

نیبھر کے پچیس برس بعد تک یمن کے دوسرے کتبوں کی طرف توجہ نہیں کی گئی، البتہ سنہ ۱۸۳۰ء میں حکومت بمبئی (ہندوستان) نے سواحل یمن کی جانب وہاں کے نقشے مرتب کرنیکی غرض سے اپنا ایک جہاز بھیجا اور اس جہاز نے سنہ ۱۸۳۳ء میں حضرموت کے ساحل حصن الغراب کے سامنے لنگر ڈال دیا، جہاز کے افسروں کو جنمیں سے ایک افسر کا نام ولسٹد ([illegible]) ہے۔ حصن غراب کے پہاڑ میں کچھ کھنڈرات نظر آئے جنکی وجہ سے ان کے دل میں پہاڑ پر چڑھنے کا شوق دامنگیر ہوا جب وہ چوٹی پر پہونچے تو انھیں کثرت سے قدیم آثار ملے جنمیں عظیم الشان برج بھی تھے جو غالباً اس محفوظ ترین قلعہ کے دروازے تھے جو پہاڑ کی بلندی پر قائم تھا وہاں انھوں نے دو کتبے دیکھے جنکے حروف کو حبشی زبان سے مشابہ پایا اور حمیری سمجھکر نقل کرلیا اور یورپ واپس جاکر ان کتبوں کو شائع کردیا۔

دوسرے سال اس جہاز نے پھر سواحل یمن کا قصد کیا ساحل پر اتر کر الحاف چلے گئے جہاں ان کو بتایا گیا کہ یمن کے اندرونی حصہ میں بہت سے کھنڈرات ہیں جنمیں کثرت سے کتبے پائے جاتے ہیں، یہ سنکر انھوں نے اندرونی مقامات میں جانیکا تہیہ کرلیا اور نقب الہجر کے خرابات میں ایک پہاڑ کی اس بلند مقام پر پہونچگئے جو وادی میفعہ کیجانب مائل ہے تعجب انگیز امر یہ ہے کہ اس پہاڑ کے نیچے کی تہائی حصہ کی مرتفع میدان کو عظیم الشان برجوں کی دیوار احاطہ کئے ہوئے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قلعہ کی شکل میں ایک زبردست شہر آباد تھا جسکے جنوب و شمال میں دو دروازے تھے ولسٹد وہاں داخل نہ ہوسکا لیکن بعض کتبوں کو نقل کرلیا اور اپنے ساتھ یورپ میں لیتا آیا لیکن کتابت غیر واضح ہونیکی وجہ سے علما اس سے مستفید نہ ہوسکے۔

ولیسٹڈ نے حصن غراب میں جن چیزوں کا انکشاف کیا ان میں عمدہ اور بہترین بنے ہوئے نقشے بھی تھے جن کے نشانات سرخی سے رنگے ہوئے تھے اس کے علاوہ دوسری تحریروں کا پتہ چلایا جنھوں نے حمیری تحریر کا راز معلوم کرنیکا دروازہ کھولدیا۔ اور مسٹر ولیلم جسنیوس [illegible] امیل رودجر Emil Rodiger نے انکے مطالعہ کرنے میں بہت جد و جہد کی دونوں نے سنہ ۱۸۴۱ء میں ان خطوط کی تفسیر میں ایک رسالہ شائع کیا وہ ان کے بہت ہی کم الفاظ سمجھ سکے، رودجر نے دوسرے سال پھر سخت کوشش کی اور اس مرتبہ وہ نصف کتبوں کی تشریح میں کامیاب ہوگیا۔

سر کروٹنڈن Cruttenden

جولائی اور اگست سنہ ۱۸۳۶ء میں ایک انگریز افسر سر کروٹنڈن نے مخا سے صنعا کا قصد کیا اسے شہر کے راستہ میں اور منزلوں میں سفید سنگ مرمر کے پانچ کتبے ملے جو مارب سے حاصل کئے گئے تھے ان میں سے دو برونز (لوہے تانبے جست سے مخلوط دھات) پر کھودے ہوئے تھے ان دونوں کی اس نے پوری نقل لیلی اور یورپ بھیجدیا مسٹر رودجر نے ان دونوں کتبوں سے بہت کچھ فائدہ اٹھایا۔ مگر بقیہ کتبوں کی وہ نقل نہ لے سکا کیونکہ وہ امام یمن کے محل میں گویا بالکل نظر بند ہو رہا تھا، مگر نظر بندی و قید دوسری طرف مفید بھی ثابت ہوئی اس محل سے متعلق باغ میں ایک مرمرین مجسمہ کے سر کا پتہ چلایا جو بلاد مارب سے لایا گیا تھا اس نے اسے حاصل کر کے لندن بھیجدیا یہ سر اب تک لندن کے متحف (عجائب خانہ) میں موجود ہے۔

کروٹنڈن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مارب کے عرب سونے کے مربع ٹکڑے صنعا میں لاکر فروخت کرتے ہیں اور بعض مقامات میں جب شدت کی بارش ہوتی ہے تو پانی کے ساتھ جواہرات بھی بہ کر آجاتے ہیں جنکو عرب کے دیہاتی اٹھا لیتے ہیں اور یہ تمام چیزیں قدیم یمنی تہذیب و تمدن کے زبردست ثبوت ہیں

توماس یوسف ارنڈ Thomas Joseph Arnaud.

فولجانس فرنل Fulgence Fresnel

سنہ ۱۸۴۳ء تک یمن میں حمیری

کتبوں کا انکشاف ان کی تعداد پندرہ سے آگے نہ بڑھ سکی ساتھ میں انکی تحریر نہایت غیر واضح تھی جس کی وجہ سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں حاصل کیا جاسکا بعض بالکل ناقص تھے، مگر ۱۸۴۳ء میں توماس اور نورڈ کی سعی مشکور سے بہت سے یمنی آثار اور کتبوں کا انکشاف ہوا جس کی وجہ سے ہماری معلومات میں بہت ترقی ہوگئی۔

یہ شخص پہلے مصری فوج میں کمپونڈر تھا وہاں سے ۱۸۴۰ء میں صنعا چلا گیا اور امام یمن کے یہاں اس خدمت پر مامور ہوگیا، اس اثناء میں وہ مارب کے آثار اور کتبوں کے متعلق بہت سی خبریں سنا کرتا تھا، کچھ دنوں بعد وہ یہاں سے بھی علیحدہ ہو کر جدہ چلا گیا، وہاں اُسکی فرانسیسی مستشرق فولجانس فرنل سے ملاقات ہوئی، مستشرق مذکور ایک طویل عرصہ تک مصر میں قیام پذیر رہا، وہاں اس نے عرب ان کی زبان ان کے حالات ان کی تاریخ اور انکی تصنیفات کی جانب پوری توجہ صرف کی اور اغانی اور عقد الفرید جیسی بہترین عربی کتب کا ذخیرہ جمع کیا۔ اس وقت وہ نہایت جدوجہد اور کاوش سے یمن اور حضرموت سے حجاز آنیوالے لوگوں سے ان دونوں مقامات کے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا اور ابتک جو کچھ مسالہ جمع ہوگیا تھا اسے ایک خوبصورت رسالہ کی صورت میں مرتب کر لیا تھا، توما میں یوسف جس وقت جدہ پہونچا مستشرق فولجانس سے ملاقات کی اور یمن کے خرابوں کے متعلق تمام واقعات جو دیکھے یا سنے تھے بیان کئے۔ فولجانس نے اسے پھر واپس ہوتے اور ان خرابوں میں حمیری آثار کی تفتیش کی ترغیب دی۔ اتفاق سے اس زمانہ میں عثمان پاشا والی حجاز نے جدید امام یمن کی تخت نشینی کی تہنیت میں ایک وفد بھیجنے کا قصد کیا اور نرد اس وفد کے ساتھ ہولیا مگر جس وقت صنعا پہونچا تو اس نے دیکھا کہ ترک اہل یمن کو اب اور بھی نفرت اور بیزاری کی نظر سے دیکھتے ہیں اسلئے اس نے وفد سے علیحدگی مناسب سمجھی اور وفد سے جدا ہو کر وہاں کی ایک سرائے میں اتر پڑا پھر اس نے وہاں ایک دوست سے مارب جانیکے متعلق گفتگو طے کی اور جولائی ۱۸۴۳ء میں کھانے پینے کا اسقدر سامان لیکر جو پندرہ دن کو کافی ہوسکتا تھا منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگئے اور نودرنے یمن

کا لباس پہنکر اپنے کو بالکل یمنی بنا لیا۔ چھ منزلوں کے بعد مارب پہونچے تین دن قیام کیا اس عرصہ میں بعض قدیم خرابات دیکھے اور انہوں نے بعض کتبوں کو نقل کیا۔ اور وہاں سے واپسی کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا راستہ میں ایک گاؤں سے ہوکر گذرا جسکا نام اس نے خربہ رکھا حالانکہ صحیح نام سرواح[1] ہے۔ اس غلطی کا سبب ایک دوسری غلطی ہے جسکا ذکر بعد میں کیا جائیگا۔

سرواح میں اسے مختلف قسم کے کتبے ملے اور تمام کتبے جو اس عرصہ میں اس نے جمع کئے انکی تعداد ۵۶ تک پہونچ گئی چنانچہ ۳ صنعا میں ۸ اس مقام میں جسکا نام اس نے خربہ رکھا تھا اور ۴۶ مارب میں دستیاب ہوئے۔ راستہ میں جو لوگ اس کے پاس سے ہوکر گذرتے تھے اس کے چہرہ کا رنگ دیکھکر شک میں پڑجاتے تھے، کوئی جاسوس سمجھتا تھا، کوئی ساحر، اور اگر میارب اسکی پشت پناہی نہ کرتا تو یہ شکوک اس کی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیتے۔ اس سیاحت میں اسکی آنکھوں میں کچھ فتور ہوگیا جس کی وجہ سے دس مہینہ تک وہ اپنی آنکھوں کو کام میں نہ لاسکا اس نے فرنل کو خط لکھا اپنے اور ان ممالک کی جغرافی حالات لکھے جن کی بنا پر فرنل نے اپنے نقشے مرتب کئے اور فرانسیسی گورنمنٹ کے حکم سے تمام کتبوں کی نقل ایک کتاب میں چھاپدی فرنل نے اپنے اجتہاد سے ان حروف کی عربی حروف سے مقاربت ثابت کرنیکی کوشش کی اور اس بحث اور تحقیق کے نتائج کو ضمیمہ کے طور پر کتاب میں شامل کردیا اسے جسنیوس نے جو کچھ لکھا تھا صرف اسی کی اطلاع ہوسکی رودجر نے اس بارے میں جو کوشش کی تھی۔ اس سے وہ بالکل بے خبر رہا اور نہ بہت سی چیزوں کے سمجھنے میں جنھیں وہ ابتک نہیں سمجھ سکا تھا اسے قیمتی مدد ملتی۔

عمران کے کتبے

اس کے بعد ایک انگریزی افسر نے ۴۲ یمنی کتبے جو برنز پر تھے عدن سے خرید کر برطانی متحف (عجائب خانہ) میں پیش کردئے ان میں سے اکثر عمران کے کتبے ہیں جو اللحیہ اور مارب کے درمیان واقع ہے یہ کتبے نہایت اہم

---

[1] یہاں بعض اثری خرابات ہیں جو مقام حاشد اور ارحب کے قریب واقع ہیں۔

ہیں اور ان پر تصویریں اور مختلف رنگ کے نقش و نگار منقوش ہیں جو قدیم اہل یمن کی فنون جمیلہ میں مہارت کی دلیل ہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ کتبے بعد میں جدید بحث و تحقیق کی بنیاد پڑ گئے جس پر پروفیسر ارنسٹ ا ز ز ندر Ernest Renan نے بہت کچھ لکھا ہے اور ۱۸۶۶ء میں اس مبحث پر ایک کتاب بھی تالیف کی ہے (سیو شارل لنورمان (Charles Lenormant) کے مصنوعی کتبے)

۱۸۶۶ء میں ماہر اثریات شارل لنورمان نے پانچ کتبے شائع کئے اور یہ بیان کیا کہ یہ تمام کتبے ابین میں دستیاب ہوئے ہیں اور ایک فرنچ ڈاکٹر نے ان کو ۱۸۴۷ء میں نقل کیا ہے اور یہ نقول ۱۸۶۷ء میں نورمان کے سپرد کی گئی ہیں۔ شائع ہونے کے بعد پیرس کے ۱۸۷۰ء کے فتنہ میں ان کی اصل ضائع ہو گئی۔

یہ موسیو لنورمان کا خیال تھا لیکن جیسا کہ مستشرق داوہا فرنچ مور ۱۸۸۲ء (David Heinrich Muller) کے بیان سے ظاہر ہوا یہ کتبے مصنوعی نکلے معلوم نہیں اس علمی خیانت سے ان کتبوں کے مصنف کا کیا مقصد تھا۔

دوسرے مصنوعی کتبے

پھر ۱۸۷۰ء میں تین ایسی کتبے جو برنز پر منقوش تھے عدن سے یورپ لائے گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ یہ بھی مصنوعی ہیں اور یمن کے تانبے کے کاریگر (ٹھٹھیرے) نے جب سنا کہ ان پرانے کتبوں کو مستشرقین اسقدر قیمتی سمجھتے ہیں تو وہ بعض اثری پتھروں برنز کے حروف اور کلمات برنز کے مصنوعی کتبے بنا کر ان پر نقل کرنے لگا۔ اور اس سے اس کا مقصد محض ذاتی منفعت تھی لیکن ان مصنوعی کتبوں سے بھی کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا کیونکہ ان میں فقرے نہایت صحت کے ساتھ نقل کئے گئے تھے۔ اسی طرح صنعا کے ایک دوسرے شخص نے بھی جو پتھر پر کھدائی کا کام کرتا تھا وہی حرکت شروع کی ہاتھ کے بنے ہوئے پتھر امام یمن کے پاس

پہونچے اور انھوں نے ان کو قسطنطنیہ کے عجائب خانوں میں بھیجدیا۔

اب ہم ایک ایسے شخص کا تذکرہ کرتے ہیں جس نے حمیری زبان کے اسرار و حقائق پر سے نقاب اٹھا کر اور کثیر التعداد کتبوں اور تاریخ کے گمشدہ اوراق کا انکشاف کر کے ایک اہم اور مشکل ترین خدمت انجام دی ہے۔

یہ علامہ ہالیقی (Joseph Halevy) ہے شروع شروع میں بلاد عثمانیہ میں مقیم تھا وہاں سے فرانس چلا آیا۔ اور اساتذہ کی صف میں شامل ہوگیا۔ ہالیقی کے متعلق کچھ کہنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آثار قدیمہ کے انکشاف سے دلچسپی رکھنے والوں کی جو عام رفتار تھی اس کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔

انیسویں صدی کے نصف میں برلن کی انجمن علمی نے ان تمام قدیم لاطینی کتبوں کے جمع کرنے کی تحریک کو جو یورپ ایشیا اور افریقہ میں منتشر تھے علمی جامہ پہنانا شروع کیا اور اس مجموعہ کا جو متعدد ضخیم مجلدات پر مشتمل تھا (Corpus Inscriptionum Latinarum) نام رکھا۔

۱۸۶۵ء میں پیرس کی مجمع علمی نے برلن کی انجمن کے قدم بقدم چلنے کا ارادہ کیا اور وزارت تعلیم کے سامنے سامی کتبوں کا مجموعہ مرتب کرنیکی تجویز پیش کی اور اس کا نام Corpus Inscriptionum Semiticarum رکھا اور اس کی چار بڑی تقسیمیں کیں۔

۱۔ فینیقی کتابے۔

۲۔ آرامی زبانوں کے کتابے۔

۳۔ عربی کتابے۔

۴۔ حمیری کتابے۔

انھوں نے اس موقع پر صرف حمیری کتبوں کا ذکر کیا کیونکہ عرب کے جنوبی بلاد کی

زبانوں مثل سبایہ اور معینیہ وغیرہ کا اس وقت تک انکشاف نہیں ہوا تھا وزارۃ نے تجویز منظور کر لی اور پیرس کی انجمن علمی نے ان حمیری کتبوں کے جمع کرنیکے لئے ہالیقی کا انتخاب کیا۔ وہ سنہ ۱۸۶۹ء میں فرانس سے چل کھڑا ہوا اور عدن میں اترا وہاں سے بچ گیا لیکن اسے کچھ ہاتھ نہ آیا اسلئے دوبارہ صیدہ کی جانب واپس ہوا وہاں سے یمن میں داخل ہوا تا آنکہ صنعا پہونچ گیا اور ایک مدت تک اثری کتبوں کی تفتیش کرتا رہا لیکن وہاں اسے قابل ذکر کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اول تو وہاں اس کے کتبے بمنزلہ سرے سے نہیں اور ہیں بھی تو ایسے بلند مقامات پر کہ ان تک پہونچنا محال اور ناممکن ہے اسی طرح بعض کتبے ان مسجدوں میں ہیں جنمیں اجنبی شخص خاص اجازت حاصل کئے بغیر داخل نہیں ہو سکتا جو بڑی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

پروفیسر نلینو کہتے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ صنعا کی ایک مسجد میں نہایت قدیم کتبے ہیں لیکن "مسلمان" کے سوا کسی دوسرے کی وہاں تک رسائی ناممکن ہے۔

ان مشکلات کے علاوہ اہل صنعا نے قدیم پتھر اپنے مکانات کی تعمیر میں استعمال کر لئے ہیں جنکی وجہ سے ان کے حروف محو ہو گئے ہیں۔

ہالیقی صنعا کے اطراف میں پھرتا رہا بے انتہا صعوبتیں برداشت کیں لیکن اس کے مقابلہ میں فائدہ بہت ہی کم ہوا اور بجز پتھر کے چند ٹکڑوں کے جن پر قرآن کی آیتیں یا سورتیں کندہ تھیں اور کچھ ہاتھ نہ آیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر وہاں کی کھدائی ممکن ہوتی تو کتبوں اور اثری پتھروں کے انکشاف اور حصول میں بڑی حد تک کامیابی ہوتی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ غمدان صنعا میں ہے اور یہ ظہور اسلام سے قبل ملک یمن کا ایک رفیع الشان قصر تھا جسے امیر المومنین عثمان بن عفان نے اپنے عہد حکومت میں توڑ ڈالا۔ قدیم تاریخی کتب کے ذریعہ سے اس عظیم الشان محل کی تعریف جو ہم تک پہونچی ہے وہ یہ ہے کہ "اس میں بیس چھتیں ہیں (شاید منزلیں) جن میں ایک دوسرے کے اوپر بے شمار کھڑکیاں ہیں، اور سفید سنگ مرمر کی تمام لوحیں زمین میں مدفون ہیں یہ ہمدانی مولف "کتاب الاکلیل" کا قول

ہے یہ کتاب دس حصوں میں منقسم ہے جن میں سے ہم تک صرف آٹھواں اور نواں حصہ پہونچا ہے اور ان دونوں کا بھی بہت تھوڑا سا حصہ چھپا ہے جس کو پروفیسر مولر نے شائع کیا ہے۔

ہالیقی نے ایک مدت تک صنعا میں قیام کے بعد بلاد جوف کی جانب سفر کا ارادہ کیا جو صنعا کے شمال میں ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس سے پہلے کوئی اثری اس طرف نہیں گیا تھا، یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ بلاد جوف پر آنیوالے خصوصاً اجنبی کے لئے گویا قبرستان ہے جہاں سے زندہ واپس آنیکا خیال فعل عبث ہے لیکن ہالیقی نے جوف میں داخل ہونے کے لئے یہ ترکیب کی کہ قدس کے یہودیوں کا لباس اختیار کرلیا۔ اسلئے اس کے لئے آسانی ہوگئی خصوصاً جبکہ وہ واقعہ میں یہودی تھا۔ اور اس کا نام بھی مشہور یہودی ناموں میں سے تھا۔ اس نے ایک بات یہ بھی کی کہ حاخام صنعا کے مذہبی یہودی عالموں سے جوف کے یہودیوں سے سفارشی خطوط لکھوائے کیونکہ یمن میں عیسائیوں کا وجود گھس لگانے کیلئے نہیں یہودی بہت قدیم سے تھے اور اسلام کے بعد بھی باقی رہے لیکن نہایت ذلت و حقارت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور اہل یمن ان کی اور ان کے مذہب کی ہنسی اور مذاق اوڑاتے ہیں بہرحال یہ بات ضرور ہے کہ وہ یمن کے ہر حصہ میں آزادی کے ساتھ آجا سکتے ہیں۔

ہالیقی نے ایک یہودی ٹھٹھیرے کے ساتھ جو وہاں کا اصلی باشندہ تھا اور حاتیم حشبوش نام تھا اپنا سفر شروع کیا اس یہودی ٹھٹھیرے کی وجہ سے اسکو بہت سہولت رہی لیکن اس کے باوجود اسے بعض ایسے زبردست خطرات سے دوچار ہونا پڑا کہ اسکی جان کے لینے کے دینے پڑگئے وہ کھلم کھلا کسی کتبے کی نقل نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لئے آستین میں قلم اور کاغذ لئے رہتا تھا۔ اور کوئی کتبہ مل جاتا تھا اسے لکھنا شروع کردیتا تھا۔ اور جہاں کہیں سے بھی کسی آدمی کا شبہ ہوتا تھا تو سونے کی صورت بنا لیتا تھا اور اسی لئے وہ نماز کی مشغولیت کے اوقات کو بہترین موقع سمجھتا تھا اور اسی وقت نقل کرتا تھا۔ اس کے یہودی ہمسفر نے اسے حمیری حروف سکھادے تھے

تاکہ اسے لکھنے میں مدد پہونچ سکے۔

لیکن ہمیں ہالیقی کے طرز عمل سے حیرت ہوتی ہے کہ اس نے اس سفرنامہ کے متعلق جو رسالہ لکھا ہے اس میں اس یہودی کا بالکل تذکرہ نہیں کیا ہے، اور نہ اس ہمسفری اور اس کی وجہ سے جو اسے امداد و اعانت حاصل ہوئی اس سے تعرض کیا ہے۔ معلوم نہیں اس بات کے پوشیدہ رکھنے سے اس کی کیا غرض تھی۔ یہ بات مدت تک پوشیدہ رہی تا آنکہ ۱۵ برس بعد علامہ گلیزر (Glaser) یمن گئے۔

ہم نے اس لئے اسکا تذکرہ کیا کہ ہالیقی کے کتبوں میں ہمیں عجیب باتیں نظر آئیں۔ بعض تو بہت بہتر لکھے ہوئے تھے، اور بعض کے متعلق معلوم ہوتا تھا کہ غفلت کی حالت میں لکھے گئے ہیں، جن کی غلطیاں بہت واضح تھیں۔ تحقیق و تدقیق کے بعد معلوم ہوا کہ بہت سے ٹکڑے ایک دوسرے کو مکمل کر رہے ہیں ورنہ وہ ایک بڑا قطعہ ہے جس کے لکھنے میں ٹکڑے ٹکڑے کر دئے گئے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ حشبوش یہودی نہایت بے ایمان چالاک اور حریص تھا اجرت پر کام کرتا تھا جسقدر لکھتا تھا اس کی اُجرت پاتا تھا۔ اور ہالیقی اس کو بڑے اور طویل قطعہ کے لکھنے کی بھی اتنی ہی اجرت دیتا تھا جتنی چھوٹے قطعہ پر اسی لئے حشبوش کسی بڑے لمبے قطعہ کو پاتا تھا تو زیادہ اجرت حاصل کرنے کے لئے نقل کرتے وقت کئی کئی ٹکڑے کر دیتا تھا۔

بلاد جوف۔ نجران۔ الاخدود

جوف ایک نہایت اہم مقام ہے کیونکہ وہ مملکت معین کا وسطی حصہ ہے جس سے ہالیقی سے پہونچنے اور وہاں کے چشم دید حالات میں ایک رسالہ لکھنے کے قبل کوئی اس سے واقف نہ تھا۔

وہ اپنے رسالہ میں شہر معین کے اس حصہ کا تذکرہ کرتے ہوئے جو چاروں طرف فصیل کی دیواروں سے قلعہ بند ہے لکھتا ہے۔

وہ ایک ٹیلہ پر ہے جسکا طول ۲۰۰ اور عرض ۲۴۰ میٹر ہے فصیل کی دیوار جو ٹیلہ کے نیچے ہے

وہ صرف شمالی جانب کچھ تھوڑی سی باقی رہگئی ہے، دو دروازے بھی ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مقابل ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی جانب۔ وہ اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ اسی طرح ان سے قریب کے برجوں کی بھی حالت بہت بہتر ہے۔ یہ بہت طویل و عریض خوشنما اور شاندار ہیں۔

یہ عمارتیں برابر اور صاف کئے ہوئے پتھروں کی ہوئی ہیں اور باوجودیکہ ان پر صندلہ یا پلاسٹر نہیں پھر بھی دیکھنے والیکو ایک پتھر معلوم ہوتا ہے، اور ان میں سے اکثر پر کتبے نقوش ہیں جنکا طول تعجب انگیز مقدار کو پہونچتا ہے۔ مگر چہار دیواری کے اندر عرب کے بدؤں نے ان آثار کو بالکل خراب خستہ اور برباد کر ڈالا ہے انھوں نے اس کے وسط میں رہنے کا ارادہ کیا اور مسجد تک اس کے قدیم پتھروں ہی سے بنائی۔

بلاد کے جوف میں اپنا کام پورا کرکے ہالیقی نے شمال کا رخ کیا اور جون ۱۸۷۰ء میں مخلاف پہونچا یہ ایک وسیع وادی میں ایک گاؤں ہے اس وادی کا نام وادی نجران ہے، اور یونان کے قدیم مورخین کے خیال کے مطابق نہیں پر مشہور اور عظیم الشان شہر نجران واقع تھا۔ مخلاف کے چاروں طرف پانی ہے۔ جس کے کنارے سرسبز و شاداب درخت اُگے ہوئے ہیں۔

مخلاف کے خرابوں میں ایک جگہ ہے جسکا نام انھوں نے شہر اخدود رکھا ہے۔ انکا (مسلمانوں کا) خیال ہے کہ یہ وہی مقام ہے جس کی طرف کلام پاک (سورۂ بروج) میں اشارہ کیا گیا ہے وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۝ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۝ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۝ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝

اور کوئی شک نہیں کہ ان اطراف میں بے شمار اور بیش قیمت اہم اور مفید آثار اور کتبے پائے جاتے ہیں، لیکن چونکہ ان مقامات کے لوگ (بنو یام) اسماعیلی (باطنی) فرقہ سے تعلق رکھتے تھے متعصب تھے مسلم یا غیر مسلم جو ان کے عقیدہ کے خلاف ہو اس کی تکفیر کرتے تھے اس لئے اب چھپ چھپ کر اور یہودیوں کی آڑ لیکر کام کرنا غیر ضروری اور بیکار تھا۔
یہاں سے صنعا کی جانب واپسی کے وقت یراقش اور اسی قسم کے دوسرے گاؤں میں اسے خرابے" (کھنڈر) اور کتبے ملے جنمیں سے بعض کو اس نے نقل کر لیا۔
اگست ۱۸۷۰ء میں وہ مارب پہونچا۔ مگر اہل مارب نے اسے کتبے نقل کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔ پھر ان "خرابوں" سے ہو کر گذرا جسکا نام ارنود (Arnaud) نے الخربہ رکھا حالانکہ صحیح نام (صرواح) ہے۔ یہ مملکت سبا کے بڑے شہروں میں تھا اور یہاں بیش قیمت اور مفید ترین کتابے ہیں۔ چنانچہ ان کے متعلق ہالیقی کا قول ہے کہ "میں نے یہاں کی طرح طویل ترین کتبے کہیں نہیں دیکھے"۔
باوجودیکہ حالات ہالیقی کے مساعد نہیں تھے پھر بھی اس نے ۶۸۶ کتبے جمع کئے اسقدر کتبے نقل کر لینے کی وجہ سے حمیری زبان کے کتبوں کے انکشاف میں اس کو زبردست فضل و تقدم حاصل ہو گیا۔ وہی ایک تنہا شخص ہے جس نے مملکت معین کے آثار کا انکشاف کیا جنکا عرب۔ روم۔ یونان کے قدیم مورخین نے بھی اپنی قدیم تاریخوں میں تذکرہ نہیں کیا۔
ہالیقی نے حمیر۔ سبا اور معین کی زبانوں کا صرف و نحو لکھتے وقت انھیں کتبوں پر اعتماد کیا اور ۱۸۷۲ء میں ایشیاٹک جرنل (Journal Asiatiques) میں شائع کرایا۔
اور باوجود نسخ کی اسقدر غلطیوں کے جو اول تو لکھتے وقت اطمینان و سکون نہ ہونے دوسرے حسنبوش یہودی کی شرارتوں بے ایمانیوں اور دھوکہ بازی سے واقع ہوئیں یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ حمیری زبان کا علم ہالیقی کے اس سفر کی بدولت کئی قدم آگے بڑھ گیا اور ان چیزوں پر سے نقاب اٹھ گئی جو پردۂ غیب میں مستور تھیں۔ اور یہ امر روشن ہو گیا کہ بلاد

عرب کے جنوبی حصہ اور ان ممالک میں بھی جنکا یونان، روما اور عرب کے مورخین نے تذکرہ نہیں کیا ہے قدیم تہذیب موجود تھی۔

کوئی شبہ نہیں کہ یمن سے متعلق اسوقت تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں ہالیقی کے مساعی کو بہت بڑا دخل ہے اور یہی وجہ ہے کہ علمائے مستشرقین میں یمن کے آثار کی تحقیق کا عام شوق پیدا ہو گیا، ملک میں مختلف لیاسی وجود کی بنا پر اضطراب نہ ہوتا نیز اہل یمن اجانب خصوصاً اہل یورپ سے اسقدر پرہیز نہ کرتے تو علمائے مستشرقین میں یمن کی آثار کی تحقیق کا عام شوق پیدا ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی جس نے یورپ کی مہموں کو طویل عرصہ تک یمن کے قیام سے بالا رکھا۔

لانجر

ہالیقی کے تقریباً بارہ برس بعد سگفرڈ لانجر نساوی نے بلاد یمن میں اسی غرض سے داخل ہونے نیکا ارادہ کیا۔ اور ۱۸۸۲ء میں اس ارادہ کی تکمیل کی غرض سے وہ یمن کیجانب روانہ ہو گیا۔ لیکن جوف میں داخلہ نہ ہو سکا۔ بلکہ حدیدہ سے بیت الفقیہ۔ طوران اور ضاف ہوتا ہوا جو اس کے راستے میں پڑتے تھے صنعا چلا گیا، یہاں پہونچکر بھی وہ قیام نہ کر سکا کیونکہ والی نے جو ترک تھا اس کو فوراً حدیدہ کی جانب واپس ہونے پر مجبور کیا۔ اس پر بھی اس نے ۲۲ کتبے لکھ ہی لئے جن میں اسے ضاف میں ملے تھے۔

ان مشکلات سے اس کے عزم و ارادہ میں مطلقاً فرق نہیں آیا۔ اور اس نے دوسری مرتبہ عدن کی جانب سے یمن میں داخل ہونیکا ارادہ کیا۔ مگر جسوقت وہ وادی بنا میں پہنچا جو عدن سے ۹۰ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے کہ ڈاکوؤں نے اسے روپیہ کے لالچ سے قتل کر دیا۔ یہ دوسرا شخص ہے جو یمن کے آثار قدیمہ کی تلاش و جستجو پر قربان ہوا۔

اس شخص کے بعد یورپ میں یمن کے آثار اور کتبے پہونچنا بند ہو گئے البتہ خود وہاں کے باشندے کچھ پاتے تھے تو تاجروں کے ہاتھ بیچ ڈالتے تھے اور یہ تیجر

یا برونز[۵] کی لوحیں مٹی کے بخور سلگانے کے ظروف خصوصاً مجسموں کے ٹکڑے اور سنگ مرمر کے بنے ہوئے سر ہوتے تھے۔ اور جن متاحف (عجائب خانوں) نے ان چیزوں کو اپنے یہاں لیا ان میں قسطنطنیہ کا قصر چینیلی کا کتبخانہ بھی ہے۔

ان میں سے اکثر چیزیں ایسی ہیں جن میں سے اکثر کے متعلق معلوم نہیں کہ کہاں سے نکالی گئیں ہیں اور یہ بات ایسی ہے کہ علم آثار کی حیثیت سے ان کی وقعت و اہمیت کو کم کر دیتی ہے۔

معینی علا میں

یہ بات قابل ذکر ہے کہ معینی زبان کے ۶۹ کتبے ایسی زمین میں دستیاب ہوئے جو یمن سے خارج ہے۔ انکے انکشاف اور نقل کرنیکا سہرا جولیس اوٹینگ (Julius Euting) کے سر ہے (۱۸۸۳ء) یہ موضع علا میں چٹانوں پر منقوش ہیں یہ موضع حجاز میں مدینہ اور حدود شام (فلسطین) کے درمیان شمالی حصہ میں واقع ہے۔ مدائن صالح بھی اس سے قریب ہیں جنکا نام رجحر ہے ان اطراف کے رہنے والوں کا بیان ہے کہ چٹانوں کے اندر جو غار ہیں ان میں ثمود رہتے تھے اور یہی حضرت صالح علیہ السلام کا وطن ہے۔ اور قابل یقین بھی ہے کیونکہ نبطی اور خوداوں کی زبانوں میں لکھے ہوے کتبات و آثار سے اسکا ثبوت ملتا ہے۔

سب سے حیرت انگیز بات اس مقام میں جو مملکت معین سے بہت دور ہے ان کتبوں کا وجود ہے۔ ان کتبوں سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ معین کے تاجروں کا بڑا حصہ ایک طویل مدت تک علا اور اس کے گرد و نواح میں قیام پذیر رہا، اور یہ معین کے ان نو بادشاہوں کے زمانہ میں جنکا تذکرہ ان کتبات میں ہے۔ یہ لوگ (معینی) اپنی حفاظت کی غرض سے قلعے اور برج تعمیر کرتے تھے۔ ہیکلیں بناتے تھے جن میں آلہہ معین (معین معبودوں) کی پرستش کرتے تھے۔ (ملخص)

۵۔ تانبے پیتل اور جست سے مرکب ایک دھات

غزل

از
جناب نسیم صاحب صبحی

یاس بس رحم یہ کیا مجھ پہ غضب ڈھاتی ہے
خلشِ آرزو بھی ہاتھ سے اب جاتی ہے

دیکھ کر حال مرا ان کو ہنسی آتی ہے
میری امید ترحم بھی رہی جاتی ہے

ہجر کی رات قیامت ہے کہ ہوتی نہیں ختم
موت فرقت زدہ کو دیکھئے کب آتی ہے

بس یہ دلسوز فسانے نہ سنا اے بلبل
خوگر رنج کو کب تیری صدا بھاتی ہے

سر میں سودا ہے خلش دل میں جگر میں سوزش
آگ سی ایک بدن بھر میں لگی جاتی ہے

تجارت

از

جناب سید امیر حیدر صاحب بخت اکبر آبادی

وہ کیا شے ہے کہ جسکے ہم قدم اقبال و دولت ہے
تجارت ہے! تجارت ہے۔ تجارت ہے تجارت ہے

جو کل گمنام تھے وہ آج نام آور ہیں عالم میں
تجارت کی بدولت آج دنیا میں وجاہت ہے

جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں حق اُنکا معاون ہے
یہی قانونِ فطرت ہے یہی قانونِ قدرت ہے

تجارت چھوڑ دی جس قوم نے اسکو زمانہ میں
الم ہے رنج ہے افلاس ہے ادبار و نکبت ہے

تجارت میں نہیں ہے دخل جسکا اس زمانہ میں
اکارتِ زندگی ہے مال و زر کو اُن سے نفرت ہے

مدد قومی تجارت کی نہ خود شوق تجارت ہے
نحوست پر نحوست ہے قیامت پر قیامت ہے

جو تاجر آچکے ہیں وہ شکار کس مپرسی ہیں
نہ ہمدردی ہے کچھ ان سے نہ کچھ ان کی اعانت ہے

(خیال اسکا نہیں مشرک نجس قرآں میں آیا ہے
جنھیں نفرت ہے دل سے آپکو اُن سے محبت ہے)

کہاں ایثارِ نفس و پیروی دینِ حق لیکن
خلافِ عقل اب اخلاق کی معدوم جرأت ہے

نہ چونکے آپ افسوس انقلاباتِ زمانہ سے
جہاں میں آپکی غفلت بھی ایک تصویرِ عبرت ہے

مگر پھر بھی نہیں مایوس ہونے کی ضرورت ہے
کھلا چاروں طرف دُنیا میں میدانِ تجارت ہے

بنو اب دستکار اور اپنی صنعت کو ترقی دو | کرو ضائع نہ وقت اپنا کہ جو دم ہے غنیمت ہے
قلیل انسان کی عمر ہے کثیر اشغال دنیا میں | تعجب ہے دو روزہ زندگی میں جنکو فرصت ہے
اسی پر منحصر ہے کاروبارِ عالمِ ہستی | ضروری آدمی کیواسطے دنیا میں محنت ہے
بڑے جو لوگ گذرے ہیں جو مشہور زمانہ ہیں | تواریخ جہاں میں وصف جنکے جنکی شہرت ہے
انھیں محنت کی عادت تھی ریاضت سے محبت تھی | ہوئے مخدوم وہ جس فخر سے وہ فخر خدمت ہے
حقیقت میں تجارت کی اگر ہے جان سرمایہ | تو ایمان تجارت واقعی تاجر کی محنت ہے
جو کاہل ہے وہ عالم میں خدا کی اُس پہ لعنت ہے | خدا جس چیز سے خوش ہے وہ کیا ہے صرف محنت ہے
ہماری کاہلی سے یہ ہماری آج نوبت ہے | وہ جاہل ہیں جو کہتے ہیں کہ یہ حق کی مشیت ہے
کلہاڑی پاؤں میں ماری ہے ہمنے اپنے ہی ہاتھوں | گلہ تقدیر کا ہے اور نہ گردوں کی شکایت ہے
تجارت میں بڑھیگا اعتبار ایمانداری سے | یہ ہے ایمان کی ایمانداری سے تجارت ہے
زمانہ بھر کو اخلاقِ حسن ہم نے سکھائے ہیں | خدا کی شان اب مفقود خود ہم میں وہ نعمت ہے
کہانی درد و غم کی اہل دل کے روبرو کہدی | نہ کچھ رنگیں بیانی ہے نہ اظہار فصاحت ہے

نہ کی قدر تجارت بخت جس نے اُسکی قسمت میں
ترقی ہے نہ عزت ہے۔ نہ بے فکری نہ راحت ہے

معلومات

از

جناب حسن عابد جعفری صاحب ۔ (آکسن) مدیر شمع

مصر میں طوطن خامن کے مقبرے کی کھدائی کا کام کچھ عرصہ سے ہو رہا ہے، اور چونکہ صرف جاڑے کے موسم میں کام ہوتا ہے اس لیئے کھدائی کا سلسلہ سرما کی پانچ فصلوں سے جاری ہے۔ عمارت میں داخل ہونے کے لیئے زینہ ہے، اور ایک برآمدہ ہے جس میں ہو کر چاروں حجروں تک پہونچنے کا راستہ ہے، پہلے حجرے کی کھدائی میں ایک فصل صرف ہو گئی، لیکن بے شمار چیزیں ہاتھ آئیں، یہاں سے چھوٹے حجرہ میں داخل ہونے کا راستہ ہے، مگر ابھی تک اس سے ہاتھ نہیں لگایا گیا ہے، قیاس ہے کہ بہت سی چیزیں برآمد ہونگی۔ گزشتہ تین فصلیں صرف اُس حجرہ کے کھودنے میں صرف ہوئے ہیں جسمیں فرعون کا مقبرہ ہے۔ ۱۷ فروری ۱۹۲۳ء کو اس حجرہ کی دیوار شکست کی گئی، اور ایک گز کے فاصلہ پر اصل مقبرہ کی طلائی دیوار چمکتی ہوئی نظر آئی، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ دیوار لکڑی کی ہے اور سونے کا پانی پھرا ہوا ہے، اصل مقبرہ اور حجرہ دیوار کے درمیان میں دونوں جانب ڈیڑھ ڈیڑھ فیٹ جگہ ہے، جہاں بعض نہایت نفیس چیزیں دستیاب ہوئی ہیں، ایک قرنا ہے، شراب کے پیپے ہیں، شاہی کشتی کی گاڑیاں اور الاباسٹر کی دو قندیلیں ہیں ایک قندیل کا قبہ بظاہر صاف ہے، لیکن چراغ روشن کرنے سے قبہ کی سطح پر فرعون اور اسکی ملکہ کی نہایت حسین تصویریں نمودار ہو جاتی ہیں۔

چوبی مقبرہ سترہ فیٹ لانبا، گیارہ فیٹ چوڑا، اور نو فیٹ بلند ہے دیواروں پر جنازے کے مناظر منقوش ہیں، مقبرے کی چوبی دیواروں کے اندر دو دیواریں اور ہیں

پہلے مقبرے کے دروازے پر مُہریں نہ تھیں، لیکن دوسرے مقبرے کے دروازے سر بہ مُہر تھے دونوں مقبروں کے درمیان دو بڑے مرتبان رکھے ہوئے ملے۔ چھوٹے مرتبان کا ڈھکنا شیر کی وضع کا ہے، اور اس کے اندر مرہم ہے، دیوار کے قریب کونوں میں فرعون کی استعمالی چھڑیاں ہیں جن پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں، دوسرے مقبرے پر کپڑا لگا ہوا ہے اور اس پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے طلائی گلاب کے پھول ٹکے ہوئے ہیں، یہ کپڑا مقبرے پر منڈھا ہوا نہیں ہے، لکڑی کے چوکھٹوں پر تنا ہوا ہے، لیکن چوکھٹے اور کپڑے کی موجودہ حالت بالکل ناقص ہو چکی ہے، تینوں مقبروں اور کپڑے سے منڈھے ہوئے چوکھٹے کو ہٹانے میں انتہائی احتیاط کی گئی، یہ کام اس قدر دشوار اور نازک تھا کہ ایک پوری فصل نذر ہو گئی۔ مگر کام کرنے والوں کو قائل ہونا پڑا کہ فرعون کی نعش کی حفاظت کے لیے اس سے بہتر اور کامیاب تر طریقہ ممکن نہ تھا، ۴ر جنوری ۱۹۲۴ء کو ڈاکٹر کارٹر نے اخیر مقبرے کا دروازہ کھولا، اور قبر کی پہلی جھلک نظر آئی، قبر عہد فراعنہ کے طرز قدیم کا نمونہ ہے، بادشاہوں کے نام اور اُن کے خطاب لکھے ہوئے ہیں، اور چاروں گوشوں پر اُبھرے ہوئے کام کی آئی سس، نیب تھائس، نیتھ، اور سرکیٹ دیویوں کی مورتیاں ہیں، جو نعش کے اوپر پروں کو پھیلائے ہوئے ہیں، نعش کے اوپر پتھر ہے، لیکن زمانہ دراز کے باعث بالکل بودا اور بے جان ہو چکا ہے، قبر میں داخل ہو کر جس قدر کام ہوا وہ احتیاط اور ہوشیاری کے لحاظ سے عدیم المثال ہے، اور اُسکی اہمیت اور دشواریاں صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں، وزنی پتھر کو اونچا اُٹھانا معمولی کام نہ تھا، کیونکہ معمولی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ جانے کا اندیشہ تھا اور احتمال تھا کہ نیچے رکھی ہوئی نعش اور اسکے تین صندوقوں یا کفنوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ جائے گا، مگر یہ کام بھی انجام کو پہونچ گیا، اور کاریگروں نے نہایت ہوشیاری سے پتھر کو اونچا اُٹھا لیا، غالباً جس چیز نے اس مشکل کو حل کر دیا وہ اِن لوگوں کا شوق تھا! کیونکہ عام طور پر یقین تھا کہ اس پتھر کے

نیچے فرعون، طوطن خامن کی نعش ملیگی۔ پتھر کے اُٹھتے ہی سفید کفن نظر آیا، اُس کے اندر فرعون کی نعش کا صندوق ملا جس پر نہایت اعلےٰ درجے کا طلائی کام ہو رہا ہے اور منہ اور ہاتھ خالص سونے کے ہیں، اور مُرصع ہیں، ہاتھوں میں عصا، اور چنور اور پیشانی پر عقاب، اور کُبرت سانپ بنے ہوئے ہیں، ان کے گرد نازک پھولوں کا ہار ہے جسکو دیکھکر چشم تصور میں وہ نقشہ پھر جاتا ہے جبکہ نوجوان، بیوہ ملکہ نے اسکو اپنے شوہر سے عقیدت کی، اخیر یادگار میں بچشم گریاں دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چڑھایا ہوگا! دوسرا صندوق اوپر کے صندوق سے جکڑا ہوا ملا، اس پر بھی سنہری کام ہو رہا ہے، اور سفید کفن پڑا ہوا ہے، قیمتی جواہرات کے گلوبند سے مُرصع ہے۔ صندوق کے اندر ایک تیسرا صندوق ہے جو خالص سونے کا ہے اور جسکی قیمت آٹھ لاکھ روپیہ ہے، اس پر انواع و اقسام کے بیشمار جواہرات کا کام ہے، ہاتھوں اور شکم کے اوپر عقاب اور کربت سانپ کی چمکدار تصویریں ہیں، اور پیروں پر آئی سیس، اور نیفتا اِنس دیویوں کی تصویریں ہیں۔

سونا آٹھ لاکھ روپیہ کی قیمت کا ہے لیکن دنیا کے ماہرین فن اور نقادوں کی رائے ہے کہ اس سے بہتر آرٹ کا نمونہ ابتک دنیا کی آنکھوں نے نہ دیکھا تھا! اسکی تعریف سے قلم عاجز ہے، اور یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ قدرت خداوندی کے بعد یہی ایک چیز ہے جس پر روز قیامت تک انسان فخر کرے گا! تینوں صندوقوں کے اوپر مصری صناعوں نے طوطن خامن کی صحیح تصویر بنانی چاہی ہے تاکہ اگر اصلی نعش قدرتی یا دیگر وجوہ سے پاش پاش ہوجائے تو طلائی مورتیں متوفی کی صورت کو روز قیامت تک صفحۂ دنیا پر برقرار رکھیں۔

اخیر صندوق کے تختہ کو جدا کرنے پر تماشائیوں کی حریص نگاہوں نے وہ کمال دیکھا جسکی برسوں سے آرزو تھی، اور جو مدت تک دلوں سے محو نہ ہوسکے گا اُن کے سامنے خود فرعون طوطن خامن کی نعش تھی۔ سر کے اوپر مُخروق طلائی خود تھا، سینہ پر عقاب، اور انسانی کھوپڑی کی تصویریں تھیں اور نعش پر کئی گز کپڑے کی دھجیاں تھیں جن کے اندر

شاہی جسم تھا، افسوس ہے کہ روغن ڈالنے کی مذہبی رسوم نے ممی سازوں کے بہترین نمونۂ کمال کو شدید نقصان پہونچا دیا! ڈاکٹری معاینہ سے معلوم ہوا کہ فرعون بالکل نوخیز نوجوان تھا اور مرتے وقت اُسکی عمر اٹھارہ برس سے زیادہ نہ تھی) اس کا عہد حکومت چھ برس رہا، اس لیے تخت نشینی کے وقت اُسکی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ تھی، ممی کے اوپر کپڑے کی دھجیوں کے درمیان بیشمار جواہرات ملے، اُن میں ایک کلغی بھی ہے اور بہت سے جواہرات زیورات میں جڑے ہوئے ہیں، گلے میں عقاب کی شکل کا کنٹھا ہے جس میں ۳ سو چھپن جواہرات ہیں، دو خنجر ہیں جنکے دستے طلائی اور مرصع ہیں، پھل لوہے کے ہیں یقین ہے کہ اُسی زمانہ میں مصر میں لوہا آیا ہوگا اور بیش قیمت رہا ہوگا،

موجودہ فصل میں پہلا کام یہ ہوا کہ وزنی پتھر کے اندر فرعون کی نعش کو بدستور رکھدیا گیا کیونکہ عوام کے طبائع کو نعش کے برآمد ہونے پر ملال تھا، اور اُنکی متفقہ آرزو تھی کہ یہ ہڈیاں عجائب خانوں کی زینت نہیں،

مقبرے کے حجرے میں ہوکر ایک اور کمرے کا راستہ ہے، اس سال وہ کمرہ بھی کھول لیا گیا، یقین ہے کہ اسمیں بھی عجیب و غریب چیزیں ملینگی، اب تک توکشتیوں کے نمونے اور ایک طلائی صندوق میں چار مرتبان برآمد ہوئے ہیں جن کے اندر طوطن خامن کے پیٹ کے اندر کی آلائش محفوظ ہے، صندوق کے چاروں کونوں پر محافظ دیویوں کی تصویریں ہیں، لوگوں کا بیان ہے کہ اس بکس کو دیکھکر انسان کا دل بے قابو ہوجاتا ہے!

ابھی اس حجرے میں کام ہو رہا ہے اور آئے دن نئی نئی چیزیں نکل رہی ہیں، نقادوں اور آرٹ کے ماہروں کی عید ہے کہ اُن کی معلومات میں جدید اضافہ ہو رہا ہے، لیکن حسرت شناس دلوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے کیا انسان کو یہ بھی گوارا نہیں کہ ہزاروں برس کے خفتگانِ لحد کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

امریکہ میں تقریباً ایک لاکھ طالب علم ایسا ہے جو اپنی تعلیم کے اخراجات کو قوت بازو سے پورا کرتا ہے، یہ تعداد اُن طلبار کی ہے جو اس ملک کی مشہور یونیورسٹیوں میں داخل ہیں اور فرصت کے اوقات میں، یا وقت نکال کر محنت اور مزدوری کرتے ہیں، رکابیوں کو دھونا، قالینوں کو صاف کرنا، گھروں میں جا کر مکان اور دیواروں کی جھاڑ پونچھ کرنا وغیرہ انکی معاش کے ذرایع ہوتے ہیں، انمیں بہت طلبار ایسے بھی ہیں جو علاوہ تعلیم کے رہائش اور قیام وطعام کے کل اخراجات کے لیے بھی روپیہ پیدا کرتے ہیں، لیکن جو طلبار ایسے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم پاتے ہیں اُنکی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، طلبار میں ذکور اور اناث شامل ہیں، اور باوجود محنت اور مزدوری کرنے کے اُنکی تعلیمی رفتار بہت اچھی اور اُنکے مقابلے میں ممتاز ہوتی ہے جو والدین، یا اپنے ذاتی اثاثہ کی امداد کی ذریعہ سے حصول تعلیم میں مصروف ہیں، قوت بازو، پر بھروسہ کرنا، امریکہ کا زریں اصول ہے، اور اُسی کی برکت سے ملک متمدن اور قوم آزاد ہے، ہندوستان اور بلاد اسلامیہ میں بھی کبھی یہ طریق تعلیم رائج تھا اور جاپان میں تو اب بھی اس طریقہ کو فروغ ہے۔

ہندوستان میں ماہرین تعلیم اور گورنمنٹ نے اس مسئلہ پر ابتک توجہ نہیں کی حالانکہ ملک کی اقتصادی حالت، اور تعلیم کی روز افزوں گرانی ایسی مصیبتیں ہیں کہ جن کو رفع کرنا حکومت کا فرض اولیں ہے۔ خدا معلوم اس ملک کے ارباب حل وعقد اس طرف کیوں توجہ نہیں کرتے، اور مدارس و یونیورسٹیوں میں اوقات و زمانۂ تعلیم کو اسطرح کیوں منضبط نہیں کرتے کہ طلبار کو حصول معاش کے مواقع مل جایا کریں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا فرض ہے کہ وہ طلبار کو تعلیم دینے کے علاوہ اُنکی فرصت کے اوقات کے لیئے ملازمتیں تلاش کریں، اور اُن کے لیئے ایسی سہولتیں پیدا کریں کہ وہ روپیہ کما سکیں، ہمارے نوجوانوں کا فرض ہے کہ وہ خود بھی توجہ کریں اور قوت بازو سے کمائی پیدا کرنے کو اپنا فخر سمجھیں۔ افسوس ہے کہ اس ملک میں نوجوانوں کو اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی

طرف مطلق رغبت نہیں ہے: بلکہ ہاتھ سے کام کرنا عیب سمجھتے ہیں، اور اُن کے نزدیک زمانۂ طالب علمی میں روپیہ پیدا کرنا سیلف رسپکٹ کے منافی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں اور بالخصوص شرفاء میں افلاس بڑھ رہا ہے، اور ادنے طبقہ کے آدمی محض قوت بازو کی برکت سے ترقی کر رہے ہیں، اور اس زمانہ میں جبکہ یوروپ اور ایشیا کے اتصال سے مادیت کو عروج ہو رہا ہے، شرفاء نہایت سرعت سے زوال پذیر ہو رہے ہیں ؎



امریکہ میں ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء میں ایک پرترقی ہوئی یونیورسٹی کی تکمیل ہوئی، یعنی ایک بہت بڑے جہاز پر قائم کی گئی۔ چار سو پچاس طالب علم اور چالیس فاضل استاد اس میں شامل ہیں، یہاں تعلیم دینے کے لیے متعدد کمرے، معمل، بڑا کتب خانہ اور ورزش کے تمام ضروری سامان موجود ہیں، جہاز تمام عالم کا چکر لگا کر ایک سال کے بعد امریکہ کو واپس ہوگا، اس عرصہ میں چوالیس بنادر، اور تیس ممالک میں ہوکر گذریگا، طالبعلم ہر مقام کی جہاں پر جہاز لنگر انداز ہوگا، سیر کریں گے، ترتیب طلباء اس طرح پر رکھی گئی ہے، ایک تہائی تو وہ ہیں جو اسکولوں میں زیر تعلیم تھے اور اُن کے والدین کی خواہش ہے کہ کالج میں جانے سے پہلے وہ دنیا کو دیکھ لیں، ایک تہائی وہ ہیں جو امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں تھے، اور اُن کے والدین چاہتے ہیں کہ وہ وسیع، اور غیر محدود تجربات اور تربیت حاصل کریں، بقیہ ایک تہائی فارغ التحصیل ہیں جو مخصوص موضوعات اور مضامین کے متعلق ذاتی تحقیقات اور تجربات کرنا چاہتے ہیں، اور اُن ہی طلباء کے لیے یونیورسٹی بنائی گئی ہے۔ انتخاب طلباء میں یہ اصول پیش نظر رہا ہے کہ کمزور اور سست طلباء پر مضبوط اور چست طلباء کو فوقیت دیگئی ہے۔

جہاز میں آرٹ، ادب قدیم، سیاسیات، تعلقات بین الاقوام، حکومت، معاشیات، فلکیات، معدنیات، جغرافیہ، تاریخ، اقتصادیات وغیرہ وغیرہ کی تعلیم کا انتظام ہے

اور ریڈیو لگا دیا گیا ہے تاکہ جہاز میں رہکر امریکہ سے تعلقات قائم رہیں ۔

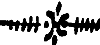
حال میں یہ یونیورسٹی بمبئی پہونچی تھی اور اُستاد او طلبا ارضِ تاج کی سیر کے لیے آئے تھے ۔ اُن سے ملکر اور تبادلۂ خیالات سے ہم کو حقیقی مسرت ہوئی ۔

مختلف ممالک میں سیاحت کرکے طلبا اور اُستادوں نے جو معلومات فراہم کی تھیں حقیقت میں حیرت انگیز تھیں، ہماری یونیورسٹیوں کو اس مثال سے متاثر ہونا چاہیے اور اگر مالی مشکلات کی وجہ سے وہ طلبا اور اساتذہ کو ممالک غیر نہ بھیج سکیں تو کم ازکم ہندوستان کے مختلف حصوں میں اس قسم کی جماعتیں ضرور ہر سال روانہ کرنی چاہئیں ۔اس صوبہ کے رہنے والوں کو برما کی سیاحت یا مدراس ، بنگال وغیرہ کی سیاحت ازبس مفید ہوگی ۔ اور ملک کے مختلف حصوں کا بچشم خود مطالعہ کرکے نوجوانوں میں حوصلہ مند، وسیع اخلاق اور اپنے اوپر بھروسہ کرنیکی پاکیزہ جذبات پیدا ہوسکیں گے ، اور تعلیم کے سلسلہ میں جو تجربات کرنے کا اُنکو موقع ملیگا اُسکی خوبیوں کا اندازہ ممکن نہیں ہے ۔

ہم کو یہ معلوم کرکے دلی مسرت ہوئی کہ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے صدر جناب ابوبکر احمد حلیم صاحب - بی-اے (آکسن) ایبرسٹر، پروفیسر تاریخ نے سال گذشتہ کے آخر میں اپنے ہونہار طلبا کو لیکر ٹیکسیلا کا سفر کیا تھا - یہ علمی سفر امتحاناً کیا گیا تھا ، اور جہاں تک معلوم ہوا ہے کچھ زیادہ خرچ طلب بھی نہ تھا، مگر اس سفر سے طلبا کو جو مسرت حاصل ہوئی اور جو فوائد اُنکو حاصل ہوئے اُنکی تعریف میں وہ رطب اللسان ہیں، ہم جناب پروفیسر صاحب سے متوقع ہیں کہ وہ اپنے تجربات و مشاہدات کو بہ حیثیت اُستاد قلمبند فرماکر قارئین شمع کی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کرنیکے لیے ضرور مرحمت فرمائینگے ، اور اُنکے ہونہار طالبعلم بھی اپنے کیفنا ت نظر سے آثار قدیمہ کے مشاہدات ہمکو بھیجینگے ۔ یقین ہے کہ ان حالات کو پڑھکر اُستادوں و طلبا میں پروفیسر صاحب کی قابل قدر اور نہایت مفید عملی تحریک کی تقلید کا شوق پیدا ہوگا پروفیسر حلیم صاحب اپنی ذاتی صفات علمی قابلیت اور اشاعت تعلیم میں گہرے انہماک کی وجہ ملک کی مایہ ناز ہستی ہیں، اور ہم اُن کی کامیابی پر مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔

تبصرے

نظریہ اضافیت - جناب مولوی منہاج الدین صاحب ایم۔ ایس۔ سی، پروفیسر علوم طبیعات اسلامیہ کالج پیشاور کی تازہ تالیف ہے، پنجاب گورنمنٹ میں ساڑھے سات سو روپیہ مؤلف کو انعام دیا ہے، آئن اسٹائن کی نظریہ اضافیت نے انسان کے تصورات اور قیاسات میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے، اور بقول جناب مؤلف "فضائے بسیط غیر متناہی نہیں رہی، زمانہ اور طول مستقل ہونے کے بجاے اضافی حرکت پر منحصر ہیں۔ کمیت مادہ بھی رفتار سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ آئن اسٹائن نے اس نظریہ کے تمام مسایل اصول ریاضی سے حل کیئے ہیں"، لیکن لائق مولف نے علم ریاضی سے حتی الوسع اجتناب کیا ہے چنانچہ ریاضی سے ناواقف اصحاب بھی نظریہ اضافیت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں، ریاضی کے اصول حاشیہ پر درج کر دیے گئے ہیں، تاکہ ریاضی داں اصحاب بھی مستفید ہو سکیں، غرضکہ عجب جامع کتاب ہے جسکو لائق مؤلف نے نہایت محنت اور قابلیت سے تالیف کیا ہے، اردو میں بالکل نئی چیز ہے اور اس لائق ہے کہ ملک کے روشن خیال اور علم دوست حضرات اسکو ضرور خریدیں۔ اردو کا کوئی کتب خانہ اس کتاب کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ حجم مع غلط نامہ ۳۴۶ صفحے قیمت صرف للعہ مجلد للعہ جناب مؤلف سے مل سکتی ہے۔ کتاب نہایت سلیقہ سے طبع ہوئی ہے اور دیدہ زیب ہے۔



نفسیات ترغیب - جناب پروفیسر سید وہاج الدین احمد صاحب کنتوری کی تالیف ہے قابل مؤلف نے بڑا کام کیا ہے کہ ایسے ضروری فن کو نہایت صفائی کے ساتھ اردو کے قالب میں اتار لیا ہے، مولنا عبدالماجد صاحب بی۔ اے نے مختصر مگر دلچسپ

دیباچہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے ناواقف کو بھی نفسیات ترغیب سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اُردو میں بالکل نئی چیز ہے، اُردو کے قدرداں اور بہی خواہ اصحاب پھولے نہ سمائیں گے کہ اس زمانے میں ہمارے نوجوان کس محنت اور کوشش سے یورپ کے علمی خزاین کو نہایت قابلیت کے ساتھ اُردو میں منتقل کر رہے ہیں۔

ترغیب، بجائے خود ایک دلچسپ موضوع ہے اور اب تو یورپ کی فضا میں جدید تحقیقات نے اس کو ایک مستقل فن بنا دیا ہے، بقول مولوی عبدالماجد صاحب "نفسیات میں ایک اہم اور دلچسپ بحث ترغیب کی آتی ہے۔ عمل ترغیب کی ماہیت نفسی کیا ہے؟ انسان کو خود کیونکر کسی فعل کی جانب ترغیب ہوتی ہے۔ اور وہ دوسروں کو کیونکر ترغیب دیتا ہے؟ جذبات اور عقل کا ترغیب سے کیا تعلق ہے؟ دلائل منطقی اور ترغیب نفسی کے درمیان کس قسم کا رشتہ ہے؟ مؤیدات ترغیب اور موانع ترغیب کیا کیا ہیں؟ ترغیب کے صحیح مواقع استعمال کیا ہیں؟ غلط رجحانات اور باطل ترغیبات سے کیونکر بچنا ہے۔ اس قسم کے سارے مباحث کے لیے ایک جامع نام نفسیات ترغیب ہے"

لائق مؤلف نے یہ تمام مسائل اُردو زبان میں بہت صفائی سے بیان کر دیے ہیں۔ اور مکمل کتاب کو دلچسپ اور مفید بنانے میں کافی محنت اور دماغ سوزی کی ہے، ہم خوش ہیں کہ دارالمصنفین مفید اور قابل قدر کتب کی اشاعت کی طرف متوجہ ہے۔ طباعت کی خوبیوں کے لیے مولوی مسعود علی صاحب ندوی کا اسم گرامی کافی ہے۔ قیمت عہ ۲ روپیہ ہے اور دارالمصنفین اعظم گڈھ سے مل سکتی ہے۔



التربیۃ الاستقلالیہ - یعنی اولاد کی تعلیم و تربیت اور صحیح طریقہ پرورش کے متعلق زبان فرانسیسی کی ایک مشہور کتاب انیسویں صدی کا "امیل" کا ترجمہ جو اول مصر میں فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھی، اب اس کے ضروری حصول کو

جناب مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے حسب الارشاد نواب صدر یار جنگ بہادر مولنٰا محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی - عربی سے اردو میں ترجمہ کیا اور تعلیم قدیم وجدید کے نقائص پر اپنی طرف سے اسمیں ایک مقدمہ اضافہ کیا، اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ نے شایع کیا -

پوری کتاب دلچسپ اور مفید ہے قابل مترجم اُردو کی دنیا میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں، اولاد کی تعلیم کا مسئلہ جیسا کچھ روکھا پھیکا ہے اور جی کا جنجال ہے اسکو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی تقدیر میں چھوٹے بچوں کا باپ ہونا لکھا ہے لیکن اس موضوع کو شگفتہ بنا دینا جناب مترجم ہی کا کام تھا! کتاب کے چار حصے ہیں - پہلا حصہ ماں کے متعلق ہے - دوسرا بچے کے متعلق، تیسرا قریب البلوغ لڑکے کے اور چوتھا جوان لڑکے کی تربیت کے متعلق ہے، ہر حصہ میں چند خطوط ہیں جو دو فرضی میاں بیوی نے لکھے ہیں - شوہر کسی سیاسی جرم میں قید ہو گیا اور میاں بیوی کے درمیان طویل جدائی ہو گئی لیکن شوہر اپنی زندہ یادگار بیوی کے پاس چھوڑ گیا اور اُسی کے متعلق میاں بیوی کے درمیان خط وکتابت ہوئی، مصنف نے اس فرضی لڑکے کی تعلیم و تربیت کا انتظام دو مختلف ملکوں میں کیا ہے، یعنی انگلستان کو اُسکی تربیت کے لیئے منتخب کیا ہے کیونکہ اُس کے نزدیک تمام یورپ میں انگریزی قوم کی اخلاقی حالت سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور قابل تقلید ہے۔ اور اُسکو اعلےٰ تعلیم جرمنی میں دلوائی ہے جو علمی ترقی کے لحاظ سے تمام یورپ میں ضرب المثل ہے .... زمانۂ حمل سے لیکر زمانۂ شباب تک لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے غیر مرتب اصول درج ہیں اور ان تمام اصول میں فرانس کی اصلی روح کے لحاظ سے صرف یہ مقصد پیش رکھا گیا کہ طلبا کو ایسی تعلیم و تربیت دیجائے جس سے اُن میں آزادی اور استقلال کی روح پیدا ہو اور اُن کے تمام اعمال اور افعال خود اُن کے " ارادہ اور اختیار سے صادر ہوں، جبر، استقرار اور تقلید کی اُن میں آمیزش نہو"

تمام خطوط دلچسپ ہیں - ہندوستانی والدین ان کا مطالعہ کرکے بہت کچھ اپنے بچوں کی اصلاح کرسکیں گے - اور اُنکی اصلاح سے خود اُنکی ذہنیت کی بھی اصلاح ہو جائیگی جس کی فی زمانہ سخت ضرورت ہے - لائق مترجم نے ایک بسیط دیباچہ لکھکر بڑا کام کیا ہے اور چونکہ وہ خود قدیم اصول پر تعلیم پا چکے ہیں اور جدید اصول سے واقف ہیں اسلئے اُن کا تبصرہ قابل وقعت ہے - آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے کتاب کو شایع کرکے ملک پر احسان کیا ہے - لکھائی چھپائی بہت اچھی - حجم ۲۰۰ صفحہ - قیمت عہ دفتر آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے مل سکتی ہے -

فطرت اطفال - یعنی ایک انگریز فلسفی اور ماہر نفسیات کرسچین ڈی لارسن کی تصنیف کا اُردو ترجمہ مترجمہ منشی فاضل مولوی حامد حسن صاحب قادری بچھرایونی - یہ رسالہ بھی نواب صدریار جنگ بہادر مولوی محمد حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی کی فرمایش سے ترجمہ ہوا ہے اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ نے شایع کیا ہے - بچوں کی نفسیات کے تمام ضروری شعبوں پر بحث ہے - بچوں کی ازجی - رجحانات طبعی - تربیت تخیل، احساسات لطیفہ، ملکۂ نقالی، تاثرات فطری - اور تعمیر سیرت کے سات ضروری عنوانات پر رسالہ کو تقسیم کیا گیا ہے اور ہر عنوان کے تحت میں جدید اور دلچسپ تجاویز اور اشارات ہیں - اور لائق مترجم نے اصل کتاب کی دلچسپی کو ایک بڑی حد تک قائم رکھا ہے آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنی جدید مطبوعات کے ذریعہ سے اہم خدمات انجام دینے کا بیڑا اُٹھایا ہے - تعلیم یافتہ والدین اور اُستاد اس قسم کی کتابوں کی جسقدر عزت کریں کم ہے - دفتر ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ سے یہ رسالہ مل سکتا ہے - قیمت ۴ ر ہے

قرآن مجید کا اردو ترجمہ حسب تحریک وانتظام عالی جناب نواب بہادر صاحبزادہ محمد سلطان اللہ خاں

صاحب چیف سکریٹری حضور سرکار عالی دام اقبالہ دربار جاورہ و بہ منظوری حضور پر نور لفٹنٹ کرنیل
ہز ہانیس فخر الدولہ نواب سر محمد افتخار علیخاں بہادر صولت جنگ کے ۔سی ۔آئی ۔ای فرمانروائے
ریاست جاورہ شمس العلماء مولانا نذیر احمد صاحب دہلوی مرحوم کے ترجمہ قرآن مجید کی پہلی جلد
دار الطبع سرکار عالی جاورہ سے اہتمام کے ساتھ شائع ہوئی ہے مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم
کا ترجمہ ملک میں مقبول ہو چکا ہے مزید تعارف کا محتاج نہیں ۔لیکن ابتک اصل عربی
کے ساتھ ترجمہ شائع ہوتا تھا ۔صاحبزادہ صاحب نے محض ترجمہ کو علیحدہ شائع فرما کر
ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا فرمایا ہے پہلی جلد پندرہ پاروں کا ترجمہ ہے ۔خوشخط
ہے ،اور نفاست کے ساتھ چھپی ہے ۔ تمام ضروری نوٹ اور حواشی بھی دئے گئے ہیں
جن کی وجہ سے ترجمہ بہت دلچسپ اور سبق آموز بن گیا ہے ۔ہمارے خیال میں صاحبزادے
صاحب کی توجہ لائق ستائش ہے اور یقین ہے کہ شائقین اس بے مثل ترجمہ کو ضرور
خریدیں گے پہلی جلد کا حجم چار سو چوبیس صفحات ہے ،کاغذ سفید ہے ،اور رحمن علی صاحب
کاتب ہیں ۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت للعہ ، مستورات ،اور عربی نہ جاننے والے
لوگوں کے واسطے یہ ترجمہ ایک نعمت ہے اور اس لائق ہے کہ کتب خانوں و مدارس میں
خرید کر رکھا جائے ۔ ملنے کا پتہ ۔

دار الطبع سرکار عالی جاورہ ریاست

قواعد اردو ۔ مؤلفہ مولوی عبد الحق صاحب بی ۔اے ۔ علیگ
انتخاب کلام میر ۔ معہ مقدمہ مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب بی ۔اے ۔ علیگ
مثنوی خواب و خیال ۔ خواجہ اثر مرحوم ، مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب بی ۔اے علیگ

یہ تینوں کتابیں انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن نے شائع کی ہیں ۔ انجمن مذکور

ہر سال متعدد مفید کتابیں شایع کرتی ہیں۔ ٹائپ کے حروف میں چھپی ہیں۔ جلد بندی کا بہت نفیس ہے، اور قیمتیں بالکل واجبی ہیں، ٹائپ کو رائج کرنے میں جو کوشش انجمن مذکور کی جانب سے ہو رہی ہے وہ حقیقت میں قابل قدر ہے۔

قواعد اردو۔ مولوی صاحب کی مشہور تالیف ہے۔ کچھ عرصہ سے کیاب تھی۔ آپ دوبارہ شایع ہوئی ہے۔ لائق مؤلف نے اسکو جدید اور آسان اصول پر تالیف کیا ہے۔ اس مرتبہ عروض کا اضافہ کر دیا ہے۔ بہ لحاظ ترتیب اور جامعیت کے، لاجواب کتاب ہے مجلد عہ/ غیر مجلد عہ

انتخاب کلام میر۔ بہت مقبول انتخاب ہے۔ تیسری بار شایع ہوا ہے مولوی صاحب نے مقدمہ لکھکر ادب پر بڑا احسان کیا ہے انتخاب اور مقدمہ دونوں کی تعریف کرنے کو بے اختیار جی چاہتا ہے۔ بعض طبایع انتخابات کو پسند نہیں کرتے، لیکن ہمارا خیال ہے، کہ جہاں شاعر، چار چار اور پانچ پانچ دیوان لکھنا اپنی استادی کی دلیل سمجھتے ہوں، وہاں عوام کے لیے انتخابات نہ کرنا، خود شاعر کے اوپر ظلم کرنا ہے، طلبا، یا عوام کے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ روپیہ کہ وہ ایک ایک صاحب دیوان کی سیکڑوں غزلوں، قصائد، قطعات، اور مثنویوں کے سمندر میں غوطے لگا کر آبدار اشعار نکال لایا کرے۔ ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کہ اصل دیوان بالائے طاق رکھ دیے جائیں۔ ہم صرف اس قدر عرض کرتے ہیں کہ انتخابات کی بہت ضرورت ہے، اور شعرا کو عوام میں مقبول بنانے کا یہی ایک موثر طریقہ ہے۔ مجلد عہ غیر مجلد عہ

مثنوی خواب و خیال۔ خواجہ درد مرحوم دہلوی کے بھائی خواجہ اثر کی مثنوی ہے جو نایاب تھی۔ مگر مولوی عبدالحق صاحب نے پیدا کر دی، اور اپنے دلچسپ اور مفید مقدمہ کے ساتھ شایع کر کے ملک پر بڑا احسان کیا۔ مولانا حالی مرحوم کا خیال تھا کہ حکیم نواب مرزا شوق مرحوم لکھنوی نے اس مثنوی کو اپنا ماخذ قرار دیا تھا، مثنوی خواب و خیال کے

مطالعہ سے مولٰنا مرحوم کے خیال کی طرف حرف بہ حرف تائید ہوتی ہے ۔ مثنوی نہایت پاکیزہ ہے اور فصاحت اور سلاست کے اعتبار سے لاجواب ہے ، خواجہ اثر مرحوم کا دیوان ناپید ہے ، مگر مثنوی میں اُنکی جا بہ جا غزلیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غزلگوئی میں بھی باکمال تھے ، مجلد عہ غیر مجلد عہ ۔

یہ تینوں کتابیں خریدنے اور مطالعہ کرنے کے لائق ہیں ۔ انجمن ترقی اُردو بڑا کام کر رہی ہے ، اور مولوی صاحب اسکے مسیحا ہیں ۔ یقین ہے کہ اُنکی دماغی کاوشیں ملک میں مقبول ہوگئیں ، اور اہل ذوق ان پاکیزہ کتب سے لطف اندوز ہونگے ۔ چھپائی نہایت صاف و خوبصورت ہے ۔ جلد بندی مضبوط ، اور نفیس ۔ قیمت کم ۔ غرض ہر اعتبار سے کتابیں اپنی خریداری کی خود سفارش کرتی ہیں ۔

آئین اُردو مؤلفہ جناب مولوی محمد زین العابدین صاحب فرجاد کوزہانوی (نامی پریس میرٹھ عہ) قواعد اُردو پر نئی کتاب ہے جو محنت اور توجہ سے لکھی گئی ہے ۔ چونکہ مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری کی مصباح القواعد ، اور مولوی عبدالحق صاحب کی قواعد اردو کے بعد تالیف ہوئی ہے اسلیئے لائق مؤلف کو ہر دو کتب مذکور کی خوبیوں سے مستفید ، اور انکی غلطیوں سے محفوظ رہنے کا پورا موقع ملا ، لائق مؤلف نے ابتدا میں دونوں بزرگوں کے تسامحات کی فہرستیں لکھدی ہیں ۔ کسی زبان کے قواعد مرتب کرنا آسان کام نہیں ، اسی لیئے مؤلفین میں اختلاف آرا کا ہو جانا بھی تعجب کی بات نہیں ۔ لائق مؤلف نے قواعد اردو کی بعض غلطیوں کی صحیح گرفت کی ہے اور بعض جگہ خود بھی غلطی کی ہے ، ابھی کچھ عرصہ تک کوئی کتاب قواعد کے متعلق غلطیوں سے پاک نہو گی ۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان پھیلی ہوئی ہے ۔ اور رفتہ رفتہ بحث و تنقیح کے بعد ایک دن آئے گا جب کہ مکمل قواعد مرتب ہو سکیں گے ،

لیکن اس وقت بھی اختلاف آرا کا مسئلہ بدستور قائم رہے گا ۔ لائق مؤلف نے بہت محنت کی ہے ، اور اردو کے قواعد کو حتی الوسع جامع بنایا ہے ۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہیں کہیں غلطیوں کا ہو جانا غیر معمولی بات نہیں ہے ۔ مولوی فتح محمد خاں صاحب تو دنیا میں نہیں ہیں جو مؤلف کو جواب دیتے ، لیکن مولوی عبدالحق صاحب زندہ ہیں اور بہت زیادہ زندہ ہیں ۔ انھوں نے اپنی کتاب کے متعلق رسالہ اردو میں جواب دے دیا اور لائق مؤلف کی کتاب آئین اردو میں متعدد غلطیاں نکال کر رکھ دیں " تا کہ فاضل مؤلف کو معلوم رہے کہ لغزشوں کا صادر ہونا اُن سے بھی ممکن ہے " اس جھگڑے میں مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو بھی کھینچنا پڑا ، حسب تحریر مولوی عبدالحق صاحب " کتاب (آئین اردو) کے سرورق پر جلی قلم سے یہ بھی تحریر ہے ، مصدقہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ ، اور قابل مؤلف کا یہ لکھنا بجا بھی ہے کیونکہ سرورق کی پشت پر اس سے بھی جلی قلم میں حضرت علامہ موصوف کا نامۂ صداقت بھی منقول ہے جس میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے ماہ رمضان کی فرصت میں آپ کی پوری کتاب " آئین اردو " دیکھی ؛ مجھے تو کہیں حرف رکھنے کی جگہ ملی نہیں .... "

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　　کسی کے ماری تھی برچھی کسی کے آن لگی

مولوی صاحب کو شاید خیال نہ رہا کہ علامہ موصوف نے اپنی رائے صرف ایک کتاب پر دی ۔ اور وہ بھی رمضان کے مہینہ میں لکھ کر بھیجی تھی ، ورنہ مولوی صاحب اتنے خفا ہوتے ! چونکہ اردو کے اور رسالوں میں بھی فریقین کے تسامحات پر کافی بحث ہو چکی ہے ۔ اس لیے مزید رائے زنی عبث معلوم ہوتی ہے ۔ مولوی عبدالحق صاحب کی کتاب قابل قدر ہے ، اور مقبول ہے ، جدید طرز کی تالیف ہے ۔ اس میں غلطیوں کا رہ جانا مقتضائے بشریت تھا ۔ آئین اردو بالکل تازہ تالیف ہے ، اس میں بھی غلطیاں ہیں ، یہ بھی بشریت کا اقتضا ہے لیکن معمولی غلطیوں کے ہونے سے ہر دو کتب کی قدر و قیمت میں کمی واقع نہیں ہوتی جناب مجاہد نے

صرف کے حصہ کو بہت تفصیل کے ساتھ لکھا ہے ، اور جدتیں بھی پیدا کی ہیں یقین ہے کہ
انکی محنت ٹھکانے لگے گی ، اور ملک میں کتاب مقبول ہوگی - انھوں نے ایک قابل قدر
ادبی خدمت انجام دی ہے جسکے لیئے وہ ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں حجم ۲۱۶ صفحے
جناب مصنف سے مل سکتی ہے -

آئینۂ حقیقت نما - جلد اول - مصنفہ مولنٰنا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی
جناب مولنٰنا نے اس کتاب کو نیک نیتی سے تصنیف کیا ہے - ان کا خیال بالکل بجا ہے
کہ انگریزی مدارس میں حال کی لکھی ہوئی تواریخ کا مطالعہ مسلمانوں کے عہد حکومت کی تاریخ
سے بے اعتنائی اور لیڈروں کی خود بینی نے ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کو شدید نقصان
پہونچا دیا ہے - ان کا دعوی ہے سنہ ء لغایتہ ۱۸۵۷ء یعنی گیارہ سو برس مسلمانوں نے
ہندوستان میں حکومت کی ، لیکن ان کے تعلقات ہندوؤں سے بہت اچھے رہے -
افسوس ہے کہ انگریز مورخوں نے سچائی پر قصداً پردہ ڈالا ، جھوٹے اور غلط واقعات کو
مدرسوں اور کالجوں کے طلباء کے دماغ میں جاگزیں کرایا ، باہمی منافقت بڑھائی -
اصلی کتب تواریخ جو فارسی میں تھیں اور صحیح واقعات و حالات کی حامل تھیں ان کو
پس پردہ ڈالدیا - نتیجہ یہ ہوا کہ دو رنگا ہوں کی فضا میں سمیت پھیل گئی ، اور دلوں میں
مغائرت اور عناد کی آگ بھڑک اٹھی ، اسکو جاہ طلب اور عزت کے خواہاں بدنصیب
لیڈروں نے اپنی اغراض کے لیئے تمام ہندوستان میں پھیلا دیا - مولنٰنا اپنی تصنیف کے
ذریعہ سے غلط خیالات کو دور کرنا چاہتے ہیں ، اور بتانا چاہتے ہیں کہ مسلم حکومت ابتداء
انتہا تک ہندو دوست تھی ، ہندو کش نہ تھی - ظاہر ہے کہ صحیح تاریخی واقعات اور حالات
کے تحت میں اگر کوئی کتاب اس اہم موضوع پر لکھی جائے تو ملک اور قوم کے لیے بیحد مفید
ثابت ہوگی ، اور مورخانہ حیثیت سے اسکا مرتبہ بلند ہوگا ہم نے آئینہ حقیقت نما کو جستہ جستہ دیکھا

مولانا کا طرز استدلال مدعیانہ ہے اور وہ کمزور واقعات کو بھی اپنی قوت سے مضبوط بنانا چاہتے ہیں یہ باتیں فن کے اعتبار سے قابل گرفت ہیں، ہندوستانی مورخ عموماً انگریزی میں کتابیں لکھتے ہیں اور بہ شکل خالی الذہن ہوکر تاریخ پر قلم اٹھاتے ہیں۔ شروع سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہندو مسلم کشیدگیاں اس زمانہ میں بہت زیادہ تھیں اور اسی رنگ کی عینک چڑھا کر حالات اور واقعات کو دیکھتے اور موشگافیاں کرتے ہیں اور اس بدعت کو ریسرچ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ مولانا نے جو ریسرچ کی ہے وہ بھی ایک خاص رنگ کے تحت میں ہے۔ اس لیے اُن کو ہر مقام پر مسلمان بادشاہوں کی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ ہم ممنون ہیں کہ مولانا کا قلم ایسے موضوع پر گل فشانیاں کر رہا ہے جس سے خیر و برکت کی توقع ہوسکتی ہے کیونکہ وہ اصل فارسی کتب کو پیش کرتے ہیں۔ انگریز مورخین کی تحریرات کو سامنے لاتے ہیں اور پھر اُنکی قلعی کھولنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اسی کوشش میں کبھی کبھی وہ خود مغالطہ میں آجاتے ہیں ہمارا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کی رواداری اور اُنکی منصف مزاجی کو ایک حد تک صحت اور صفائی سے ظاہر کرسکے ہیں۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ بے تعصبی کے ساتھ صحیح تاریخی استدلال اور استخراج کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ موجودہ تصنیف جلد اول ہے اور سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی اور خسرو خاں کے حالات پر ختم ہوتی ہے۔ مولانا اگر مدعیانہ طرز کے ہوتے ہوئے بھی اپنے قلم کو حد اعتدال کے اندر رکھتے تو بہتر ہوتا۔ بعض جگہ وہ ہندو مورخین اور اہل ہنود کے متعلق سخت الفاظ استعمال کرجاتے ہیں جنکی وجہ سے لفظی بحثوں میں اصلی تاریخی حالات غائب ہوجاتے ہیں، یہ تو ایک موٹی سی بات ہے اگر مسلمانوں میں رواداری نہ ہوتی تو گیارہ سو برس تک ہندوستان میں کس طرح رہ سکتے تھے، لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ رواداری کو واضح کرنے میں اگر مخالف ہندو مورخین یا ہندوؤں کی بے عنوانیاں نظر آئیں تو اُن کا ذکر سخت الفاظ میں کیا جائے ؟۔

بہرکیف کتاب پڑھنے کے قابل ہے اور ہندوستان کے تاریخ کے طلباد کو ضرور مطالعہ کرنی چاہیے حجم ۲۳۷ صفحے قیمت عیؔ، نجیب آباد میں مصنف سے ملسکتی ہے۔

عبرت - یعنی تفسیر الفرقان فی معارف القرآن کا وہ حصہ جس میں سورۂ یوسف کی معنی خیز تفسیر ہے۔ ازجناب خواجہ محمد عبدالحیٔ صاحب فاروقی اُستاد تفسیر ناظم دینیات جامعہ اسلامیہ دہلی - ایک جامع اور عالمانہ تفسیر ہے جس کے مطالعہ سے بصیرت حاصل ہوتی ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، مولٰنا عالم و فاضل ہیں محقق ہیں اور بالغ نظر بزرگ ہیں۔ اُنھوں نے جابجا ضروری اور مفید معلومات کا اضافہ کرکے تفسیر کو بہت ہی دلکش بنا دیا ہے۔ جامعہ ملیہ نے اس کتاب کو شایع کرکے مسلمانوں کی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ غیر مسلم بھی اس تفسیر کے مطالعہ سے محظوظ ہوں گے جنکو اسلام سے دلچسپی ہے، اور اُنکی بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی جو باوجود مسلمان ہونے کے عقلی اور نقلی دلائل یا جہل و کم علمی کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں ایسی مفید مذہبی کتابوں کی اشاعت ازبس ضروری ہے اور ہم منتظر ہیں کہ اسی انداز سے مولوی صاحب پورے کلام مجید کی تفسیر جلد شایع فرمائیں گے۔

قیمت فیجلد عہ، غیر مجلد سہ پتہ:- جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

دیوان شیدا - یعنی جناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب شیدا کا فارسی اور اُردو کلام، حضرت مسیح الملک مشہور حکیم، اور مستند ادیب ہیں۔ ممکن نہ تھا کہ ظاہری اور باطنی آراستگی کے ساتھ اُن کے قلب پر محبت کی چوٹ نہ ہوتی، اور یہ اس لیے ضروری ہے کہ انسان بغیر عشق کے کامل نہیں ہوسکتا، یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو اگر قلب انسانی میں موجود نہو تو عالم بے عمل اور محقق محض مقلد رہجاتا ہے۔ حضرت مسیح الملک کے قلب کی کیفیت اُن کے اشعار میں نمایاں ہے۔

فارسی کے چند اشعار جو ملاحظہ طلب ہیں :-

بزیر گنبد گردوں اگر رنج و محن دارم — مکن نسبت بہ گردونش کہ من از خویشتن دارم
کنوں در عشق تو جاناں نہ جاں دارم نہ تن دارم — ولے دل باہزاراں آرزو زیر کفن دارم
حبیبا! از لب جاں بخش خود یک قطرہ آبم دہ — لبے بگذشت در عشقت کہ من آتش بہ تن دارم
بدار ایمن خدایا از حوادث ایں ودیعت را — نہاں در خانۂ دل آنچہ زاں رشک چمن دارم

دلبرا در گردش آور جام را — تا ز خسارت بجویم کام را
بادۂ گلگوں بہ بانگ کوس خور — پشت پا زن چرخ نیلی فام را
چوں زدی در وادیٔ اُلفت قدم — ننگ را بر ہم زن و ہم نام را
تا رہ شیدا ز جور آسماں — ساقیا برخیز و پُر کن جام را

آں بیخودم کہ بر لب من آہ و نالہ نیست — مستم ز عشق یار و بدستم پیالہ نیست
از درد دل ہر آنچہ کہ بسپردہ شد بشعر — در گوش کن کہ گفتۂ شیدا رسالہ نیست

گہ بزلف او بپیچم گہ بُرخ زنم بوسہ — ناصحا ز من بگذر عالم جوانیہاست
دی تو با رقیب من زیر لب چہ بر گفتی — دلبرا مکن غیبم عشق و بدگمانیہاست

غم دل با کہ تواں گفت کہ غمخواری نیست
ہمہ مستند دریں میکدہ ہشیارے نیست

صد ہزاراں جاں شد و بازش مبیں — شمع در بزم است خنداں الغیاث

فارغ از راحت و رنج دو جہانم کردی — مرحبا عشق کہ ہم این و ہم آنم کردی

مژدہ اے یاراں کہ باز آں دلستاں آید ہمی — در گلستانم بہار بے خزاں آید ہمی

دست تہی ز برگ و ساز ، پاے شکستہ رہ دراز
خود تو بگو ، جہان ناز ، چوں کنم از جستجو ،
انچہ کہ رفت ماجرا ، گرچہ نہفتہ ز ما
لالہ رخا ، سمنبرا ! زلفت تو گفت مو بمو
حور و سروش انس و جاں ، خلق زمین و آسماں
ہر چہ کہ ہست در جہاں ، میکند از تو گفتگو

اُردو کلام ملاحظہ ہو :-

لو مبارک ہو لٹا پھر نقد دل لوٹا ہوا — پھر پھنسا دام بلا میں مرغ جاں چھوٹا ہوا
یاس و نومیدی کے ہاتھوں اس دل بیتاب میں — پھر رہا ہے حسرتوں کا قافلہ لوٹا ہوا

آباد بلبلوں سے خزاں میں بھی تھا چمن — ہر ہر قدم پہ سنتے ہیں اک اک ہزار تھا
خلوت میں کٹ رہی تھی کسی سے نہ تھی غرض — غم تھا نہ جام مے کا ، نہ فکر نگار تھا
اتنے میں تیرہ ابر اٹھا کوہسار سے — وہ ابر جو کمیں میں بہت بے قرار تھا
پھر آرزوے بادہ مجھے لے چلی کہیں — یاد آیا میکشوں سے جو قول قرار تھا
لیکن ابھی لیا بھی نہ تھا جام ہاتھ میں
دیکھا تو فصل گل تھی ، نہ ابر بہار تھا

لذت ہی تھی کچھ ایسی کہ چھوڑا نہ صبر کو — کرتے رہے وہ جور و ستم ہم سہا کیا
کیا شے تھی وہ جو آنکھ سے دل میں اتر گئی — دل سے اٹھی تو اشک کا طوفاں بپا کیا
تیری کشادِ لب ہے مری موت کا پیام — نکلے گا دم جو تو نے تبسم ذرا کیا

ظلم کی تیری کریں فریاد کیا — لطف ہو جب اسمیں پھر بیداد کیا
وصل ہی شیدا اجل کا نام ہے — دیتے ہیں اسکی مبارکباد کیا

واعظ یہ فصلِ گل ہے، یہ گھر ہے، یہ میکدہ — قصہ نہ چھیڑ آج حرام و حلال کا

آنکھ کے ظرف سے اندازۂ مظروف نہ کر — ہم نے دریا کو اسی کوزے میں بھر رکھا تھا

تو اے بختِ سیہ سن لے کہ اک دن وہ بھی آئیگا — نہ ہم ہوں گے نہ تو ہوگا، نہ دورِ آسماں ہوگا

مجھ سے پوچھو اثرِ بادۂ گلگوں واعظ — میں ہوں رندوں میں بہت شکستہ رسن جامِ شراب

آخر لبوں تک آ ہی گئی آرزوئے دل — کھو بیٹھے آج ہاتھ سے ہم اپنے دل

مرنا بھلا ہے ضبط کی طاقت اگر نہ ہو — کتنا ہی دردِ دل ہو مگر چشم تر نہ ہو
مل جاؤ تم تو شب کو بڑھائیں گے تا ابد — مانگیں گے یہ دعا کہ الٰہی سحر نہ ہو

عصیاں کے تلاطم نے کیا ہے تہ و بالا — یہ ہاتھ مگر دامنِ ساحل کے لیئے ہے

ہے راہ پہ سر بے سر و ساماں ترا مجنوں — لیلیٰ یہی ساماں تری منزل کے لیے ہے
کہتے ہیں جسے مرگ نہیں مرگ وہ ہرگز — پہلا یہ قدم لطفِ منازل کے لیے ہے
آئی ہے بہت شان سے گو فصلِ بہاری — پیغام مگر مرگِ عنادل کے لیے ہے

شیداؔ سے کہا راز یہ اک صاحبِ دل نے
جو کچھ ہے جہاں میں وہ فقط دل کے لیے ہے

رہیں یہ آرزو میں یا نکل جائیں برابر ہیں — مریضِ عشق سے پوچھو تو غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
کبھی صیاد کا ڈر ہے، کبھی خوفِ خزاں اسکو — گلستاں میں دلِ بلبل پہ غم یوں بھی ہے اور یوں بھی
وہ لیلیٰ تھی مگر جذبِ محبت سے ہوئی مجنوں — کتابِ عشق میں شیداؔ رقم یوں بھی ہے اور یوں بھی

رخسار پر ہے رنگِ حیا کا فروغ آج — بوسہ کا نام میں نے لیا وہ نکھر گئے

پھرتے ہیں چاک جیب و گریباں پہ منہ دئے — ہم دستِ عشق کے ہیں پریشاں کیے ہوئے
پھر داغِ ہجر تازہ کرونگا بہار میں — مدت گذر گئی ہے چراغاں کیے ہوئے

درد کو رہنے بھی دے دل میں دوا ہو جائیگی — موت آئیگی تو اے ہمدم شفا ہو جائے گی
محتسب اور ہم ہیں دونوں متفق اس باب میں — برملا جو میکشی ہو بے ریا ہو جائے گی

کب بدلتے ہیں زمانہ سے حقیقت آگاہ — میں نہیں اور، زمانہ کی ہوا اور سہی
ہے بقا دہر کی ہر لحظہ ہم آغوشِ فنا — تم بقا اسکو سمجھتے ہو فنا اور سہی

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے حضرت شیدا کے دیوان کو نہایت نفاست اور خوبصورتی کے ساتھ جرمنی میں چھپوایا ہے۔ پاکٹ سایز ہے اور کاغذی بکس میں فروخت ہوتا ہے۔ جلد سنہری اور نفاست طبع کا اعلےٰ نمونہ ہے قیمت صرف عہ ہے شروع میں مکرمی جناب قاضی عبدالغفار صاحب بی۔ اے۔ علیگ کا دیباچہ ہے، جو مجسم کیف ہے اور پڑھنے کے قابل ہے۔

ہم کو دلی مسرت ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی علمی دنیا میں نہایت سرگرمی کے ساتھ عملی ترقی کر رہی ہے۔ دعا ہے کہ خدا اسے برتر جامعہ کو کامیاب فرمائے۔

جامعہ ملیہ سے ایک رسالہ "جامعہ" بھی شایع ہوتا ہے، مولٰنا اسلم صاحب جیراجپوری، اور جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایڈیٹر اور ہمارے عزیز دوست جناب محمد مجیب صاحب "آکسن" ناشر ہیں۔ رسالہ ملک کا مشہور علمی پرچہ ہے سالانہ قیمت عہ، روپیہ ہے۔

کتب بغرض ریویو

مندرجہ ذیل کتب بغرض ریویو وصول ہوئی ہیں۔ شکریہ کے ساتھ رسید پیش کیجاتی ہے، ان کتب پر عنقریب ریویو کیا جائیگا۔

میخانہ۔ تالیف ملا عبدالنبی فخرالزمانی قزوینی، باعتنا مولوی محمد شفیع صاحب ایم۔ اے۔ پروفیسر عربی پنجاب یونیورسٹی لاہور عہ

حقیقت اسلام۔ مصنفہ نواب سر امین جنگ بہادر کے، سی، آئی، ای نظامی پریس بدایوں۔ عہ

پیام صلح (نظم) ماسٹر باسط صاحب بسوانی (جناب نیساں لکھنوی -
نظامی پریس بدایوں ۸ر

پس پردہ - مجموعہ مضامین جناب آغا حیدر صاحب دہلوی مرتبہ مولوی عبدالباسط صاحب ایم - اے - علیگ مسلم یونیورسٹی علیگڈھ -

خطبات اسلامیہ مدراس - مصنفہ جناب سید سلیمان ندوی صاحب انجمن الاصلاح دسنہ ڈاک خانہ استھاوان ضلع پٹنہ

دیباچہ صحت - مصنفہ میجر لطافت حسین صاحب - آئی، ایم ایس انجمن ترقی اردو اورنگ آباد

باغبانی - مترجمہ حامد حسین صاحب قادری بچھراونی - میسرز میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ کلکتہ

صحت کی کہانی - مترجمہ مولوی عابد حسین صاحب زیدی - ایم - اے - ایل ٹی ،، ،،

جنگل اور زندگی - مترجمہ مولوی حامد حسن صاحب قادری ،، ،، ،،

حکایات پنجاب - مترجمہ سید عبدالقادر صاحب ایم - اے ،، ،، ،،

خیابان عرفاں - مولفہ مولوی محمد حسن صاحب بلگرامی - حیدرآباد دکن

بزم ایران - مولفہ حاجی آقا محمد رضا صاحب قزوینی - رام پور

اقبال - مصنفہ جناب مولوی محمد دین صاحب وکیل لاہور -

میرا پیارا وطن - فیاض محمد عبدالقدوس صاحب آف مستان قیملی نمائندہ اسمبلی، ممبر حن پٹن - میسور

اردو ترجمہ قرآن - ڈاکٹر نذیر احمد صاحب مرحوم دہلوی ۵ اسیپارہ حصہ اول سرکاری پریس ریاست جاورہ -



امرت دھارا ختم ہو تے ہی برات سے چلا آیا

برات میں دوسرے سامان کیساتھ امرت دھارا کو باندھنا نہ بھولو

ایک دن میں ریل میں سفر کر رہا تھا جبکہ دو دوست آپس میں باتیں کرتے تھے۔ ایک نے پوچھا کہ آپ برات سے پہلے کیوں واپس آ گئے۔ دوسرے نے جواب دیا کہ میں تو جب امرت دھارا ختم ہوئی بھاگ آیا۔ اتنی ثقیل غذا ملتی تھی کہ سوائے امرت دھارا کے گزارا نہ تھا۔ پوریاں ٹوٹنے سے ٹوٹتی نہیں تھیں شام کو بھتوں پر دے دیا جاتا تھا پھلکا تو ایک وقت بھی نہیں دیکھا۔ براتوں میں اچھی سے اچھی غذا ملے تو بھی ثقیل ضرور ہوتی ہے اور اتنے آدمیوں میں کسی نہ کسی کو کچھ گڑبڑی رہتی ہے۔ اسی واسطے عقلمند لوگ برات میں امرت دھارا ساتھ لے کر ہی جاتے ہیں۔ تو بھی ان دوستوں کی گفتگو سن کر ہمارا خیال ہوا کہ عام پبلک کو بھی آگاہ کرنا چاہیئے۔ کہ وہ

برات میں دوسرے سامان کیساتھ کافی مقدار امرت دھارا کو باندھنا نہ بھولیں

چودھری نوٹ کر رکھیں جہاں وہ اور سامان کی فہرست لیں وہاں امرت دھارا کو بھی پوچھ لیا کریں تاکہ وقت بے وقت کی تمام تکالیف دور ہوں۔ پیٹ درد، چوٹ، زخم، بدہضمی وغیرہ پر فوراً لگا سکتے ہیں اور ہیضہ، دانت، بواسیر، پیچش، دست وغیرہ میں کھلا سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی بھی شخص کو کبھی بھی امرت دھارا کو بھولنا نہیں چاہیئے۔ یہ دوائی تجربوں کے مرحلے سے گذر چکی ہے۔ اسکو ہر کوئی اب انسانی ضرورتوں میں سے جانتا اور مانتا ہے۔ غلامی نہ کرو امرت دھارا کو پاس رکھو۔

قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (۱؎۸) نصف شیشی ایک روپیہ چار آنہ (عہ ۱؎) نمونہ ۸؍

ہر شہر میں ملتی ہے یا اس پتہ سے منگوا لیں:۔ امرت دھارا (۸۶) لاہور

المشتہر:۔ مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

باہتمام خواجہ صدیق حسین صاحب

آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھاپا گیا